برصغیر پاک و ہند کی چورانوے نامور شخصیات
کے حالات، واقعات و تصاویر کا دلچسپ تذکرہ

عظمتِ رفتہ

ضیاءُ الدّین احمد برنی
بی اے

ادارۂ علم و فن

عظمتِ رفتہ

از

فہرست مضامین

نمبر شمار		صفحہ

نمبر شمار | | صفحہ

ضمیمے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تمہید

جو کتاب اب پیش کی جارہی ہے وہ ''یاران کہن''، ''گنجہائے گرانمایہ''، ''یاد رفتگاں''، ''کیا خوب آدمی تھا''، ''چند ہمعصر'' وغیرہ جیسی کتابوں کے نہج پر لکھی گئی ہے - جن اشخاص کے متعلق یہ یادیں پیش کی گئی ہیں وہ میری نظر میں صاحب عظمت تھے - ان میں صرف دو شخصیتیں ایسی ہیں جن سے میری ایک دفعہ بھی بات چیت نہیں ہوئی ، بعض ایسی ہیں جن سے ایک ایک دفعہ ملاقات ہوئی ، بعض ایسی ہیں جن سے صرف چند ملاقاتیں ہو کے رہ گئیں ، لیکن غالب اکثریت ایسے اصحاب کی ہے جن سے میرے برسوں تک تعلقات رہے اور جنہیں میں نے انگریزی محاورہ کے مطابق بہت قریب سے دیکھا اور عظیم المرتبت پایا - ان سب کی یادیں میری زندگی کا متاعِ عزیز ہیں:-

یاد ماضی کے بہت نقش ابھی باقی ہیں

مولوی محمد اسحاق والا مضمون کوئی پچیس سال قبل لکھا گیا تھا - اس وقت اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ مجھے کبھی ''عظمت رفتہ'' کے نام سے کوئی کتاب لکھنی ہوگی اور یہ مضمون اس کا سنگ بنیاد بنیگا - میں اس کتاب کو اپنی ارضی زندگی کا نچوڑ سمجھتا ہوں اور ساتھ ہی اپنے تئیں خوش قسمت خیال کرتا ہوں کہ اتنے صاحب عظمت بزرگوں سے میرے تعلقات رہے -

مجھے افسوس ہے کہ میں سب شخصیتوں کی تصاویر حاصل نہ کرسکا ۔ بعض کی تو سرے سے تصاویر ہی موجود نہیں ہیں۔ تصویر سے شخصیت ابھر آتی ہے ۔ جو تصویریں درج کتاب کی جارہی ہیں ان میں سے بعض نایاب ہیں۔ مثلاً خواجہ حسن نظامی کی تصویریں اس دور کی یادگار ہیں جبکہ وہ ویدانت کے مطالعہ میں غرق تھے اور یوگی بن گئے تھے ۔ گروپ والا فوٹو بھی خاص اہمیت رکھتا ہے ۔ یہ ۱۹۱۳ میں لیا گیا تھا اور اب یہ نوادرات میں داخل ہے ۔

ان شخصیتوں کے بارے میں میں نے کسی ترتیب کو ملحوظ نہیں رکھا ۔ میں نے زیادہ تر اپنے ''موڈ'' پر اعتماد کیا ہے ۔ مجھے اس بےترتیبی میں بھی ترتیب کی ایک شان نظر آتی ہے - کچھ عرصہ پہلے جب میں نے محترمی مولوی احتشام الحق تھانوی سے اپنی کتاب کا ذکر کیا تو انھوں نے ایک شعر سنایا اور خواہش ظاہر فرمائی کہ اسے بھی درج کتاب کردیا جائے ۔

یہ منزلت بھی غنیمت ہے اہل دنیا کی
ملا کے خاک میں ذکر کمال کرتے ہیں

لیکن یہ معلوم نہ ہوسکا کہ یہ شعر کن صاحب کا ہے ۔ بہرحال میں شکریہ کے ساتھ ان کے حکم کی تعمیل کرتا ہوں ۔

آخر میں خدائے برتر سے دعا ہے کہ وہ اس کتاب کو ''باغ و بہار'' کا درجہ عطا فرمائے !

یا رب ایں نو باغ را از باد صرصر دور دار!

کراچی : اپریل ۱۹۶۱

صباح الدین عبدالرحمن

اظہار تشکر

بہت سے احباب نے اس کتاب کی تیاری میں میری امداد فرمائی ہے۔ مثلاً بعض نے قیمتی مشورے دئے اور بعض نے تصویریں بہم پہنچائیں۔ میں ان سب کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں، لیکن چند نام ایسے ہیں جن کا ذکر کئے بغیر دل کو تسکین نہیں ہوتی۔ اس فہرست میں سب سے پہلے میں محترمی مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود کتاب کا "پیش لفظ" تحریر کرکے مجھے مفتخر فرمایا۔ باقی نام یہ ہیں:۔ برادرم منشی عبدالقدیر، برادرم محمد فاضل، عابد رضا بیدار، بیگم عارف ھسوی، محمد یوسف، آغا آفتاب قزلباش، بیگم اروناآصف علی، اے۔ اے۔ اے فیضی، فاضل رحمت اللہ، منیر الدین، قطب الدین ابن سائل، حکیم عبدالحئی انصاری، ذاکر اعجاز، غزالی، کرار حسن قزلباش، عبدالسلام اقصاری، صلاح الدین، علاء الدین خالد، عبدالمجید قریشی (جہانیان) اور حافظ محمد عثمان۔ سفارتخانہ ہند متعینہ مصر جس کی وساطت سے مجھے سید عبداللہ بریلوی اور ڈاکٹر سید حسین کے فوٹو دستیاب ہوئے۔

ریاض احمد برنی اور عبدالرؤف کا بھی شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہایت تن دھی سے پروف پڑھے اور جمال برنی کا بھی کہ انہوں نے اپنے آرٹ سے متعدد مدھم تصویروں کو اجاگر کرکے ان میں نئی زندگی پیدا کردی:۔

زہے تمثال جاں پرور کہ آرد

بہ تن جاں گرچہ جاں در تن ندارد

ض۔ا۔ب

پیش لفظ

(از حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریا بادی)

شبلی ، حالی ، نذیر احمد ، ذکاء اللہ ، اقبال ، محمد علی ، سید سلیمان ندوی ان سب کے حالات و کمالات کی جھلک ، وہ سرسری ہی سہی ، کہیں یکجا دیکھنے کو مل جائے ، تو کون پڑھا لکھا ہے ، جس کا دل للچا نہ اٹھیگا ؟ ـــــ اور پھر منظر جب یہیں تک محدود نہ ہو ، بلکہ شوکت علی اور ظفر علی خاں ، حسرت موہانی اور خواجہ حسن نظامی ، حکیم اجمل خان اور خواجہ کمال الدین ، راشدالخیری اور فرہنگ آصفیہ والے سید احمد دہلوی ، جالب ، حکیم نابینا اور جگر مراد آبادی سر آغا خاں اور ولایت علی بمبوق ، وقار الملک اور مفتی کفایت اللہ کی جلوہ آرائیاں بھی ساتھ ساتھ ہاتھ آجاتی ہوں ! ـــــ شوق و اشتیاق کی تھاہ ملنا بھی اب شاید آسان نہیں !

آپ کے پیش نظر جو مجموعۂ اوراق ہے ، وہ کچھ اسی قسم کا جادو گھر یا کاغذی سنیما ہے ۔ جس میں ۹۰ - ۹۱ شخصیتیں ، کوئی رند اور کوئی پاکباز ، لیکن سب کی سب معزز و ممتاز ، چلتی پھرتی نظر آتی ہیں ۔ اوراق کے مرتب کوئی چابک دست نقاش نہیں ، جو اپنے 'آرٹ' کے زور سے بے جان کو جاندار بنادیں ، اور اپنے موقلم کی رنگ آمیزیوں سے دیو کو پری جمال کر دکھائیں ۔ وہ ایک سیدھے سادے اہل قلم ہیں ، جو وہی لکھتے ہیں جو کچھ کہ وہ دیکھتے ہیں ، اور جو کچھ محسوس

کرتے ہیں، اس کو قلم سے دہرا دیتے ہیں —— وہ " تخلیق " کا کاروبار نہیں کرتے۔ ۵۰، ۵۵ سال کے عرصہ میں ان کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اور ان کے قلب نے جو کچھ محسوس کیا، بس اسی کا نقشہ نقش و نگار کی صناعیوں کے بغیر، انہوں نے کاغذ پر اتار دیا —— یہ ایک سادگی ہر پر کاری پر بھاری! ع

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا!

یہ 'برنی' صاحب صرف نام کے برنی ہیں۔ بلند شہری سے کہیں زیادہ دہلوی ہیں۔ یہیں پلے اور بڑھے۔ بڑے بڑوں کی، اور بعض بہت بڑوں کی آنکھیں دیکھے ہوئے۔ دہلی کے گلی کوچوں کی خاک چھانے ہوئے، شہد کی مکھی کی طرح گلشن کی ایک ایک کلی کا رس چوسے ہوئے —— طبیعت کے شریف، عیبوں پر نظر بہت کم گئی ہے۔ جس جس کی جو خوبی دیکھی بس اسی کو سراہا ہے، اچھالا ہے۔ ساتھی اور رفیق سب کے ہیں، نقارچی کسی کے بھی نہیں۔ متانت تحریر، اجازت نہ مبالغہ کی دیتی ہے، نہ چیخ چلا کر بولنے کی۔ قلم کی ہمواری ایک سطح پر قائم۔ دھیما لہجہ، میٹھی بول چال، شروع سے آخر تک ایک! —— دائرۂ نظر، وقت کے علمی، ادبی، سیاسی ناموروں میں مسلمانوں ہی تک محدود نہیں، مسز نائیڈو اور مسز بیسنٹ اور پادری اینڈریوز اور پرنسپل ردرا اور لالہ بلاقی داس، اور منشی یا نرائن نگم اور ایم۔ این۔ رائے اور منشی پریم چند اور نریمان اور سہتا جیسے مسیحیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے جلوے بھی آپ کو یہاں جابجا نظر آجائینگے۔

ہندوستان کے ماضی قریب کی تاریخ لکھنے والے کو اس کتاب سے بڑی مدد ملیگی، اور اس دور کی متعدد شخصیتوں کے خد و خال اس آئینہ میں نظر آئینگے۔ اردو میں ایسی کتابیں بس چند ہی ہیں اور یہ کتاب اس مختصر فہرست میں معقول و

خوشگوار اضافہ ہے — کتاب کا نام "عظمت رفتہ" ہے۔ اور اس لئے قدرتاً اس کا خاتمہ ماضی ہی پر ہوجاتا ہے۔ کیا اچھا ہوتا، اگر مصنف نے ماضی کے ساتھ حال کو بھی شامل کرلیا ہوتا! موجودہ معاصرین میں دو ایک نہیں، بہت سے ان کے قلم کی توجہ کے قابل تھے۔

دریا باد — بارہ بنکی۔ (دستخط) عبدالماجد

۲۱ جون ۱۹۶۱

برین رواق زبرجد نوشته اند به زر
که جز نکوئی اهلِ کرم نخواهد ماند

— حافظ

"The most precious and intimate recollection of each man's memory is his series of recollected portraits and biographies of persons he has individually known. A peculiar sacredness attaches to these recollections of persons when they themselves are dead......Every living man or woman can reckon up those select of the dead who are most memorable to him or to her; and sometimes there may be a duty, or at least an impulse, that one should speak to others of the dead whom he remembers, and of whom they know little or nothing."——

Professor Masson.

" ہر ایک شخص کے حافظہ کی نہایت قیمتی اور گہری یاد آن اشخاص کے ذہنی مرقعے اور سیرتوں کے سلسلے ہوتے ہیں جنہیں وہ ذاتی طور پر جانتا ہے ۔ جب یہ اشخاص خود دنیائے آب و گل میں موجود نہ ہوں تو پھر ان یادوں میں ایک عجیب سی تقدیس آجاتی ہے ۔ . . . ہر زندہ شخص (مرد یا عورت) اپنے ذہن میں مردہ اشخاص میں سے ایسے منتخب لوگوں کی یادوں کو ابھار سکتا ہے جو اس کی نظر میں سب سے زیادہ یاد کئے جانے کے قابل ہوتے ہیں ۔ اور بعض اوقات ممکن ہے کہ یہ فرض عین ہو یا کم سے کم جذبۂ تشویق کہ اسے آن مردہ اشخاص کا تذکرہ دوسروں سے کرنا چاہئے جو اسے یاد آتے ہیں مگر جن کے بارے میں دوسرے لوگ یا تو بہت کم جانتے ہیں یا کچھ بھی نہیں جانتے ۔ " —— پروفیسر میسن

مولوی محمدّ اسحاق رامپوری

دھلی کا بچہ بچہ مولوی محمد اسحاق کے نام نامی سے واقف ھے ۔ وہ رھنے والے تو تھے رامپور کے مگر اپنی وفات سے پچاس ساٹھ سال قبل سے دھلی میں قیام پذیر تھے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ ان کی تعلیم کہاں کہاں ھوئی مگر اتنا معلوم ھے کہ ان کی تعلیم و تربیت میں ان کے والد کا کچھ کم حصہ نہ تھا ۔ وہ بسا اوقات ان کی قابلیت کا ذکر کیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''ان جیسا عالم ڈھونڈھے سے بھی نہ ملیگا ۔''

دھلی کا ایک مشہور محلہ ھے کوچۂ چیلان ۔ یہ بہت دور تک پھیلا ھوا ھے ۔ ایک زمانہ میں اس میں زیادہ تر مسلمانوں ھی کی آبادی تھی ۔ یہ وھی محلہ ھے جہاں غدر سے پہلے دھلی کالج مرحوم کے مشہور پروفیسر مولوی امام بخش صہبائی رھا کرتے تھے ۔ یہ وھی محلہ ھے جہاں مفتی کفایت اللہ ، سید آصف علی اور مولوی احمد سعید رھتے تھے ۔ یہ وھی محلہ ھے جہاں منشی ذکاءٗ اللہ کی کوٹھی واقع تھی ۔ یہ وھی محلہ ھے جہاں سے مولانا محمد علی ''کامریڈ'' اور ''ھمدرد'' نکالتے تھے ۔ اسی محلہ کے ایک حصہ میں وہ مکان ھے جہاں سر سید پیدا ھوئے تھے ۔ یہیں گلی مومن خاں کے بالمقابل نواب شرف الدین خاں کی حویلی تھی جو سر سید احمد خاں کے ماموں زاد بھائی تھے ۔ نواب صاحب اپنے بچوں (خواجہ وجیہ الدین ، خواجہ فخر الدین اور خواجہ مصلح الدین) کی تعلیم کے لئے مولوی صاحب کو دربار قیصری سے تین چار سال قبل رامپور سے دھلی لائے تھے ۔ انہوں نے زندگی بھر انہیں بیحد عزت و احترام سے رکھا اور کوئی تکلیف نہ ھونے دی ۔ ان کی وفات کے بعد ان کے بیٹے نواب

مصلح الدین بھی ہمیشہ محبت آمیز مدارات سے پیش آتے رہے اور اپنے دونوں بیٹوں (سعید الدین اور مجد الدین) کی تعلیم بھی مولوی صاحب کے سپرد رکھی ۔ یہ میرے دیکھے کی بات ہے کہ جس ہمدردی ، محبت اور جانسوزی سے مولوی صاحب نے ان دونوں بچوں کی تعلیم و تربیت کا خیال رکھا ، وہ آپ اپنی نظیر ہے ۔ ان کی شفقت دیکھکر ان تعلقات کی یاد تازہ ہوجاتی تھی جو ایک زمانہ میں ہندوستان میں گرو اور چیلے میں پائے جاتے تھے ۔

مولوی صاحب کی خدمت میں مجھے سب سے پہلے ۱۹۰۷ میں نیاز حاصل ہوا ۔ اس زمانہ میں میں ان کے یہاں فارسی پڑھنے کے لئے جایا کرتا تھا ۔ واحدی صاحب میرے رفیق درس تھے ۔ مرزا یعقوب بیگ نامی ایم ۔ اے جو بعد کو علیگڈھ یونیورسٹی میں فلسفہ کے پروفیسر بنے ، ہمارے ساتھ ہوجایا کرتے تھے ۔ اس زمانہ میں وہ اکاؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھے اور محض انٹرنس پاس تھے ۔ انھوں نے ہمارا ساتھ دینا اس لئے شروع کردیا تھا کہ وہ ہمیشہ سے لکھنے پڑھنے کے شائق تھے ۔ مگر ایک واقعہ نے جسے میں آگے چل کر بیان کرونگا ، انہیں ہمیشہ کے لئے ہم سے جدا کردیا اور اس کے بعد سے میں اور واحدی ہی مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے رہے ۔

امتحان انٹرنس کے لئے ہندوستانی مدارس میں جو فارسی پڑھائی جاتی تھی وہ بہت معمولی ہوتی تھی لیکن مولوی صاحب کی توجہ کا نتیجہ تھا کہ وہ زور دے دیکر ہم سے شاہنامہ کی زبان میں ترجمہ کروایا کرتے تھے ۔ اگرچہ انھوں نے ہمیں صرف پندرہ منٹ دے رکھے تھے ، مگر خدا گواہ ہے کہ ہم دو دو تین تین گھنٹے تک ان کے فیض صحبت سے مستفید ہوا کئے ۔ اس عرصہ میں ترجمہ کا کام تو مشکل سے ۱۵ منٹ ہوتا ہوگا لیکن جو کام کی باتیں اس اثر قبول کرنے والی عمر میں ہمارے کانوں میں پڑ گئیں ، انہیں میں تضیع اوقات کا کافی بدل سمجھتا ہوں ۔

جس وقت ہم مولوی صاحب کے یہاں پہنچتے وہ ہمارے آنے والے استحان کا خیال کر کے ہمیں فوراً کام میں لگا دیتے۔ ہم زیادہ تر ترجمہ کا کام کیا کرتے تھے۔ ان کی ہدایت تھی کہ ''موزوں الفاظ دماغ کی گہرائیوں میں سے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر نکالو'' اور یہی وجہ ہے کہ اس وقت کے پڑھے ہوئے سبقوں کا اثر آج تک باقی ہے۔ ابھی چند فقروں کا ترجمہ ہونے پاتا تھا کہ مولوی صاحب اپنے اصلی رنگ میں ظاہر ہوجاتے تھے۔ کبھی اس کو برا کہتے کبھی اس کو، کبھی ایک کو نالائق ٹھہراتے اور کبھی دوسرے کو، کبھی شاعری پر اظہار خیال فرماتے اور کبھی امام غزالی اور ابن رشد کے فلسفہ پر تبصرہ فرماتے، کبھی مذہب پر گل افشانی فرماتے اور کبھی فقہ پر، الغرض وقت کے وقت جو مسئلہ سامنے آ جاتا اس پر بے دھڑک اپنے مخصوص مجنونانہ انداز میں کچھ نہ کچھ ضرور کہتے اور جب کچھ وقت اس طرح سے گزر جاتا تو فرماتے، ''ارے میاں، یہ قصے تو ہوتے ہی رہینگے۔ تم تو اپنے کام سے کام رکھو۔''

مولوی صاحب کو دوسروں کی نالائقیاں بیان کرنے میں بڑا لطف آتا تھا۔ خواہ کوئی شخص کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو، ان کی نظروں میں مطلق نہ سماتا تھا۔ اور یہ واقعہ ہے کہ وہ اپنے لگے کا کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ ایک دن خوشی کے عالم میں ان کے منہ سے نکل گیا کہ ''دنیا میں میرے والد اور میرے استاد جیسے آدمی مشکل سے نکلینگے۔'' میں نے پوچھا: ''مولوی صاحب، کیا آپ کے بھی کوئی استاد تھے؟'' فرمانے لگے کہ ''تھے ایک نالائق سے۔'' یہ کہا اور مسکرادئے۔

ایک دن عرفی کے اس شعر پر بہت دیر تک بحث رہی:-

من کہ باشم عقل کل را ناوک انداز ادب
مرغ اوصاف تو از اوج بیان انداختہ

میں نے عرض کیا کہ ہمارے پروفیسر نے ''من کہ باشم'' کا ترجمہ ''میں کون ہوں'' بتایا ہے ۔ اس کا سننا تھا کہ انہیں طیش آ گیا اور لگے فرمانے :— ''ان گدھوں کو کون پروفیسر بنا دیتا ہے؟ یہاں تو میں ان کو اپنے کمرے میں بھی گھسنے نہ دوں ۔ بات یہ ہے کہ جس کسی کو ذرا سی فارسی اور انگریزی آ گئی وہ پروفیسر بن بیٹھا ۔ میاں ، ہندوستان سے عربی مدت ہوئی ناپید ہوچکی ہے ، فارسی بھی اب اٹھتی جا رہی ہے ، وغیرہ وغیرہ ۔'' پھر جب آپے میں آئے تو فرمانے لگے کہ '' تمہارے پروفیسر کو دھوکا ہو گیا ہے ۔ یہ کاف بیانیہ ہے ، کاف استفہامیہ نہیں ہے ۔'' باتوں باتوں میں میں نے پوچھا کہ ''حضرت جبرئیل کو عقل کل کیوں کہا جاتا ہے؟'' کہنے لگے ، '' احمق ایسا کہتے ہیں ۔ میں تو اسے ایک معمولی فرشتہ سمجھتا ہوں ۔''

مولوی صاحب کا مذاق شاعری بہت بلند تھا اور اگرچہ وہ ذوق و غالب کی بیکار بحث میں کبھی نہیں پڑے تاہم انہوں نے ہمیشہ مومن ہی کو غالب پر ترجیح دی ۔ مومن کی سہل گوئی کے وہ حد سے زیادہ معترف تھے اور غالب کی مشکل پسندی کے سخت مخالف ۔ ایک دن مومن کے کلام پر حسب معمول تعریف کے پل باندھ رہے تھے اور اس شعر پر وجد کر رہے تھے :-

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

اور اس سلسلہ میں غالب کے اس شعر کو—

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

بھونڈا قرار دئے جا رہے تھے ۔ میں نے عرض کیا کہ ''ممکن ہے کہ غالب کا یہ شعر کسی کابلی معشوق کی تعریف میں ہو'' ، تو ہنس دئے ، مگر غالب اور دوسرے شعرا کو حسب عادت برا بھلا کہتے رہے ۔ میری جو شامت آئی میں نے اتنا پوچھ لیا

که "غالب کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے؟" فرمایا کہ "میں تو اسے شاعروں کا بھٹیارہ سمجھتا ہوں۔" اگرچہ یہ رائے تھی سخت تکلیف دہ مگر مولوی صاحب سے اختلاف رائے کرنا قیامت سے کم نہ تھا۔ ذرا ان سے اختلاف کیا اور انہوں نے اپنی سلیم شاہی جوتی سنبھالی اور غصہ میں پلنگ پر بیٹھے بیٹھے فرش پر مارنی شروع کردی۔ ایسی حالت میں کسے کیا پڑی تھی کہ غالب کی حمایت میں کچھ کہتا! لیکن مولوی صاحب تھے بہت انصاف پسند۔ غالب کی ان غزلوں کو جو چھوٹی بحروں میں ہیں اور سہل الممتنع کی بہترین مثال پیش کرتی ہیں، بیحد پسند فرماتے تھے اور مزے لےلے کر پڑھا کرتے تھے۔

ایک دھلی کیا سارا ہندوستان مولوی صاحب کے شاگردوں سے پٹا پڑا ہے، مگر سب کے سب ادھورے۔ مشکل سے چند خوش قسمت ایسے ہونگے جنہوں نے ان سے درس کی تکمیل کی ہو۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے تھے اور پھر سزا کے طور پر پڑھانا بند کر دیتے تھے۔ ان کی طبیعت اس قدر نازک واقع ہوئی تھی کہ غلط محاورہ کا استعمال ان میں درد سر پیدا کردیتا تھا۔ وہ فرمایا کرتے تھے کہ "غلط تلفظ کا اثر میرے دل پر برچھی سے کم نہیں ہوتا۔" اور پھر کیا مجال کہ وہ شخص ان کے یہاں دوبارہ پھٹک جائے۔ یوں تو ان کے شاگردوں کی فہرست بہت طویل ہے مگر جن چند اشخاص کے نام ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں وہ یہ ہیں:۔ شہزادوں میں مرزا نسیم الدین، مرزا انتظام الدین، مرزا محمود شاہ، مرزا اشرف گورگانی اور مرزا عبدالغنی ارشد۔ پنجابیوں میں مولوی محمد*، محمد عبدالحکیم، مولوی روشن الدین اور

---

* مولوی محمد اسلام کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد سکھ مذہب سے مسلمان ہوئے تھے۔ عربی پر انہیں اس درجہ عبور تھا کہ دھلی کے قدیم انصاری پریس میں عربی کے مصحح مقرر ہو گئے۔ بعد کو مولوی نذیر احمد صاحب کے یہاں چلے آئے اور ترجمۂ قرآن میں ان کا ھاتھ بٹایا۔ ان کے (بقیہ صفحہ ۶ پر)

سولوی نور محمد خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ دھلی والوں میں مولوی نذیر حسین صاحب محدث کے پوتے مولوی عبدالسلام، مولوی محمد ایوب جو اپنی خداداد لسانی اور فصیح البیانی کی وجہ سے دھلی اور کراچی میں خاص شہرت کے مالک ہیں اور مولوی شرف الحق نمایاں نظر آتے ہیں۔ سوخرالذکر جوتے والوں میں سے تھے اور پادری لیفرائے سے مذہبی مباحثے کرنے میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ پٹھانوں میں مولوی محمد الیاس کابلی زیادہ مشہور ہیں اس لئے کہ انہوں نے پشتو میں قرآن مجید کا ترجمہ بھی کیا تھا۔ خود پادری لیفرائے بھی جو عربی میں فائینل کی ڈگری رکھتے تھے، شاگرد بننے کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ مگر مولوی صاحب نے حسب معمول کمی وقت کا عذر کرتے ہوئے مولوی نذیر حسین بنگالی کو ان کے پڑھانے پر مقرر کردیا۔ پادری صاحب کا ذوق مطالعہ دیکھئے کہ انہوں نے تفسیر جلالین، تفسیر کشاف اور تفسیر بیضاوی ان سے سبقاً سبقاً پڑھی تھی۔ ان کے علاوہ جمعیت علمائے ہند کے ناظم مولوی احمد سعید بھی برسوں ان کی خدمت میں حاضری دیتے رہے ہیں۔ ولی اشرف دھلوی نے بھی ان سے اخلاق جلالی نصف کے قریب پڑھی تھی۔ اس کے بعد وہ مکروھات دنیا میں کچھ ایسے پھنسے کہ مولوی صاحب سے خاطر خواہ استفادہ نہ کرسکے۔ استاذی پروفیسر غلام یزدانی جو بعد کو ریاست حیدرآباد میں محکمۂ آثار قدیمہ کے افسر اعلیٰ بنے، اور اردو کے مشہور مزاح نگار ادیب مرزا فرحت اللہ بیگ بھی ان کے شاگردوں کے زمرے میں داخل تھے۔ مولوی مشتاق احمد المعروف بہ منطقی بھی جن

انتقال پر ان کی صاحبزادی خدیجۃ الکبریٰ اور صاحبزادے عبدالرحمن کی غور و پرداخت میر شاهجهان کے سپرد رهی جو مشن کالج دهلی میں فارسی و عربی کے پروفیسر تھے۔ ان کی صاحبزادی کی شادی میرے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر سے ہوئی۔ اب بهن بھائی دونوں اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں۔

کا چند سال ہوئے اجمیر میں انتقال ہو گیا ہے، برسوں ان سے استفادہ کرتے رہے ہیں۔ یہ میرے دیکھے کی بات ہے کہ تحصیل علم کے شوق میں مولوی صاحب کی جھڑکیاں جس خندہ پیشانی سے اس شخص نے برداشت کیں، اس کی دوسری مثال مشکل سے ملیگی۔ بالعموم یہ رات کو حاضر ہوا کرتے تھے، اور احادیث پڑھا کرتے تھے۔ اگر کسی دن یہ مطالعہ دیکھ کر نہ آتے یا کسی پڑھی ہوئی بات کا تشفی بخش جواب نہ دیتے تو وہ وہ صلواتیں سنتے کہ خدا کی پناہ اور اس دھمکی کا تو وہ ہر روز شکار ہوا کرتے تھے کہ تمہارا سبق بند کردیا جائیگا۔ ایک دن حسب معمول انہیں ڈانٹ پڑ رہی تھی کہ میں پہنچ گیا۔ فرمانے لگے کہ ''اس جیسا کودن بھی کوئی نہ ہوگا۔ دس برس سے پڑھتا ہے، مگر ابھی تک اسے کچھ نہیں آیا۔'' میں نے عرض کیا کہ ''مولوی صاحب، اس میں تو آپ کا بھی کسی حد تک قصور ہے۔ آپ کا شاگرد اور یونہی رہے!'' فرمایا:—

زمین شور سنبل برنیارد

اتنا کہنے کے بعد فرمانے لگے کہ ''دیکھو، میں نے مرزا حیرت (ایڈیٹر کرزن گزٹ) کو پڑھایا، ڈیڑھ کتاب پڑھانے کے بعد میں نے اندازہ کرلیا کہ یہ شخص اپنے علم وفن کا غلط استعمال کریگا، اسلئے میں نے اس کا سبق بند کردیا۔ سید احمد (امام جامع مسجد) بھی بہت دنوں تک نہ چل سکے، وغیرہ وغیرہ۔ الغرض بیسیوں شاگردوں کے نام گنوائے اور ان کی برائیاں مزے لے لے کر بیان کیں اور آخر میں ارشاد فرمایا کہ ''میں لوگوں کو اس لئے پڑھا دیا کرتا ہوں کہ کہیں لوگ مجھے یوسف بے فیض نہ سمجھ لیں۔''

مولوی صاحب بے حد سادگی پسند تھے۔ قناعت ان کے مزاج میں اس درجہ بسی ہوئی تھی کہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔

انہوں نے اپنے شاگردوں سے کبھی کوئی فیس نہیں لی اور نہ کسی صورت میں کوئی ھدیہ یا نذرانہ ھی قبول کیا۔ ان کی ضروریات زندگی نہایت مختصر تھیں اور میں نے کبھی انہیں اس بنا پر پریشان ہوتے نہیں دیکھا۔ فارسی کے مشہور شاعر ابن یمین نے انسانی آزادی کی تعریف یوں کی ھے کہ ''اگر آدمی کو اطمینان کے ساتھ کھانے کو دو روٹیاں اور پہننے کو کپڑے کے دو تین جوڑے مل جائیں تو وہ اس بادشاہت سے ہزار درجہ بہتر ھے، جو طرح طرح کے جنجالوں سے پر ھو۔'' وہ کہتا ھے:

دو قرص ناں اگر از گندم است یا از جو
سہ تائی جامہ اگر کہنہ است یا از نو
بچار گوشۂ دیوار خود بہ خاطر جمع
کہ کس نہ گوید ازیں جا بخیز و آنجا رو
ہزار بار فزوں تر بہ نزد ابن یمیں
ز فر مملکت کیقباد و کیخسرو

ھمارے مولوی صاحب کی زندگی عملاً ایسی ھی تھی۔ ان کی ضروریات یہ تھیں: دو تین جوڑے کپڑوں کے اور وہ سب لٹھے کے، پرانی وضع کی اچکن بند والی جس کے سینے والے بھی اب ناپید ھوگئے ھیں، شرعی پاجامہ ٹخنوں سے تین چار انچ اونچا، سلیم شاھی جوتی سادہ ترین وضع کی، جب ایک بالکل پھٹ جاتی تو دوسری خرید لاتے۔ جراب انہوں نے عمر بھر استعمال نہیں کی، ایک بڑا سا لٹھے کا رومال ھمیشہ کندھے پر رکھتے جو حضرت موسیٰ کے عصا کی طرح ان کے کئی کام آتا، سفید کپڑے کی سادہ ٹوپی جسے وہ اس طرح پہنتے کہ ان کا چھوٹا سا سر سارے کا سارا اس میں سما جاتا۔ ان کے دانت منجن یا داتن جیسی عیاشی کے کبھی ممنون احسان نہیں ھوئے، یہی وجہ ھے کہ لوگوں کو ان کے دیکھے سے گھن آتی تھی۔ آخری عمر میں انہیں آنکھوں کا عارضہ ھوگیا تھا، مگر حضرت

ایوب کی طرح انہوں نے کبھی علاج نہیں کیا یہاں تک که وہ کلیتاً جاتی رہیں۔ ولی اشرف نے ایک دن ان سے کہا :— ''چلئے، میں آپ کو سول ہسپتال میں دکھا لاؤں۔ وہاں میرے تعلقات ہیں۔'' اس پر وہ بگڑ بیٹھے اور بولے : ''تو مجھے کافروں کے پاس لے جائیگا۔ یہ ہاتھ کسی غیر مسلم کے سلام کے لئے کبھی نہیں اٹھے۔ نہ مجھے وہاں کسی کو سلام کرنا ہے اور نہ انگریزی دوا ہی استعمال کرنی ہے۔'' آخری زمانہ میں وہ لوگوں کو آواز سے پہچانا کرتے تھے اور بڑی محبت سے پاس بٹھا کر باتیں کیا کرتے تھے۔

مولوی صاحب تھے تو پرانی وضع کے بزرگ مگر پابندی وقت کے معاملہ میں وہ بالکل انگریز تھے۔ میں بڑھاپے کی حالت تو بیان نہیں کرتا کیونکہ اس زمانہ میں وہ دن بھر لیٹے رہتے تھے، لیکن جب تک ان کے قویٰ مضبوط رہے وہ ہر روز نہایت پابندی سے صبح کی ہواخوری کو جایا کرتے تھے اور میلوں نکل جاتے تھے، دوپہر کو قیلولہ کرتے اور رات کو سوتے وقت گرم دودھ پینے کے عادی تھے اور وہ بھی ایک خاص دکان کا۔ لوگوں سے وقت مقرر کرکے ملتے تھے اور اگر کوئی دیر سے ملنے آتا تو ملنے سے انکار کردیتے تھے۔ سنا اور وثوق سے سنا ہے کہ انہوں نے سر سید احمد خاں تک سے اسی بنا پر ملنے سے انکار کردیا تھا کہ وہ وقت مقرر کئے بغیر ملاقات کرنے کے لئے تشریف لے گئے تھے۔ جیسا کہ اوپر مذکور ہوچکا ہے ہم تین طالب علم (واحدی، ناسی اور راقم الحروف) فارسی پڑھنے کے لئے جایا کرتے تھے۔ وقت کی پابندی کے بارے میں ہمیں خصوصیت سے محتاط رہنا پڑتا تھا۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ میں اور واحدی کچھ دیر پہلے پہنچ گئے۔ چونکہ ہم دونوں کو مولوی صاحب سے بہت خصوصیت تھی، اس لئے دیکھتے ہی انہوں نے ہمیں اندر بلا لیا۔ ناسی چند منٹ بعد آئے اور ہمیں

اندر بیٹھا دیکھکر چاہتے تھے کہ داخل کمرہ ھوجائیں کہ اتنے میں مولوی صاحب نے گھڑی دیکھکر فرمایا کہ ''ذرا ٹھہرو، تمہارے آنے میں ابھی چار منٹ باقی ھیں۔ وقت سے پہلے آنے کی ضرورت نہیں۔ آیندہ وقت پر آیا کرو۔'' یہ کہنا غیر ضروری ھے کہ اس ''جھڑکی'' کے بعد نامی نے اپنا سبق بند کردیا۔

مولوی صاحب کے کمرے کا نقشہ یہ تھا کہ ایک کونے میں چارپائی پڑی ھے۔ اس کے قریب ھی ایک الماری رکھی ھے جس میں گرد سے اٹی ھوئی موٹی موٹی عربی فارسی کی سیکڑوں کتابیں اوپر نیچے دھری ھیں جنہیں صرف مطالعہ کے وقت جھاڑا جاتا تھا۔ انہوں نے ان سب کتابوں کو کچھ ایسی دقت نظری سے پڑھا تھا کہ انہیں صفحہ اور سطر تک یاد تھی۔ مجھے ہمیشہ ان کی اس صفت پر حیرت رھی اور اب جب کبھی ان کا خیال آجاتا ھے تو انگریزی شاعر گولڈ اسمتھ کے ''قریۂ ویراں'' کے استاد کی یاد تازہ ھوجاتی ھے۔ ''ملل و نحل'' کے وہ بہت مداح تھے اور یہ کتاب ہمیشہ ان کے مطالعہ میں رھا کرتی تھی۔ مولوی صاحب نوے برس جئے۔ بقول واحدی ''جس کمرے میں وہ اول دن آکر بیٹھے تھے اور جس پلنگ پر اول رات سوئے تھے، اسی کمرے سے ایسی حالت میں بھی نہ ھٹے جبکہ کمرے کی آدھی چھت غائب ھوگئی تھی۔ اور پلنگ تو مرتے مرتے ان کے نیچے رھا۔''

پرانی وضع کے عربی دانوں میں ھند و پاکستان میں گنتی کے چند افراد ایسے نکلینگے جو عربی میں بلا تکلف بات چیت کرسکتے ھوں۔ یہ کچھ تو ھماری طرز تعلیم کا قصور ھے اور کچھ اس کا کہ جس ماحول میں عربی کی تعلیم دی جاتی ھے اس سے دلوں میں امنگ پیدا ھونے نہیں پاتی۔ یہ سچ ھے کہ قدیم وضع کے چند مولوی جو آج بام شہرت پر نظر آتے ھین عربی میں

بول چال کے علاوہ تقریر بھی کرلیتے ہیں لیکن یہ عام کلیہ کی استثنا ہیں۔ ہمارے مولوی صاحب عربوں سے گھنٹوں اس طرح بات چیت کرتے تھے گویا یہ ان کی مادری زبان ہے۔ ان کی فارسی بھی ایسی ہی اچھی تھی۔ میں نے ایرانیوں سے انہیں گھنٹوں بات چیت کرتے دیکھا ہے، وہ بلا تکلف اس زبان میں اظہار خیال فرماتے تھے۔

لیکن ایک خاص شق میں وہ اپنے زمانے کے علما میں غالباً سب سے ممتاز تھے۔ یہ بات عام طور سے مشہور ہے کہ آج کل کے علما کو ریاضی میں مطلق درک نہیں ہوتا۔ یہ سچ ہے کہ یہ علم ہمارے علما میں سے اس طرح سے اٹھ گیا ہے جس طرح سے اطبا میں سے جراحی، مگر مولوی محمد اسحاق ریاضی کی ہر شاخ میں یدطولیٰ رکھتے تھے، بالخصوص الجبرا اور اقلیدس میں۔ ۱۹۰۸ میں امتحان انٹرنس میں اقلیدس کے پہلے چار مقالے تھے۔ عام مسلمانوں کی طرح مجھے بھی ریاضی سے کوئی دلچسپی نہ تھی، لیکن امتحان پھر امتحان ہے، کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑا۔ مولوی صاحب سے جب میں نے اپنی مشکل بیان کی تو انہوں نے فرمایا کہ ”میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے، لیکن اگر تم صبح کی سیر میں میرے ساتھ ہوجایا کرو تو میں تمہیں چاروں مقالے یاد کرادونگا۔“ چنانچہ میں روزانہ ساتھ ہوجایا کرتا تھا۔ مولوی صاحب چلتے چلتے روزانہ چند شکلیں یاد کرادیتے تھے۔ سیر کے وقت نہ تو ہمارے پاس کاغذ ہوتا تھا اور نہ پنسل۔ وہ صرف ذہن میں شکلیں کھچواتے اور انہیں ثابت کراتے جاتے۔ یہی طریقۂ تعلیم ارسطو کا تھا۔ میں جب کبھی ان کی طرز تعلیم پر غور کرتا ہوں تو میری حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہتی۔ عام مدرسین کے لئے ایسا کرنا قطعاً ناممکن ہے۔ آج کل کے اساتذہ کی طرح انہیں کبھی اپنے سبق پہلے سے تیار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ ہر مضمون ان کے ذہن

میں اس طرح سے محفوظ اور تازہ تھا گویا استداد زمانہ کوئی چیز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ ان کا حافظہ نہایت قوی تھا۔

واحدی صاحب نے لکھا ہے کہ ”منشی ذکاء اللہ جیسے ریاضی دان اپنے بیٹے رضاء اللہ انجینیر کو مولوی صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتے تھے کہ اس سوال کو وہ حل کردینگے، مولوی صاحب کبھی منشی ذکاء اللہ کے گھر جاتے تھے وہ اگر کھانا بھی کھاتے ہوتے تھے تو ان کے استقبال کو نکل آتے تھے۔ ریاضی میں منشی ذکاء اللہ بھی ان کا لوہا مانتے تھے۔“

علما کی تنگ خیالی کہاوت سی بن گئی ہے۔ مولوی صاحب نے دھلی کا وہ دور دیکھا تھا جبکہ ذرا ذرا سی بات پر مولویوں کے اکھاڑے جم جاتے تھے۔ مردے سنتے ھیں یا نہیں، کوا حلال ہے یا حرام، خدا جھوٹ بول سکتا ہے یا نہیں، ٹخنوں کے نیچے پاجامہ پہننے والا جنتی ہے یا دوزخی، یہ اور بہت سے بیکار و لاطائل مسائل دھلی کے پیٹ بھرے مولویوں میں زیر بحث رہا کرتے تھے۔ مگر مولوی محمد اسحاق ان تمام باتوں کو لغو سمجھتے تھے۔ وہ آزادی لباس کے قائل تھے۔ وہ خود ڈاڑھی رکھتے تھے لیکن میں نے کبھی نہیں دیکھا کہ انہوں نے کسی انگریزی تعلیم یافتہ سے ڈاڑھی رکھنے کو کہا ہو۔ وہ خود ٹخنوں سے اوپر پاجامہ پہنتے تھے، مگر نیچے پہننے والوں کو انہوں نے کبھی برا نہیں کہا۔ مذھبی شعایر کی ادائگی کے معاملہ میں وہ کبھی متشدد واقع نہیں ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی صحبت میں رہنے کے بعد رواداری اور روشن خیالی خود بخود پیدا ہوجاتی تھی۔ مسلم اور غیر مسلم ان کی نظر میں یکساں تھے۔

افسوس اس کا ہے کہ مولوی صاحب نے اپنی کوئی مستقل یادگار نہیں چھوڑی۔ انہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی اور نہ

کوئی کتاب ھی لکھی*۔ مرنے سے چند دن قبل وہ نواب مصلح الدین کے ساتھ ان کے بڑے بیٹے خواجہ سعیدالدین سے جو دھرہ‌دون میں تحصیلدار تھے، ملنے گئے۔ وھاں ان کی طبیعت جلد اکتا گئی اور وہ واپس دھلی روانہ ھوگئے۔ غازی‌آباد کے قریب ان کی حالت یکایک غیر ھوگئی اور وہ بار بار پوچھتے تھے کہ دھلی آئی یا نہیں۔ ''خدا خدا کرکے دھلی کا اسٹیشن آیا۔ وھاں سے وہ تانگہ میں سوار ھوئے۔ ابھی راستہ میں تھے کہ جامع مسجد کے قریب آن کی حالت اور زیادہ خراب ھوگئی اور انہیں گھر لایا گیا، اور اسی کمرے کی چار پائی پر جس پر وہ ۵۰ - ۶۰ سال سے لیٹا کرتے تھے، لٹا دئے گئے۔ مولوی صاحب کی رحلت سے آدھ گھنٹے پہلے مولانا محمد ایوب نے پوچھا: '' طبیعت تو نہیں گھبرا رھی؟'' بولے، ''اجی واہ!'' اس سے آگے زبان نے ساتھ نہ دیا۔ ''اجی واہ'' کا مطلب یہ تھا کہ میں اور مرنے سے گھبراؤنگا؟ وہ حد درجہ مضبوط طبیعت کے انسان تھے۔''

علم کی یہ شمع جو عرصۂ دراز سے اپنی آخری منزلیں طے کر رھی تھی، بالآخر ۱۹۳۰ کی ابتدا میں ھمیشہ کے لئے خاموش ھوگئی۔ وہ غیر معمولی قابلیتوں کے مالک تھے، لیکن دھلی جس کے چپہ چپہ میں قابل اور فاضل اشخاص مدفون ھیں بڑے لوگوں کی موت سے کچھ اس درجہ خوگر ھوچکی ھے کہ اب اسے ان کی موت کا زیادہ احساس بھی نہیں ھوتا۔ یہی وجہ ھے کہ ان کے جنازہ کے ساتھ گنتی کے صرف چند آدمی تھے۔

تا جہاں باشد بہ نیکی در جہانت باد نام!

---

* مولوی صاحب کے ایک شاگرد سردار احمد سے معلوم ھوا ہے کہ مولوی صاحب نے تفسیر کبیر کے ابتدائی حصوں کا ترجمہ لکھوادیا تھا جو بعد کو کتابی صورت میں بھی شائع ھوگیا۔ لیکن کتاب اس سے آگے نہیں بڑھی۔

علامہ راشد الخیری

میری ملاقات علامہ سے اس زمانہ کی ہے جب کہ وہ اکؤنٹنٹ جنرل کے دفتر میں ملازم تھے ۔ کئی برس تک ملازمت کرنے کے بعد انہوں نے یک قلم استعفیٰ دیدیا ۔ وجہ یہ تھی کہ ان کے افسر نہیں چاہتے تھے کہ ان کے ادبی مشاغل جاری رہیں اور اس لئے وہ بار بار اعتراض کرتے تھے ۔ بالآخر انہوں نے ہمیشہ کے لئے اس بندھن کو توڑ دیا ۔ وہ پرندے کی سی آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے تھے ۔

پھر کچھ دنوں تک وہ چاندنی چوک اور دوسرے پبلک مقامات پر اسلام کی تبلیغ کرتے رہے ۔ میرا اپنا یہ خیال ہے کہ وہ اس تلاش میں تھے کہ معلوم کریں کہ وہ کونسا مقصد ہے جس کے لئے قدرت نے انہیں اس دنیا میں بھیجا ہے ۔ آخرکار انہوں نے اپنا مشن معلوم کر لیا اور پھر وہ پوری طرح اس میں منہمک ہوگئے اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک اسی میں مصروف رہے ۔

ان کا مشن یہ تھا کہ وہ ملک کے طبقۂ نسواں کی حالت کو سدھاریں ۔ جہاں تک مسلم عورتوں کا تعلق ہے وہ عمر بھر کوشاں رہے کہ اسلام نے جو حقوق انہیں دئے ہیں اور جنہیں مردوں نے زبردستی غضب کر رکھا ہے ، وہ انہیں پھر سے دلوائیں ۔ ان میں حق خلع اور ترکۂ پدری بھی شامل ہے ۔ بچیوں کو صحیح قسم کی تعلیم دینےکی غرض سے انہوں نے ایک مدرسہ بھی جاری کیا تھا جس میں ان کی اہلیہ بھی ان کا ہاتھ بٹاتی تھیں ۔ اس مدرسہ میں صرف چھوٹی عمر کی بچیاں داخل کی جاتی تھیں ۔ انہی اغراض کے پیش نظر انہوں نے کتابیں

لکھنی شروع کیں تاکہ ان کا پیغام دور دور پھیلے ۔ انہوں نے خراب رسموں کی طرف بھی قوم کی توجہ مبذول کرائی جو عام جہالت کی وجہ سے مسلمانوں میں رائج ہوگئی تھیں اور جو آج بھی کم و بیش ان میں پائی جاتی ہیں ۔

ایک مرتبہ سر محمد شفیع نے انہیں لاہور بلایا تاکہ عورتوں اور مردوں کے ایک مشترکہ جلسہ میں ان سے ''ترکہ'' جیسے موضوع پر تقریر کرائیں ۔ ان کی تقریر اس قدر موثر تھی کہ حاضرین نے وہیں عہد کرلیا کہ ہم اپنی لڑکیوں کو آیندہ سے ترکۂ پدری سے محروم نہ کرینگے ۔ خود سر محمد شفیع نے بھی سب کے سامنے عہد کیا کہ وہ اس غلط اور غیر اسلامی رسم کے خلاف زندگی بھر جہاد کرینگے ۔ اس تقریر میں علامہ نے رسول اکرم (ص) کی مبارک زندگی کے واقعات بیان کئے تھے اور ان تمام اصلاحات پر روشنی ڈالی تھی جو اسلام کی بدولت سماج میں آہستہ آہستہ نفوذ پذیر ہوئیں ۔ اس پر ان کا انداز بیان اس قدر شگفتہ اور دل نشین تھا کہ جو کچھ ان کے منہ سے نکلتا تھا سننے والوں کے دلوں میں گھر کرتا جاتا تھا ۔ ان کی آواز میں بے حد درد تھا جو دل و دماغ کو متاثر کئے بغیر نہ رہتا تھا ۔

''مخزن'' کے دھلی والے دور میں ان کا اپنا مشہور و معروف ناول ''شاھین و دراج'' نکلنا شروع ھوا ۔ مجھے خوب یاد ھے کہ جب ۱۹۰۸ میں اس کی پہلی قسط شائع ھوئی تو کئی دن تک شہر کے علمی حلقوں میں اس کا خوب چرچا رھا ۔ وہ افسانہ بے حد مشہور ھوا اور اس نے مصنف کی حیثیت سے علامہ کی دھاک بٹھادی ۔ لوگ یہ دیکھ کر خوش تھے کہ مولوی نذیر احمد کا جانشین پیدا ھوگیا ھے ۔ اس کے بعد ان کے اور بھی ناول ''مخزن'' کے اوراق کی زینت بنے ۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ھے انہیں ان تخلیقات کا اچھا خاصا معاوضہ ملتا تھا ۔

۱۹۰۸ میں شیخ محمد اکرام نے ''عصمت'' جاری کیا ۔ یہ پہلا رسالہ تھا جو دھلی سے خاص مسلم عورتوں کے لئے جاری ھوا ۔ چند مہینے کے بعد اسے علامہ نے لے لیا ۔ چونکہ اس زمانہ میں مسلمان عورتوں میں مضمون نگار خواتین کی بہت کمی تھی اس لئے علامہ نے شوق دلانے کے لئے عورتوں کے فرضی ناموں سے مضامین شائع کرنے شروع کئے تاکہ ان کی دیکھا دیکھی پڑھی لکھی عورتیں میدان میں آئیں ۔ علامہ کی یہ انوکھی تدبیر بہت کارگر ثابت ھوئی اور کچھ ھی مدت میں بہت سی لکھنے والی خواتین پیدا ھوگئیں ۔

کچھ عرصہ بعد علامہ نے '' تمدن '' جاری کیا ۔ اس کی تہ میں جو مقصد کار فرما تھا وہ یہ تھا کہ ''عصمت'' کے ذریعہ جو پیغام عورتوں تک پہنچایا جارھا ھے وہ اس وقت تک نامکمل رھیگا جب تک کہ اسے مردوں تک نہ پہنچایا جائے ۔ میرے بھی متعدد مضامین ''تمدن'' میں شائع ھوئے ۔ میرے لئے یہ امر باعث فخر ھے کہ علامہ تقاضا کرکے مجھ سے مضامین لکھواتے تھے ۔

علامہ نے سب سے پہلا ناول '' احسن و میمونہ '' کے نام سے لکھا تھا لیکن اسے چاک کردیا گیا ۔ شاید وہ اس معیار پر پورا نہ آترا ھوگا جو انہوں نے اپنے ذھن میں قائم کر رکھا تھا ۔ ان کا سب سے پہلا ناول جو شائع ھوا ، وہ ''حیات صالحہ'' تھا ۔ اس میں ایک ایسی لڑکی کی زندگی کا سراپا کھینچا گیا ھے جو بڑے صبر کے ساتھ اپنی ساس کے مظالم برداشت کرتی ھے ۔ اس ناول کے متعلق مجھ سے علامہ نے چند باتیں بیان کی تھیں جنہیں میں اس لئے درج کرتا ھوں تاکہ ھمارے نوجوان ادیب ابتدائی ناکامیوں سے گھبرا نہ جائیں ۔

علامہ '' حیات صالحہ '' کا مسودہ لے کر دھلی کے ایک پبلشر کے پاس پہنچے ۔ اس نے کتاب تو رکھ لی اور علامہ سے کہا کہ چند دن کے بعد آئیے ۔ جب وہ دوبارہ اس کے پاس

پہنچے تو اس نے کہا :—"میاں صاحبزادے، جو کتاب تم نے لکھی ھے وہ معمولی درجہ کی ھے اور اس لئے تمہیں کسی بڑے معاوضہ کی توقع نہ رکھنی چاھئے۔ بہرحال میں تمہیں ۵۰ روپے تک دیدونگا۔ تم نوعمر ھو۔ تمہیں معلوم نہیں کہ اس کتاب کی چھپائی پر مجھے کس قدر روپیہ لگانا پڑیگا، اور پھر اس کا بھی اندیشہ ھے کہ کتاب بکے بکے نہ بکے نہ بکے۔" علامہ راضی ھوگئے، لیکن چند مرتبہ کے آنے جانے کے بعد یہ رقم گھٹ کر ۲۵ روپے رہ گئی۔ لیکن بالآخر جو رقم انہیں واقعتاً ملی وہ صرف ۱۶ روپے تھی۔

علامہ نے جتنی کتابیں لکھی ھیں ان کی صحیح تعداد تو مجھے معلوم نہیں، لیکن وہ تیس چالیس سے کم نہ ھونگی۔ خود علامہ کو بھی احساس نہ تھا کہ وہ کتنی کتابوں کے مصنف ھیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ اعلیٰ حضرت نظام دکن میر عثمان علی خاں نے ان سے دریافت کیا کہ "آپ نے کتنی کتابیں لکھی ھیں؟" علامہ نے جواب میں فرمایا کہ "کوئی دس بیس لکھی ھونگی۔" راستہ میں رازق الخیری نے انہیں یاد دلایا کہ "ابا جان، آپ نے تو اتنی کتابیں لکھی ھیں۔" علامہ نے بے پروائی سے جواب دیا: "لکھی ھونگی۔"

علامہ نے کم و بیش ۵۰ سال تک مسلم عورتوں کے حقوق کی خاطر جہاد کیا۔ وہ مسلم عورت کو مغربی تعلیم دلوانے کے مخالف نہ تھے، مگر وہ مردوں اور عورتوں کے بے حجابانہ اختلاط کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ وہ مغربی عورتوں کے نیم عریاں لباس کو بھی اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ وہ ایسی تعداد ازدواج کے بھی خلاف تھے جس میں عورتوں کے حقوق کو یکسر نظر انداز کردیا گیا ھو اور اسی بنا پر ان کی خواھش تھی کہ مسلمان مرد اس رسم قبیحہ کو ترک کردیں اور مذھب کی دی ھوئی مخصوص رعایت کا بیجا استعمال نہ کریں۔

وہ یتیموں کی پرورش کے حامی تھے۔ وہ قبر پرستی، تعویذ گنڈوں، فنیلوں وغیرہ کے قائل نہ تھے۔ وہ ان باتوں کو غیر اسلامی قرار دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ ''ان کے رواج کی وجہ یہ ھے کہ مسلمانوں کے ایمانوں میں تزلزل آ گیا ھے۔''

علامہ عام طور سے ''مصور غم'' کے لقب سے یاد کئے جاتے ھیں۔ ان کی بعض کتابیں (صبح زندگی، شام زندگی، شب زندگی) انتہائی غمناک ھیں۔ حقیقت یہ ھے کہ ٹریجڈی لکھتے وقت علامہ کا زور قلم انتہائی بلندیوں پر پہنچ جاتا تھا۔ ایک مرتبہ انہوں نے ملا واحدی کے مکان پر خواجہ حسن نظامی، عارف هسوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، ڈاکٹر سید سجاد دھلوی اور راقم الحروف کی موجودگی میں وہ مضمون پڑھ کر سنایا جو انہوں نے اپنی بہو (خاتون اکرم۔ بیگم رازق الخیری) کی بے وقت وفات پر لکھا تھا۔ مضمون کیا تھا اچھا خاصا مرثیہ تھا۔ جب مضمون پڑھا جارھا تھا اس وقت بعض حضرات کی آنکھیں پرنم تھیں اور بعض کی اشک بار اور باقی اشخاص مجسم غم بنے بیٹھے تھے۔ اس پر مستزاد ان کا لہجہ تھا جو انتہائی دردناک تھا۔

راشدالخیری نہایت پاکیزہ سیرت کے مالک تھے۔ وہ مزاج کے بھی بہت نرم تھے۔ ایک طرف وہ درد مند دوست تھے اور دوسری طرف شفیق باپ اور خاوند۔ اپنی بیگم کے ساتھ ان کا برتاؤ ایسا شریفانہ تھا کہ قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ وہ اپنی بیوی بچوں کو لیکر کبھی کبھی سیر و تفریح کے لئے قطب صاحب اور دوسرے مقامات کو جایا کرتے تھے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند تھی۔

برسوں کی رفاقت میں میں نے علامہ کے منہ سے کبھی کوئی رکیک یا نازیبا لفظ نہیں سنا اور نہ میں نے انہیں کبھی غصہ کی حالت میں دیکھا۔ درشتی یا تلخی انہیں چھو نہیں گئی تھی۔

سجھے کوئی شخص ایسا نہیں ملا جس نے انہیں برائی سے یاد کیا ہو۔ وہ اپنے دور کے ایک شریف ترین انسان تھے۔ ملازمین اور محلہ کے جانے پہچانے غریب اشخاص سے ان کا برتاؤ دیکھنے کے قابل تھا۔ بیماری کے زمانے میں وہ ان کے یہاں عیادت کے لئے جاتے تھے اور اپنی بساط کے مطابق ان کی دستگیری بھی کرتے تھے۔ ضرورت مندوں کی امداد وہ اس طرح سے کرتے تھے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی تھی۔ غریبوں کی تکلیف دیکھ کر ان کا حساس دل تڑپ اٹھتا تھا۔

۱۹۲۸ میں علامہ اپنے مدرسہ کے لئے سرمایہ جمع کرنے کی غرض سے بمبئی تشریف لائے۔ سب سے پہلے میں انہیں مولانا شوکت علی کی خدمت میں لے گیا۔ مولانا نے مجھ سے فرمایا :— ''علامہ بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ ان کے لئے ہر ممکن کوشش کرو۔'' یہ کہہ کر انہوں نے اپنی جیب خاص سے پانچ روپے عنایت کئے۔ یہ تھی ہمارے چندہ جمع کرنے کی سہم کی شروعات۔ اس کے بعد میں انہیں سید عبداللہ بریلوی (مدیر ''کرانیکل'')، عطیہ بیگم اور دوسرے اکابر کے پاس لے گیا۔ بریلوی نے خود چندہ دیا اور اپنے دوستوں کے نام خطوط بھی لکھ کر دئے۔ عطیہ بیگم صاحبہ نے ان کے اعزاز میں ''ایوان رفعت'' میں ایک ٹی پارٹی بھی ترتیب دی اور تعلیم نسواں پر ان سے تقریر کرائی۔ آخر میں ایک لفافہ میں بند کر کے اپنی طرف سے چندہ کی رقم پیش کی۔ بمبئی میں اپنا کام ختم کرنے کے بعد پارٹی پونا پہنچی جہاں سر غلام حسین ہدایت اللہ کے تعاون سے مدرسہ کے لئے معقول رقم جمع ہو گئی۔ چندہ جمع کرنے والی پارٹی میں میرے دوست موسیٰ یونس حکیم اور محمد عظیم شریک تھے۔ جو فوٹو اب شامل کتاب کیا جارہا ہے وہ اسی دور کی یادگار ہے۔

علامہ یوں تو ''مصور غم'' کے لقب سے موسوم ہیں لیکن

وہ حزن و ملال سے کوسوں دور تھے۔ انہوں نے ''نانی عشو'' کے قبیل کی ہنسانے والی کتابیں بھی لکھی ہیں۔ ویسے بھی ان کے مزاج میں بیحد مزاح تھا۔ ایک دفعہ مبلغ اسلام قاری سرفراز حسین کے مکان پر ادبی نشست تھی جس میں خود قاری صاحب نے تصوف پر اپنے مخصوص دلچسپ انداز میں تقریر کی تھی۔ تقریر کے دوران میں ایک بوڑھا خضر صورت فقیر دروازہ پر نمودار ہوا۔ علامہ نے چپکے سے اشارہ کرکے اسے بھی اندر بلا لیا اور اپنے پاس بٹھا لیا اور پھر بدستور تقریر سننے میں مشغول ہو گئے۔ تقریر میں قاری صاحب نے فرمایا تھا کہ ''سچا صوفی وہ ہے جو تحمل اور بردباری کا پیکر ہو، جو دوسروں کا خدمت گزار ہو، جو تلخ بات کا جواب خاموشی سے دے، جو اپنا پتا مار کر اپنے نفس پر قابو حاصل کرے، وغیرہ وغیرہ۔'' تقریر بہت پسند کی گئی تھی۔ جب وہ ختم ہو گئی تو علامہ نے نہایت سنجیدگی سے یہ کہ کر حاضرین سے اس فقیر کا تعارف کرایا کہ ''ان سے ملئے، یہ قاری صاحب کے والد ہوتے ہیں۔'' یہ سنتے ہی قاری صاحب بگڑ گئے اور علامہ کو بہت سخت سست کہا۔ اس پر علامہ نے صرف اتنا فرمایا: ''آپ حضرات نے دیکھ لیا کہ اس شخص پر تصوف کا کس قدر گہرا رنگ چڑھا ہوا ہے۔'' یہ فقرہ سنتے ہی حاضرین ہنس پڑے اور قاری بھی بل کھا کے رہ گئے۔ مگر علامہ کی متانت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ خود نہیں ہنستے تھے، دوسروں کو ہنسایا کرتے تھے۔

علامہ کا انتقال ۳ فروری ۱۹۳۶ کو ۶۶ برس کی عمر میں ہوا اور وہ دہلی میں اپنے بزرگوں کے قبرستان میں سپرد خاک کئے گئے۔ ان کی موت سے ایک صاحب طرز ادیب اور طبقہ اناث کا ایک مخلص خدمت گزار اٹھ گیا۔ جو جگہ ان کی وفات سے خالی ہوئی وہ ابھی تک سونی پڑی ہے۔

***

خواجہ حسن نظامی

خواجہ صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۰۸ میں ہوئی۔ اس زمانہ میں میں طالب علم تھا۔ خواجہ صاحب حلقہ" المشائخ قائم کرچکے تھے جس کا ایک مقصد یہ تھا کہ نوجوانوں میں تحریر و تقریر کا شوق پیدا کیا جائے۔ نواب بڈھن کے بالا خانہ واقع چتلی قبر میں حلقہ کے ہفتہ وار اجتماعات ہوتے تھے جن میں ہم سب کو تقریریں کرنی پڑتی تھیں۔ اس دور کا ایک واقعہ ذہن میں محفوظ رہ گیا ہے اور وہ یہ ہے کہ جب گورنر جنرل نے پہلی مرتبہ لارڈ سنہا کو اپنی کونسل کا لا ممبر بنایا تو ہم نے ایک جلسہ میں اس امر پر اظہار مسرت کیا کہ ہندوستانیوں کو دن بدن حکومت میں زیادہ دخیل کیا جا رہا ہے لیکن ساتھ ہی یہ مطالبہ بھی کیا کہ لا ممبر باری باری سے ہندو مسلمان ہوا کرے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا جیسا مسلمان چاہتے تھے۔ لارڈ موصوف کے اس عہدۂ جلیلہ سے سبکدوش ہونے پر محکمۂ قانون سر علی امام کے سپرد کیا گیا۔

خواجہ صاحب ہم نوجوانوں سے مضامین لکھوایا کرتے تھے جو اصلاح کے بعد ''نظام المشائخ'' میں شائع ہوتے تھے۔ میری طرح متعدد طالب علم تھے جو خواجہ صاحب کی ان کاوشوں سے مستفید ہوتے تھے۔ چونکہ وہ ابتدا ہی سے روز نامچہ لکھنے کے عادی تھے اس لئے انہوں نے ہم سب سے کہ رکھا تھا کہ ''تم بھی ڈائری لکھا کرو۔'' ان ہفتہ وار نشستوں میں وہ بالالتزام ہر ایک کی ڈائری سنتے اور جہاں کہیں ترمیم و تنسیخ کی ضرورت پڑتی، وہاں رد و بدل کرادیتے۔ میرے بچپن کے دوست ملا واحدی کے ساتھ اس زمانہ کی کچھ ڈائریاں دہلی سے کراچی

آ گئی ہیں۔ برنی کا جو لقب میرے نام کا جزو ہے وہ بھی خواجہ صاحب کا عطا کردہ ہے ۔ وہ حکومت کی طرح ہر سال اپنے دوستوں اور مریدوں کو ''خطابات'' سے نوازتے تھے ۔ پریمی ، واحدی، غزالی ، خواجہ پرشاد وغیرہ سب انہی کے دئے ہوئے لقب ہیں ، یہ محبت و اخلاص کی نشانیاں ہیں ۔

راقم الحروف کا خاندان پنجابی الاصل ہے لیکن جہاں تک خود میرا تعلق ہے ، میری پیدایش دهلی کی ہے اور اس بنا پر خواجہ صاحب مجھے ''دهلوی'' لکھتے تھے ۔ ہمارے ایک مشترکہ دوست تھے مرزا یعقوب بیگ ناسی ایم ، اے ۔ وہ خواجہ صاحب سے اس بات پر بگڑ بیٹھے کہ وہ مجھے ''دهلوی'' کیوں لکھتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ''دهلوی'' وہ ہوتا ہے ۔ جس کی کم سے کم سات پشتیں دهلی میں گزری ہوں ، پھر کہیں جا کر وہ دهلی کا روڑا کہلا سکتا ہے ۔ اس پر خواجہ صاحب نے فرمایا :— ''میں برنی کو دهلوی ہونے کی سند دیتا ہوں'' اور ہر جگہ وہ میرا تعارف دهلوی کہکر کراتے تھے ۔ ناسی صاحب کو ہمیشہ یہ بات شاق گزرتی اور بالآخر انہوں نے خواجہ صاحب سے ہمیشہ کے لئے ملنا جلنا ترک کردیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ناسی صاحب اپنے عقیدہ میں بہت سخت واقع ہوئے تھے ۔

خواجہ صاحب نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز رسالوں میں مضامین لکھ کر کیا تھا ۔ شروع شروع میں انہوں نے رسالوں سے کچھ معاوضہ طلب نہیں کیا ۔ لیکن جب رفتہ رفتہ لوگ ان کے مضامین ذوق و شوق سے پڑھنے لگے اور دنیائے ادب نے محسوس کرلیا کہ ایک بڑی جسامت والا تارہ فضائے آسمانی پر نمودار ہوا ہے تو پھر انہوں نے اپنے مضامین کی قیمت ایک اشرفی فی مضمون مقرر کردی ۔ جو رسالے یا اخبار ان سے مضمون لکھوانا چاہتے وہ ایک اشرفی بذریعۂ منی آرڈر بھیج دیا کرتے۔ یہ پچاس سال پہلے کی بات ہے جب کہ اشرفیوں کا چلن تھا ۔

لیکن یہ کوئی بندھا ہوا قاعدہ نہ تھا۔ وہ متعدد رسالوں کو مفت مضامین بھی بھیجا کرتے تھے۔

اردو سے خواجہ صاحب کو والہانہ عشق تھا۔ انہوں نے اعلان کر رکھا تھا کہ اگر ان کے نام کوئی خط ایسا آئیگا جس پر پتہ انگریزی میں ہوگا تو وہ اسے کھولے بغیر ردی کی ٹوکری میں پھینک دینگے۔ انہوں نے مچھلی والوں میں جو مکان ''اردو منزل'' بنایا تھا، اس کے ٹائلوں پر ''اردو سیکھو، اردو بولو اور اردو پڑھو'' کے الفاظ لکھوائے تھے۔ مولانا محمد علی خواجہ صاحب کو ''قد آدم پوسٹر'' کہا کرتے تھے۔ مراد یہ تھی کہ وہ مجسم پوسٹر ہیں۔ در حقیقت خواجہ صاحب نے اردو کی ترویج کے لئے جو طریقے رائج کئے، وہ ایسے تھے کہ آج بھی اشتہار دینے والی ایجنسیاں ان کی گرد تک نہیں پہنچتیں۔ جس عجیب عجیب ڈھنگ سے وہ اردو کا پروپیگنڈہ کرتے تھے وہ انہی کا حصہ تھا۔ ''اردو منزل'' کے سامنے جو سڑک گزرتی ہے، خواجہ صاحب کی خواهش پر واحدی نے جو ان دنوں میونسپل کمشنر تھے، میونسپلٹی سے کہکر اس کا نام ''اردو بازار'' رکھوا دیا تھا جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔

غالباً ۱۹۲۷ تھا جب کہ خواجہ صاحب پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔ اس وقت موٹر میں خواجہ صاحب کے ساتھ ان کے خسر پیر سید محمد صادق بھی سوار تھے۔ اندھیرے میں حملہ آور یہ نہ دیکھ سکا کہ خواجہ صاحب کدھر بیٹھے ہیں، اور اس لئے حملہ کا شکار محمد صادق ہوگئے اور خواجہ صاحب بال بال بچ گئے۔ حملہ آور گرفتار نہیں ہوا اور نہ اس پستول کا پتہ چل سکا جو اس حملہ میں استعمال کیا گیا تھا۔ حملہ آور انہیں ختم کر دینا چاهتا تھا مگر اسے کیا معلوم تھا کہ ''جسے اللہ رکھے اسے کون چکھے؟'' اس حملے کے باوجود خواجہ صاحب نے اپنی حفاظت کا کوئی خاص انتظام نہیں کیا۔ وہ سچے مسلمان

کی طرح یہ یقین رکھتے تھے کہ موت وقت سے پہلے کبھی نہیں آسکتی ۔ خواجہ صاحب نے موٹر سے اتر کر حملہ آور کو پکڑنے کی کوشش بھی کی تھی مگر اندھیرے میں وہ کہیں غائب ہو گیا ۔ خواجہ صاحب نے کسی مخالف کو پھنسانے کی کوشش نہیں کی اگرچہ بعض اصحاب یہ چاہتے تھے کہ وہ کسی آریا سماجی کا نام لے دیں ۔ سردار دیوان سنگھ مفتون نے ان کے اس کردار کی تعریف کی تھی ۔

خواجہ صاحب کی عادت تھی کہ جب بھی وہ بمبئی آئے . مجھے پہلے سے اطلاع دیدیتے کہ وہ فلاں گاڑی سے آرہے ھیں اور فلاں وقت پہنچینگے ۔ متعدد بار وہ میرے غریب خانہ پر بھی ملنے کے لئے تشریف لائے ۔ مجھے ان کی یہ دونوں ادائیں ہمیشہ بھلی معلوم ہوئیں ۔ بمبئی میں وہ مختلف جگہ ٹھہرتے تھے اس لئے کہ ان کے متعدد دوست تھے جن میں حاجی داؤد ناصر خصوصیت سے قابل ذکر ھیں ۔

موجودہ دور کے مسلمانوں میں خواجہ صاحب غالباً پہلے مسلمان ھیں جنہوں نے مندروں کی جاترا کی اور اپنی ابتدائی عمر کا ایک بڑا حصہ سادھوؤں اور پنڈتوں کی صحبت میں گزارا ۔ انہوں نے ۱۹۰۴ میں جوگی کا بھیس بھرا اور ہندوستان کے مختلف مندروں کی سیر کی ۔ جو فوٹو شائع کئے جارہے ھیں وہ اسی دور سے تعلق رکھتے ھیں ۔ ھندو دھرم سے انہیں بہت اچھی واقفیت تھی ۔ انہوں نے ویدوں، اپنشدوں اور بھگوت گیتا کا غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا ۔ انہیں سری کرشن جی سے بھی عقیدت تھی ۔ غالباً اسی کا اثر تھا کہ انہوں نے ”کرشن بیتی“ لکھی ۔ جب وہ شائع ہوئی تو اسلامی حلقوں میں اس پر حیرت کا اظہار کیا گیا ۔ لوگ کہتے تھے کہ خواجہ صاحب نے مسلمان ہو کر کرشن جی کی لائف کیوں لکھی ھے ۔ خواجہ صاحب نے اس کتاب میں تصوف کے ایسے ایسے لطیف نکتے بیان کئے ھیں

کہ خود ہندو متعجب تھے۔ حضرت عیسیٰ اور بابا گرونانک کے سوانح حیات بھی انہوں نے تحریر کئے ہیں۔ یہ کتابیں لکھ کر انہوں نے درحقیقت اپنی وسیع المشربی کا ثبوت دیا ہے۔

میری والدۂ ماجدہ کا انتقال ۳۰ نومبر ۱۹۳۶ کو ہوا۔ مرنے سے کئی سال پہلے انہوں نے مجھے لکھا کہ ”زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں، لہذا بہتر یہ ہے کہ تم خواجہ صاحب کو خط لکھ کر ان کے خاندانی قبرستان میں میرے لئے جگہ محفوظ کرالو۔“ چنانچہ میں نے خواجہ صاحب کی خدمت میں بمبئی سے خط بھیجا اور انہوں نے فوراً جواب دیا کہ ”تمہاری والدہ کے لئے میرے خاندانی قبرستان میں جگہ محفوظ کردی گئی ہے۔“ والدہ نے یہ پوسٹ کارڈ بہت سنبھال کر رکھا اور جب ان کا وقت آگیا اور حالت غیر ہونے لگی تو انہوں نے وہ خط نکال کر میرے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر کو دیا کہ جا کر نظام الدین میں قبر کا انتظام کریں۔ خواجہ صاحب یہ واقعہ بھول چکے تھے، مگر جب انہیں پوسٹ کارڈ دکھایا گیا تو انہوں نے فوراً جگہ کا انتظام کردیا۔ میں اس محبت آمیز مہربانی کے لئے ان کا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ میری والدہ کو حضرت سلطان جی سے گہری عقیدت تھی اور وہ چاہتی تھیں کہ ان کی قبر حضرت کی درگاہ کے قریب ہو۔

جب کبھی میں چھٹیوں میں دہلی جاتا تو ایک ایسی دعوت ضرور ہوتی جس میں خواجہ صاحب اور دوسرے احباب بھی شریک ہوتے۔ یہ طریقہ برسوں قائم رہا۔ خواجہ صاحب کو ہمارے یہاں کے پراٹھے بیحد مرغوب تھے اور اس لئے ایسی دعوتوں میں پراٹھوں کا انتظام ہمیشہ میری طرف سے ہوتا تھا۔ مختلف قسم کے سالن مختلف اصحاب تیار کروا کر لاتے تھے۔ یہ دعوت پکنک کی صورت میں ہوا کرتی تھی جس کا بار سب پر پڑتا تھا۔ ان دعوتوں میں خواجہ صاحب کے علاوہ ملا

واحدی، فضل احمد شیدا، عارف ھسوی، بھیا احسان، قاری عباس حسین، عبدالحمید، عزیز حسن بقائی، غزالی وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ ایک دو دعوتوں میں سردار دیوان سنگھ نے بھی شرکت کی تھی۔ ان دعوتوں کا ذکر ''منادی'' میں پابندی سے ہوتا تھا۔

خواجہ صاحب ہمیشہ اپنے ھاتھ سے خط لکھنے کے عادی تھے۔ بیماری کے زمانہ میں وہ دوسروں سے جواب لکھواتے تھے، مگر دستخط اپنے ھاتھ ھی سے کرتے تھے۔ آخری بیماری میں انہوں نے جتنے خطوط لکھوائے وہ اگرچہ دوسروں کے ھاتھ کے لکھے ہوئے ہوتے تھے، مگر عبارت خود ان کی ہوتی تھی۔ مثلاً ذیل کا خط جو واحدی کے نام ھے، مرنے سے دو مہینے دس دن قبل لکھا گیا تھا۔ اس کا رنگ صاف طور پر ظاہر کرتا ھے کہ اس کی عبارت خواجہ صاحب کی ھے۔ وھو ھذا:—

''دل کے دیس میں بسنے والے پردیسی واحدی کو عید مبارک۔''

میرے خیال میں خواجہ صاحب نے جتنے خطوط لکھے یا لکھوائے یا جتنے خطوط کے جوابات انہوں نے دئے یا لکھوائے ان کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ھے اس لئے کہ وہ ھر خط کا جواب پابندی سے دیتے تھے اور پھر خود ان کے ھزاروں دوست اور مرید تھے جنہیں وہ خط لکھا کرتے تھے۔

اپریل - مئی ۱۹۲۹ میں بمبئی میں زبردست ھندو مسلم فساد ہوا جس میں ایک ھزار کے قریب جانیں ضائع ہوئیں اور دو ھزار کے قریب افراد زخمی ہوئے۔ فساد کے بعد حکومت نے پبلک کے اصرار پر ایک تحقیقاتی کمیٹی* بٹھائی جس کے دو ممبر ھندوستانی تھے اور تیسرا ممبر (صدر) انگریز تھا۔ ایک آریا سماجی گواہ

* ممبران کمیٹی کے نام یہ ہیں:- (۱) پی - ای - پرسیول، آئی - سی - ایس - (۲) مرزا علی محمد خاں اور (۳) کنھیا لال جھویری -

نے * اپنے بیان میں گزشته فسادات کا ذکر کرتے ہوئے خواجه صاحب کی تحریرات کا بھی ذکر کیا اور کہا که ان کی وجه سے هندو مسلم فسادات میں اضافه هوا هے۔ اس کمیٹی کے روبرو میں ترجمان کے فرائض ادا کر رها تها ۔ جب میں نے اس گواہ کا بیان دیکھا تو میں نے خواجه صاحب سے (جو اتفاق سے ان دنوں بمبئی میں موجود تھے) کہا که وہ اس کمیٹی کی رهنمائی کے لئے اپنی سرگرمیوں کا ایک تفصیلی بیان لکھکر دیدیں ۔ چنانچه میں نے کمیٹی کے سامنے اس کا ترجمه پیش کر دیا ۔ اس کے مطالعه کے بعد کمیٹی نے فیصله کیا که همارا مقصد صرف ۱۹۲۹ کے فسادات کے اسباب کی تحقیقات کرنا هے اور پچھلے واقعات سے همارا کوئی تعلق نہیں هے۔ساتھ هی انہوں نے گواہ کو هدایت کردی که وہ اپنے بیان میں خواجه صاحب کی طرف اشارہ تک نه کرے ۔

جب ڈاکٹر اقبال کے کلام کا پہلا مجموعه ،، بانگ درا ،، شائع هوا تو میری نظر اتفاقیه طور پر ،، التجائے مسافر ،، والی نظم پر پڑ گئی ۔ اس میں ایک شعر غائب تها جو ابتدائی نظم میں موجود تها ۔ یه نظم ڈاکٹر صاحب نے ۱۹۰۵ میں ولایت جاتے وقت سلطان نظام الدین اولیا کے مزار مبارک کے سامنے چند احباب کی موجودگی میں کھڑے هو کر پڑھی تھی۔ وہ شعر یه هے :—

---

* اس کا نام چاپسی تها ۔ شہادت میں اس نے کہا که فلاں سن میں هندو مسلم فساد هوا ۔ جب میں نے اس کا ترجمه ''هندو مسلم رائٹس'' کیا تو اس نے مجھے ٹوکا اور کہا که ''مسلم هندو رائٹس'' کہنا چاہئے ۔ صدر نے بہت سمجھایا که ان دونوں جملوں میں کوئی فرق نہیں ہے مگر اس نے کہا که '' مسلم کا لفظ پہلے آنا چاہئے اس لئے که وهی اس فساد کے بانی تھے ۔'' اس پر زور کا قہقهه هوا ۔ آگے چل کر گواہ نے سکھوں اور مسلمانوں کے کسی فساد کا ذکر کیا ۔ اس پر میں نے گواہ سے پوچھا که '' مجھے بتایا جائے که اس فساد میں پہل کس نے کی تھی تاکه پہلے اس کا نام لوں ۔'' اس نے کہا که مجھے اس فساد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے ۔ آپ جس کا نام پہلے لینا چاهیں لے لیں ۔'' اس پر پھر قہقهه هوا ۔

بھلا ہو دونوں جہاں میں حسن نظامی کا
ملا یہ جس کے توسل سے آستاں مجھ کو

میں نے خواجہ صاحب کو خط لکھکر دریافت کیا کہ ”کیا آج کل ڈاکٹر صاحب سے آپ کے تعلقات ٹھیک نہیں ہیں؟ آخر وہ شعر درج کتاب کیوں نہیں کیا گیا؟“ خواجہ صاحب نے جو جواب دیا وہ حسب ذیل ہے:—”ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات کچھ خراب نہیں ہیں، مگر ڈاکٹر صاحب اب اتنے اونچے ہو گئے ہیں کہ مجھ سے بھی بڑے بڑے آدمیوں کا نام اپنے کلام میں لکھنا خلاف شان سمجھتے ہیں اور بات بھی ٹھیک ہے۔“

خواجہ صاحب نے دھلی کے آفت زدہ شہزادوں کی جس قدر خدمت کی اتنی اور کسی شخص یا ادارہ نے نہیں کی۔ انہوں نے انہیں سکھایا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور حکومت کی حقیر پنشن کو ٹھکرادیں۔ کچھ شہزادوں کو ۱۰ روپے ماہوار پنشن ملتی تھی اور بہت سے ایسے تھے جنہیں ایک پیسہ بھی نہیں ملتا تھا۔ انہوں نے جس خود اعتمادی کا جذبہ ان میں پیدا کیا اس کا نتیجہ تھا کہ بیسیوں شہزادے اس کے بعد سے بڑے بڑے عہدوں پر نظر آنے لگے۔ چونکہ خواجہ صاحب نے اپنی زندگی عسرت میں شروع کی تھی اور محض ذاتی جد و جہد سے دنیوی عظمت کی بلندیوں تک پہنچے تھے اس لئے وہ چاہتے تھے کہ ہر ایک شخص ان کی پیروی کرے اور محنت و مزدوری کو عار نہ سمجھے۔

غدر دھلی کے افسانوں کے سلسلہ میں دو کتابیں میری ترجمہ کردہ ہیں اور ان پر میرا نام درج ہے۔ میں نے خواجہ صاحب سے عرض کیا تھا کہ یہ کام میں مفت انجام دونگا، لیکن خواجہ صاحب کسی نوع راضی نہ ہوئے۔ جو خطوط اس سلسلہ میں انہوں نے مجھے لکھے، ان میں سے ایک کا اقتباس یہ ہے:—

”اس ترجمہ کا کیا معاوضہ بھیجوں؟ مطلع کیجئے۔

جو کم سے، کم معاوضہ آپ کہینگے وہ زیادہ سے زیادہ
فوراً آپ کو بھیج دونگا۔ اور اول تو امید ہے کہ آپ یہ
لکھینگے کہ واہ خواجہ صاحب، معاوضہ کی کیا
ضرورت ہے۔ آپ اس کا کچھ بھی خیال نہ کیجئے۔
مگر میں جب بھی کچھ نہ کچھ بھیجونگا کہ معاملہ
علیحدہ چیز ہے اور تعلق علیحدہ۔"

خواجہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ بغیر کچھ دئے کسی سے کوئی کام نہیں لیتے تھے۔

جس زمانہ میں خواجہ صاحب نے سجدۂ تعظیمی کے جواز کا رسالہ لکھا تو کچھ لوگ ان سے بگڑ گئے۔ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ میں بھی ان کی خدمت میں پہنچ گیا۔ فرمانے لگے کہ "مرشد کو سجدۂ تعظیمی کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے کہا کہ "بندہ مرشد ورشد کا قائل نہیں۔ البتہ اگر کوئی نہایت حسین عورت ہو اور اسے سجدہ کرنے کا سوال ہو تو میں بلا تامل اسے سجدہ کرونگا۔" اس پر سب ہنس پڑے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ خواجہ صاحب اپنے مریدوں میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اسوقت انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ "تمہارے سب دوست میرے مرید بن گئے ہیں سوائے تمہارے کہ تم ابھی تک مرید نہیں بنے۔" میں نے جواب میں کہا:۔"خواجہ صاحب، یہ سب لوگ آپ کے مرید ہیں اور مریدی کا تقاضا ہے کہ وہ بلا چون و چرا آپ کی باتوں کو تسلیم کرلیں اور کبھی نکتہ چینی نہ کریں۔ میں نکتہ چینی کرنے کے حق سے کسی قیمت پر دست بردار نہیں ہونا چاہتا اور یہی وجہ ہے کہ میں ابھی تک مرید نہیں ہوا۔" خواجہ صاحب نے میری دلیل کو پسند فرمایا اور کہا کہ "تم جس حال میں چاہو، رہو تمہیں مرید بننے کی مطلق ضرورت نہیں۔"

ایک دن کسی دوست کے مکان میں قوالی ہو رہی تھی اور قوال تھا کہ پکے گانے گائے جا رہا تھا، اس پر میں نے خواجہ صاحب کو مخاطب کرکے عرض کیا: ”خواجہ صاحب پکے گانے بہت ہوچکے۔ اب کچھ کچے گانے بھی ہو جانے چاہئیں۔“ خواجہ صاحب مسکرا دئے اور قوال سے ارشاد فرمایا کہ ”ان کی خوشی بھی کردو۔“

خواجہ صاحب کی زندگی کے ایک پہلو پر میں ہمیشہ متعجب رہا اور وہ یہ کہ گونا گوں مصروفیات کے باوجود وہ اتنی کتابیں کیسے لکھ سکے۔ میرے خیال میں اس کی توجیہ یہ ہے کہ انہیں مضمون لکھنے کے لئے زیادہ کاوش نہیں کرنی پڑتی تھی۔ وہ بلا تکان قلم برداشتہ لکھتے تھے اور اسی باعث ان کی تحریروں میں کانٹ چھانٹ بہت کم ہوتی تھی۔ میرے پاس ان کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایک دو مضمون ہیں جن میں مشکل سے ایک دو جگہ ترمیم ہوگی۔ بعض دفعہ وہ دوسروں کو پاس بٹھا کر مضمون لکھواتے تھے، وہ بولتے جاتے تھے اور لوگ لکھتے جاتے تھے۔ وہ ایک دریائے مواج تھےاور چونکہ ان کے خیالات میں ژولیدگی مطلق نہ ہوتی تھی، اس لئے وہ جیسا سوچتے تھے ویسا لکھتے جاتے تھے۔ ان کی طرز نگارش انتہائی سلیس ہوتی تھی۔ ان کی تحریروں میں جذبات کی فراوانی بھی ہوتی تھی۔ اگر آپ ان کی مختلف دعائیں پڑھیں یا غدر کے افسانوں کا مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ آپ کا قلب خود بخود اثر پذیر ہورہا ہے۔ ان کا یہ لٹریچر زندہ رہنے والی چیز ہے۔ دنیا کی بہت کم زبانیں اس لٹریچر کا مدمقابل پیش کرسکتی ہیں۔ دوست دشمن سبھی ان کی طرز تحریر کے قائل تھے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی جو خود ایک صاحب طرز انشا پرداز ہیں ان کی تحریرات کے معترف تھے اور انہیں ”قلم کا بادشاہ“ قرار دیتے تھے۔ مولانا محمد علی بھی ان کی سلیس طرز تحریر کے دلدادہ تھے۔ انہوں نے جن

عنوانات پر مضامین لکھے ہیں وہ کسی دوسرے ادیب یا انشا پرداز کو نہیں سوجھے۔ مثلاً مچھر کا اعلان جنگ، طمانچہ برخسار یزید، جھینگر کی موت، پیسہ کا سفر، دیاسلائی وغیرہ۔ حقیقت یہ ہے کہ طرز نگارش میں وہ امام کی حیثیت رکھتے تھے۔

خواجہ صاحب غیر معمولی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے۔ اس سلسلہ میں دو مثالیں پیش کی جاتی ہیں:— (۱) ایک دفعہ اعلیٰ حضرت نظام حیدرآباد نے ان سے کہا کہ ''خواجہ صاحب، میں حضرت علی کی فضیلت کا تو قائل ہوں مگر کوئی ایسی وجہ جواز نہیں ملتی جس سے مجھے اطمینان ہوجائے۔'' خواجہ صاحب نے معاً فرمایا: ''وجہ تو بالکل صاف ہے۔ جس طرح ہمارے رسول (ص) سب نبیوں میں افضل ہیں اس لئے کہ وہ سب سے آخر میں تشریف لائے اسی طرح حضرت علی بھی جو خلفائے راشدین میں سب سے آخر میں تشریف لائے سب سے افضل ہیں اور یہی ان کی فضیلت کی دلیل ہے۔'' نظام اس جواب سے بے حد خوش ہوئے اور فرمایا:—'' واہ خواجہ صاحب، واہ، آپ نے میرے دل کی پھانس نکال دی۔'' یہ واقعہ خود خواجہ صاحب نے بمبئی میں حاجی داؤد ناصر کے مکان میں چند دوستوں کی موجودگی میں بیان فرمایا تھا۔ (۲) میں نے ۱۹۱۳ میں اخبار بین حضرات کی سہولت کے لئے ایک فرہنگ مرتب کی مگر مجھے اس کے لئے موزوں نام کی تلاش تھی۔ چنانچہ میں خواجہ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنی مشکل بیان کی۔ خواجہ صاحب نے ذرا سے غور و فکر کے بعد فرمایا کہ ''اس کا نام 'اخباری لغات عرف کلید اخبار بینی، رکھدو۔'' بالآخر وہ کتاب اسی نام سے شائع ہوئی۔

خواجہ صاحب میں یوں تو بہت سی خوبیاں تھیں مگر یہاں میں صرف ایک خوبی کی طرف اشارہ کرونگا۔ جب کبھی وہ بڑے آدمیوں کی معیت میں ہوتے اس وقت بھی انہوں نے اپنے معمولی

درجہ کے دوستوں سے کترانے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ جب موقع مل جاتا وہ ان کا تعارف اُن بڑوں سے کرادیتے۔ انہوں نے اپنے معمولی دوستوں میں کبھی احساس کمتری پیدا ہونے نہیں دیا۔ وہ خود تو خیر بڑوں سے بزرگانہ طریقہ سے ملتے ہی تھے، لیکن چاہتے تھے کہ ان کے دوستوں کی خود داری بھی نمایاں رہے۔ ابتدائی دور کے احباب سے ملنے میں انہوں نے کبھی کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی۔ مجھے ان کی یہ وضع داری بے حد پسند تھی۔

وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن مجید کا ہندی میں ترجمہ کیا تاکہ غیر مسلم بھی اسلامی تعلیمات سے بہرہ اندوز ہوں۔ انہوں نے مسلمانوں کی بہت سی بیجا رسوم اور عادات کے خلاف جہاد کیا اور انہیں اُن خرابیوں کی دلدل سے نکالا۔ انہوں نے بعض ایسی خرابیوں کی طرف بھی لکھکر عوام کی توجہ مبذول کرائی جن کی جانب کسی مولوی نے آج تک توجہ نہیں کی تھی۔

خواجہ صاحب کا دروازہ ہر شخص کے لئے کھلا رہتا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا ان سے ہر وقت بلا دقت مل سکتا تھا۔ انہوں نے آج کل کے ”بڑے آدمیوں“ کی طرح کبھی یہ نہیں لکھا کہ وہ اتنے بجے سے اتنے بجے تک ملینگے۔ چونکہ وہ لکھنے پڑھنے کا کام رات کے تین چار بجے سے شروع کردیتے تھے اس لئے قدرتی طور پر ان کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ ملنے والے انہیں صبح کے وقت کام کرنے دیا کریں۔ مگر لوگ کب چوکنے والے تھے! وہ صبح ہی صبح جا پہنچتے تھے۔ خواجہ صاحب ان سب سے اپنی امتیازی خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ اگرچہ ملتے وقت کوئی شخص انفرادی طور پر یہ محسوس نہیں کرتا تھا کہ خواجہ صاحب اس سے خفا ہیں، مگر وہ روزنامچہ میں اجتماعی طور پر اپنی ناراضگی کا اظہار ضرور کردیتے تھے۔

جن اشخاص پر خواجہ صاحب کی نظر کرم تھی ان کے

گھریلو معاملات تک سے وہ دلچسپی لیا کرتے تھے۔ انہی میں راقم الحروف بھی شامل تھا۔ جب کبھی میں چھٹیوں میں دھلی پہنچتا خواجہ صاحب مجھ سے میری تنخواہ کا حساب پوچھتے، وہ ہر مرتبہ یہ ضرور سوال کرتے کہ اپنے والدین کو کتنا روپیہ بھیجتے ہو؟ یہ ایک قسم کی اخلاق نگرانی تھی جو وہ اپنے مخصوص دوستوں پر رکھتے تھے۔

۱۹۳۶ میں خواجہ صاحب کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ اس پر میں نے ذیل کے الفاظ میں بمبئی سے مبارکباد بھیجی۔ ''محترمی خواجہ صاحب، تسلیم۔ نئے اعزاز پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیے۔ یہ اعزاز آپ کی ادبی خدمات کا کھلا ہوا اعتراف ہے۔ خدا کرے یہ مزید خدمات کے لئے مہمیز کا کام دے!'' خواجہ صاحب نے میرا خط یکم جون کے ''منادی'' میں شائع کیا اور ذیل کی عبارت میں شکریہ ادا کیا:۔

> ''پیارے برنی! اگرچہ آپ پنجاب کے ہیں، لیکن خورد سالی سے دھلی میں رہتے ہیں، اور ۱۹۰۸ سے ۱۹۱۲ تک میری رفاقت میں رہے اور میں نے آپ کو برنی کا لقب دیا اور پھر آپ نے بمبئی جا کر ترجمہ ڈیپارٹمنٹ میں اپنی قابلیت سے بڑے بڑے کام کئے۔ آپ اخبار نویس نہیں ہیں لیکن اخباروں کے انجکشن ضرور ہیں۔ آپ کی تہنیت سے خوشی ہوئی۔ دلی شکریہ۔ نظامی۔''

خواجہ صاحب کو اردو کے پرانے اخباروں اور رسالوں کے فائل جمع کرنے کا بہت شوق تھا اور وہ اچھی قیمت دیکر انہیں خریدتے تھے۔ اس کے علاوہ ان کی لائبریری میں بہت سی بیش قیمت قلمی کتابیں بھی تھیں۔ خواجہ صاحب کے ایک مرید حمزہ خاں تھے۔ انہیں بھی ہندوستان بھر کے اردو اخباروں اور رسالوں کے فائل جمع کرنے کا شوق تھا۔ وہ بوڑھے آدمی تھے

اور اس لئے انہوں نے اپنا سارا ذخیرہ خواجہ صاحب کے پاس بھیجدیا تھا۔ یہ ذخیرہ پوری ایک ویگن میں آیا تھا۔

کوئی دن ایسا نہ آتا تھا جبکہ خواجہ صاحب کے پاس لوگ نوکریوں یا سفارشوں کے لئے نہ پہنچتے ہوں۔ خواجہ صاحب حتی‌الامکان ہر ایک کی خدمت کردیتے تھے۔ انہوں نے بیسیوں اشخاص کو مہاراجہ سر کرشن پرشاد اور دوسرے امرا سے مالی امداد دلوائی۔ ان کی خواہش ہمیشہ یہی رہی کہ لوگوں کو اُن کی ذات سے فیض پہنچتا رہے۔

وہ دبلے پتلے لانبے قد کے سوکھے ساکھے انسان تھے، مگر اس ''ناتوان پیکر'' میں ایک صابر اور بےباک دل رکھتے تھے۔ جتنے خارزاروں میں سے انہیں اپنی زندگی میں وقتاً فوقتاً گزرنا پڑا، بہت کم اشخاص کو اس کا پورا پورا احساس ہوگا، مگر جس برداشت اور مستقل مزاجی سے انہوں نے ان سارے طوفانوں کا مقابلہ کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔ خواجہ صاحب کے مخالفین بھی بہت تھے۔ خود ان کے خاندان کے کچھ افراد بھی ہمیشہ ان کے خلاف رہے، مگر اس کے باوجود ان کا کاروان چلتا ہی رہا۔

میرے ایک دوست راوی ہیں کہ ایک دفعہ اینگلو عربک کالج میں ''یوم غالب'' منایا گیا۔ طرح تھی:—

خاک میں کیا صورتیں ہونگی کہ پنہاں ہو گئیں

اسد ملتانی نے اس موقع پر بڑی مرصع غزل پڑھی جس کا مطلع تھا:—

بجلیاں مٹی کے پیکر میں نمایاں ہو گئیں
عشق کی بےتابیاں سمٹیں اور انسان ہو گئیں

خواجہ صاحب صدر کے برابر براجمان تھے، انہوں نے داد دیتے ہوئے فرمایا:— ''ملتان کی مٹی بہت مردم خیز ہے۔'' اسی طرح ایک دن کوئی صاحب ان کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ ''فلاں صاحب آپ کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔'' خواجہ صاحب نے قدرے سکوت کے بعد جواب دیا:—''انہوں نے یقیناً سجھ میں

کچھ برائی دیکھی ہوگی جو ایسی بات کہی - مسلمان کبھی جھوٹ نہیں بولتا - "

خواجہ صاحب کی وفات ہند و پاکستان دونوں کے لئے زبردست نقصان کی حیثیت رکھتی ہے - یہ سچ ہے کہ آیندہ بڑے بڑے اہل قلم ، ادیب اور انشا پرداز دنیا میں آئینگے ، بڑے بڑے بلبل شیراز اس چمن میں نغمہ سرائی کرینگے مگر سجھے یقین نہیں کہ کبھی کوئی دوسرا حسن نظامی پیدا ہو جو ان کی طرح گوناگوں اوصاف کا حامل ہو - وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے - کسی نے سچ کہا ہے :-

"ان کے مرنے سے مر گئی دھلی"

اردو علم و ادب کا یہ آفتاب دھلی میں ۳۱ جولائی ۱۹۵۵ کی شام کو سات بجکر پینتالیس منٹ پر غروب ہو گیا - ہزاروں آدمیوں نے ان کے جنازہ کو کندھا دیا اور ابدی نیند سونے کے لئے انہیں ان ھی کی تیار کردہ قبر میں لٹا دیا -

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے !

***

میر باقر علی داستان گو

دھلی کے پڑھے لکھے لوگوں میں بہت کم ایسے ہونگے جنھوں نے باقر علی کا نام نہ سنا ھو یا جنہیں آن کی زبان فیض ترجمان سے داسنان سننے کا اتفاق نہ ھوا ھو۔ میں نے کوئی پچاس سال قبل آصف علی کے مکان پر پہلی مرتبہ ان کی داستان سنی تھی۔ داستان میں پرانے زمانہ کی کسی جنگ کا حال بیان کیا گیا تھا۔ دوران تقریر میں آنھوں نے قدیم آلات جنگ نام بنام اس طرح گنوائے تھے کہ میں حیران رہ گیا۔ ان کی داستانیں زیادہ تر رزمیہ ھوتی تھیں، مگر ان میں خوبی یہ تھی کہ جیسا مجمع دیکھتے اسی کے مذاق کے مطابق داستان سناتے۔

جن لوگوں نے ان کی داستانیں سنی ھیں وہ اندازہ کرسکتے ھیں کہ آنھوں نے اپنے فن کو ترقی دیکر کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ وہ اس فن میں اپنے ماموں میر کاظم علی کے شاگرد تھے۔ ان کے دور میں ملک میں اور بھی داستان گو تھے، مگر کوئی بھی ان کے لگے کا نہ تھا۔ اس کے علاوہ وہ صاحب قلم بھی تھے۔ ان کے کچھ داستان نما مضامین ''مخزن'' اور ''ھمدرد'' میں بھی شائع ھوئے تھے اور بعد کو پمفلٹوں کی صورت میں بھی پبلک کے سامنے آئے۔ * یہ حقیقت ھے کہ وہ اپنے فن میں حرف آخر کی حیثیت رکھتے تھے۔ انہیں اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی۔

ان کی جیب میں ھروقت نوٹ بک اور پنسل رھتی تھی۔

---

* بعض کے عنوان یہ ھیں :۔ اھل محلہ اور نااھل پڑوس، سولا بخش ھاتھی استالی، آرا را دھوں، خلیل خاں اور فاختہ، فقیر کی جھولی، مانگا تانگا، کانا باتی، خاتمۂ داستان۔

ان کی عادت تھی کہ وہ مختلف پیشہ وروں اور علوم و فنون کی اصطلاحوں کو اس میں درج کرتے رہتے تھے۔ ایک مرتبہ دھلی میں ہیجڑوں میں لڑائی ہوئی۔ باقر علی بھی کھڑے تماشہ دیکھتے رہے اور جو نئی اصطلاحیں معلوم ہوئیں انہیں درج نوٹ بک کرلیا۔ یہ ان کا ایک تفریحی مشغلہ (hobby) تھا جس میں وہ ساری زندگی مصروف رہے۔

ان کے لکھنے کی شان بھی نرالی تھی۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ وہ پیدل سلطان جی چلے جارہے تھے اور میں سائیکل پر سلطان جی سے واپس آرہا تھا کہ ان سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ راستہ میں جتنا مضمون لکھ چکے تھے اسے سنایا اور پھر فرمایا کہ ''نظام الدین پہنچتے پہنچتے مکمل ہوجائیگا۔'' وہ لکھنے لکھانے کے لئے میز کرسی کے محتاج نہ تھے۔

افسوس اس کا ھے کہ انہوں نے قدردان زمانہ نہ پایا۔ لوگ دو دو گھنٹے تک داستانیں سننے کے بعد ان کی خدمت میں حقیر نذرانہ پیش کرتے تھے۔ میرے علم میں آصف علی اور حکیم اجمل خاں ایسے تھے جو ھمیشہ اپنی قدردانی کا ثبوت دیتے رہتے تھے۔ بادشاھی یا نوابی دور ھوتا تو وہ مالا مال ھو جاتے۔ کچھ دنوں کے لئے مہاراجہ پٹیالہ نے انہیں اپنے یہاں بلالیا تھا۔ اسی طرح دوسرے رؤسا بھی انہیں کبھی کبھار طلب کرلیا کرتے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کی زندگی کا آخری دور نہایت عسرت میں کٹا۔ ان کی بیوی فرصت کے اوقات میں چھالیہ کترا کرتی تھیں۔

میر صاحب کی وضع قطع کا اب کوئی شخص مجھے تو نظر نہیں آتا۔ دبلا پتلا منحنی جسم، سر پر دھلی کی پرانی وضع کی بانات کی کڑھی ھوئی ٹوپی، جسم پر کرتا اور کرتے کے اوپر انگرکھا جس کے سینے والے بھی اب نہیں ملتے، اور تنگ موریوں کا پاجامہ اور سادی وضع کی سلیم شاھی جوتی۔ کپڑے صاف ستھرے پہنتے تھے۔ بات کرتے وقت چہرے پر مسکراھٹ رقصاں رھتی تھی۔

چہرے سے انکساری اور معصومیت ٹپکتی تھی۔
''مخزن'' کے ابتدائی دور میں ان کے کچھ مضامین شائع ہوئے تھے جن میں ''برسات میں سرائے کا نقشہ'' آج بھی دلچسپی سے پڑھے جانے کے قابل ہے۔ ان کے کچھ مضامین ''ہمدرد'' کے آخری دور میں بھی شائع ہوئے تھے اور میرا خیال ہے کہ مولانا محمد علی ان کی تھوڑی بہت خدمت ضرور کر دیتے ہونگے اگرچہ اُن دنوں خود ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔

دھلی میں ایک مرتبہ مرکزی اسمبلی کی ممبری کے لئے ایک حلوائی کو کھڑا کیا گیا۔ اس کے لئے پوسٹر کا مضمون میر صاحب سے لکھوایا گیا جس میں مٹھائی سازی کی صنعت کی اصطلاحات کچھ اس انداز سے سموئی گئی تھیں کہ اسے پڑھ کر ہر شخص داد دئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ مجھے ایک اصطلاح یاد رہ گئی ہے اور وہ ہے ''جوج'' جس سے مراد ہے وہ مٹی کی چھوٹی ھانڈی جسے حلوائی جلیبیاں بناتے وقت استعمال کرتے ھیں۔ آج کل کے حلوائی کپڑا استعمال کرتے ھیں۔ وہ زمانہ عدم تعاون کا تھا اور سیاسی جماعتوں نے قانون ساز اسمبلیوں کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔

میر صاحب کے مزاج میں بیحد سادگی تھی۔ باوجود غربت کے وہ کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے۔ داستان سناتے وقت وہ شیر کی طرح گرجتے تھے، ویسے وہ دبلے پتلے منحنی آدمی تھے، متوسط قد کے یا اس سے بھی چھوٹے۔

عدم تعاون کی تحریک میں میر صاحب نے عملی طور پر حصہ نہیں لیا، مگر ان کی ھمدردی اس سے ضرور تھی۔ اسی سلسلہ میں انہوں نے کھدر کی تائید میں ایک مضمون لکھا تھا جس کا عنوان تھا :۔ ''گاڑھے خاں نے ململ جان کو طلاق دیدی۔'' حکومت نے بھی شاید اس کا نوٹس لیا تھا۔ بہرحال یہ مضمون بہت دلچسپ ہے اور زبان کے اعتبار سے بھی بہت اونچی چیز ہے۔

ان کی موت سے جو ۸۲ سال کی عمر میں ۱۹۲۸ میں ۱۴ شعبان کو واقع ہوئی فن داستان گوئی کا خاتمہ ہو گیا۔* باقر علی اپنے فن میں امام کا درجہ رکھتے تھے اور اسی میں ان کی عظمت کا راز پوشیدہ تھا۔ خدا جانے غالب کی طرح وہ خود بھی اپنی اس عظمت سے آگاہ تھے یا نہیں، مگر اہل دہلی ضرور واقف تھے۔ افسوس یہ ہے کہ باوجود اس احساس کے وہ اس امام فن کی قدر کرنے سے قطعاً قاصر رہے:—

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز پس رفتی و کس قدر تو نشناخت دریغ

* * *

* پروفیسر رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں:۔ "دہلی کے مشہور داستان گو میر باقر علی کو فن کا کمال دکھانے کے لئے پہلے پہل علیگڈھ میں نواب محمد اسحاق خاں ہی نے دعوت دی تھی۔ عزت اور محبت کے الفاظ میں نواب صاحب نے باقر علی کا تعارف کرایا تھا جس کا آخری فقرہ اب تک یاد ہے۔ میر صاحب آج داستان سنائیں گے، کل خود داستان بن جائینگے۔"

میر بشارت علی جالبؔ

جالب اور راقم الحروف ہم محلہ تھے اور ہم دونوں کوچۂ چیلاں میں مسجد کالے خاں کے قریب رہا کرتے تھے۔ جالب کوئی ۳۵ برس تک اردو صحافت میں رہے۔ وہ اپنے دور کے سب سے معمر جرنلسٹ تھے۔ وہ متعدد اخبارات کے ایڈیٹر رہے جن میں ''پیسہ اخبار'' (لاہور)، ''وکیل'' (امرتسر)، ''ہمدرد'' (دہلی)، ''ہمدم'' (لکھنو)، اور ''ہمت'' (لکھنو) قابل ذکر ہیں۔ میں انہیں بابائے صحافت کہا کرتا تھا۔ ان کے بیسیوں شاگرد ہندوستان اور پاکستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔

ان کی طرز تحریر بہت سنجیدہ تھی۔ وہ ہفتہ میں چھ چھ اداریے لکھنے کے عادی تھے۔ وہ دہلی کی ٹکسالی زبان لکھتے تھے، سلیس اور شستہ، لیکن جذبات سے معرا۔ وہ سیاسیات میں اعتدال پسند طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور اپنی افتاد طبیعت کی وجہ سے جوشیلے مضامین لکھنے سے قطعاً معذور تھے۔ وہ لمبے لمبے اداریے لکھتے تھے جو ٹھوس معلومات اور دلائل سے پر ہوتے تھے۔

انہیں تاریخ سے گہرا لگاؤ تھا۔ ایک زمانہ میں انہوں نے پانی پت کی تیسری لڑائی پر ایک طویل فاضلانہ مقالہ تحریر کیا تھا جسے لکھنو کے ایک خصوصی جلسہ میں پڑھ کر سنایا بھی گیا تھا۔ یہی مضمون بعد کو ''زمانہ'' (کانپور) میں دو قسطوں میں شائع ہوا اور علمی حلقوں میں بہت پسند کیا گیا، اس لئے کہ اس میں تاریخی واقعات پر خالصتاً مورخانہ انداز میں بحث کی گئی تھی اور فرقہ وارانہ جذبات سے مطلق کام نہیں لیا گیا تھا۔

میر جالب دهلی کے عاشق زار تھے اور چاہتے تھے کہ اس شہر کی ایک جامع تاریخ لکھیں۔ اس کے کچھ حصے لکھ بھی لئے گئے تھے مگر مجھے معلوم نہ ہوسکا کہ آیا اسے مکمل کر لیا گیا تھا یا نہیں۔ میر صاحب کی ہمیشہ سے یہ خواہش تھی کہ وہ دھلی سے اپنا اخبار نکالیں مگر خدا کو یہی منظور تھا کہ وہ تلاش رزق میں وطن سے دور رہیں۔ بعض اوقات قدرت کی ستم ظریفیوں کو دیکھ کر ھنسی آتی ھے اس لئے کہ انہوں نے اسٹاف تک نامزد کرلیا تھا۔ میں خوش قسمت ہوں کہ انہوں نے مجھے بھی آفر دی تھی۔ مگر یہ ارادہ کبھی شرمندۂ تکمیل نہ ھوسکا۔ انسان بھی کتنا بے بس ھے!

ان کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ مولوی حافظ نذیر احمد کی طرح انہوں نے محض اپنے زور مطالعہ سے اس زبان پر عبور حاصل کیا تھا۔ ان کی ذاتی لائبریری ھزاروں کتابوں پر مشتمل تھی جو مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی تھیں۔ درحقیقت وہ دور جدید کے جرنلسٹ کی لائبریری تھی۔ وفات کے بعد ان کی قیمتی لائبریری کا معتدبہ حصہ جامعۂ ملیہ کو دیدیا گیا۔

ان کا انداز گفتگو بہت دل نشیں ھوتا تھا۔ بحث و تمحیص کے دوران میں وہ کبھی کبھار گرم ھوجاتے تھے اور زور زور سے بولنے لگتے تھے۔ لیکن انہوں نے جوش میں بھی کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لیا اور نہ کبھی حد اعتدال سے آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ ان کی مخصوص مسکراھٹ اور ھنسی مجھے آج بھی یاد ھے۔ وہ مسکرا مسکرا کر گفتگو کرنے کے عادی تھے۔ اس طرز گفتگو سے وہ سننے والوں کے دلوں کو آسانی سے موہ لیتے تھے۔

وہ ھر قسم کے موضوع پر خامہ فرسائی کرسکتے تھے۔ وہ بجٹ پر اسی آسانی سے لکھ سکتے تھے جس آسانی سے وہ شہر کی صفائی پر لکھتے تھے۔ میں نے ایسا ایڈیٹر آج تک نہیں دیکھا جو

بیک وقت مفاد عامہ کے جملہ مضامین پر ان کی طرح خامہ فرسائی کرسکتا ہو۔

ان کی تحریر میں مزاح بھی تھا اور طنز بھی ۔ ایک مرتبہ انھوں نے فیض بازار (دریا گنج) کی دو سڑکوں میں سے ایک کی جانب دھلی میونسپلٹی کی توجہ دلائی مگر بے سود۔ یہ سڑک انتہائی خراب حالت میں تھی اور باوجود اس کے میونسپلٹی اس کی درستی سے مسلسل غفلت برتتی رھتی تھی، حالانکہ اسی کے برابر دوسری جرنیلی سڑک تھی جو نہایت اچھی حالت میں رکھی جاتی تھی۔ چنانچہ ''ھمدرد'' کے ایک شمارہ میں انھوں نے لکھا کہ ''اب دھلی میونسپلٹی کو اسکی درستی اور تزئین کی طرف توجہ کرنے کی مطلق ضرورت نہیں ھوگی اس لئے کہ حکومت ھند نے اسے آثار قدیمہ میں داخل کرلیا ھے اور اب وہ اسے موجودہ خراب حالت ھی میں رکھیگی۔'' اس مضمون کا چھپنا تھا کہ میونسپلٹی نے بہت جلد اس کی مرمت کرادی۔

جس زمانہ میں جالب مولانا محمد علی کے اخبار ''ھمدرد'' میں ایڈیٹر تھے اس وقت میرا ان سے تقریباً روزانہ ملنا جلنا رھتا تھا۔ شام کے وقت میں ان کے یہاں پہنچ جاتا اور گھنٹوں ان کی دلچسپ صحبت سے لطف اندوز ھوا کرتا۔ اس وقت ان کی بیٹھک میں بہت سے احباب جمع ھوجاتے تھے جن میں خان بہادر ظفر حسن (آثار قدیمہ) خصوصیت سے قابل ذکر ھیں۔ ایک مرتبہ انھوں نے اپنے ملازم کو دیا سلائی لانے کے لئے کہا۔ پیسے دینے سے قبل انھوں نے دیا سلائی پر ایک اچھا خاصا لکچر دے ڈالا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ ''سویڈن کی دیا سلائیاں لانا۔ وہ اچھی جلتی ھیں اور آخیر تک جلتی رھتی ھیں۔ مزید بر آن وہ تعداد میں بھی زیادہ ھوتی ھیں۔ جاپانی دیاسلائیاں مت لانا، وہ شعلہ دیتی ھیں اور جلاتے وقت ٹوٹ بھی جاتی ھیں، وغیرہ وغیرہ۔''

ان کی تحریر کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ اس سے کبھی کسی کی دلآزاری نہیں ہوئی ۔ آج کی صحافت کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے اس لئے کہ اس میں لوگوں پر بے دھڑک حملے کئے جاتے ہیں ، جھوٹی خبریں شائع کی جاتی ہیں اور سنسنی خیز سرخیوں کے ساتھ انہیں پیش کیا جاتا ہے ۔ لیکن میر صاحب کی تحریریں صرف ملک و ملت کے بہترین مفاد میں لکھی جاتی تھیں اور اگر کسی پر نکتہ چینی بھی کی جاتی تھی تو ذاتیات سے بلند ہو کر ۔ ان کا مطمح نظر صرف سچائی تھا اور بس ۔ ان کے اخبار میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں نکلی جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ وہ سچائی کے معیار پر پوری نہیں اترتی ۔ مراسلات کی اشاعت میں بھی وہ بیحد محتاط تھے اور رطب و یابس چیزوں پر نیلی پنسل پھیر دیتے تھے ۔ بلیک میلنگ سے وہ قطعاً ناآشنا تھے ۔

اخبارات کے مدیر جب اداریے لکھتے ہیں تو وہ اپنے لئے جمع متکلم کا صیغہ استمال کرتے ہیں جس سے مراد ہوتی ہے ایڈیٹر اور اس کے ہمنوا قاری ۔ مگر جب جالب ''پیسہ اخبار'' میں ملازم تھے ، اس وقت مولوی محبوب عالم ''ہم'' کی بجائے ''میں'' لکھنے کے عادی تھے اور چاہتے تھے کہ جالب بھی انہی کا تتبع کریں ۔ یہ طرز نگرش میر صاحب کو دل سے ناپسند تھی اور اس لئے وہ کوشش کرکے اداریے اس طرح لکھتے تھے کہ ''میں'' اور ''ہم'' دونوں نہ آنے پائیں ۔ یہ واقعہ خود جالب صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا ۔ ساتھ ہی فرماتے تھے :—

مگر اس میں پڑتی ہے مشکل زیادہ

جس طرح مولانا محمد علی نے محض قومی درد سے مجبور ہو کر اخبار نویسی شروع کی تھی اسی طرح میر جالب نے بھی قومی خدمت کے جذبے سے سرشار ہو کر میدان صحافت میں قدم رکھا تھا ۔ انہوں نے یہ پیشہ اس لئے اختیار کیا تھا تاکہ

اس کے ذریعہ ملکی و ملی خدمت کریں - یہی ان کا مقصد وحید تھا - وہ اخبار پڑھنے کے اس قدر خوگر تھے کہ بغیر اس کے وہ ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتے تھے -

اخباری مضامین وہ بہت محنت سے لکھتے تھے اور خوب مطالعہ کرنے کے بعد - مطالعہ ان کی فطرت ثانیہ بن گیا تھا - وہ روزانہ بیسیوں اخبار، کتابیں اور رسالے پڑھنے کے عادی تھے انہوں نے اپنی زندگی میں ہزارھا کتابیں پڑھی ہونگی اور چونکہ ان کا حافظہ قوی تھا اس لئے وہ پڑھی ہوئی کتابوں سے پوری طرح فائدہ اٹھاتے تھے - جیسا کہ میں کہ چکا ہوں ان کا کتب خانہ صحیح معنی میں ایک جرنلسٹ کا کتب خانہ تھا جس میں ہر موضوع کی کتابیں موجود تھیں۔ ایک مرتبہ وہ اپنی لائبریری درست کر رہے تھے - جب درست کرچکے تو انہوں نے بہت سے انگریزی رسائل ، ناول اور دوسری کتابیں مجھے تحفتاً دیں۔ یہ میری طالب علمی کے زمانہ کا واقعہ ہے - دفتر سے جب گھر آتے تو اخبارات کا ایک بہت بڑا پلندہ ان کی بغل میں دبا ہوتا - وہ اس بوجھ کو خود ہی اٹھا کر چلتے۔ انہوں نے کبھی کسی چپڑاسی سے یہ نہیں کہا کہ یہ پلندہ گھر پہنچا دینا - اس پلندہ کے بغیر ان کا تصور نہیں کیا جاسکتا -

جنگی امور کے بارے میں ان کی معلومات بیحد وسیع تھی - دنیا کے بڑے بڑے جنگی لیڈروں کے حالات سے بھی وہ کماحقہ واقف تھے اور انہوں نے خصوصیت سے غازی صلاح الدین ، نپولین، عثمان پاشا ، ھنڈنبرگ وغیرہ کی زندگیوں اور ان کے جنگی اصولوں کا بالاستیعات مطالعہ کیا تھا - دنیا کی بڑی بڑی لڑائیوں سے بھی انہیں پوری واقفیت تھی - ایک دن پہلی جنگ عظمیٰ کے دوران میں جرمنوں کی جنگی قابلیت کا ذکر ہو رہا تھا - فرمانے لگے کہ ''ھنڈنبرگ نے دلدلوں کی جنگی مشقوں میں اپنی قیمتی زندگی کے ۳۰ سال صرف کئے ہیں اور یہی وجہ

ہے کہ اس نے اتنی آسانی کے ساتھ ٹیننبرگ کے مقام پر دلدلوں میں پھنسا کر روس کو ایسی زبردست شکست دی کہ اسکے بعد وہ اتحادیوں سے ٹوٹ کر جرمنی سے جدا گانہ صلح کرنے پر مجبور ہو گیا حالانکہ اتحادیوں نے پہلے سے طے کرلیا تھا کہ شکست و فتح کی حالت میں بھی وہ سب ساتھ رہینگے۔''

جس زمانہ میں وہ ''پیسہ اخبار'' میں تھے انہوں نے مختلف کفایتی تدابیر سے تقریباً تین سو روپے ماہانہ کی بچت کرکے دکھادی تھی۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ محض ایڈیٹر ہی نہ تھے بلکہ ان کی نظر سب چیزوں پر رہا کرتی تھی۔ میں نے انہیں کفایت کی غرض سے مستعمل لفافوں اور ریپروں کو دوبارہ سہ بارہ استعمال کرتے دیکھا ہے۔ وہ بالعموم ریپروں اور بڑے لفافوں کی پشت پر نوٹ اور مضامین لکھنے کے عادی تھے۔ دوران جنگ میں انگریزی حکومت نے دفاتر میں کاغذ کی بچت کے جو طریقے ہندوستان میں رائج کئے تھے میر جالب برسوں پہلے سے ان پر حالت امن میں عمل پیرا تھے۔

انہیں اپنے غریب یا چھوٹے درجہ کے دوستوں سے ملنے میں کبھی ھچکچاھٹ محسوس نہیں ہوئی۔ ان کے ایک ایسے ہی دوست امیر بخش (کباڑیے) تھے۔ وہ ان کے ہم محلہ بھی تھے اور بچپن کے دوست بھی۔ وہ ہمیشہ ان سے بے تکلفی سے ملتے اور آتے جاتے دیر تک ان سے باتیں کرتے۔ مجھے ان کی یہ ادا بیحد پسند تھی اس لئے کہ اونچی جگہ پہنچ جانے پر لوگ بالعموم اپنے غریب دوستوں یا ملنے والوں کو بھول جایا کرتے ہیں یا ان سے کترا کر چلتے ہیں۔

خاکساروں سے خاکساری تھی

''ہمدرد'' میں جالب اس وقت آئے جب میرا تعلق اس سے ٹوٹ چکا تھا۔ اس زمانہ میں دھلی کا مشہور مقدمۂ سازش (جس کے نتیجہ میں ماسٹر امیر چند کو پھانسی کی سزا ہوئی تھی) چل

رہا تھا ۔ اس کی رپورٹ لینے کے لئے راقم الحروف ہی جایا کرتا تھا ۔ چونکہ میری رپورٹ بہت جامع ہوا کرتی تھی ، اس لئے پبلک میں بیحد پسند کی جاتی تھی ۔ چنانچہ ایک خط میں جالب مجھے لکھتے ہیں : ۔

"از دفتر ہمدرد ۔ دہلی ۔

دوشنبہ مورخہ ۲۹ جون ۱۹۱۴ ۔

مکرمی ۔ السلام علیکم ۔ میں آپ کو اطلاع دینی چاہتا ہوں کہ مسٹر محمد علی نے یہ منظور فرمایا ہے کہ مقدمۂ سازش دہلی کے اختتام تک "ہمدرد" کے لئے آپ ہی مقدمہ کی روزانہ رپورٹ اسی طریقہ سے لکھتے رہیں جس طرح اب تک لکھتے رہے ہیں ۔ چپڑاسی لنچ کے وقت تک کی کارروائی آپ سے خود جا کر لے آیا کریگا اور باقی آپ خود دفتر میں دیتے چلے جائینگے ۔ اس کا معاوضہ دونوں صورتوں میں قرار پاسکتا ہے یعنی یا تو سابق شرح تنخواہ ہی پر رہے یا آپ کو روزانہ رپورٹ کی مقررہ اجرت دیدی جائے ۔ میں نے آپ کو اطلاع دیدی ہے ۔ آپ آج شام تک مجھے اس کی بابت اپنی منظوری سے آگاہ کرجائیں تا کہ میں کل وقت مقررہ پر چپڑاسی کو بھیجدوں ۔ فقط ۔

آپ کا ہوا خواہ

سید جالب دہلوی آف ہمدرد ۔ دہلی "

بعض وجوہ سے میں نے اس آفر کو قبول نہ کیا اور انکار میں جواب بھیجدیا ۔

بابائے صحافت میر جالب سے بابائے اردو مولوی عبدالحق کے تعلقات بہت دیرینہ اور مخلصانہ تھے ۔ عبدالحق جب کبھی لکھنؤ جاتے تو میر صاحب سے ملنے کے لئے دفتر "ہمدم" میں ضرور پہنچتے اور وہاں انہیں دیکھتے ہی اپنے مخصوص انداز

میں چلا چلا کر فرماتے :-

همدم کی قسم همدم کے لئے هم دم سے گئے همدم نه ملا۔

جن بزرگوں نے دوستی اور شوق کا یه نظاره دیکھا هے وه کہتے هیں که ایسے نظارے اب کاهے کو دیکھنے میں آئینگے۔ یه صحبتیں اب ختم هو گئیں۔

اکتوبر ۱۹۱۷ میں مجھے لکھنؤ جانے کا اتفاق هوا۔ مسز بیسنٹ چند دن پہلے نظر بندی سے رها هوئی تھیں۔ اس موقع پر میں نے مسز موصوفه کے ایک لکچر کا ترجمه کر کے میر صاحب کو دیا جس کا عنوان تھا : ''اسلام تھیوسوفی کی روشنی میں۔'' اس لکچر میں مسز بیسنٹ نے اسلامی تعلیمات پر نئے انداز سے بحث کی هے اور آخر میں مسلمانوں کو علمی دنیا میں اپنا سابقه وقار حاصل کرنے کے لئے پر زور الفاظ میں اکسایا هے۔ میں نے جب یه ترجمه دیا تو جالب بہت خوش هوئے اور انهوں نے اسے موزوں سرخیوں کے ساتھ ''همدم'' کے پہلے صفحه پر کچھ اس طرح سے شائع کیا گویا که وه کوئی تحفه هے جسے مسلمان مسز موصوفه کی رهائی کی خوشی میں تقسیم کررهے هیں۔

میر صاحب کا انتقال لکھنو میں ۲۵ جولائی ۱۹۳۰ کو هوا۔ وفات سے کچھ عرصه پیشتر وه ''همدم'' سے مستعفی هو گئے تھے اور انهوں نے اپنا اخبار ''همت'' جاری کردیا تھا۔ مرتے وقت وه اسی اخبار سے وابسته تھے۔ چند مہینے تک علیل رهنے کے بعد وه میڈیکل کالج کے هسپتال میں منتقل کردئے گئے جہاں ڈاکٹروں کی بہترین توجه کے باوجود ان کے مرض کی صحیح تشخیص نه هوسکی۔ اس کی وجه سے انهیں کئی دن تک شدید کرب سے دوچار هونا پڑا۔ وفات سے چند دن قبل ان پر بیهوشی طاری هو گئی تھی جو آخر وقت تک قائم رهی۔

ان کے انتقال سے اردو کی دنیائے صحافت سونی هو گئی۔

***

مولانا محمدّ علی جوہر

مولانا سے میری پہلی ملاقات اس زمانہ میں ہوئی جب کہ جنگ طرابلس کی ہولناکیاں زوروں پر تھیں اور مولانا اپنے مخصوص اسلامی درد سے مجبور ہوکر چندہ جمع کرنے میں مصروف تھے۔ اس کے بعد ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں۔ جب میں بی۔اے کے امتحان سے فارغ ہوا تو ایک دن خیال آیا کہ چلکر مولانا کی خدمت میں حاضری دینی چاہئے۔ چنانچہ عندالملاقات مولانا نے فرمایا:۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم 'ہمدرد' میں آکر کام کرو اور جس طرح میں نے راجہ غلام حسین کو جرنلزم میں ٹریننگ دی ہے اسی طرح میں تمہیں بھی ٹریننگ دینا چاہتا ہوں۔'' اردو جرنلزم سے مجھے طالب علمی کے زمانہ سے لگاؤ تھا اور چونکہ سرکاری ملازمت میرا کبھی نصب العین نہیں تھا اس لئے بغیر کسی پس و پیش کے میں نے مولانا کی آفر کو قبول کرلیا اور سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرنا شروع کردیا۔

جہاں تک صحافت کا تعلق ہے مولانا کا مطمح نظر بہت بلند تھا، اتنا بلند کہ وہ معمولی معیار کے اخبار کو اپنے پریس میں چھاپنا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ سردار اقبال علی شاہ نے جب اپنا اخبار ان کے پریس میں چھپوانا چاہا تو انہوں نے یہ کہہ کر صاف انکار کردیا کہ یہ میرے پریس کی توہین ہوگی۔

جب مولانا نے ''ہمدرد'' نکالنے کا ارادہ کیا تو انہوں نے اس کے لئے بہترین اسٹاف جمع کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے انہوں نے نہایت معقول مشاہرہ پر مولوی عبدالحلیم شرر کو طلب فرمایا۔ وہ کئی مہینے تک ٹائپ کے انتظار میں گھر بیٹھے تنخواہ پاتے رہے۔ اس کے بعد مولوی عبداللہ عمادی

کو دعوت دی گئی۔ انہوں نے بھی کچھ دن ٹائپ کے انتظار کی زحمت برداشت کی اور پھر تشریف لے گئے۔ آخر میں نگہ انتخاب قاضی عبدالغفار پر پڑی۔ ان کی امداد کے لئے علیگڈہ کے اولڈ بوائے محمد فاروق ایم۔اے گورکھپوری اور قاضی عبدالعزیز منصور پوری لائے گئے۔ ان کے علاوہ اسٹاف میں انگریزی اور عربی کے مترجم، رپورٹر اور پروف ریڈر بھی تھے۔ قاری عباس حسین بھی پہلے دور کے ادارتی عملہ میں شامل تھے۔

میرے زمانہ میں محمد علی ''ھمدرد'' کے لئے بہت کم لکھتے تھے۔ اکثر ایسا ھوتا تھا کہ وہ عملہ میں سے کسی کو بلا کر ھدایتیں دے دیتے تھے۔ بالفاظ دیگر اگرچہ خود مولانا مضامین نہ لکھتے تھے لیکن ان کی روح دوسرے کے لکھے ھوئے مضامین میں ھمیشہ جلوہ گر رھتی تھی۔ البتہ آخری دور میں ان کے متعدد مضامین ''ھمدرد'' میں نکلے۔

مولانا کا ارادہ تھا کہ پبلک کو تعلیم دینے کی غرض سے ایک پبلشنگ ھاؤس قائم کریں جہاں سے مختلف مسائل پر آسان زبان میں پمفلٹ شائع ھوں۔ مگر یہ ارادہ عملی شکل اختیار نہ کرسکا۔ مولانا اپنے دور کے مشہور اھل قلم سے بھی معقول معاوضے دیکر مضمون اور افسانے لکھوایا کرتے تھے۔ ان میں باقر علی داستان گو اور منشی پریم چند خصوصیت سے قابل ذکر ھیں۔

''ھمدرد'' و ''کامریڈ'' کے منیجر میر محفوظ علی بدایونی بھی کبھی کبھی ''ھمدرد'' میں مزاحیہ مضامین لکھا کرتے تھے جو بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے۔

''ھمدرد'' (نیز ''کامریڈ'') سے مولانا کو ھمیشہ خسارہ ھی رھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی بلند فطرت نے کبھی گوارا نہ کیا کہ وہ سوقیانہ قسم کے اشتہاروں کو قبول کرکے اپنا خسارہ پورا کریں۔ مولانا ''ھمدرد'' کو عوام میں سیاسی

بیداری پھیلانے کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور جب تک وہ اخبار زندہ رہا وہ اسی سطمح نظر کے قریب ترین رہا۔

جب ''ھمدرد'' نکالنے کے سارے انتظامات مکمل ھوگئے تو مولانا نے اپنے دوست ڈاکٹر اقبال کو پیغام کے لئے لکھا۔ یہ پیغام پہلے نمبر میں نہ نکل سکا۔ دیر سے موصول ھونے کی وجہ سے وہ ۲۵ فروری ۱۹۱۳ کی اشاعت میں شائع ھوا۔ وہ پیغام یہ ھے:-

تجھے کیوں فکر ھے اے گل دل صد چاک بلبل کی
تو اپنے پیرھن کے چاک تو پہلے رفو کر لے

اگر منظور ھو تجھ کو خزاں نا آشنا رھنا
جہان رنگ و بو سے پہلے قطع آرزو کر لے

تمنا آبرو کی ھو اگر گلزار ھستی میں
تو کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو کر لے

صنوبر باغ میں آزاد بھی ھے پا بہ گل بھی ھے
انھی پابندیوں میں حاصل آزادی کو تو کر لے

تنک بخشی کو استغنا سے پیغام خجالت دے
نہ رہ منت کش شبنم نگوں جام و سبو کر لے

نہیں یہ شان خود داری چمن سے توڑ کر تجھ کو
کوئی دستار میں رکھ لے کوئی زیب گلو کر لے

چمن میں غنچۂ گل سے یہ کہکر اڑ گئی شبنم
مذاق جور گلچیں ھو تو پیدا رنگ و بو کر لے

دھلی کی ابتدائی زندگی میں مولانا کے دو معرکے ھمیشہ یادگار رھینگے۔ اول میونسپلٹی کے احکام کے خلاف قصائیوں کی ھڑتال اور دوسری وہ جنگ جو خود انھوں نے جامع مسجد والوں کے خلاف برپا کی۔ ان دونوں میں مولانا سو فیصدی کامیاب ھوئے۔ قصائیوں کی اتنی بڑی ھڑتال کی سربراھی کوئی آسان کام نہ تھا۔ یہ مولانا کی دانشمندانہ رھنمائی کا نتیجہ تھا کہ

قصائی آخر وقت تک پرامن رہے اور یہی چیز ان کی جیت کا باعث ہوئی ۔ دوسری جنگ جامع مسجد کے ارباب بست و کشاد کے خلاف تھی ۔ مولانا کا مطالبہ تھا کہ جامع مسجد کے صحن میں شامیانے لگوادئے جائیں تاکہ نمازی گرمی میں تمازت آفتاب سے محفوظ رہیں ۔ اگرچہ مسجد کی آمدنی نہایت معقول تھی اور مطالبہ بھی جائز اور حق بجانب تھا مگر جامع مسجد والوں نے اس وقت تک اس مطالبہ پر کان نہیں دھرا جب تک کہ مطالبہ نے عام ایجی ٹیشن کی صورت اختیار نہ کر لی ۔ بالآخر یہ مطالبہ تسلیم کر لیا گیا ۔ آج جو نمازی اطمینان سے شامیانوں کے نیچے نمازیں پڑھتے ہیں انہیں کیا خبر کہ کتنی زبردست اور طویل جد و جہد کے بعد خداوندان مسجد نے مولانا محمد علی کا اور سارے دھلی والوں کا مطالبہ منظور کیا تھا ! اس زمانہ میں دھلی کے خطاب یافتگان نے پورا زور لگادیا تھا کہ اس ''باہر والے'' کو جس نے دھلی میں آ کر ان کے سکون میں اس قدر خلل ڈالا ہے، کسی نہ کسی بہانے شہر بدر کرادیا جائے ۔ اسی غرض سے انہوں نے یہ مسئلہ زوروں سے اٹھایا کہ مولانا کو جامع مسجد * میں سیاسی تقریریں کرنے کی اجازت نہ ہونی چاہئے ۔ مگر کاسہ لیس حکام پرست لیڈر اس ''رام پوریے'' کو دھلی سے نکلوانے میں یا جامع مسجد میں ان کی سیاسی تقریروں پر پابندی عائد کرانے میں کامیاب نہ ہوسکے ۔

جنگ طرابلس اور جنگ بلقان نے مولانا محمد علی کو بہت پریشان رکھا ۔ وہ ترکوں کی پے در پے ہزیمتوں سے بیحد مغموم تھے ۔ آنہوں نے ان کے مصائب کو ہلکا کرنے کی غرض سے ڈاکٹر انصاری کی سرکردگی میں طبی مشن روانہ کیا ۔ پہلی

---

* غدر کے بعد جامع مسجد جن شرائط پر مسلمانوں کو واگزار کی گئی تھی ان میں ایک شرط یہ تھی کہ اس میں سیاسی تقریریں نہ کی جائینگی ۔ دھلی کے حکام پرست لیڈر اسی شرط کو آڑ بنانا چاہتے تھے ۔

جنگ بلقان کے بعد جب ''فاتحین،، میں تقسیم غنیمت پر جھگڑا ہوا اور دوسری جنگ بلقان برپا ہوئی تو اس موقع سے فائدہ اٹھا کر ترکوں نے ایڈریانوپل پر دوبارہ قبضہ کرلیا اس وقت عالم اسلام میں غیر معمولی خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ یہ خبر جب رائیٹر کے ذریعہ دھلی پہنچی تو اس وقت رات بہت زیادہ گزرچکی تھی۔ مگر مولانا کی ترک دوستی کا اندازہ کیجئے کہ آنہوں نے اس کا انتظار نہیں کیا کہ یہ خبر دوسری صبح کو اخبارات کے ذریعہ لوگوں تک پہنچے ، چند رفقائے کار کو لیکر سیدھے جامع مسجد پہنچے اور راستہ بھر چلا چلا کر مسلمانوں کو یہ روح افزا خبر پہنچاتے رھے۔ بہر حال نا وقت ہونے کے باوجود جامع مسجد میں ہزارھا آدمیوں کا اجتماع ھو گیا۔ وھاں مولانا نے درد انگیز تقریر کرکے اس خبر کی اھمیت کو واضح کیا اور دول یورپ کی شاطرانہ چالوں کا پول کھولا ۔ وہ رات بھی کیسی ھیجان انگیز تھی اور آج جب کہ اس واقعہ کو اتنے سال گزر چکے ھیں، وہ روح پرور سماں میری آنکھوں کے سامنے جوں کا توں موجود ھے ۔

کچھ عرصہ بعد کانپور کا واقعۂ ھائلہ پیش آگیا ۔ مولانا محمد علی نے کوشش کی کہ صوبہ کے لفٹنٹ گورنر سر جیمیز میسٹن سے جو ان کے بہت گہرے دوست تھے ، خط و کتابت کرکے اس گتھی کو سلجھا دیں ۔ مگر جب اس نے بھی مداخلت کرنے سے انکار کر دیا اور الٹا محمد علی سے کہا کہ وہ اس جھگڑے سے علیحدہ رھیں تو وہ مسلم لیگ کے سیکریٹری وزیر حسن کو ساتھ لے انگلستان جاپہنچے اور وھاں اپنے انگریز دوستوں کے ذریعہ وہ حل پیش کرایا جس سے مسلمان بھی خوش ھو گئے اور انگریزی حکومت کے وقار کو بھی ٹھیس نہ لگی۔

محمد علی کی بیباک صحافت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ھے کہ آنہوں نے ''لندن ٹائمز،، کے ایک بیہودہ اور اشتعال انگیز مضمون کا منہ توڑ جواب دیا ۔ یہ اس زمانہ کا واقعہ ھے

جب کہ ۱۹۱۴ کے آخر میں یورپ پر جنگ کا بھوت سوار تھا اور ہر لمحہ اس امر کا اندیشہ ظاہر کیا جارہا تھا کہ کہیں ترک بھی اپنی قسمت کو جرمنی کے ساتھ وابستہ نہ کرلیں۔ چنانچہ انہوں نے ترکی کے صدر اعظم کے نام تار بھیجا اور ترکوں کو مشورہ دیا کہ وہ ایسی جنگ میں جس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے ہرگز ہرگز نہ کودیں۔ پھر یہ خیال کرکے کہ کہیں "ٹائمز" کا مضمون ترکوں کو جرمنی کا ساتھ دینے پر نہ اکسائے، انہوں نے چالیس گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد جس میں انہوں نے اپنے اوپر خواب و خور حرام کرلیا تھا اور صرف چائے اور قہوہ پر گزارہ تھا، ایک نہایت طویل مضمون میں انگلستان سے اپیل کی کہ ایسے وقت میں جب کہ وہ بلجیم کی غیر جانبداری کی خاطر میدان جنگ میں آگیا ہے اس کا اخلاقی فرض ہے کہ وہ اسی اصول کی خاطر مصر کو خالی کردے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری دنیائے اسلام خود بخود اس کا ساتھ دینے کے لئے اٹھ کھڑی ہوگی۔

چند ماہ بعد حکومت نے اس مضمون کو قابل اعتراض ٹھہرایا اور اس کی پاداش میں انہیں چھند واڑہ میں نظر بند کر دیا۔ ان کی نظر بندی کا آخری زمانہ بیتول جیل میں گزرا۔ بالآخر دسمبر ۱۹۱۹ میں اختتام جنگ سے پورے ایک سال بعد دونوں بھائی رہا کردئے گئے۔ چھند واڑہ میں اب ان کی واحد یادگار وہ مسجد ہے جو انہوں نے اپنے پنج سالہ جبریہ قیام کے دوران میں تعمیر کرائی تھی۔

جس زمانہ میں مولانا محمد علی چھندواڑہ میں نظر بند تھے میں وہاں کے ڈپٹی کمشنر جی۔ ایل۔ کاربیٹ کی اجازت سے تین دن تک ان کا مہمان رہا۔ اس اثنا میں میں نے اپنی انگریزی کتاب جو مولانا کے حالات زندگی پر مشتمل تھی، ان کے گوش گزار کردی اور جہاں جہاں انہوں نے تصحیح فرمائی

میں نے اسے درست کرلیا ۔ یہ کتاب جولائی ۱۹۱۸ میں شائع ہوگئی ۔ اس پر میرا نام نہیں ہے اس لئے کہ اس کی اشاعت کے وقت میں مدخولۂ حکومت بمبئی ہوچکا تھا ۔*

نظربندی سے رہا ہوتے ہی علی برادران سیدھے امرتسر پہنچے ۔ وہاں طے پایا کہ ترکوں سے منصفانہ شرائط حاصل کرنے کی غرض سے انگلستان ایک وفد بھیجا جائے ۔ محمد علی اس وفد کے لیڈر قرار پائے ۔ یورپ میں چند مہینے گزارنے کے بعد وفد ناکام واپس آگیا اور اس لئے ہندوستان پہنچتے ہی خلافت کی تحریک شروع کردی گئی ۔ کراچی میں محمد علی نے ایک بھرے جلسہ میں مسلمانوں کو ایک تقریر میں مشورہ دیا کہ وہ فوج میں بھرتی نہوں اور مسلمانوں پر گولیاں نہ چلائیں ۔ یہ تقریر ترجمہ کے لئے میرے پاس آئی ۔ اس کے بعد حکومت نے مجھے حکم دیا کہ میں گواہی دینے کے لئے بھی کراچی جاؤں میں اپنے دوستانہ روابط کی بنا پر عدالت میں پیش ہونا نہیں چاہتا تھا اور اس لئے میں نے اپنے شریف پارسی افسر (جہانگیر ایدلجی سنجانا) سے کہا کہ مجھے اس خدمت سے معاف رکھا جائے اور کسی دوسرے مترجم کو گواہی دینے کے لئے بھیج دیا جائے ۔ چنانچہ انہوں نے تاج الدین ملک کو بھیج دیا مگر وہ بھی مترجم کی حیثیت سے پیش نہ ہوسکے اور ان کی بجائے تھرپارکر کے سپرنٹنڈنٹ پولیس محمود شاہ بطور مترجم پیش ہوئے مولانا کی تقریر یو۔پی انسپکٹر لخت حسنین نے شارٹ ہینڈ میں لکھی تھی ۔ دوران مقدمہ میں مولانا نے ان صاحب کی شان میں ایک شعر کہا جسے میں یہاں درج کرتا ہوں ۔ و ھوھذا :۔

محمد کا دشمن علی کا عدو نہ کہہ لخت حسنین اپنے کو تو

مقدمہ کے بعد علی برادران ابھی کراچی جیل ہی میں تھے

* کتاب کا نام یہ ہے: Muhammad Ali. His Life & Services
Foreword By C. P. Ramaswami Iyer, B.A., B. L.

کہ شہر میں یہ افواہ اڑگئی کہ دونوں بھائیوں کے ساتھ برا برتاؤ ہو رہا ہے اور انہیں ایسے جانگیے دئے گیے ہیں جنہیں پہنکر وہ نماز نہیں پڑھ سکتے۔ اس افواہ کا پھیلنا تھا کہ ہزارہا آدمی جیل پہنچے اور چاہتے تھے کہ جیل کا دروازہ توڑ کر اندر داخل ہوجائیں کہ اتنے میں جیل کے سپرنٹنڈنٹ نے مشتعل ہجوم کو اطمینان دلایا کہ یہ افواہ غلط ہے اور ساتھ ہی دونوں بھائیوں کو سامنے کردیا ۔ اس موقع پر مولانا محمد علی نے ایک تقریر کی اور پبلک کی محبت کا شکریہ ادا کیا اور ساتھ ہی لوگوں کو یقین دلایا کہ وہ بہت آرام سے ہیں اور انہیں کوئی تکلیف نہیں ہے ۔ آخر میں انہوں نے اپیل کی کہ لوگ پر امن طریقہ سے اپنے اپنے گھروں کو واپس چلے جائیں۔ اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ پبلک کو دونوں بھائیوں سے کتنی عقیدت تھی ۔

اس مقدمہ میں سزایاب ہونے کے بعد علی برادران بیجاپور جیل میں رکھے گئے۔ وہ جب تک وہاں رہے میرا ان سے برابر سرکاری تعلق قائم رہا اور میں ہر ممکن طریقہ سے ان کی خدمت کرتا رہا ۔ میں اس سعادت پر جتنا فخر کروں کم ہے :-

منت منہ کہ خدمت سلطان همی کنم
منت شمار ازو کہ بہ خدمت گزاشت

جیل سے مولانا ۸۰—۸۰ صفحات کے خط لکھکر بھیجا کرتے تھے ۔ پہلا خط مولوی عبدالباری فرنگی محلی کی خدمت میں بھیجا گیا تھا ۔ ان خطوں میں جہاں دنیا بھر کی باتیں ہوتی تھیں وہاں تازہ کلام بھی ہوتا تھا ۔ میں ان کی غزلوں کو الگ کاغذ پر نقل کرکے ملک کے مختلف جرائد میں بھیجدیتا تھا تاکہ دوسرے لوگ بھی میری طرح ان کے تازہ کلام سے لطف اندوز ہوں ۔ رہائی سے پہلے جو آخری خط میرے پاس سنسر ہونے کے لئے آیا اس میں ۲۲ اشعار کی غزل تھی جسے میں نے ”معارف“ میں اشاعت

کے لئے بھیجدیا ۔ اس کا مطلع ہے :-

ہے یہاں نام عشق کا لینا اپنے پیچھے بلا لگا لینا

ہرچند میں نے سید سلیمان ندوی کو ھدایت بھجوادی تھی کہ یہ ظاھر نہ کیا جائے کہ یہ غزل ان تک کیسے پہنچی مگر انہوں نے نوٹ میں شوخی کے طور پر یہ الفاظ بڑھا ھی دئے :-

''جناب جوھر کا یہ کلام ان کی آزادی سے پہلے آزاد ھوکر ھمارے پاس پہنچا تھا ۔''

مولانا آئے دن کتابوں کی لمبی لمبی فہرستیں بھیجتے تاکہ حکومت ان کی منظوری دے ۔ میں ان کتابوں کو منظور کرتا رھا اس لئے کہ مجھے معلوم تھا کہ مولانا بلا کے بڑھنے والے ھیں اور اس لئے اگر میں نے ان کی علمی بھوک کو آسودہ کرنے میں مدد دی تو میں ملک وملت کی بہت بڑی خدمت انجام دونگا ۔ رھائی کے بعد مولانا نے میرا بہت بہت شکریہ ادا کیا ان سہولتوں کے لئے جو میں نے انہیں بہم پہنچائی تھیں ۔ مولانا نے اپنی سوانح عمری (My Life —A Fragment) بیجاپور جیل میں لکھی تھی ۔

زمانۂ قید کا ایک واقعہ ھے کہ بی اماں نے اپنے دونوں بیٹوں سے ملنے کے لئے حکومت کو درخواست دی ۔ محمد علی سے تو ملنے کی اجازت مل گئی مگر شوکت علی سے ملنے کی اجازت نہیں ملی کیونکہ جیل خانہ میں ان کی بعض ''حرکتوں'' کی وجہ سے ان سے یہ رعایت چھین لی گئی تھی ۔ اس وقت مولانا محمد علی نے نہایت ایثار سے کام لیکر پر لطف مگر محبت آمیز پیرایہ میں بی اماں کو یوں لکھا :-

''میری جنت یا تلواروں کی چھاؤں میں ھے یا آپ کے قدموں کے نیچے ھے ۔ تاھم مجھے یہ قبول ھے کہ آپ کو دیکھے بغیر آپ سے ھمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ھوجاؤں ، مگر یہ ھرگز قبول نہیں کہ میں

آپ کے دیدار سے سعادت اندوز ہوا کروں اور شوکت
کی آنکھیں اس نظارہ کو ترسا کریں۔ وہ ہر حالت میں
مجھ سے کہیں زیادہ آپ کی محبت اور اس انعام کے
مستحق ہیں۔"

مذکورہ بالا عبارت دنیا کے ہر لٹریچر کے لئے باعث فخر
ہے اس لئے کہ اس میں نہ صرف ماں کے احترام کو نہایت
خوبی سے دکھایا گیا ہے بلکہ بڑے بھائی کی عزت کو بھی جس
خوبصورتی سے نبھایا گیا ہے وہ آپ ہی اپنی نظیر ہے۔ اس قسم
کے سیکڑوں جواہر پارے ان کے خطوں میں موجود ہیں۔

رہائی کے بعد مولانا کی ساری اردو کتابیں میرے پاس
آخری بار سنسر ہونے کے لئے آئیں۔ ان میں دیوان غالب کا
ایک نسخہ بھی تھا۔ مولانا کی عادت تھی کہ وہ پڑھتے وقت
اچھے اچھے شعروں پر ایک، دو یا تین نشان (√-√√-√√√)
لگا دیا کرتے تھے۔ بعض بعض جگہ وہ ریمارک بھی لکھ دیا
کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں میں دو ایک مثالیں پیش کرونگا۔
غالب کا ذیل کا قطعہ ملاحظہ ہو:-

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

نظامی والے ایڈیشن میں اس قطعہ پر جو شرح درج ہے اس پر
مولانا نے مندرجۂ ذیل نکتہ چینی کی۔ وہ فرماتے ہیں:—

"اس لطیفہ کے آخری حصہ کا ستیا ناس کر دیا۔ حکم
ہوا کہ اے چنے! تیری خیر اسی میں ہے کہ ہمارے
سامنے سے دور ہوجا ورنہ کچا چبا جائینگے۔" سب
سے زیادہ پرلطف نہ دلا ہوا ہوتا ہے نہ بھنا ہوا نہ
پکا ہوا بلکہ کچا بونٹ۔"

اسی طرح غالب کے اس غیر مطبوعہ شعر پر —

چند تصویر بتاں چند حسینوں کے خطوط
بعد مرنے کے مرے گھر سے یہ ساماں نکلا

مولانا نے ذیل کی عبارت تحریر فرمائی:۔

”تیور تو کچھ اور ہی کہ رہے ہیں۔ مرزا ایسے ہرجائی نہ تھے کہ چند بتوں اور حسینوں کی یادگاریں ان کا ترکہ ہوتیں۔ مگر ممکن ہے کہ شعر مرزا ہی کا ہو۔ بہرحال کچھ اچھا شعر نہیں ہے۔“

محمد علی سیاسی آدمی تھے اور اگرچہ وہ ہر وقت انہی مشاغل میں مصروف رہتے تھے تاہم ان میں خشکی نام کو نہ تھی۔ ان کی بہت سی خوش گپیاں اور بذلہ سنجیاں ثبوت ہیں اس بات کا کہ وہ قدرت کی طرف سے کیسا دل لیکر آئے تھے۔ وہ درحقیقت اپنے دور کے غالب تھے۔ چند لطیفے ملاحظہ ہوں:۔

ایک زمانہ میں حکومت ہند میں سر ڈینس برے ہوم ممبر تھے۔ اپنے اخبار میں مولانا نے لکھا: ”کون کہتا ہے کہ اسمبلی میں گدھے نہیں ہوتے۔ وہاں بھی ایک گدھا ہے۔ کیا تم نے اسے رینگتے (یعنی bray کرتے ہوئے) نہیں سنا؟“ یہ مذاق لندن ”ٹائمز“ میں بھی نقل ہوا تھا۔

محمد علی نو چینجر تھے یعنی وہ چاہتے تھے کہ عدم تعاون کرنے کے بعد ہندوستانی دوبارہ اسمبلیوں میں نہ جائیں۔ برخلاف اس کے ملک میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو اسمبلیوں میں رہ کر تخریبی مہم جاری رکھنا چاہتا تھا۔ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ محمد علی اسمبلی کا تماشا دیکھنے کے لئے پریس گیلری میں جا کر بیٹھ گئے۔ پنڈت شام لال نہرو نے انہیں دیکھتے ہی کہا:۔ ”مولانا، جب آپ یہاں تک تشریف لے آئے ہیں تو نیچے بھی آجائیے۔“ مولانا نے برجستہ جواب دیا: ”میں اس بلندی سے آپ کی پستی دیکھنے آیا ہوں۔“

ان کے اصل الفاظ یہ تھے : “I have come here to look down upon you.” ممبران اسمبلی کھسیانے ہوکر رہ گئے ۔ (یہ لطیفہ سمیع آرٹسٹ کا بیان کردہ ہے جو اسکیچ بنانے کے لئے مولانا کے ساتھ اسمبلی جایا کرتے تھے ۔)

مولانا بڑے بیباک صحافی تھے ۔ وہ اپنے دلی جذبات کا اظہار برملا کیا کرتے تھے ۔ پہلی اسلامی موتمر میں جو ۱۹۲۶ میں حج کے موقع پر منعقد ہوئی تھی ، انہوں نے سلطان ابن سعود سے مخاطب ہوکر کہا تھا :۔

”تو اپنے آپ کو اس مقدس سرزمین کا بادشاہ (ملک الحجاز) کہتا اور کہلواتا ہے جہاں رسول (ص) مقبول نے اپنی زندگی بسر کی تھی حالانکہ تیرے پیش رو ترکوں نے ہمیشہ اپنے آپ کو خادم الحرمین الشریفین کہا اور کہلوایا ۔ تو بھی ان کی تقلید میں اپنے آپ کو خادم الحرمین کہ اور ملوکیت پر جو معاویہ کی سنت ہے ، ہرگز ہرگز نہ چل ۔“

اسی طرح انہوں نے پہلی گول میز کانفرنس میں جو کھری کھری باتیں سنائیں وہ کسی اور ”نمایندہ“ سے بن نہ آئیں ۔ یہ باتیں ایک سرپھرا مرد قلندر ہی کہ سکتا ہے اور محمد علی اپنے زمانہ کا سب بڑا سر پھرا قلندر تھا ۔ اعلائے کلمۃ الحق کی ان سے بہتر مثالیں اور کیا ہوسکتی ہیں !

اهل حق کے واسطے زخم جگر ، رنج و محن
اهل حق کے واسطے زنداں ہے یا دار و رسن

***

راجہ غلام حسین

راجہ غلام حسین پنجاب کے رہنے والے تھے - وہ مشہور اس وقت ہوئے جب علی گڈھ میں زمانہ طالب علمی میں انہوں نے اسٹرائک* میں حصہ لیا - اس کے بعد انہوں نے وہیں سے ڈگری لی اور "کامریڈ" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بن گئے - اس زمانہ میں مسلمان صحافیوں کا اس قدر قحط تھا کہ راجہ غلام حسین کے انتقال کے بعد مولانا محمد علی کو سارے ہندوستان میں ڈھونڈے سے بھی کوئی ایسا مسلمان نہ مل سکا جو صحیح معنوں میں ان کا جانشین بنتا - جب تک راجہ اسسٹنٹ ایڈیٹر کے فرائض ادا کرتے رہے مولانا کو ایک گونہ اطمینان تھا - انہوں نے سب کام سنبھال رکھے تھے - ان کی انگریزی اتنی اچھی تھی کہ ان کی تحریروں پر خود مولانا کی تحریروں کا گمان ہوتا تھا - میر محفوظ علی بدایونی جو ابتدا سے منیجر کی حیثیت سے "کامریڈ" اور "ہمدرد" سے وابستہ تھے، مولانا اور راجہ کو انگریزی انشا پردازی کا "آفتاب و مہتاب" کہا کرتے

---

* ڈاکٹر ضیاءالدین کی سوانح حیات مرتبہ محمد امین زبیری کے دیباچہ میں چودھری خلیق الزماں رقمطراز ہیں :- "میں اکتوبر ۱۹۰۷ میں علیگڈھ کالج میں داخل ہوا - یہ سال کالج کی تاریخ میں اس نوعیت سے بہت اہم ہے کہ میرے داخلہ سے چند ہفتہ پہلے طلبا کی اسٹرائک ہوچکی تھی جس کے سلسلہ میں راجہ غلام حسین مرحوم جو ایک نہایت ہونہار اور قابل طالب علم تھے' کالج سے خارج کردئے گئے تھے اور بعد ازاں چھ دیگر طلبا کا اخراج ہوا تھا - ظاہراً یہ اسٹرائک مسٹر آرچ بولڈ کالج کے پرنسپل اور بعض یورپین پروفیسروں کے رویہ کے خلاف تھی مگر در اصل یہ مسلمانوں کی نئی پود میں حریت کے بڑھتے ہوئے جذبات کا مظاہرہ تھا -"

تھے - ان پڑھ لوگ راجہ کو ” چھوٹا کمریٹ ،، کہا کرتے تھے ، ” بڑے کمریٹ ،، محمد علی تھے -

راجہ کی عادت تھی کہ وہ دفتر میں آتے ہی پہلے تو مختلف اخبارات کا مطالعہ کرتے ، پھر گھنٹے دو گھنٹے کے لئے دفتر ہی میں آرام کرسی پر دراز ہو کر سو جاتے - اٹھنے کے بعد وہ ایڈیٹوریل اور نوٹ لکھتے - کبھی کبھار وہ نوٹ یا ایڈیٹوریل سنانے کے لئے ” ہمدرد “ کے عملہ کے دوستوں کو بھی بلا لیتے تھے - مجھے بھی متعدد مواقع پر ان کی زبان سے ان کے لکھے ہوئے مضامین سننے کا اتفاق ہوا ہے -

۱۹۱۸ میں میں تین دن تک چھند واڑہ میں مولانا محمد علی کا مہمان رہا - میرا مقصد یہ تھا کہ میں انہیں اپنی انگریزی کتاب کا مسودہ دکھاؤں جو میں نے اُن کی زندگی پر لکھی تھی - اس سلسلہ میں انگریزی کا ایک مضمون جس کا اقتباس میں نے اپنی کتاب میں دیا تھا ، زیر بحث آگیا - خود مولانا آخر وقت تک یہ فیصلہ نہ کرسکے کہ آیا وہ مضمون ان کا ہے یا راجہ غلام حسین کا - ان دونوں کی انشا پردازی میں درحقیقت بہت کم فرق تھا -

جب مولانا کی نظر بندی کے بعد ” کامریڈ “ بند ہو گیا تو راجہ غلام حسین نے لکھنؤ سے اپنا ہفتہ وار پرچہ ” نیو ایرا “ نکالا - یہ پرچہ ” کامریڈ “ کی طرز کا تھا - اس کا پہلا شمارہ ۷ - اپریل ۱۹۱۷ کو نکلا - اس کا مسلک بھی وہی تھا جو ” کامریڈ “ کا تھا اور چونکہ قوم ” کامریڈ “ کو ترس گئی تھی اس لئے یہ پرچہ ہاتھوں ہاتھ لیا گیا - اس کے لکھنے والوں میں بھی وہی بزرگ تھے جو ” کامریڈ “ میں لکھا کرتے تھے - ان میں ایک صاحب ولایت علی تھے جو ” بمبوق “ کے نام سے ” گپ “ کے کالم لکھا کرتے تھے - کبھی کبھی وہ نوٹ اور ایڈیٹوریل بھی لکھدیا کرتے تھے - جو رفاقت ” بمبوق “ نے

راجہ کے ساتھ برتی اس کی مثال بہت کم دیکھنے میں آئیگی ۔ ڈاکٹر اقبال بھی کبھی کبھار اس میں لکھا کرتے تھے ۔ مولانا محمد علی کی نظر بندی پر میرا ایک طویل مراسلہ ۱۹۱۷ میں ''نیو ایرا'' میں شائع ہوا تھا۔

راجہ غلام حسین ملک کی آزادی کے زبردست علم بردار تھے ۔ انہوں نے مسز بیسنٹ کی ہوم رول لیگ کو زور شور سے چلایا ۔ وہ چاہتے تھے کہ مسلمان آزادی کی جنگ میں پیش پیش رہیں ۔ انہوں نے جھوٹے ، خطاب یافتہ ، نمایشی اور خود غرض لیڈروں کو بے نقاب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی ۔ وہ مولانا محمد علی کی طرح بت شکن واقع ہوئے تھے ۔ وہ بیحد محنتی تھے ۔ وہ بیورو کریسی (بدیشی حکمران ٹولی) کے شدت سے مخالف تھے ۔ وہ مسلمانوں کو یہی تعلیم دیتے تھے کہ اسلام اور آزادی توام ہیں اور اس لئے مسلمانوں کو ہر تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لینا چاہئے ۔ وہ شورش پسند انسان تھے اور چاہتے تھے کہ قوم کو منظم کریں اس لئے کہ کوئی شورش اس وقت تک بار آور نہیں ہوسکتی جب تک کہ اس کی پشت پر تنظیم نہ ہو۔ وہ یہ جملہ بار بار دہرایا کرتے تھے کہ ''اسلام متوقع ہے کہ ہر مسلمان اپنا فرض منصبی ادا کریگا۔'' افسوس اس کا ہے کہ وہ ''نیو ایرا'' کے ذریعہ صرف چند مہینے تک اعلائے کلمۃ الحق کرسکے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''اگر ہمارے موجودہ لیڈر ہمیں مایوس کردینگے تو اسلام میں اتنی سکت موجود ہے کہ وہ بے غرض ، ایماندار اور جری لیڈر ان کی جگہ پر پیدا کردے۔''

راجہ غلام حسین مولانا محمد علی کی طرح پیدایشی جرنلسٹ تھے۔ ان دونوں نے اس فن میں کہیں تعلیم و تربیت نہیں پائی تھی ، مگر اس کے باوجود محض اپنی غیر معمولی خداداد ذہانت اور قومی درد کی بنا پر ان کا شمار چوٹی کے جرنلسٹوں میں ہوتا تھا ۔

ایک مرتبہ ''پین اسلامزم'' پر میرا ایک مضمون ''ایفریکن ٹائمز اینڈ اورینٹ ریویو'' (لندن) میں شائع ہوا ۔ یہ اخبار دیوس محمد کی ادارت میں ہفتہ وار شائع ہوتا تھا ۔ راجہ نے اس مضمون کو بیحد پسند کیا اور فرمایا کہ ''میں اسے ''کاسریڈ'' میں شائع کرونگا ۔'' یہ ۱۹۲۳ کا واقعہ ہے ۔

راجہ کی شادی دھلی میں ہوئی تھی ۔ لیکن بدقسمتی سے انہیں یہ شادی راس نہ آئی ۔ جو بیوی انہیں ملی وہ شیخ سعدی کی بیوی کی وضع کی تھی ، اور اس وجہ سے ان کی ازدواجی زندگی ہر وقت ضیق میں رہتی تھی ۔ اس غریب کو اُن کی عظمت کا مطلق احساس نہ تھا ۔

اُن کا انتقال اس طرح ہوا کہ ایک سہ پہر کو وہ اور ''ایڈوو کیٹ'' (لکھنو) کے ایڈیٹر رنگا آیر ھوم رول لیگ کے جلسہ سے واپس آ رہے تھے کہ اتنے میں وہ دونوں ایک گھوڑے کی زد میں آگئے جو پیچھے سے سرپٹ بھاگا چلا آ رہا تھا ۔ رنگا آیر تو خیر کسی طرح بچ نکلے مگر راجہ کے سر میں دو تین جگہ شدید زخم آئے ۔ ڈاکٹروں نے دو زخموں کا تو آپریشن کر دیا ، مگر تیسرے بند زخم پر ان کی نظر نہ گئی اور وہ ان کی توجہ سے یکسر محروم رہا ۔ یہی اندرونی زخم بالآخر اُن کی موت کا باعث بنا ۔ ان کی تاریخ وفات ۲۵ اگست ۱۹۱۷ ہے ۔ مرتے وقت اُنہوں نے آیر سے کہا :۔ ''کوشش کرتے رہو ، فتح قریب آ گئی ہے ۔'' (نصرٌ من اللہ و فتحٌ قریب) ۔

حادثہ کے دو تین دن کے بعد ڈاکٹر انصاری بھی لکھنؤ پہنچ گئے اور ان سے جو کچھ بن پڑا انہوں نے اپنے دوست کے لئے کیا ۔ بیماری کے زمانہ میں ''الناظر'' کے ایڈیٹر ظفر الملک (اسحاق علی) ، چودھری خلیق الزماں اور شعیب قریشی ہر وقت راجہ کی خدمت کے لئے موجود رہتے تھے ۔ ہمبوق بھی دیکھنے کے لئے بار بار آتے تھے ۔ راجہ غلام حسین بلرام پور ھسپتال

میں رکھے گئے تھے اور یہ حقیقت ہے کہ ڈاکٹروں کی جو جماعت ان کے علاج میں مصروف تھی اس نے انسانی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا، مگر وہ بچ نہ سکے۔

ان کے مرنے پر سارے ہندوستان میں ماتم کیا گیا۔ مسز اینی بیسنٹ نے ان کے بیوی بچوں کے لئے امدادی فنڈ کھولا اور جب اس میں معقول رقم جمع ہوگئی تو اسے راجہ کی بیوی کے پاس بھیج دیا۔

ان کے انتقال کے بعد ''نیو ایرا'' بند کردیا گیا، اگرچہ کچھ دنوں تک ممبوق اور شعیب قریشی نے اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی تھی۔ مگر یہ انتظام محض عارضی تھا۔ ''کامریڈ'' کی طرح جو نقش اس اخبار نے پبلک کے دل پر چھوڑا ہے اسی کا اثر ہے کہ آج بھی لوگ اسے یاد کرتے ہیں۔ وہ اپنے دور کا بہت اچھا اخبار تھا اور اگر کبھی مسلم صحافت کی تاریخ لکھی گئی تو اس میں اس اخبار کی خدمات سنہری حروف سے لکھی جائینگی۔

جس زمانہ میں راجہ ''نیو ایرا'' نکال رہے تھے انہی دنوں کا قصہ ہے کہ حیدرآباد دکن کے وزیر مالیات سر اکبر حیدری کے پاس سے بڑی تنخواہ کی پیشکش آئی۔ حیدری انہیں حیدرآباد میں بلانا چاہتے تھے، مگر راجہ نے انکار میں جواب بھیج دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ اخبار کے ذریعہ ملک وملت کی خدمت کے کام کو زیادہ ضروری سمجھتے تھے۔ وہ پرندے کی سی آزاد زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔

راجہ فطرتاً بہت شریف الطبع انسان تھے۔ دھلی کی ہر قسم کی سوسائیٹی انہوں نے دیکھی تھی۔ وہ دھلی کی تہذیب اور کلچر کے انتہائی مداح تھے۔ دھلی اور دھلی والوں سے انہیں قلبی محبت تھی۔ ان کا دل قومی درد سے معمور تھا۔ مگر وہ قدرے شرمیلے واقع ہوئے تھے، ویسے وہ بیحد جری تھے اور

زبردست صاحب قلم۔

دو تین سال کی رفاقت کے دوران میں میں نے کبھی ان کے منه سے کسی کے بارے میں کوئی برا لفظ نہیں سنا۔ ان کا ظاهر و باطن یکساں تھا۔

خود مولانا محمد علی کو راجه سے جو والهانه محبت تھی اسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔ جب یه دونوں محو گفتگو هوا کرتے تو ایسا معلوم هوتا تھا که عاشق و معشوق باتیں کر رهے هیں۔ مولانا نے اپنی نظربندی میں راجه کی بےوقت اور اچانک موت پر جو نوحه لکھا وہ غالب کے رنگ کا هے اور اس مرثیه سے ملتا جلتا هے جو عارف کی موت پر لکھا گیا تھا۔ اس نوحه کے چند اشعار درج ذیل کئے جاتے هیں تاکه ان دونوں هم‌سفروں کے باهمی تعلقات کا صحیح صحیح اندازہ هوجائے:—

هائے غلام حسین!

ابھی مرنا نه تھا غلام حسین — کوئی دن اور بھی جئے هوتے
کچھ تو انعام حق پرستی کے — هم غریبوں سے بھی لئے هوتے
اے مرے رند بادۂ حق کے! — ابھی دو چار خم پئے هوتے
تم تو دل بھی فگار کرکے چلے — زخم هائے جگر سئے هوتے
یوں نه دامن چھڑاکے چل دیتے — تم گر اس بزم کے لئے هوتے
تم کو ایسا هی تھا اگر جانا — چند نعم البدل دئے هوتے
تھی شہادت کی کس قدر جلدی — کام کچھ اور بھی کئے هوتے
خوب کٹتا بہشت کا رسته — ساتھ هم کو بھی گرلئے هوتے
آج جوهر هیں دل کے قاش‌فروش — کاش کچھ اور قافیے هوتے

یه ایک دوست اور مربی کا هدیۂ عقیدت هے اور اس میں جن خیالات اور جذبات کی عکاسی کی گئی هے، وہ تمام تر حق و صداقت پر مبنی هیں۔ مولانا محمد علی زندگی بھر راجه غلام حسین کا ماتم کرتے رهے۔ وہ فرمایا کرتے تھے که ''غلام حسین کا جانشین پیدا نہیں هوا''۔ اور حقیقت بھی یہی هے۔

مولانا شوکت علی

جنگ طرابلس کی ہولناکیوں سے ہندوستانی مسلمان جس درجہ متاثر ہوئے تاریخ اس کی دوسری مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس زمانہ میں علی برادران نے اپنی جوشیلی تقریروں سے ملک کے ایک سرے سے دوسرے تک آگ لگادی تھی۔ اگر یہ دونوں بھائی نہ ہوتے تو ناممکن تھا کہ ملک میں ہمدردی کی وہ لہر پیدا ہوتی جو بالآخر پیدا ہوئی۔

مولانا سے میری پہلی ملاقات ستمبر ۱۹۱۱ میں ایک جمعہ کو ہوئی جب کہ وہ دھلی کی جامع مسجد میں ترک اور عرب زخمیوں کے لئے چندہ جمع کر رہے تھے۔ وہ زمانہ میری طالب علمی کا تھا۔ یہ ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہوگئی جو مولانا کے انتقال تک قائم رہی۔

ان دونوں بھائیوں کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی باہمی محبت تھی جو بچپن سے شروع ہوکر نہ صرف علیگڈھ کے زمانۂ طالب علمی میں قائم رہی بلکہ ساری پبلک لائف میں بھی یہ دونوں ایک جان دو قالب ہوکر رہے۔ ان دونوں میں زندگی بھر کوئی ایسا اختلاف رونما نہیں ہوا جس سے ان کی باہمی محبت پر برا اثر پڑتا۔

اس صدی کے ابتدائی حصہ میں مولانا نے سر آغاخان کے سیکریٹری* کی حیثیت سے مسلم یونیورسٹی کے لئے سارے ملک کا دورہ کیا اور لاکھوں روپیہ جمع کیا۔ درحقیقت مسلم یونیورسٹی کا قیام بڑی حد تک انہی کی کوششوں کا رہین منت ہے۔ بعد

---

* آغا خاں نے اپنی آپ بیتی (Memoirs) میں مولانا کی رفاقت کا بہت اچھے الفاظ میں ذکر کیا ہے۔

کو عدم تعاون کے زمانہ میں یہی دونوں بھائی سرکاری امداد سے چلنے والی مسلم یونیورسٹی کا بت توڑنے میں سب سے آگے تھے ۔

علی برادران نے جنگ بلقان میں ترکی زخمیوں کی دیکھ بھال کے لئے ایک ’’فیلڈ ہاسپیٹل‘‘ قسطنطنیہ بھیجا ۔ اس کی تحریک تو مولانا محمد علی نے کی تھی لیکن سرمایہ جمع کرنے کی خدمت شوکت علی کے ذمہ تھی ، چنانچہ دسمبر ۱۹۱۲ میں یہ مشن ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سرکردگی میں بمبئی سے روانہ ہوا اور ترکی میں قابل فخر انسانی خدمات انجام دینے کے بعد ۱۹۱۳ میں ہندوستان واپس آگیا ۔ اس مشن میں بہت سے علیگڈھ اولڈ بوائز شریک تھے ۔ غازی انور پاشا اس کے کام سے بیحد خوش تھے اور ہندوستانی مسلمانوں کی عملی ہمدردی کے اس مظاہرہ سے غیر معمولی طور پر متاثر تھے ۔

’’کامریڈ‘‘ کے کلکتہ سے دھلی آجانے کے بعد سے مولانا شوکت علی اس شہر کے حقیقی لیڈر بن گئے ۔ ان کی آل انڈیا لیڈری کی ابتدا اسی زمانہ سے ہوئی ۔ اس دور کے اکثر مسلمان اکابر محض نمایشی لیڈر تھے جن کی حقیقی غرض اپنے رشتہ داروں کے لئے ملازمتیں اور ٹھیکے اور اپنے لئے خطابات اور دوسرے اعزازات حاصل کرنے کے سوا اور کچھ نہ تھی ۔ لیکن ان دونوں بھائیوں نے مسلم سوسائیٹی کی کایا پلٹ دی اور اسمیں ایک نئی روح پھونک دی ۔ چونکہ میں اسی زمانہ میں سیاسی اجتماعات میں پابندی سے شریک ہوا کرتا تھا اس لئے اپنے تجربہ کی بنا پر کہ سکتا ہوں کہ عوام کے دلوں پر مولانا کی تقریروں کا کیا اثر ہوتا تھا ، یہ دونوں بھائی اس وقت کی مسلم سوسائیٹی کے ترقی پرور عناصر کے صحیح نمایندہ تھے ۔ اسے دیکھر گاندھی جی تک نے ان کو اپنے ساتھ لے لیا تھا اس لئے کہ وہ اچھی طرح سے سمجھتے تھے کہ مسلم عوام تک صرف انہی کے ذریعہ پہنچا جاسکتا ھے ۔

۱۹۱۵ کے شروع میں علی برادران کو "دی چوآئس آف دی ٹرکس" (The Choice of The Turks) والے مضمون کی بنا پر ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ کے ماتحت غیر معینہ مدت کے لئے پہلے مہرولی میں اور پھر چھندواڑہ میں نظربند رکھا گیا ۔ بعد میں مولانا محمد علی کی ایک تقریر کے نتیجہ میں یہ نظربندی بیتول میں قید کی شکل میں تبدیل کردی گئی تھی ۔ دونوں بھائیوں نے پہلی جنگ عظمیٰ چھڑ جانے کے بعد نہایت خلوص سے کوشش کی تھی کہ ٹرکی اور برطانیہ کی آویزش نہ ہونے پائے لیکن یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ ان کی کوششیں بارور نہ ہوئیں ۔ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر اوڈوآیر نے بھی اپنی کتاب میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے ۔

دسمبر ۱۹۱۹ کے آخری ہفتہ میں رہائی کے بعد مولانا شوکت علی پوری طرح سیاسیات میں داخل ہوگئے ۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے تحریک خلافت کی بنیاد ڈالی تاکہ ترکوں کے لئے منصفانہ شرائط صلح حاصل کریں ۔ یہ ہندوستانی باشندوں کی ایجیٹیشن اور غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی تلوار کا نتیجہ تھا کہ معاہدۂ سیورے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا اور اس کی بجائے معاہدۂ لوزان مرتب کیا گیا ۔ علی برادران نے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں "خلافت" کے لئے جان دیدینے کا ولولہ پیدا کردیا تھا ۔ اس دور کا مشہور ترانہ تھا :-

"بولی اماں محمد علی کی جان بیٹا خلافت پہ دے دو"

تحریک عدم تعاون میں مولانا شوکت علی گاندھی جی کے دست راست بنے رہے ۔ ان ہنگامہ خیز ایام میں مولانا نے ہندو مسلم اتحاد کو مضبوط کیا ۔ اس دور میں دونوں فرقوں میں محبت و یگانگت کے جو روح پرور نظارے دیکھنے میں آئے تھے ان سے امید بندھتی تھی کہ یہ اتحاد پائیدار ہوگا ۔ لیکن نہرو رپورٹ پر دونوں بھائیوں کا کانگریس سے اختلاف ہوگیا اور اسکے

بعد سے مسلمان من حیث القوم کانگریس سے دور ھی ھٹتے گئے -

انتقال سے کچھ عرصے پیشتر مولانا کلیتاً مسلم لیگ سے وابستہ ھوگئے - انہوں نے محمد علی جناح کی ماتحتی میں اسی جوش و خروش سے کام کیا جس جوش کا اظہار وہ گاندھی جی کی رھنمائی میں کیا کرتے تھے - مولانا نے کبھی لیڈری کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ وہ آخر وقت تک معمولی سپاھی کی طرح کام کرتے رھے - ویسے بھی وہ اپنے آپ کو ''اللہ کا سپاھی'' کہا کرتے تھے -

مولانا کے کیریکٹر کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ وہ جس میدان میں کام کرنے کے لئے نکلتے اس میں دل و جان تک وقف کر دیتے تھے - انہوں نے کبھی کوئی کام تھڑدلی سے نہیں کیا - چنانچہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں انہوں نے جس شدت سے کانگریس اور نہرو رپورٹ کی مخالفت کی اس میں بھی ان کی سیرت کی یہی شان پوری طرح نمایاں رھی -

مولانا کو تمام اسلامی ممالک سے دلی محبت تھی - مگر ترکی سے انہیں سب سے زیادہ محبت تھی - وہ ان سب ممالک کو آزاد دیکھنا چاھتے تھے - وہ معزول خلیفہ عبدالمجید آفندی کا بیحد احترام کرتے تھے اور کہتے تھے کہ اس ''بے گناہ انسان'' کو اپنے پیش روؤں کے گناھوں کا کفارہ بھگتنا پڑ رھا ھے - عربوں اور بالخصوص فلسطین کے عربوں سے بھی مولانا کو گہری محبت تھی - انہیں اس سر زمین سے اس درجہ انس تھا کہ انہوں نے بالآخر مولانا محمد علی کی نعش کو اسی مقدس سر زمین میں دفن ھونے دیا تاکہ متحدہ ھندوستان کے مسلمان اور عرب ایک دوسرے سے زیادہ قریب آجائیں -

۱۹۲۹ کے ھندو مسلم فسادات میں ''فری پریس آف انڈیا'' کے ایڈیٹر سدا نند نے یہ بے بنیاد خبر شائع کی کہ ''خلافت کے رضا کاروں کی موٹر سے چھریاں اور خنجر برآمد ھوئے ھیں اور یہ وہ اسلحہ تھے جو مسلم فسادیوں میں تقسیم کئے جانے والے تھے -''

سولانا شوکت علی نے سدانند پر مقدمہ دائر کر دیا اور اسے جھوٹا پروپیگنڈا کرنے کی علت میں سزا بھی ہو گئی ۔ بعد میں تحقیقاتی کمیٹی نے بھی جو ان فسادات کے اسباب و علل دریافت کرنے کی غرض سے مقرر کی گئی تھی ، صاف صاف لکھدیا کہ کسی لیڈر نے ان فسادات کو ہوا دینے کی کوشش نہیں کی بلکہ الٹا انہیں دبانے کی ہر ممکن سعی کی ۔ اس طریقہ سے کمیٹی نے بھی خلافت کے دامن کو آلودہ ہونے سے بچالیا ۔

مولانا یاس و نا امیدی کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دیتے تھے ۔ نازک ترین موقعوں پر بھی وہ مستقبل سے کبھی مایوس نہیں ہوئے ۔ اپنی نظر بندی کے زمانہ میں وہ قرآن مجید اور اقبال کی نظموں کے مطالعہ میں اپنا وقت صرف کیا کرتے تھے ۔ معاہدۂ سیورے کے تاریک ایام میں بھی انہوں نے کبھی ہمت نہیں ہاری بلکہ ہمیشہ یہ یقین رکھا کہ بالآخر ترکوں کے ساتھ انصاف ہوگا ۔ وہ اپنی قوم کی خامیوں اور کمزوریوں سے اچھی طرح واقف تھے مگر اس کے باوجود وہ اس کے شاندار مستقبل پر ایمان رکھتے تھے ۔

سولانا نے چندہ لینے کے مشکل کام کو ایک مستقل فن بنادیا تھا ۔ چندہ مانگنے سے وہ کبھی نہیں تھکتے تھے ۔ کوئی قومی تحریک ایسی نہ تھی جس میں انہوں نے جھولی نہ پھیلائی ہو اور شکر گزار قوم نے اسے نہ بھر دیا ہو ۔ بابائے اردو ایک خط میں کسی صاحب کو لکھتے ہیں :— ''اس وقت تو حیدرآباد سے کچھ سلنا مشکل ہی ہے ۔ ایک تو ہیڈلے صاحب کی مسجد کے لئے بہت کچھ چندہ ہوچکا ہے ۔ ادھر شوکت علی صاحب تشریف لائے اور ایک سرے سے دوسرے تک سب کچھ سمیٹ کر چل دئے ۔ چندہ لینے کا ڈھنگ ان کو آتا ہے ۔ میں تو دنگ رہ گیا ۔'' راقم الحروف نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ قوم دینے کے لئے تیار رہتی ہے ۔ لینے والا چاہئے ۔ لینے کا فن مولانا کو

خوب آتا تھا اور اس میں ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔
وہ آخر وقت تک سودیشی پر عامل رہے۔ وفات سے چند سال پیشتر جب وہ ہندوؤں سے الگ ہو گئے تھے، وہ ہمیشہ مسلمان بھائیوں کے ھاتھ کا بنا ھوا کپڑا استعمال کرتے تھے۔ ان کی ابتدا کوٹ پتلون اور ولایتی کپڑوں سے ہوئی تھی مگر تحریک خلافت کی رو میں یہ سب چیزیں بہ گئیں اور ان کی جگہ موٹے کھدر کے ڈھیلے ڈھالے کرتے اور پاجامہ نے لیلی۔
شوکت علی کی طبعیت بہت اشتعال پسند تھی۔ بعض اوقات ان کا ظاھر بہت کھرا، ترش اور خوفناک دکھائی دیتا تھا لیکن ان کا باطن ہمیشہ اس کے خلاف رھا۔ یہ سچ ھے کہ وہ بعض اوقات بچوں کی طرح غصہ میں آجاتے تھے لیکن اس کے فرو ہوتے ھی وہ پھر پہلے کی طرح سیدھے سادے، ھنسی مذاق کرنے والے شوکت علی نظر آتے تھے۔ ان کے چہرے کی مسکراھٹ ملنے والوں کو متاثر کئے بغیر نہ رھتی تھی۔ یہ نتیجہ تھا اس بات کا کہ کالج کے زمانہ میں وہ کرکٹ کے اچھے کھلاڑی رہ چکے تھے، اگرچہ زندگی میں کبھی کبھار اوٹ پٹانگ ھٹیں مارنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔
ایک مرتبہ مولانا نے نواب زادہ سید مرتضیٰ علی خاں* سے شکایتاً کہا کہ ''آپ ھمارے یہاں نہیں آتے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ ''خلافت ھاؤس کے دروازہ کا نام 'باب عمر' ھے، ایسی حالت میں کون شیعہ ایسا ھوگا جو آپ کے یہاں آنے کی جرائت کرے؟'' مولانا نے فرمایا:۔ ''اب تک ھیبت بیٹھی ھوئی ھے؟'' نواب زادہ مسکرا کر چپ ھو گئے۔ اس دروازہ کا نام بمبئی کے لیڈر عمر سوبانی کی یاد میں رکھا گیا ھے، اور

* یہ بھکنا پہاڑی (پٹنہ) کے رھنے والے تھے۔ انہوں نے اپنے خاندانی حالات انگریزی میں ایک کتاب کی صورت میں لکھے ھیں۔ ۱۹۵۴ میں ان کا کراچی میں انتقال ھو گیا۔ انگریزی کے اچھے انشا پرداز تھے۔

حضرت عمر کی ذات گرامی سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

ایک دفعہ مولانا شوکت علی مدن پورہ (بمبئی) میں عام جلسہ میں تقریر کررہے تھے۔ دوران تقریر میں انہوں نے فرمایا :- برطانوی وزیراعظم گلیڈ اسٹون کہا کرتا تھا کہ ہم ترکوں کو یورپ سے بوریا بستر (Bag & Baggage) سمیت نکال دینگے۔ لیکن میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم ہندوستان سے انگریزوں کو نکالتے وقت بوریا بستر یہیں رکھوالینگے۔ یہ چیزیں ہماری ہیں۔" جلسہ میں سی۔ آئی۔ ڈی کے انسپکٹر شیرازی میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے چپکے سے ان سے کہا کہ مولانا سے کہدو کہ "از راہ کرم بوریا بستر تو انگریزں کے پاس ہی رہنے دیں۔" چنانچہ شیرازی صاحب نے یہ بات مولانا سے کہدی۔ اسپر مولانا نے فرمایا :- "بھائیو، انسپکٹر شیرازی سفارش کرتے ہیں کہ بوریا بستر انگریزوں سے نہ چھینا جائے بلکہ انہیں اجازت دیدی جائے کہ وہ اسے چلتے وقت اپنے ساتھ لیجائیں۔ لہذا نکالتے وقت ہم انہیں بوریابستر اپنے ساتھ لیجانے دینگے۔" اسپر دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ یہ واقعہ ان کی خوش طبعی کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔

مولانا نے ایک مرتبہ اپنے اخبار "روزنامہ خلافت" میں ایک نہایت مدلل مضمون لکھا۔ میں نے دفتر سے انہیں ٹیلیفون پر ایسا مبسوط اور مربوط مضمون لکھنے پر مبارکباد دی، جواب میں انہوں نے فرمایا :- "میں محمد علی نہیں ہوں، لکھتے وقت میں اس بات کا خیال نہیں کرتا کہ خیالات کو موتیوں کی طرح لڑی میں پرو دیا جائے، میں تو جیسا سوچتا ہوں ویسا لکھدیتا ہوں، لیاقت اور قابلیت ڈھونڈنی ہو تو محمد علی کے مضامین پڑھو، میں تو سیدھا سادہ اللہ کا سپاہی ہوں۔"

مولانا کی شخصیت عجیب و غریب تھی۔ لوگ انہیں "بڑے بھائی" کے محترم لقب سے یاد کرتے تھے۔ ان کی ذات

میں بہت سی خوبیاں جمع تھیں جن کی وجہ سے لوگ ان کے گرویدہ ہو جاتے تھے - صلح و جنگ دونوں حالتوں میں وہ شریف انسان تھے اور ایک وفادار دوست اور بہادر دشمن - وہ ایسے شخص تھے جو معاف کرنے میں شیر تھے لیکن کسی بات کو بھولنا نہ جانتے تھے - میرے علم میں ہے کہ انہوں نے اپنے کئی دشمنوں کو معاف کردیا تھا حالانکہ انہوں نے مولانا کو بدنام کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی تھی -

کھانے پینے کے معاملہ میں مولانا شیر تھے - رازق الخیری کا بیان ہے کہ ''ایک دفعہ ابا جان (راشدالخیری) نے علی برادران کی نہاری کی دعوت کی ، مولانا محمد علی نے اپنی پلیٹ میں نلی سے گودا نکال کر ایک طرف کو رکھا ، اتنے میں مولانا شوکت علی نے ان سے کہا کہ ذرا روٹی لینا ، وہ روٹی دینے میں رہے کہ مولانا شوکت علی نے ایک ہی نوالہ میں وہ سارا گودا صاف کردیا ، اس پر مولانا محمد علی ہنسے اور کہا :- سگ باش برادر خورد مباش - '' اس پر خوب قہقہہ ہوا - کھانے پینے کے معاملہ میں زندگی بھر مولانا شوکت علی کی یہی شان رہی -

ایک دفعہ مولانا شوکت علی نے تحریک پیش کی کہ مسلمان ہفتہ میں ایک وقت کی روٹی چٹنی سے کھایا کریں اور اس طرح جو بچت ہو اسے قومی کاموں میں دیدیا کریں - میں نے متعدد مرتبہ چٹنی والے دن ان کے ساتھ کھانا کھایا ہے اور اس لئے کہہ سکتا ہوں کہ وہ روٹی چٹنی بھی اسی ذوق و شوق سے کھاتے تھے جس ذوق و شوق سے وہ لذیذ کھانے کھاتے تھے - خلافت ہاؤس میں انہوں نے قدغن لگا رکھی تھی کہ چٹنی والے دن باہر کی دکانوں سے کھانے پینے کی کوئی چیز نہ آنے پائے -

مولانا انگریزوں کے شدت سے مخالف تھے ، مگر اس کے باوجود وہ کہا کرتے تھے کہ ''اگر میں انگریزوں کو قتل بھی کرنا چاہوں تو نہیں کرسکتا اس لئے کہ بیک اور ماریسن کی

نیلی نیلی آنکھیں بیچ میں حائل ہوجاتی ہیں۔ " ان کی دوستی اور دشمنی بوجہ اللہ ہوتی تھی۔

مولانا کا انتقال ۲۷ نومبر ۱۹۳۸ کو ہوا اور وہ جامع مسجد (دہلی) کے سامنے والے پریڈ کے میدان میں سرمد شہید کے مزار کے قریب دفن ہوئے۔ یہ جگہ مسلمانوں کو ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد کی وجہ سے مل سکی جنہوں نے کمانڈر انچیف سے خاص طور پر اجازت لیکر یہ جرنیلی قطعۂ اراضی مسلمانوں کو دلوا دیا۔ زندگی بھر ڈاکٹر صاحب مولانا شوکت علی کی مخالفت کا شکار رہے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے مولانا کے انتقال پر جس وسعت قلبی کا ثبوت دیا وہ اپنی جگہ پر نہایت قابل قدر ہے۔ ان کے کردار سے قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔

ہزاروں بندگان خدا روزانہ مولانا کی قبر کے پاس سے گزرتے ہیں اور فاتحہ پڑھکر ان کی روح پر فتوح کو ثواب بخشتے رہتے ہیں۔ اللہ رے نصیب !

***

نواب سراج الدّین احمد خاں سائل

سائل دہلی کے اس دور سے تعلق رکھتے تھے جو اب ختم ہو گیا ہے۔ ان کی مخصوص وضع قطع ، ان کی چو گوشہ ٹوپی ، ان کا چوڑا چکلا سینہ ، ان کی امتیازی چال ڈھال ، ان کی شگفتہ مزاجی ، ان کی نکھری ہوئی شستہ گفتگو اور ان کی موہ لینے والی مسکراہٹ ہر ملنے والے پر اپنا اثر ڈالے بغیر نہ رہتی ۔ اس آن بان اور ٹھاٹھ کے آدمی اب دہلی میں بھی پیدا نہیں ہوتے ، الا ماشاءاللہ ۔

وہ داغ کے داماد تھے اور شاگرد بھی ، اور ریاست لوہارو کے جاگیردار۔ دہلی کی قدیم سوسائیٹی کے ادبی و علمی حلقوں میں وہ عام طور سے استاد کے محترم لقب سے یاد کئے جاتے تھے۔ غدر کے بعد شرفا کے جو چند گھرانے دہلی میں باقی رہ گئے تھے ان میں سائل کا خاندان ممتاز حیثیت رکھتا تھا ۔

داغ کے یوں تو بیشمار شاگرد تھے لیکن ان کے تعلقات سائل سے بوجہ داماد ہونے کے بہت ھی قریبی تھے ۔ داغ کے انتقال کے بعد شاعر دہلوی ، بیخود دہلوی ، سائل دہلوی اور نوح ناروی کو ان کے شاگردوں نے الگ الگ جلسے کرکے داغ کا جانشین قرار دیدیا ۔ حق یہ ہے کہ یہ چاروں حضرات اپنی اپنی جگہ پر اس قابل تھے کہ انہیں جانشین داغ کا درجہ عطا کیا جاتا ۔ اب اس زبردست چوکڑی میں نوح ناروی کی ذات گرامی باقی رہ گئی ہے اور باقی اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں ۔

سائل زندگی بھر اردو کی خدمت میں منہمک رہے ۔ آخری زمانہ میں بھی جب کہ ان کی صحت گری گری سی رہتی تھی ، وہ اس زبان کی خدمت میں مصروف رہے ، اور اپنی طویل مثنوی

کو مکمل کرتے رہے ۔ ان کی شاعری بہت بلند پایہ تھی ، مزید برآں آن کے پڑھنے کا انداز اس قدر دل آویز تھا کہ اسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ۔ اسی نے ان کی شاعری میں چار چاند لگا دئے تھے ۔ غالباً وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے مشاعروں اور جلسوں میں ترنم کے ساتھ پڑھنے کی بنا ڈالی ، ان کا سا ترنم پھر کسی کو نصیب نہیں ہوا ۔

سائل اپنی وضعداری کے لئے بہت مشہور تھے ، مثلاً وہ ہر شام کو جامع مسجد کے قریب اردو بازار میں برادرم منشی عبدالقدیر والاخوان کی دکان پر ضرور آکر بیٹھتے ، اور جو لوگ ان کی اس عادت سے واقف تھے وہ وہیں ان سے مل لیا کرتے تھے۔ اس پروگرام میں کبھی فرق نہیں آیا۔ گرمی ہو ، جاڑا ہو ، برسات ہو ، وہ وقت مقررہ پر دکان پر پہنچ جاتے تھے ، اس پروگرام میں تبدیلی اس وقت ہوتی جب کہ وہ ناسازی طبع کی وجہ سے باہر نکلنے سے معذور ہوتے یا دھلی سے باہر چلے جاتے ۔

میرے والد منشی محمدالدین سے بھی ان کے گھرے روابط تھے ، در حقیقت وہ ہمارے گھر بھر کے ہر فرد سے گھرے اور مخلصانہ مراسم رکھتے تھے ۔ والد سے وہ گھنٹوں گفتگو کرتے تھے اور پرانے بزرگوں کی طرح نام لے لے کر ایک ایک کا احوال پوچھتے تھے ۔ ان کی ہمیشہ یہ کوشش رہی کہ وہ دوسروں کے کام آئیں ۔ راقم الحروف سے وہ بہت شفقت سے پیش آتے تھے ۔

وفات سے چند سال پیشتر وہ ۱۹۳۷ میں حیدرآباد گئے جہاں ان کا پاؤں رپٹا اور وہ بری طرح گرے جس کی وجہ سے ان کے کولہے میں سخت چوٹ آئی اور پیدل چلنا پھرنا دوبھر ہو گیا ۔ صحت یابی کے بعد وہ رکشا میں بیٹھ کر نکلتے تھے اور اسی حالت میں دوستوں سے ملنے جایا کرتے تھے ۔

قائد اعظم محمد علی جناح کی طرح سائل بلیرڈ کے بیحد شوقین تھے ۔ جن لوگوں نے ان کا کھیل دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ

ضعیفی میں بھی وہ ایسا بلیرڈ کھیلتے تھے کہ مشاق کھلاڑی حیرت میں رہ جاتے تھے۔ اسی طرح شہ سواری، تیر اندازی وغیرہ فنون میں بھی انہیں مہارت تامہ حاصل تھی۔ وہ غلیل بھی اچھی چلاتے تھے۔ بنوٹ کے فن میں بھی انہیں کامل دستگاہ تھی۔ بندوق کا نشانہ بھی خوب لگاتے تھے۔ انہیں فن خیاطی سے لگاؤ تھا اور مشہور انگریز کٹر (Cutter) رینکن کے شاگرد تھے۔ دھلی کے بہترین سینے والوں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ یہ سب چیزیں ان کے تفریحی مشاغل (Hobbies) میں شامل تھیں۔ پہلوانی کا حال تو مجھے معلوم نہیں لیکن ان کی چال ڈھال سے اندازہ ہوتا تھا کہ بچپن اور جوانی میں انہیں ضرور کسرت کا شوق رہا ہوگا۔ انہیں کاڑھنا بھی خوب آتا تھا۔ خالی اوقات میں انہی مشاغل سے وہ اپنا دل بہلاتے تھے۔ وہ پنیر کے بیحد شائق تھے۔ کھانے پینے کے معاملہ میں وہ حد درجہ نفاست پسند واقع ہوئے تھے اور گھر پر بھی محض صفائی کے خیال سے چھری کانٹے کا استعمال کرتے تھے۔ کھانے میں وہ تکلفات برتنے کے عادی تھے۔

ایک دن میں نے پوچھا کہ آپ کے خیال میں غالب کا کوئی شعر ایسا ھے جس کی تشریح میں شارحین نے غلطی کھائی ہو۔ فرمایا کہ ''ایسے کئی شعر ھیں لیکن کم سے کم ایک شعر تو ایسا ھے جسے شارحین مطلق نہیں سمجھ سکے۔ وہ شعر یہ ھے:—

کرتے ہو مجھ کو منع قدم بوس کس لئے
کیا آسمان کے بھی برابر نہیں ہوں میں

شارحین نے اس کا مطلب بیان کرتے وقت صرف اتنا لکھا ھے کہ اس کا تعلق معراج سے ھے لیکن کسی نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ وہ تعلق ھے کیا۔ یہ سب دور از قیاس باتیں ھیں حالانکہ واقعہ محض اتنا تھا کہ ایک دن غالب ایک

بی صاحبہ کے یہاں جانکلے۔ وہاں دیکھا کہ اس کا نوکر (آسمان جاہ) اس کے پاؤں دبارہا ہے۔ غالب کو جو شوخی سوجھی تو انہوں نے کہا کہ لائیے میں آپ کے پاؤں دبادوں، مگر اس نے اجازت نہ دی۔ اسپر انہوں نے برجستہ یہ شعر فرمایا۔ بس اتنی سی بات تھی جسے افسانہ کردیا گیا ہے۔ آسمان جاہ شہزادوں میں سے تھا اور اس نے گردش زمانہ سے بی صاحبہ کے یہاں ملازمت اختیار کرلی تھی۔"

پھر میں نے پوچھا کہ کیا غالب کا کوئی ایسا لطیفہ بھی یاد ہے جو کتابوں میں درج نہ ہو اور سینہ بہ سینہ چلا آرہا ہو۔" فرمایا، "ہاں ہے" اور اس سلسلہ میں انہوں نے یہ لطیفہ سنایا:— "ایک سہ پہر کو مفتی صدرالدین بگھی میں چلے جارہے تھے کہ راستہ میں مرزا صاحب مل گئے۔ وہ پیدل آرہے تھے۔ مفتی صاحب نے انہیں دیکھتے ہی فرمایا، آئیے مرزا صاحب، گاڑی میں تشریف رکھئے۔ مرزا صاحب بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد جب لوٹے تو جامع مسجد میں مغرب کی اذان ہو رہی تھی۔ مفتی صاحب نے فرمایا، چلئے مرزا صاحب، نماز پڑھ لیجئے۔ مرزا ساتھ ہولئے۔ نماز سے فارغ ہوکر جب دونوں گاڑی میں بیٹھے تو مفتی صاحب نے فرمایا: 'خدا کا شکر ہے کہ آج ایک کافر کو تو مسلمان بنایا۔' اس پر مرزا نے بگڑ کر کہا کہ 'میاں، جب تم نے ہمیں گاڑی میں بٹھایا تھا ہم اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ آج کچھ حرمزدگی کروگے۔ چنانچہ ہم نے بھی نماز بغیر وضو ٹرخادی۔'" سائل کہتے تھے کہ اس قصہ کا راوی مفتی صاحب کا کوچوان تھا۔

جن دنوں شیخ عبدالقادر (جو بعد کو سر ہوئے) اور محمد اکرام دہلی سے "مخزن" نکالتے تھے، اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ مولوی ذکاءاللہ کے صاحبزادے منشی عنایت اللہ نے لارڈ لٹن کی ایک نظم "اندھی پھول والی کا گیت" کا نثری ترجمہ

”مخزن،، میں شائع کرایا اور شعرائے کرام کو دعوت دی کہ وہ اسے نظم کا جامہ پہنائیں۔ اس کے جواب میں جہاں اور بہت سے نامی شعرا نے نظمیں لکھیں وہاں حضرت سائل نے بھی ۱۴ اشعار کی ایک لاجواب نظم لکھی جو ستمبر ۱۹۰۸ کے پرچہ میں شائع ہوئی تھی ۔ اس کے چند شعر ملاحظہ ہوں :—

باغباں کی جائی جس کے دونوں دیدے ہیں پٹم
گھر سے نکلی پھول لیکر بیچنے بازار میں
ہاتھ میں لکڑی لئے سر پرسبد گل کا دھرا
کہہ رہی ہے رہروؤں سے نالہائے زار میں
مجھ کو دیکھو رحم کے قابل ہے میرا حال زار
ہو اگر حسن بصارت دیدۂ بیدار میں
پھر مری محنت مری ہمت کو دیکھو روز روز
گھر سے پھولوں کے لئے جاتی ہوں میں گلزار میں
اُن کا چننا سہل کچھ مجھ سے اپاہج کو نہیں
ٹہنیوں میں میں اُلجھ جاتی ہوں کپڑے خار میں
الغرض لاتی ہوں میں ان دقتوں سے چنکے پھول
پھول بھی وہ جو شگفتہ تازہ تر گلزار میں
ان کی دنیا باغ دولت خانہ ہے صحن چمن
ان کی گنجایش قلوب کافر و دیں دار میں
ان کے شائق پیر و برنا ان کے عاشق جن و انس
شوق سے رکھتے ہیں ان کو طرۂ دستار میں
یوسف کنعان گلشن ان میں ایک اک پھول ہے
ہاتھ خالی آکے کیا لیگا کوئی بازار میں
نظم سائل تونے لکھی خوب کیا کہنا ترا !
لیکن احسن سے مزہ کم ہے ترے اشعار میں

مجھے خوب یاد ہے کہ یہ نظم بیحد پسند کی گئی تھی ، اور عرصہ تک دھلی کے علمی و ادبی حلقوں میں اس کا چرچا

رہا تھا ۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ دہلی کے متعدد جلسوں اور مشاعروں میں مجھے سائل کی زبان فیض ترجمان سے ان کی نظمیں اور غزلیں سننے کے مواقع ملے اور خود ان کے دولت کدہ پر بھی ۔ سب سے پہلے میں نے اُن کی نظم ایک ٹی پارٹی کے موقع پر سنی تھی جو سر محمد شفیع کے اعزاز میں روشن آرا باغ میں دی گئی تھی ، جب کہ وہ لارڈ سنہا کے بعد وایسرائے کی کونسل کے لا ممبر نامزد کئے گئے تھے ۔

سائل صاحب کا خط بہت پاکیزہ اور منشیانہ تھا ، خوش قسمتی سے میرے پاس ان کا ایک گرامی نامہ ہے جسے میں تبرکاً درج کرتا ہوں ، درحقیقت یہ تعزیتی خط ہے جو انہوں نے مجھے جون ۱۹۳۴ میں میری پہلی بیوی محمودہ بانو کے انتقال پر ارسال کیا تھا ۔ و ھو ھذا :۔

پس از ماوجب مسنونہ مدعا طراز ہوں کہ کل کئی روز بعد میں منشی عبدالقدیر کی دکان پر گیا تھا ، ان کی زبانی تمہاری پریشانی خانہ ویرانی کا حال معلوم ہوا ۔ نہایت افسوس ہوا ۔ مرضی ایزد تعالیٰ ۔ تم کو اور دیگر اعزائے مرحومہ کو اللہ تعالیٰ صبر عطا فرمائے ! دور از وطن و اقربا ہونے پر جو تکالیف اور زحمتیں تم نے اس واقعہ کے متعلق برداشت کی ہونگی ان کا خیال دل کو الم دہ ہوتا ہے ، لیکن بہ مقتضائے مشیت الٰہی وہ ناگزیر تھیں اور مستقبل پر نظر کی جائے تو اور دل دکھانے والے خیال ہاتھ باندھے سامنے موجود ہیں ، یعنی بچوں کی داشت و نگہبانی ، تربیت و تعلیم ، تمہاری بے آرامی ایک افسانۂ پرسوز و الم ہے ۔ مکرمی منشی صاحب کو اس عہد ضعیفی میں اپنی ناسازی طبیعت کے علاوہ ناسازگاری طالع نے بھی صعوبات دے رکھی ہیں ، آپ علیل ، محمد سعید * کی علالت کے افکار ،

---

* راقم الحروف کے بہنوئی ۔

پھر یہ واقعہ بہت بھاری ہوگیا ، اللہ رحم فرمائے ! والسلام

۱۳ جون ۱۹۳۴ ابوالمعظم سراج الدین احمد خان سائل

میری آخری ملاقات غالباً ۱۹۴۴ میں ہوئی جب کہ مجھے ان کے دولت کدہ واقع لال دروازہ میں مسلسل دو تین گھنٹے تک ان کی مثنوی ''نور علیٰ نور'' کے سیکڑوں اشعار سننے کی مسرت حاصل رہی ، اس مثنوی میں جہانگیر اور نور جہاں کے قصۂ حسن و عشق کو نظم کا جامہ پہنایا گیا ہے ۔ اس اثنا میں وہ پان اور چائے وغیرہ سے خاطر مدارات بھی کرتے رہتے تھے ۔ ان کے گھر کی چیزوں کو سلیقہ اور حسن سے سجا ہوا دیکھکر اندازہ کیا جاسکتا تھا کہ دھلی والوں کا گھر کیسا ہوتا ہے یا کیسا ہونا چاھئے ۔

مرحوم کا انتقال ۱۵ ستمبر ۱۹۴۵ کو ہوا اور وہ قطب صاحب میں اپنے خاندانی قبرستان میں دفن ہوئے ۔ مرتے وقت ان کی عمر ۸۴ سال تھی ۔

***

لالہ بُلاقی داس

بلاقی داس ذات کے کایستھ تھے اور کتابیں چھاپنے اور شائع کرنے کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی دوکان دھلی میں بڑے دریبہ میں گلی پیپل مہادیو میں تھی اور وھیں اس کے عقب میں ان کا میور پریس تھا، وہ قرآن مجید بھی چھاپا کرتے تھے، قرآن مجید چھاپنے کے سلسلہ میں جو اہتمام میں نے ان کے یہاں دیکھا وہ کسی مسلمان کے پریس میں بھی نہیں دیکھا گیا۔

میرے والد کا لالہ بلاقی داس سے دوستانہ تھا اور چونکہ انہوں نے ان کے لئے اُس قرآن کی کتابت کی تھی جس کی ہر سطر الف سے شروع ہوتی ھے، اس لئے میں بھی کبھی کبھار ان کے یہاں چلا جاتا تھا۔ قرآن مجید چھاپنے کے دوران سب وہ ملازمین کی پاکیزگی کا خاص خیال رکھتے تھے، مثلاً وہ اپنے ھندو ملازمین کو پہلے نہلواتے، پاک و صاف کپڑے پہنواتے اور پھر انہیں قرآن مجید چھاپنے کی اجازت دیتے۔ وہ چھپے ہوئے خراب فرموں کو نہایت احتیاط کے ساتھ پیکٹوں کی صورت میں بندھواتے اور پھر انہیں یا تو دریا برد کرادیتے یا کسی گہرے کوئیں میں ڈلوادیتے۔ ان کے یہاں کبھی کوئی فرمہ یا پرزہ پیروں میں نہیں آیا۔ قرآن کے ایک ایک ٹکڑے کو وہ بصد ادب محفوظ کرالیتے تھے تاکہ وہ بےادبی سے بچا رہے۔ نہ صرف یہ بلکہ گھستے وقت وہ پتھروں کی دھوون تک کو جمع کراکے دریائے جمنا میں ڈلوادیتے تھے۔ بلاقی داس قرآن کی برکت کے قائل تھے اور کہا کرتے تھے کہ ”خدا نے مجھے جو کچھ دھن دیا ھے، وہ سب کچھ اسی کا طفیل ھے۔“

***

سُشِل کمار رُدرا

گورنمنٹ ھائی اسکول دھلی سے انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد میں ۱۹۰۸ میں سید آصف علی کے مشورہ سے سینٹ اسٹیفنز کالج میں داخل ھو گیا۔ اس زمانہ میں ردرا پرنسپل تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ بیحد سخت آدمی ھیں، لیکن کالج میں ۵ سالہ قیام کے بعد میں کہ سکتا ھوں کہ جھاں ان میں سختی تھی وھاں نرمی، ھمدردی اور صبر بھی بدرجۂ اتم تھا۔

درشتی و نرمی بھم در بہ است

یہ اعلیٰ صفات وہ ھیں جن کا تجربہ ھر اسی شخص کو ھوا ھوگا جو کبھی ان سے ملا ھو۔

ان دنوں مشن کالج میں مسلم طلبا کی تعداد بہت ھی کم تھی اور اس لئے قدرتاً ردرا صاحب کی خواھش تھی کہ مسلم طلبا زیادہ سے زیادہ تعداد میں ان کے کالج میں آئیں۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف مجھے ھر قسم کی آسانیاں بھم پھنچائیں بلکہ وعدہ فرمایا کہ ''جو مسلمان طلبا یھاں آئینگے ان کے ساتھ بھی ھر ممکن رعایت روا رکھی جائیگی۔'' اس زمانہ میں صرف عربک ھائی اسکول ھی ایسا مدرسہ تھا جھاں سے مسلم طلبا زیادہ تعداد میں آسکتے تھے، لیکن وہ طلبا زیادہ تر غریب تھے اور اس لئے جب میں نے ردرا صاحب کی پیشکش سے انھیں باخبر کیا تو وہ بہت بڑی تعداد میں داخل ھو گئے۔ اس کے بعد سے مسلم طلبا کی تعداد میں سال بہ سال اضافہ ھی ھوتا گیا۔ ردرا صاحب نے اپنے وعدہ کو پوری طرح نبھایا اور غریب مسلم طلبا کے لئے وہ سب کچھ کیا جو بہ حیثیت پرنسپل کرسکتے تھے۔

طلبا کے ساتھ ان کے تعلقات ھمیشہ خوشگوار رھے۔ وہ ان

کے ساتھ اس طرح برتاؤ کرتے تھے گویا کہ وہ ان کے بچے ھیں۔ انہوں نے اجازت دے رکھی تھی کہ طلبا جب چاھیں ان کے پاس جا کر اپنی مشکلات بیان کرسکتے ھیں۔ بعض مخصوص طلبا سے ان کے تعلقات گھر کے سے تھے۔ وہ ان کے گھر میں آتے جاتے تھے اور ان کی مہمانداری سے متمتع ہوتے تھے۔ راقم الحروف بھی انہی طلبا میں تھا۔

ردرا صاحب کے ماتحت چھ سات یورپین پروفیسر تھے جن میں اینڈریوز، ڈے، ینگ، ویسٹرن، مانک اور شارپ خصوصیت سے قابل ذکر ھیں۔ وہ سب کے سب ایک ھندوستانی پرنسپل کی سرکردگی میں اس طرح سے کام کرتے تھے گویا کہ وہ کسی کرکٹ ٹیم کے افراد ھیں اور کالج میں محض طلبا کی خدمت کے لئے موجود ھیں۔ یورپین اساتذہ سب کے سب مشنری تھے۔ ردرا ۱۷ سال تک پرنسپل رہے، لیکن اس تمام عرصہ میں ان میں اور یورپین پروفیسروں میں کبھی کوئی آویزش نہیں ہوئی۔ اسی سبب سے سینٹ اسٹیفنز کالج کی عزت ھر کہ وسہ کے دل میں تھی۔ یہ انگریز پادری طالب علموں کے ساتھ گھل مل کر رھتے تھے اور اپنے طرز عمل سے کسی اجنبیت کا احساس پیدا نہونے دیتے تھے۔

ردرا پیدایشی عیسائی تھے۔ ان کے والد ماجد اپنے وقت کے مشہور پادری الیگزیڈر ڈف کے ھاتھ پر ھندو سے عیسائی ہوئے تھے۔ اگرچہ کالج میں ھندو، مسلم اور عیسائی طلبا تھے، لیکن ردرا صاحب کا برتاؤ ایسا تھا کہ کبھی کسی عیسائی طالب علم کے دل میں یہ خیال تک نہیں آتا تھا کہ وہ محض عیسائی ہونے کی وجہ سے ان سے ترجیحی سلوک حاصل کرنے میں کامیاب ہوسکیگا۔ وہ طلبا کے ساتھ یکساں برتاؤ کرتے تھے اور ھر ایک کی امداد کرنے کے لئے ھمہ وقت تیار رھتے تھے۔

ردرا سچے محب وطن تھے۔ وہ ھر ملکی تحریک میں حصہ لیتے تھے۔ ان کا گھر چوٹی کے سیاسی لیڈروں کا ملجا و ماویٰ

تھا۔ گاندھی جی ، رابندرا ناتھ ٹیگور، مولوی نذیر احمد ، مولوی ذکاء اللہ ، مولانا محمد علی ، سر علی امام ، حکیم محمد اجمل خاں ، ڈاکٹر انصاری وغیرہ سے ان کے تعلقات بہت صمیمانہ تھے -

دھلی کی تعلیمی حالت کو ترقی دینے کے لئے ان سے جو کچھ بن پڑا ، اس سے انہوں نے کبھی دریغ نہیں کیا ۔ انگریزی تعلیم کو زیادہ سے زیادہ فروغ دینے کے سلسلہ میں ان کی خدمات همیشه شکر گزاری کے جذبات سے یاد کی جائینگی ۔

سینٹ اسٹیفنز کالج کے ارباب بست و کشاد اور حکومت وقت کے مابین شروع سے یہ سمجھوتہ تھا کہ کالج کا پرنسپل همیشه انگریز ھوا کریگا ۔ لیکن جب ۱۹۰۶ میں پرنسپل کی جگہ خالی ھوئی اور ردرا کو یہ جگہ پیش کی گئی تو اچھی خاصی رد و قدح کے بعد حکومت نے اس تقرر کو منظور کیا ۔ اس زمانے میں تمام کلیدی آسامیاں صرف انگریزوں کے لئے مخصوص ھوا کرتی تھیں اور ملازمتوں کو ھندوستانی بنانے کا آغاز تک نہ ھوا تھا ۔ ردرا کو پرنسپل بنانے میں استاذی اینڈریوز نے سب سے زیادہ حصہ لیا۔ حکومت اینڈریوز کو پرنسپل بنانا چاھتی تھی ، مگر ایثار و قربانی کے جذبہ کے ماتحت وہ خود پیچھے ھٹ گئے اور ردرا کے حق میں جگہ خالی کردی ۔

ردرا کا یہ احسان کبھی بھلایا نہیں جاسکتا کہ انہوں نے سینٹ اسٹیفنز کالج کے ھر انگریز پروفیسر کے دل میں ھندوستان کی عظمت کا نقش بٹھا دیا تھا ۔ اینڈریوز ایک جگہ لکھتے ھیں :— ''اگر ردرا نہ ھوتے تو شاید میں ھندوستان کو اچھی طرح نہ سمجھ سکتا ۔ انہوں نے ھر موقع پر میری رھنمائی کی اور میری ھمت بندھائی ۔ ''

بیوی کے انتقال کے بعد انہوں نے دوسری شادی نہیں کی ۔ ردرا کے تین بچے تھے، دو لڑکے اور ایک لڑکی۔ موخرالذکر کی

شادی میرے ہم فاضل جماعت جی۔ سی۔ چیٹرجی کے ساتھ ہوئی تھی جو انڈین ایجوکیشن سروس کے ممتاز رکن تھے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر۔ بڑے بیٹے شدھیر کمار ردرا الہ آباد یونیورسٹی میں اقتصادیات کے پروفیسر بنے ۔ برسوں تک وہ اسی حیثیت سے کام کرتے رہے ، مگر بدقسمتی سے ۱۹۵۱ میں گنگا میں نہاتے ہوئے ڈوب گئے ۔ مجھے اس اندوہناک سانحہ کی اطلاع میرے ہم کالج بنارسی داس چتر ویدی نے دی تھی جو ردرا اور اینڈریوز کے خصوصی شاگرد تھے ۔ دوسرے لڑکے اجیت کمار ردرا سب سے چھوٹے تھے ۔ یہ فوج میں بھرتی ہو گئے تھے اور پہلی جنگ عظمیٰ میں انہیں کنگز کمیشن بھی مل گیا تھا ۔ ردرا صاحب پر اجیت کی جدائی بہت شاق گزرتی تھی لیکن وہ اس خیال سے خوش تھے کہ ان کا بیٹا سپاہی ہے اور آزادی اور جمہوریت کی جنگ لڑ رہا ہے ۔

ردرا صاحب بنگالی تھے ، لیکن دھلی آنے کے بعد انہوں نے اتنی اردو سیکھ لی تھی کہ وہ اس میں اچھی طرح سے بات چیت کرسکیں۔ کبھی کبھار جب اردو کا کوئی مناسب لفظ نہ ملتا تھا تو وہ اٹک جاتے تھے اور انگریزی لفظ کا سہارا لیکر اپنا کام چلالیتے تھے۔ اس زمانہ میں سب انگریز پروفیسر اردو سیکھتے تھے ۔ انہوں نے اردو کا نام ”ہندوستانی“ رکھا تھا یعنی ہندوستان کی واحد مشترکہ زبان ۔

ردرا اخلاقی قوت کے ذریعہ ڈسپلن قائم رکھتے تھے اور اس میں وہ همیشه کامیاب ہوئے۔ ایک دن جب وہ تقریر کرنے کھڑے ہوئے تو لڑکوں نے ہال میں بیٹھے بیٹھے جوتوں کے تلوے رگڑنے شروع کردئے جس سے ہال میں اتنا شور ہوا کہ وہ تقریر نہ کرسکے۔ مگر وہ خود اعتمادی کے جذبہ کے ساتھ ایک لفظ کہے بغیر خاموش کھڑے رہے۔ چند ہی لمحوں میں پوری فضا بدل گئی۔ اس کے بعد ردرا نے تقریر کی۔ تقریر کسی

مذہبی موضوع پر تھی۔ ایسی تقریریں ہفتہ میں ایک بار ہوا کرتی تھیں۔

جنگ طرابلس اور جنگ بلقان کے دوران میں انہوں نے میری جنگی دلچسپی کے پیش نظر مجھے اجازت دے رکھی تھی کہ میں پروفیسروں کے کمرے میں بیٹھ کر اخبارات کا مطالعہ کرلیا کروں۔ طلبا کی لائبریری میں روزانہ اخبارات دوسرے دن بھیجے جاتے تھے۔ پروفیسروں کے کمرے میں اینڈریوز، سین اور ینگ سے خبروں پر کبھی کبھی تبادلۂ خیالات بھی رہتا تھا۔

ردرا صاحب کا انتقال سولن (شملہ) میں ہوا جہاں وہ تبدیلی آب و ہوا کے لئے کبھی کبھی جایا کرتے تھے۔ بیماری کے زمانہ میں میں ان کے صاحبزادے شدھیر کو خط لکھ کر دریافت حال کرتا رہتا تھا۔ ان کی وفات سے چند دن پیشتر شدھیر کا خط آیا تھا جس میں تحریر تھا کہ ''والد آپ کی ہمدردی اور محبت کی بیحد قدر کرتے ہیں۔ آپ کے خطوں سے انہیں دلی خوشی ہوتی ہے۔'' چند دن کے بعد وہ اپنے رب سے جاملے۔ جب مجھے ان کے انتقال کی خبر ملی تو بے اختیار میرے آنسو نکل آئے اور مجھے ایسا محسوس ہوا گویا کہ میرے کسی عزیز ترین بزرگ کا انتقال ہوگیا ہے۔ آج بھی جب کبھی ان کی یاد آجاتی ہے میرا دل غم سے لبریز ہوجاتا ہے۔ اور ایک دو آنسو خراج کے طور پر آنکھوں سے خود بخود ٹپک پڑتے ہیں۔ وہ میرے شفیق استاد اور محسن تھے۔

***

مولانا احمد سعید

مولوی احمد سعید میرے بچپن کے دوست تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی ایک مزدور کی طرح بسر ہوئی ۔ وہ زینت المساجد کے ایک دالان میں تارکشی کیا کرتے تھے ۔ یہ اس صدی کے پہلے عشرہ کی بات ہے ۔ اس کے بعد ان کی زندگی نے پلٹا کھایا اور وہ مدرسۂ امینیہ میں داخل ہوگئے جہاں وہ ذاتی محنت سے تھوڑے ہی عرصہ میں مذہبی علوم میں منتہی ہوگئے ۔ پھر تو وہ اتنے مشہور ہوئے کہ ان کی سی شہرت بہت کم مولویوں کو نصیب ہوئی ہوگی ۔

اُن دنوں دھلی میں ''خلاق المعانی مولوی محمد راسخ'' ایک شیریں مقال اور فصیح البیان واعظ تھے جو اردو بازار والی مسجد میں جمعہ کے جمعہ وعظ فرمایا کرتے تھے۔ چونکہ وہ دلکش خطیب تھے اور ان کے مواعظ میں تصوف اور شاعری کی چاشنی بھی ہوتی تھی اس لئے لوگ دور دور سے کھچے چلے آتے تھے۔ جب ۱۹۰۸ میں ان کا انتقال ہوگیا تو شہر والوں کی نظر انتخاب مولوی صاحب پر پڑی اور انہوں نے مولانا راسخ کی مسند پر بیٹھنا منظور کرلیا۔ ان کی فصاحت و بلاغت کے پیش نظر لوگوں نے انہیں ''سبحان الہند'' کا خطاب دیا تھا ۔ دھلی والے یہ دیکھکر خوش تھے کہ راسخ صاحب کا جانشین پیدا ہوگیا ہے۔

مدتوں وہ جمیعت العلما کے سیکریٹری رہے ۔ صدر مفتی کفایت اللہ تھے ۔ صدر اور سیکریٹری میں جو باھمی اتحاد میں نے دیکھا وہ بہت کم دیکھنے میں آئیگا ۔ وہ دو قالب اور ایک جان تھے ۔ مفتی صاحب سے انہیں اس قدر محبت تھی کہ انہوں نے اپنی زندگی ھی میں مفتی صاحب کی قبر کے بائیں جانب اپنی

آخری آرام گاہ تیار کرالی تھی ۔ اگر وہ اپنی جگہ متعین نہ کر گئے ہوتے تو انہیں مولانا آزاد کے پہلو میں دفن کیا جاتا ۔

۱۹۳۱ میں جب گاندھی جی دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے گئے اس وقت مفتی کفایت اللہ اور مولوی احمد سعید ان سے ملنے کے لئے بمبئی تشریف لائے اور مذھب ، زبان اور ثقافت کی حفاظت کے سلسلہ میں انہوں نے ان کے سامنے مسلمانوں کے اقل مطالبات پیش کردئے اور گاندھی جی سے صاف صاف کہدیا کہ اس کے بغیر مسلمانوں کو کوئی دستور قابل قبول نہ ہوگا ۔ اس وقت ملک کی تقسیم کا سوال ھی نہ اٹھا تھا بلکہ ھر مطالبہ متحدہ ھندوستان کے نظریہ کی بنا پر کیا جارھا تھا ۔

مولوی صاحب اپنی خطابت اور لسانی کے لئے سارے ھندوستان میں مشہور تھے ۔ ان کی تقریر اس قدر لچھے دار ھوتی تھی کہ سننے والے عش عش کرتے تھے ۔ وہ قصہ میں قصہ بیان کرنے کے عادی تھے اور پھر اپنی تقریر کو اس طرح سے مربوط کرتے اور سمیٹتے چلے جاتے تھے کہ سننے والے دم بخود رہ جاتے تھے ۔ چونکہ وہ دھلی کے روڑے تھے اس لئے ان کی زبان بیحد شیریں، شستہ اور سلیس تھی ۔ ان کی شان کا دوسرا خطیب میں نے نہیں دیکھا ۔ وہ پنجاب کے مشہور خطیب عطاء اللہ شاہ بخاری اور مولوی ثناء اللہ امرتسری کی طرح گھنٹوں بول سکتے تھے ۔ ان میں غضب کی آمد تھی ۔

گاندھی جی کی کوئی تحریک چل رھی تھی کہ مولوی احمد سعید بمبئی آئے اور ڈاکٹر گور کے یہاں ٹھہرے جو مولوی عبدالقادر قصوری کے ھاتھ پر ھندو سے مسلمان ھوئے تھے ۔ رات کو کسی وعظ سے دو بجے کے قریب گھر لوٹ رہے تھے کہ راستہ میں ان پر چند موالیوں (غنڈوں) نے حملہ کردیا ۔ شروع شروع میں انھی کو تاک کر نشانہ بنایا گیا مگر دوسرے ساتھیوں نے جن میں

ڈاکٹر صاحب کے برادر نسبتی ڈاکٹر شکری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، انہیں آڑ میں لے لیا۔ وہ خود ڈنڈے کھاتے رہے مگر مولوی صاحب کو بچاتے رہے۔ اگر وہ اس طرح سے نہ بچالئے جاتے تو شاید مخالفین ان کا دم ہی نکال دیتے۔ اس واقعہ کے دوسرے دن میں ان کی خدمت میں پہنچا۔ فرمانے لگے کہ ''اتنا یاد رہے کہ مجھ پر یہ حملہ آپ کے شہر میں کیا گیا ہے۔'' چونکہ مجھے پولیس سے واقعات کا علم ہوچکا تھا اور حملہ آوروں کے نام بھی معلوم ہو گئے تھے اس لئے میں نے سازش کا پورا حال کہ سنایا۔ وہ یہ معلوم کرکے خوش ہوئے کہ عوام کا اس حملہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ حملہ حکومت کے مخصوص گرگوں کے ذریعہ کرایا گیا تھا تاکہ قوم پرست مسلمان ڈرے ڈرے اور سہمے سہمے رہیں۔ ایسا ہی ایک واقعہ ۱۹۱۵ میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ بمبئی میں پیش آیا تھا جب کہ پولیس کمشنر (ایس۔ ایم۔ ایڈورڈز) نے اپنے مخصوص آدمیوں کے ذریعہ پنڈال میں زبردست ہنگامہ کرادیا تھا، جس کے نتیجہ میں بقیہ اجلاس پنڈال کی بجائے تاج محل ہوٹل میں منعقد ہوئے۔ حملہ آور بعد کو مولوی صاحب کی خدمت میں اظہار معذرت کے لئے پہنچے تھے اور انہوں نے انتہائی فراخدلی سے ان کا قصور معاف بھی کردیا تھا۔ نہ صرف یہ بلکہ جب پولیس ان کا بیان لینے کے لئے پہنچی تو انہوں نے بیان دینے سے صاف انکار کردیا۔

مولوی صاحب نے ۱۲ برس کی عمر میں قرآن مجید حفظ کرلیا تھا۔ اس کے بعد سے وہ ہر سال کسی نہ کسی مسجد میں ختم قرآن کرتے تھے۔ انہوں نے ۱۹۵۸ تک قرآن مجید سنایا۔ وہ نہایت خوش الحان قاری تھے۔ یوں تو دنیا میں ہزاروں حافظ قرآن ہیں لیکن ان میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ فوراً بتا سکتے تھے کہ فلاں آیت فلاں پارے کے فلاں رکوع میں ہے۔ وہ قرآن پر پوری طرح حاوی تھے۔

مولوی صاحب کی متعدد کتابیں شائع ہوچکی ہیں۔ وفات سے پیشتر انہوں نے قرآن مجید کا ترجمہ مع تفسیر مکمل کرلیا تھا۔ وہ ابھی منظرعام پر نہیں آیا، لیکن چونکہ وہ متعدد خصوصیات کا حامل ہے اس لئے یقین ہے کہ وہ قبولیت عامہ حاصل کرلیگا۔ انہوں نے یہ ترجمہ اور تفسیر تن تنہا تیار کی تھی۔ اسے ان کی زندگی کا شاہکار سمجھنا چاہئے۔

اپنی ابتدائی زندگی میں مولوی صاحب لال کوئیں، فوارہ اور ملکہ کے باغ میں مذہبی مناظرے کیا کرتے تھے۔ جیت ہمیشہ انہی کی ہوتی تھی اس لئے کہ وہ اپنی حاضر جوابیوں سے اپنے مخالفین کو چپ کرا دیا کرتے تھے۔ ان کے زمانہ میں آریا سماجی رام چندر اور پادری احمد مسیح کا بہت زور تھا، مگر ان دونوں پر مولوی صاحب کی علمیت، لسانی اور حاضر جوابی کا سکہ بیٹھا ہوا تھا:۔

لاکھ مضمون اور اس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

ان کی سیاسی زندگی تحریک خلافت سے شروع ہوئی، جو جمعیۃ العلما کے اشتراک عمل کی وجہ سے بہت جلد ہمہ گیر بن گئی۔ کانگریس کی کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس میں وہ شامل نہ ہوئے ہوں۔ مولانا حفظ الرحمن کا یہ فرمانا صداقت پر مبنی ہے کہ ''مولوی احمد سعید تمام تحریکات ملت و وطن کے بانیوں میں سے تھے اور تاریخ کے اس پورے سفر میں وہ اپنا اہم پارٹ ادا کرنے کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے۔''

وہ آخر وقت تک کانگریس سے وابستہ رہے۔ وہ تقسیم ملک کے خلاف تھے اس بنا پر کہ وہ سارے ہندوستان پر مسلمانوں کا حق سمجھتے تھے اور ملک کے صرف ایک حصہ پر قانع رہنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب ملک تقسیم ہوگیا تو وہ ہندوستان ھی میں جمے رہے۔ ان کے وہاں سے نہ ہٹنے کا ایک

سبب یہ بھی تھا کہ وہ مسلمانان ہند کو بے سہارا چھوڑنا پسند نہیں کرتے تھے ۔ اسی تخیل کے ماتحت انہوں نے تقسیم کے بعد جان کی بازی لگا کر ہندوستانی مسلمانوں کی پشت پناہی کی اور مولانا آزاد اور گاندھی جی کے ساتھ ملکر دھلی کے مسلمانوں کو جن سنگھیوں سے نجات دلوائی ۔ وہ ہر نازک موقع پر اپنی ملت کے کام آئے ۔

ہمارے گھر کے سب افراد کے ساتھ ان کے گہرے روابط تھے ۔ کبھی کبھار وہ والد سے ملنے کے لئے آتے ۔ بڑے بھائی منشی عبدالقدیر تو خیر ان کے ہم مشرب ھی تھے اور جیلوں میں ساتھ رہ چکے تھے ، لیکن میرے چھوٹے بھائی محمد یوسف کی خطاطی کے وہ عاشق تھے ۔ مجھ میں اور ان میں ایک رشتہ یہ بھی تھا کہ ہم دونوں ایک ھی وحید العصر استاد مولوی محمد اسحاق رامپوری کے شاگرد تھے ۔

مولوی صاحب متعدد دفعہ جیل گئے اور حسرت موہانی کی طرح انہیں بھی چکی پیسنی پڑی اور بان بٹنے پڑے ۔ وھیں حالت قید میں انہیں شاعری کا شوق ھوا ، اور اسی مناسبت سے انہوں نے اپنا تخلص ''اسیر'' رکھا تھا ۔ ان کی ایک نظم کے کچھ شعر دئے جاتے ھیں جس میں انہوں نے بعض دوستوں کی رھائی پر اپنے تاثرات کا اظہار کیا ھے ۔ و ھو ھذا :۔

زندہ کرتے ہوئے اسلاف کا تم نام چلے
ھو مبارک تمہیں تم جیل سے خوش کام چلے
سختیاں قید کی جھیلی ھیں خوشی سے تم نے
کون کہتا ھے کہ تم قید سے نا کام چلے
تم چلے خانۂ صیاد کو ویراں کرکے
شکر اللہ کا تم جیل سے خوش کام چلے
سیٹھ نورنگ چلے اور چلے گوبند سرن
گوری شنکر چلے اور عارف خوش کام چلے

چھوڑ کر چل دئے زندان میں ہمیں اسمعیل
پر خوشی ہے ہمیں اس کی کہ وہ باکام چلے
منشی عبدالقدیر اور گلاب اور امیر
باغ میں جتنے تھے چوٹی کے وہ سب آم چلے
چھوڑ کر مجھ کو چلے جیل میں تنہا عارف
چھوڑ کر ہائے مجھے گوری گلفام چلے
قیدیوں میں ہوا جانے سے تمہارے شیون
ڈال کر جیل میں تم کیسا یہ کہرام چلے

مولوی صاحب بیک وقت ایک جید عالم ، ایک متوازن سیاست دان ، ایک بے مثال خطیب ، ایک شیریں بیان واعظ اور ایک جادو اثر مقرر تھے۔ مولوی حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ کے بعد اس مخصوص طبقہ کے علما میں بس ایک احمد سعید باقی رہ گئے تھے ، سو وہ بھی ۴ دسمبر ۱۹۵۹ کی شام کو ساڑھے سات بجے ہم سے جدا ہوگئے ، اور اب ۔

افسوس کہ از قبیلۂ مجنوں کسے نماند!

***

محمدالدّین خلیقی

محمدالدین خلیقی میرے پرانے دوستوں میں تھے ۔ دھلی میں چاندنی چوک سے ورے ان کی بہت بڑی دکان تھی جس میں ٹایر، ٹیوب ، چٹائیاں ، جانمازیں اور اسی قبیل کی دوسری چیزیں فروخت ہوتی تھیں ۔ وہ دوسرے دکانداروں سے بالکل مختلف تھے ۔ وہ اس قدر خلیق اور مہذب تھے کہ دیکھکر حیرت ہوتی تھی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ تعلیم یافتہ تھے اور بلند پایہ ادیب ۔ انہی دو باتوں نے انہیں دوسرے تمام دکانداروں سے ممیز کردیا تھا ۔ میں نے ایسا شستہ اور مہذب دکاندار نہیں دیکھا ۔ ان کی دکان ادب و شعر کا مرکز بنی رہتی تھی ۔

وہ مال لینے کے لئے سال میں دو تین مرتبہ بمبئی کا چکر ضرور لگایا کرتے تھے اور آنے سے پہلے باقاعدگی سے مجھے اطلاع دے دیا کرتے تھے ۔ چونکہ میرا قیام بہ سلسلۂ ملازمت بمبئی میں رهتا تھا اس لئے اکثر ملاقاتیں بمبئی ھی میں ہوتی تھیں ۔ ایک مرتبہ میں نے ان کی دعوت کی ۔ اتفاق سے انہیں آنے میں تاخیر ہوگئی ۔ کافی انتظار کے بعد بھی جب وہ نہ آئے تو میں ان کی قیامگاہ پر پہنچا ۔ وهاں ان کا دروازہ مقفل دیکھکر فوراً گھر لوٹ آیا ۔ دیکھا کہ خلیقی صاحب غریب خانہ میں براج رہے ھیں ۔ جب انہیں معلوم ہوا کہ میں ان کے در دولت سے واپس آرہا ہوں تو وہ کھڑے ہوگئے اور گلے لگا کر کہنے لگے : ”تم نے آج مجھے خرید لیا ۔“ پھر بتایا کہ انہیں دیر کیوں ہوگئی تھی ۔

ایک مرتبہ وہ بی-بی اینڈ سی-آئی ریلوے سے بمبئی پہنچے سہ پہر کو میرے پاس دفتر میں تشریف لائے اور کہنے لگے

کہ ''میری پانوں کی ڈبیا ریل کے ڈبہ میں کہیں رہ گئی ہے ۔ ہرچند کہ وہ کم قیمت ہے لیکن اس کے ساتھ بہت سی حسین یادیں اور روایات وابستہ ھیں اور اس لئے وہ مجھے بیحد عزیز ہے ۔ ذرا چلو اس کی تلاش کریں ۔'' چنانچہ ہم دونوں قلابہ اسٹیشن پہنچے ۔ ادھر ادھر پوچھ گچھ کی لیکن کہیں پتہ نہ چلا ۔ آخر تلاش کرتے کرتے ایک صاحب کے پاس گئے ۔ ان کی میز کا خانہ کھلا ہوا تھا اور اس میں خلیقی صاحب کی ڈبیا رکھی ہوئی تھی ۔ اسے دیکھتے ھی انھوں نے چپکے سے کہا کہ ''یہی میری ڈبیا ہے ۔'' میں نے اسے ایکدم اٹھا لیا اور چلتا بنا ۔ وہ صاحب چلاتے رہ گئے ۔ میں نے کہا کہ ''حضرت ، جس چیز کی تلاش تھی وہ مل گئی ہے ۔'' اسٹیشن سے باھر نکلنے پر خلیقی اپنی دلی مسرت کا اظہار کرنے کی غرض سے مجھے ایک ریسٹاران میں لے گئے اور وہاں طرح طرح کی چیزیں کھلوائیں ۔ اس دن وہ بیحد مسرور تھے ۔

ان کے صاحبزادے رشدی آئی ۔ سی ۔ ایس کے امتحان کے لئے منتخب ھو کر لندن بھیجے گئے تھے ۔ کچھ عرصہ بعد ان کے کسی رشتہ دار نے خاندانی عداوت کی بنا پر ان کی عمر کے بارے میں کسی بے قاعدگی کی طرف حکومت کو رپورٹ کردی جس کے نتیجہ میں وہ واپس بلا لئے گئے اور جتنے مصارف اس وقت تک ان پر ہوئے تھے ، وہ سب ان سے وصول کرلئے گئے ۔ خلیقی کو اس واقعہ کا سخت صدمہ تھا اور وہ اسی صدمہ میں گھل گھل کر بیمار پڑ گئے اور راھی دارالبقا ھو گئے ۔

ان کی وفات سے چند ھفتے پیشتر میں رخصت لیکر دھلی گیا اور جب مجھے ان کی علالت کا حال معلوم ھوا تو میں ان کی خدمت میں پہنچا اور بہت دیر تک ان کی کوٹھی رشدی منزل میں ان سے باتیں کرتا رھا ۔ ان کی باتیں نہ تھیں ، پھول تھے جو ان کے منہ سے جھڑ رہے تھے ۔ ایسی شایستہ گفتگو کرنے والے میں

نے دھلی میں بھی بہت کم دیکھے ھیں ۔ باوجود علالت کے ان کی خاطر تواضع میں کوئی فرق نہیں آیا ۔ میرے پوچھنے پر انہوں نے بتایا کہ نیاز فتحپوری بھی مزاج پرسی کے لئے آئے تھے ۔ خلیقی ''یاران نجد'' میں شامل تھے جن کا تذکرہ ''نگار'' کے ابتدائی نمبروں میں ملیگا ۔ وہ درحقیقت ''نگار'' کے معماروں میں سے تھے اور ان کی امداد و اعانت کا واحد مقصد یہ تھا ، (جیسا کہ وہ خود مجھ سے کہا کرتے تھے) کہ نیاز کو آگے بڑھایا جائے ۔ بعد کو باھمی تعلقات میں قدرے تلخی آگئی تھی اور چونکہ مجھے اس تلخی کے اسباب کا علم تھا اس لئے میں نے خصوصیت سے پوچھا تھا کہ آیا نیاز بھی ملاقات کے لئے آئے تھے یا نہیں اور مجھے یہ معلوم کرکے بیحد خوشی ھوئی کہ نیاز لکھنؤ سے دھلی آئے اور اپنے دیرینہ دوست کی عیادت کرنے کی زحمت فرمائی ۔ *

میاں بشیر احمد (ایڈیٹر ھمایوں مرحوم) خلیقی صاحب کے بیحد قدردان تھے ۔ انہوں نے ان کے مضامین کا مجموعہ ''شعرستان'' اپنے ادارہ کی طرف سے عرصہ ھوا ، شائع کیا تھا ۔

خلیقی صاحب کا گھر دھلی کی تہذیب کا مرکز تھا ۔ میں جب جب ان کے یہاں گیا ، یہی اثر لیکر آیا ۔ میں اپنے دوستوں سے کہا کرتا تھا کہ دھلی کا سلیقہ اور دھلی کی شایستگی دیکھنی ھو تو خلیقی صاحب یا سائل صاحب جیسے لوگوں کے گھر جا کر دیکھو ۔ ان کا ذاتی مذاق بھی بہت شستہ تھا ۔ بیٹھنے کا کمرہ اس قدر صاف ستھرا کہ دیکھکر جی خوش ھو جائے ۔ ان کے مکان میں ھر چیز قرینہ سے رکھی ھوئی ملتی تھی ۔ ان کے خیالات میں بھی بیحد توازن تھا ۔ ان کی عملی زندگی باوجود امارت کے بہت پاک و صاف تھی ۔

---

* نیاز فتحپوری ایک خط میں مجھے لکھتے ھیں :۔ ''خلیقی کے انتقال کا جتنا صدمہ مجھے ھوا ہے اس کا اندازہ مشکل ہے ......''

بمبئی میں ان کے کئی دوست تھے جن میں حکیم ابو یوسف اصفہانی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان سے خلیقی کے تعلقات بہت دوستانہ تھے کبھی کبھی وہ بھنڈی بازار میں ان کے مطب کے بالائی کمرہ میں ٹھہر جاتے تھے ۔ ان حکیم صاحب کی ڈاڑھی بہت بڑی ، گھنی اور بے ھنگم تھی۔ ایک دن خلیقی صاحب نے ان سے سوال کیا : ۔ ”حیکم صاحب ، ایک بات پوچھتا ھوں ۔ سچ سچ بتائیےگا۔“ انہوں نے کہا کہ ”پوچھئے۔“ کہنے لگے کہ ”کیا آپ کی بیگم آپ کی ڈاڑھی کو پسند کرتی ھیں؟“ حکیم صاحب نے کھسیانی ھنسی ھنسکر کہا : ”وہ تو نکتہ چینی ھی کرتی رھتی ھیں۔“ پھر سنبھل کر بولے : ۔ ”واقعہ یہ ھے کہ ھماری عورتوں کو ھماری ڈاڑھیاں مطلق پسند نہیں ھیں ۔“ اس کے بعد دیر تک ڈاڑھیوں کی اقسام پر گفتگو ھوتی رھی ۔ خلیقی خود فرینچ کٹ ڈاڑھی رکھتے تھے اور یہ حقیقت ھے کہ وہ ان پر خوب پھبتی تھی ۔ اسی طرح ان کے ایک اور دوست مولوی محمد عرفان (معتمد مالیات ، خلافت کمیٹی) تھے۔ خلیقی جب کبھی بمبئی آتے ، ان دونوں دوستوں سے ملنے کے لئے ضرور جاتے ۔ گرمی ھو ، جاڑا ھو یا برسات ، ان کی اس وضعداری میں کبھی کوئی فرق نہیں آیا۔

ایک دن کسی صاحب نے جبر و اختیار کی بحث چھیڑ دی۔ ایک صاحب نے غالب کی رائے دھرا دی کہ اللہ میاں نے انسان کو اتنا ھی اختیار دیا ھے جتنا انگریزی حکومت نے راجاؤں اور نوابوں کو دے رکھا ھے۔ خلیقی صاحب سے پوچھا گیا کہ آپ بھی تو اپنی رائے بتائیے۔ انہوں نے جواب دیا کہ ”انسان بیک وقت اختیار بھی رکھتا ھےاور جبر کے ماتحت بھی اپنی زندگی بسر کرتا ھے۔“ احباب نے پوچھا : ۔ ”یہ کیسے ؟“ اس پر انہوں نے ایک دوست سے فرمایا کہ ”ذرا کھڑے ھوجاؤ اور ایک ٹانگ اونچی کردو۔“ وہ کھڑے ھو گئے اور ایک ٹانگ

اونچی کردی ۔ پھر فرمایا کہ ''اب دوسری ٹانگ بھی اونچی کردو۔'' وہ دوست کہنے لگے کہ ''یہ کیسے ممکن ہے؟'' اس پر خلیقی صاحب نے کہا :۔ ''بس ، اختیار و جبر کی حدوں کا ڈانڈا یہیں ملتا ہے۔'' اس پر سب ہنس دئے۔

اس کی تھی بات بات میں اک بات

خلیقی بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ ان کی قبل از وقت وفات سے جو خلا دھلی کی سوسائیٹی میں پیدا ھوا وہ بعد از تقسیم کاھے کو پر ھوگا ! دھلی کی وہ سوسائیٹی جس میں خلیقی بلبل ھزار داستان بنکر چہکا کرتے تھے ، اب بالکل سونی پڑی ہے۔

***

مولوی ذکاءاللہ

مولوی صاحب چیلوں کے کوچہ میں رہا کرتے تھے۔ اسی محلہ میں ''کامریڈ'' و ''ہمدرد'' کا دفتر تھا اور اسی کے بالمقابل مولوی صاحب کی کوٹھی تھی۔ مولوی صاحب کے چار بیٹے تھے : سب سے بڑے عطاءاللہ تھے جو اس پریس کے منتظم تھے جہاں مولوی صاحب کی کتابیں چھپتی تھیں۔ دوسرے عنایت‌اللہ تھے جو اپنے باپ کی طرح متعدد کتابوں کے مصنف، مولف اور مترجم تھے اور جن کا شاہ‌کار ''پریچنگ آف اسلام'' کا ترجمہ ''دعوت اسلام'' ھے جسے سر سید کے ایما سے اردو کا جامہ پہنایا گیا تھا۔ تیسرے رضاءاللہ تھے جو بہاولپور میں انجینیر کے عہدہ پر فائز تھے اور جن کی ریاضی دانی کی دور دور تک دھوم تھی۔ سب سے چھوٹے فرحت‌اللہ تھے۔ اب یہ چاروں اللہ کو پیارے ھوچکے ھیں۔

میری طالب علمی کا واقعہ ھے کہ ایک دن فرحت‌اللہ گورنمنٹ ھائی اسکول کے کھیل کے میدان میں میچ دیکھنے کے لئے آ نکلے۔ اتفاق ایسا ھوا کہ کسی بات پر لڑکوں میں ھاتھا پائی ھوگئی اور چونکہ فرحت‌اللہ اس گڑبڑ کے بانی مبانی خیال کئے جاتے تھے اس لئے یوروپین ھیڈ ماسٹر واؤٹرز نے انہیں حوالۂ پولیس کردیا۔ اس زمانہ میں کشمیری دروازہ کا علاقہ کوتوالی کے ماتحت تھا اور کوتوال شہر سیندھے خاں تھے جو بڑے ٹھاٹھ کے افسر تھے۔ جب فرحت‌اللہ ان کے سامنے پیش ھوئے تو انہوں نے سب سے پہلے ان کے والد کا نام پوچھا۔ انہوں نے کہا : ''مولوی ذکاءاللہ۔'' یہ سنتے ھی وہ سرو قد کھڑے ھوگئے اور ان کی دیکھا دیکھی باقی تمام افسر بھی جو وھاں موجود تھے

اور جن میں کچھ یورپین بھی تھے، کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے فرحت اللہ کو کرسی پیش کی اور پوچھ گچھ کئے بغیر ایک سپاہی کی معیت میں انہیں گھر پہنچادیا اور گاڑی کا کرایہ بھی اپنی جیب سے ادا کیا۔ اس واقعہ سے محض یہ بتانا مقصود ھے کہ مولوی صاحب شہر میں کس احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

ان کی آخری بیماری کے زمانہ میں میں تقریباً روزانہ عیادت کے لئے ان کے یہاں حاضری دیا کرتا تھا، اور پھر اینڈریوز صاحب کو ان کا حال کہہ سناتا تھا۔ وہ بھی فرصت کے اوقات میں آتے اور گھنٹوں مولوی صاحب کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے تھے۔ مولوی صاحب کا قاعدہ تھا کہ جب تک ان کے ھاتھ میں طاقت رھی وہ اپنی روز کی کیفیت ایک کاغذ پر لکھ لیتے اور جو لوگ عیادت کے لئے جاتے ان کے سامنے اسے رکھ دیتے۔ البتہ بیماری کے آخری ایام میں یہ سلسلہ ٹوٹ گیا تھا۔ غیر ضروری سوالات سے بچنے کے لئے انہوں نے یہ ترکیب نکالی تھی۔

میں چونکہ مولوی صاحب کی کوٹھی کے قریب رھا کرتا تھا اس لئے اینڈریوز صاحب نے میرے ذمہ یہ ڈیوٹی لگا دی تھی کہ ان کا حال دریافت کرتا ھوا کالج پہنچا کروں۔ مولوی صاحب کی وفات کی خبر بھی میں نے ھی اینڈریوز صاحب کو دی تھی۔ اس واقعہ کا ذکر انہوں نے اپنی کتاب ''ذکاءاللہ آف دھلی'' میں کیا ھے۔ اس میں صراحت کے ساتھ میرا نام درج نہیں ھے بلکہ صرف اتنا لکھا ھے کہ ''میرے ایک مسلمان شاگرد نے مجھے ان کی وفات کی خبر دی تھی۔'' مولوی صاحب نے اپنی تمام تصانیف کی ایک ایک کاپی اینڈریوز صاحب کو تحفتاً دی تھی۔

اینڈریوز جب آتے تو مولوی صاحب سے مصروف گفتگو ھوجاتے۔ وہ ان گفتگوؤں کی یاد داشتیں لکھتے جاتے تھے۔ چنانچہ انتقال سے کچھ ھی دیر پہلے جو آخری الفاظ ان کی زبان سے ادا

ہوئے وہ تھے ''بیٹا، بیٹا۔'' یہ محبت کا لفظ تھا جسے وہ تندرستی اور بیماری میں اپنے بیٹوں کو پکارتے وقت استعمال کیا کرتے تھے۔ چنانچہ انتقال کے بعد فرحت اللہ نے مجھ سے کہا کہ ''ذرا خیال رکھنا، یہ حضرت ٹھہرے پادری۔ ایسا نہ ہو، بیٹے سے حضرت عیسیٰ مراد لے لیں۔'' میں نے کہا: ''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟'' بہرحال جب ان کی کتاب شائع ہوئی تو میرے خیال کی تصدیق ہو گئی اور فرحت اللہ کا اندیشہ سراسر غلط نکلا۔

زمانۂ طالب علمی میں ہم محلہ ہونے کی وجہ سے مجھے روزانہ ایک دو دفعہ مولوی صاحب کو سلام کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ شروع شروع میں انہوں نے پوچھ لیا تھا کہ ''تم کن کے بیٹے ہو''؟ اور بس۔ میرے والد سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے۔ ایک دو دفعہ یہ بھی پوچھ لیا کہ ''کہاں پڑھتے ہو اور کونسی جماعت میں ہو؟'' جب انہیں معلوم ہوا کہ میں اینڈریوز صاحب کا شاگرد ہوں تو وہ بیحد خوش ہوئے۔

مولوی صاحب ساری عمر بیمار نہیں پڑے۔ جس بیماری میں بالآخر ان کا انتقال ہوا وہ ان کی پہلی اور آخری تھی۔ بیماری سے پیشتر ان کے ایک ہم جماعت خواجہ الطاف حسین حالی ان سے ملنے کے لئے پانی پت سے دہلی تشریف لائے۔ یہ ان دو دوستوں کی آخری ملاقات تھی۔ کئی دن تک اس ملاقات کا چرچا محلہ میں ہوتا رہا۔

ایک مرتبہ مولوی صاحب کے پرانے مکان میں مرمت ہو رہی تھی۔ ان دنوں وہ ناشتہ کے لئے ہر صبح دوسرے مکان میں جایا کرتے تھے۔ راستہ میں سرسید احمد خاں کے صاحبزادے سید حامد کا مکان پڑتا تھا جو ان کے گہرے دوست تھے۔ ایک دن صبح کو انہیں یہ دیکھکر ہنسی آگئی کہ سید حامد ہاتھ میں گھڑی لئے کھڑے ہیں۔ وہ رک گئے اور پوچھا کہ ''کیا کر رہے ہو؟'' سید حامد نے جواب دیا کہ ''رات کو میری گھڑی

بند ہوگئی تھی اور اب اسے آپ کی چہل قدمی کے وقت سے
ملا کر ٹھیک کر رہا ہوں۔" مولوی صاحب نے مسکراتے ہوئے
جواب دیا: "اچھا تو آپ مجھے گھڑی کے طور پر استعمال
کر رہے ہیں۔ اس پر دونوں کھل کھلا کر ہنس دئے۔ مولوی
صاحب انضباط اوقات کے بیحد پابند تھے۔

مولوی صاحب سر سید احمد خاں کے دست راست تھے۔ طلبا
کے لئے انہوں نے ریاضی اور سائنس کی بہت سی کتابیں لکھیں۔
ان کی "تاریخ ہند" بھی بہت مشہور ہے۔ یہ آٹھ ضخیم جلدوں
میں ہے۔ مولوی صاحب لکھنے کا کام ہر روز صبح کے وقت
باقاعدگی سے انجام دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت بند ہوا
جب وہ بالکل صاحب فراش ہوگئے۔ اپنی علالت سے کچھ
دن پہلے انہوں نے رسالہ "نظام المشائخ" کے لئے بھی چند
مضامین لکھے تھے۔ ان میں سے ایک کا عنوان تھا: "معاش
و معاد" جو بہت پسند کیا گیا تھا۔

مولوی صاحب کے ایک دوسرے ہم جماعت مولوی نذیر
احمد فرمایا کرتے تھے کہ "مولوی صاحب نے اتنی کتابیں
لکھی ہیں کہ اگر وہ اوپر نیچے رکھدی جائیں تو اوسط قد کے
انسان سے اونچی نکل جائینگی۔"

ان کا ایک ملازم منیر خاں تھا۔ اس نے مولوی صاحب
کی آخری اور طویل بیماری میں جس محبت اور دل سوزی سے
خدمت کی اس کی یاد آج تک میرے دماغ میں محفوظ ہے۔ کوئی
بیٹا بھی اپنے باپ کی اتنی خدمت نہ کریگا جتنی اس ملازم نے
کی۔ چند سال ہوئے اس غریب کا بھی انتقال ہوگیا ہے۔ راقم
الحروف نے ایسا وفادار، ایماندار اور خدمت گزار ملازم آج تک
نہیں دیکھا۔ مولوی صاحب اور ان کے صاحبزادے بھی ان سے
ایسا برتاؤ کرتے تھے گویا کہ وہ گھر کا کوئی فرد ہے۔ جب
میں نے اس سے کہا کہ میں تمہارا ذکر اپنی کتاب میں کرونگا

تو وہ بہت خوش ہوا۔ خدا اس کی خدمتوں کو قبول کرے!

عطاءُ اللہ کو چھوڑ کر میرے ذاتی تعلقات باقی سب بھائیوں سے تھے اور چونکہ میں نے اینڈریوز کی کتاب ''ذکاءُ اللہ آف دہلی،، کا اردو میں ترجمہ کیا تھا اس لئے تینوں بھائی مجھ سے بیحد محبت اور اخلاص سے پیش آتے تھے اور بالکل عزیزانہ برتاؤ کرتے تھے۔

مولوی صاحب جس تہذیب کے نمایندہ تھے وہ اب ختم ہوچکی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان جیسے آدمی اب پیدا نہیں ہوتے۔

ان کا انتقال تقریباً ۸۰ برس کی عمر میں دہلی میں ہوا اور وہیں وہ سپرد خاک کئے گئے۔

***

خواجہ الطاف حسین حالی

خواجه الطاف حسین حالی سے میرے والد منشی محمدالدین کے بہت دیرینہ روابط تھے - گھر میں بھی وہ جب کبھی ان کا ذکر کرتے تو بیحد احترام سے ان کا نام لیتے - مجھے ان تعلقات کا علم تھا اور اس لئے جب مجھے معلوم ھوا کہ خواجہ صاحب دھلی میں تشریف فرما ھیں تو میں ان کی خدمت میں پہنچا - اس وقت میں بی - اے کا امتحان پاس کرچکا تھا - جس پرخلوص محبت اور بزرگانہ شفقت کا اظہار انہوں نے پہلی ھی ملاقات میں فرمایا وہ آج تک میرے دل پر نقش ھے - دوران گفتگو میں انہوں نے مجھ سے بہت سی باتیں پوچھیں، مثلاً یہ کہ کالج میں مضامین کیا تھے ، تمہارا رحجان طبع کس طرف ھے؟ اب کیا کرنے کا ارادہ ھے؟ تمہارے پروفیسر کون کون ھیں؟ وغیرہ وغیرہ - انہوں نے چند انگریزی شعرا کے بارے میں بھی ایک دو سوالات کئے تھے اور جب میں نے تشفی بخش جوابات دیدئے تو وہ بہت خوش ھوئے - باتوں باتوں میں میں نے عرض کیا کہ جس طرح دنیائے اردو میں تین زبردست شاعر بیک وقت موجود ھیں، ایک معمر، ایک ادھیڑ اور ایک جوان، یعنی حالی، اکبر اور اقبال ، بعینہ اسی قسم کا ایک دور انگریزی ادب پر بھی گزرا ھے جب کہ تین بڑے نامور شاعر شیکسپیئر ، ملٹن اور ڈرائیڈن ایک ھی وقت میں موجود تھے - خواجہ صاحب اس تقابل سے بیحد محظوظ ھوئے - میں دو تین مرتبہ اور ان کی خدمت میں حاضر ھوا اور ھر دفعہ ان کی بے پایاں شفقت کا اثر لیکر آیا - پانی پت پہنچ کر انہوں نے ذیل کا گرامی نامہ والد کو تحریر فرمایا :-

"مکرمی منشی صاحب۔۔۔۔ الحمد للہ ثم الحمد للہ کہ ضیاالدین احمد صاحب بی۔ اے کے امتحان میں پاس ہو گئے۔ وہ دو تین دفعہ مجھ سے دھلی میں ملے ھیں، نہایت لائق اور ھونہار جوان ھیں۔ اب ان کو ایسا پیشہ سکھانا چاھئے جس سے ان کی طبیعت کو زیادہ مناسبت اور جس کام کی ان میں کافی قابلیت ھو۔ اور اس کا فیصلہ وہ خود کرسکتے ھیں۔ ان کی طبیعت کا میلان خود ان کا رھنما ھوگا۔ مجھے ضرور مطلع کیجئیگا کہ وہ منجملہ لا، انجینیرنگ، میڈیسن وغیرہ کے کونسا پیشہ اختیار کرنے کی طرف راغب ھیں۔۔۔۔ والسلام مع الاکرام۔

خاکسار الطاف حسین حالی

از پانی پت۔ ۳۔ اگست ۱۹۱۳"

دیکھنے کی چیز یہ ھے کہ ان کی نظر کس قدر گہری ھے۔ وہ یہ نہیں فرماتے کہ اسے ایسے پیشہ میں لگائیے جس میں تنخواہ یا یافت زیادہ ھو، بلکہ فرماتے ھیں تو یہ کہ جس کام سے زیادہ مناسبت ھو اسے اسی میں لگائیے۔ اس سے زیادہ صحت بخش اصول اور کوئی نہیں ھوسکتا۔ دنیا میں وھی لوگ اپنے پیشہ میں چمک سکتے ھیں جو اپنی افتاد طبیعت اور قابلیت کو رھنما بنا کر زندگی بسر کرنا چاھتے ھیں:۔

ھر کسے را بھر کارے ساختند

میں جہاں اس بات پر فخر محسوس کرتا ھوں کہ مجھے خواجہ صاحب سے شرف نیاز حاصل ھوا وھاں اپنی اس خوش‌قسمتی پر بھی نازاں ھوں کہ ان کے لافانی مکاتیب میں مجھے بھی ذرا سی جگہ مل گئی۔ میں متعدد بڑے آدمیوں سے ملا ھوں لیکن شرافت، انسانیت، اور روح وسیرت کی پاکیزگی کی جو بلندی میں نے خواجہ صاحب میں دیکھی وہ مجھے اور کسی میں نظر نہیں آئی۔

ڈاکٹر مختار احمد انصاری

راقم الحروف مولانا محمد علی کے اخبار ''ہمدرد'' سے ۱۹۱۲ سے ۱۹۱۴ تک وابستہ رہا۔ یہ اس اخبار کا اولین دور تھا۔ اس زمانہ میں جن چوٹی کے لیڈروں سے میری ملاقات ہوئی ان میں ڈاکٹر انصاری خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ڈاکٹر صاحب لقمان الملک حکیم عبدالوہاب انصاری عرف حکیم نابینا کے چھوٹے بھائی تھے۔ انہوں نے غالباً ۱۹۱۰ میں ایڈنبرا سے ایم۔ڈی کی وقیع ڈگری لی اور اس کے بعد وہ لندن کے ایک مشہور و معروف ہسپتال (چیئرنگ کراس ہاسپٹل) میں ریزیڈنٹ سرجن مقرر کردئے گئے۔ یہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جو اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے۔ بعض انگریز ڈاکٹر اس تقرری کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ اس قسم کی آسامیاں ہمیشہ نوجوان برطانوی ڈاکٹروں سے پر کیجایا کریں۔ کچھ اخبارات بھی ان کے ہمنوا ہوگئے۔ چنانچہ ان کے تقرر کے بعد ہی شام کے ایک اخبار نے ''برطانوی ڈاکٹروں کے ساتھ شدید بے انصافی'' (Grave Injustice to British Doctors) کے عنوان سے ایک اداریہ لکھا۔ اس واقعہ کے ایک دو دن کے بعد چیئرنگ کراس ہاسپٹل کی گورننگ کونسل کے چیئرمین نے اداریہ کے جواب میں ذیل کا سرکاری بیان شائع کرایا:—

> ''ڈاکٹر انصاری کا تقرر محض قابلیت کی بنا پر کیا گیا ہے اور برطانوی ہسپتالوں کے لئے یہ امر نہایت افسوسناک ہوگا اگر قابلیت کے معیار کے سوائے کوئی اور معیار پیش نظر رکھا گیا۔''

ڈاکٹر انصاری ہسپتال کے مریضوں اور ڈاکٹروں میں بیحد

ہردلعزیز تھے اور جب وہ واپس ہندوستان پہنچے تو ان کی نیکنامی اور شہرت بھی ان کے ساتھ ساتھ آئی۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جب تک وہ زندہ رہے ہمیشہ نیکنام رہے۔ ان کی زندگی کا مقصد پبلک کی خدمت تھی نہ کہ محض روپیہ بٹورنا۔ اگر وہ روپیہ کمانا چاہتے تو وہ بے اندازہ دولت جمع کرسکتے تھے، مگر انہوں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے جنگ بلقان میں میڈیکل مشن کے سربراہ کی حیثیت سے جو شاندار خدمات انجام دیں اس نے نہ صرف ان کی شہرت میں چار چاند لگادئے بلکہ ہندوستان اور ٹرکی کو قریب سے قریب تر کردیا۔ یہ انسانی خدمت ان کی زندگی کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ غازی انور پاشا اس مشن کی کارکردگی اور بے لوث انسانی خدمت سے بیحد متاثر تھے۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کی یہ ادا بیحد پسند تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں اور قومی کارکنوں سے فیس نہیں لیا کرتے تھے۔ میرے دیکھے کی بات ہے کہ ایک مرتبہ خواجہ حسن نظامی بیمار پڑگئے۔ جب تک وہ علیل رہے ڈاکٹر صاحب نہایت پابندی سے انہیں دیکھنے کے لئے درگاہ نظام‌الدین اولیا جایا کرتے تھے اور ایک پیسہ فیس کا نہیں لیتے تھے حالانکہ انہوں نے شہر سے باہر جانے کی فیس ۳۲ روپے مقرر کر رکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ اپنے احباب اور قومی اکابر کا علاج کرتے وقت انہوں نے اپنی پیشہ‌ورانہ حیثیت کا کبھی خیال نہیں رکھا۔

ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب نے اینڈریوز صاحب کے اعزاز میں اپنے دولت کدہ ”بہشت“ واقع کشمیری دروازہ میں ٹی پارٹی دی۔ ان دنوں جنوبی افریقہ کے مقیم ہندوستانیوں کی زبوں حالت کا مسئلہ بہت نازک صورت اختیار کرچکا تھا۔ وہاں اینڈریوز نے اسی موضوع پر تقریر کی اور اہل ہندوستان سے درخواست کی کہ وہ ہر ممکن طریقہ سے اپنے بھائیوں کی امداد کریں۔ ان کے

بعد مولانا محمد علی نے تقریر کی ۔ اس موقع پر مولانا انگرکھا اور پگڑی اور چوڑی دار پاجامہ زیب تن کئے ہوئے تھے ۔ اس ٹھیٹھ ہندوستانی لباس میں ان کی انگریزی تقریر بہت بھلی معلوم ہو رہی تھی ۔ مشن کالج کے متعدد اساتذہ اور دوسرے اکابر بھی شریک پارٹی تھے ۔ راقم الحروف مولانا محمد علی کی معیت میں ڈاکٹر انصاری کے یہاں پہنچا تھا ۔

۱۹۱۷ میں جب ڈاکٹر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں نے انگریزی میں مولانا محمد علی کی لائف لکھی ہے تو انہوں نے مجھے بلوا بھیجا تاکہ اس کتاب کے بارے میں بات چیت کریں ۔ ان دنوں گرفتار یا نظر بند لیڈروں کے حالات کے بارے میں کتابوں کی بہت مانگ تھی ۔ لیکن وہاں چند آدمی اور بھی تھے جن کی گفتگو سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری کتاب چھاپنے کے حق میں نہیں ہیں ۔ ان کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب بھی کچھ مذبذب ہو گئے ۔ اس خیال سے کہ کتاب جلد سے جلد پبلک کے ہاتھوں میں پہنچ جائے ، میں نے مدارس کی فرم گنیش اینڈ کمپنی سے معاملہ کرلیا ۔ بالآخر وہ کتاب ۱۹۱۸ کے وسط میں شائع ہو گئی ۔ اشاعت کے بعد ڈاکٹر صاحب اور ان کے دوستوں کو افسوس ہوا کہ یہ کتاب ان کے قائم کردہ ادارہ کی زیر سرپرستی کیوں نہ شائع کی گئی ۔

ڈاکٹر صاحب بہت دوست نواز آدمی تھے اور انہوں نے اپنے متعدد ملنے والوں کو مختلف ریاستوں میں اچھے عہدوں پر فائز کرا دیا تھا ۔ ان کا مکان قومی کارکنوں کے لئے مستقل مہمان خانہ کی حیثیت رکھتا تھا ۔

''ہمدرد'' سے علیحدگی کے کچھ عرصہ بعد میں ۱۹۱۵ میں کانپور چلا گیا اور پھر وہاں سے بمبئی اور اس لئے قدرتاً ڈاکٹر صاحب سے ملنے کے مواقع مجھے بہت کم میسر آئے ۔ لیکن میری جتنی بھی یادیں ان کی ذات گرامی سے وابستہ ہیں وہ

سب جذبۂ احترام پر مبنی ہیں۔

جب ۱۹۱۵ کی ابتدا میں علی برادران نظر بند کئے گئے تو اس وقت دھلی والوں پر خوف و ہراس اس درجہ طاری تھا کہ حکومت کے اس اقدام کے خلاف مدت تک کوئی احتجاجی جلسہ بھی منعقد نہ ہوسکا۔ آخر خدا خدا کرکے ایک صاحب کے گھر میں جلسہ ہوا جس کی صدارت ڈاکٹر انصاری نے کی۔ جلسہ میں گنتی کے آدمی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مناسب الفاظ میں حکومت کے اس اقدام کی مذمت کی اور دونوں بھائیوں کی فوری رہائی کا مطالبہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب مرتے دم تک کانگریسی رہے حالانکہ علی برادران کانگریس سے علیحدہ ہوچکے تھے۔ اس کے باوجود ڈاکٹر انصاری اور علی برادران میں دوستی قائم رہی اگرچہ یہ بھی حقیقت ھے کہ نہرو رپورٹ کی وجہ سے تعلقات میں قدرے تلخی آگئی تھی۔

ڈاکٹر انصاری برصغیر ہند و پاکستان کے پہلے ڈاکٹر ہیں جن کی حذاقت کے انگریز بھی قائل تھے۔

***

مولوی نذیر احمد

مولوی حافظ نذیر احمد بجنور کے رہنے والے تھے۔ زمانہ طالب علمی ہی میں دہلی آ گئے تھے۔ چنانچہ اسی تعلق کی بنا پر وہ اپنے آپ کو ''محمد نذیر احمد بجنوری ثم الدہلوی'' لکھا کرتے تھے۔

میرے والد منشی محمدالدین سے ان کے خصوصی تعلقات تھے۔ ان تعلقات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ مولوی صاحب میرے والد کے اخبار ''دارالعلوم'' میں باقاعدگی سے مضامین لکھا کرتے تھے۔ یہ ہفتہ وار اخبار ۱۹۰۱ میں جاری ہوا تھا اور اس میں مرزا حیرت (ایڈیٹر ''کرزن گزٹ'') کے مضامین کی تردید چھپا کرتی تھی۔ یہ تردیدی مضامین خود مولوی صاحب تحریر فرمایا کرتے تھے اور پبلک میں بڑے شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ مگر ان پر مولوی صاحب کا نام نہ ہوتا تھا۔

۱۹۰۴ میں لاہور میں انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں والد نے مجھے مولوی صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔ اس وقت مولوی صاحب نے اپنا دست شفقت میرے سر پر رکھا اور مجھے پیار کیا۔ ان کا قاعدہ تھا کہ انجمن کے جلسہ میں جب جب تشریف لے جاتے وہاں لکچر دینے کے علاوہ ایک ہزار روپیہ بطور عطیہ اپنی جیب سے دیتے۔ اس سال بھی مولوی صاحب نے یہ رقم دی تھی۔ انجمن میں لکچر دینا اس وقت بند ہوا جب وہ صاحب فراموش ہو گئے۔

۱۹۰۸ میں میں نے سینٹ اسٹیفنز کالج میں داخلہ لیا۔ استاذی اینڈریوز سے ابتدا ہی سے میرے مراسم قائم ہو گئے تھے اور وہ مجھے کبھی کبھار مولوی صاحب کی خدمت میں بھیجا کرتے

تھے یہ اطلاع دینے کے لئے کہ میں فلاں وقت آؤنگا یا فلاں وقت نہیں آؤنگا۔ اس کے بعد سے میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں باقاعدہ آنا جانا شروع کردیا ۔ ایک دن جب میں پہنچا تو دیکھا کہ وہ تہبند باندھے چارپائی پر لیٹے ھیں۔ میں نے پوچھا کہ ''آپ کا مزاج کیسا ھے ؟'' فرمایا : ''مجھے لمبیگو (lumbago) ھوگیا ھے۔'' چونکہ مجھے معلوم نہ تھا کہ لمبیگو کس بیماری کا نام ھے ، اس لئے انہوں نے میرے چہرے کی پریشانی سے بھانپ لیا کہ مجھے اس لفظ کے معنی معلوم نہیں ھیں اور پھر خود ھی اس کے معنی بتائے اور تشریح کرکے بتایا کہ یہ بیماری کیوں کر ھوتی ھے اور اس کا علاج کیا ھے ۔ اس وقت مجھے ایسا معلوم ھوا کہ ایک پروفیسر ھے جو مرض کے اسباب و علل پر اپنے طلبا کے سامنے کالج کے کلاس روم میں لکچر دے رہا ھے۔

تقریباً اسی زمانہ میں ''امہات الامہ'' دھلی میں جلائی گئی۔ یہ کتاب پادری احمد شاہ کی کتاب ''امہات المومنین'' کے جواب میں لکھی گئی تھی ۔ باعتبار موضوع یہ عجیب و غریب کتاب ھے اور اس میں بعض بحثیں ایسی آگئی ھیں جو مروجہ کتب میں نہیں ملتیں ۔ اس وقت تو یہ کتاب دیکھنے میں نہیں آئی تھی ۔ لیکن چند سال ھوئے مجھے اس کے دوسرے ایڈیشن کے مطالعہ کا اتفاق ھوا ۔ سوائے چند آزاد جملوں کے باقی کتاب ھرگز قابل اعتراض نہیں ٹھہرائی جاسکتی ۔ یہ کتاب بڑی تحقیق سے لکھی گئی ھے اور ھمارے مذھبی لٹریچر میں نمایاں اضافہ کی حیثیت رکھتی ھے ۔ میں نے مولوی صاحب سے براہ راست اس موضوع پر کبھی گفتگو نہیں کی اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں ان کے سامنے سہما سہما سا رہتا تھا ۔ لیکن اپنے تجربہ کی بنا پر اتنا کہ سکتا ھوں کہ انہیں رسول اقدس (ص) سے والہانہ محبت تھی ، ایسی محبت جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا ۔ رسول اللہ (ص)

کا نام آتے ھی ڈاکٹر اقبال کی طرح ان کی آنکھوں سے آنسو رواں ھو جاتے تھے۔

ایک دن تثلیث کے مسئلہ پر بحث ھو رھی تھی۔ انہوں نے فرمایا: ''میں نے تمہارے اینڈریوز سے کئی مرتبہ تثلیث کا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کی لیکن وہ سجھے نہ سمجھا سکے۔ عیسائیوں نے جس طریقہ سے خدا کے تین ٹکڑے کردئے ھیں، وہ انسانی فہم سے بالاتر ھے۔'' مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ''یہ سب کچھ پولوس کا کیا دھرا ھے جس نے بظاھر عیسائی بنکر مسیح کی تعلیم کو اندر سے کھوکھلا کردیا اور اس میں نئی نئی چیزیں داخل کردیں تاکہ نہ یہودیت باقی رھے نہ نصرانیت۔''

مولوی صاحب ''سیلف میڈ'' آدمی تھے۔ انہوں نے جس طریقہ سے اسلام کی خدمت کی وہ انہی کا حصہ تھا۔ انہوں نے قرآن کا ٹھیٹھ دھلی کی زبان میں ترجمہ کیا جو بیحد مقبول ھوا۔ قران کی صحت کے لئے جو جو انتظامات انہوں نے کئے وہ ایسے ھیں کہ ھر شخص انہیں سر انجام نہیں دے سکتا۔ ان کے شریک کار حافظ محمد رحیم بخش اور مولوی محمد بھی تھے۔ مولوی صاحب نے کئی جگہ ان کی تعریف کی ھے۔ مولوی صاحب کا ترجمہ انگریزی داں طبقہ میں خصوصیت کے ساتھ مقبول ھوا۔ مولانا محمد علی تک اس کے معترف تھے اگرچہ انہوں نے لکھا ھے کہ بعض مقامات پر مولوی صاحب نے محاورہ کی خاطر قرآنی شکوہ کو قربان کردیا ھے۔

مولوی صاحب کی طبعیت کی اپچ کا اندازہ ان کتابوں سے کیا جاسکتا ھے جو انہوں نے وقتاً فوقتاً شائع کیں۔ ''ادعیۃ القرآن،، کو لیجئے۔ یہ قرآنی دعاؤں کا مجموعہ ھے۔ اس کتاب کی اشاعت سے پہلے کسی ناشر یا عالم کے دل میں یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ ان قرآنی دعاؤں کو یکجا کرے۔ مولوی صاحب نے ان دعاؤں کو اپنے حواشی کے ساتھ شائع کیا جس کی وجہ سے

کتاب کی افادیت بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ دعائیں وہ ہیں جو مختلف پیغمبر حضرت آدم سے لیکر آنحضرت (ص) تک باری تعالیٰ کی جناب میں مانگتے چلے آئے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے قرآن و احادیث سے اسلامی تعلیمات کو ''الحقوق و الفرائض'' کے نام سے تین جلدوں میں شائع کیا۔ یہ اپنے رنگ میں منفرد ہے، اگرچہ اسی قبیل کی اور کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔

ایک دن مولوی صاحب سے مذہب کی غرض و غایت پر گفتگو ہو رہی تھی۔ انہوں نے فرمایا کہ ''ہر مذہب نے نیکی پر زور دیا ہے لیکن اسلام نے جس انداز میں دنیا کو نیکی کا مفہوم سمجھایا ہے وہ عین فطرت کے مطابق ہے۔'' مولوی صاحب مسیح کی مفروضہ تعلیم کو ''غیر عملی'' اور ''خلاف فطرت انسانی'' کہا کرتے تھے۔

ایک دن استاذی اینڈریوز نے مولوی صاحب سے پوچھا کہ ''پرانے دور کے طالب علم زیادہ قابل ہوتے تھے یا آج کل کے؟'' مولوی صاحب نے بلا تامل فرمایا: ''پرانے دور کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔ انگریزی تعلیم کے کسی دور میں ادیبوں کا، مفکروں کا، شاعروں کا، فاضلوں کا ایسا جمگھٹا نظر نہیں آتا جیسا کہ غدر سے پیشتر نظر آتا تھا۔ جدید انگریزی تعلیم نے ذکاءاللہ، محمد حسین آزاد، ماسٹر رام چندر، الطاف حسین حالی کا ثانی پیدا نہیں کیا۔'' خود مولوی نذیر احمد کا ثانی بھی آج تک پیدا نہیں ہوا۔

مولوی صاحب میں تعصب نام کو نہ تھا۔ انہوں نے ایک نہایت قابل عیسائی (جوئل واعظ لال) کو از ابتدا تا انتہا عربی پڑھائی تھی اور وہ اس میں مولوی فاضل ہو گئے تھے۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ ''آپ عیسائیوں کو عربی کیوں پڑھاتے ہیں؟'' فرمانے لگے: — ''عربی پڑھکر وہ اسلام کو بہتر طریقہ پر سمجھ سکینگے۔ اپنی نادانی اور جہل کی وجہ سے جو اعتراضات وہ اسلام

پر کرتے ہیں ، پھر کبھی نہیں کرسکینگے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایسا زمانہ آجائے جب کہ وہ اسلام ہی کے مبلغ بنجائیں۔''
یہ مولوی صاحب کی وسیع المشربی تھی کہ ان کے شاگردوں میں متعدد غیر مسلموں کے نام نظر آتے ہیں۔

ان کے زمانہ میں ایک صاحب تھے محرم علی چشتی ۔ وہ ''رفیق ہند'' (لاہور) کے ایڈیٹر تھے اور مختلف اشخاص پر بے دھڑک چھینٹے اڑانے کے عادی تھے ۔ انہوں نے اپنے اخبار میں مولوی صاحب کے بارے میں بھی چند ''ناملائم فقرے'' لکھے تھے جس کے نتیجہ میں انہوں نے ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کردیا ۔ اس مقدمہ میں چشتی صاحب کو منہ کی کھانی پڑی اور انہوں نے عدالت کے حکم مورخہ ۱۹ جون ۱۸۹۳ کے تحت نہایت سودبانہ الفاظ میں معافی نامہ لکھا جو مختلف اخبارات میں بھی شائع ہوا ۔ چشتی صاحب کے بارے میں عام خیال یہ تھا کہ قلمی جنگ میں ان سے کوئی نہیں جیت سکتا ۔ مولوی صاحب کی سیر چشمی دیکھئے کہ انہوں نے مقدمہ کا خرچہ بھی معاف کردیا ۔

مولوی صاحب کی کتابیں بالعموم ''افضل المطابع'' (حویلی اعظم خاں) اور ''مطبع انصاری'' (چتلا دروازہ) میں چھپتی تھیں۔ ان کے ناشر شیخ نذیر حسین تھے* جن کی دکان دریبۂ کلاں

---

* شیخ نذیر حسین کو مولوی صاحب نے ان الفاظ میں اپنی کتابیں فروخت کرنے کی اجازت دی تھی :۔ ''میں نے اپنی تمام کتابیں ترمیم اور نظرثانی کے بعد از سر نو رجسٹری کراکے بسعی مولوی تلطف حسین صاحب مطبع انصاری دہلی میں چھپوانی شروع کردی ہیں اور مولوی تلطف حسین صاحب نے نذیر حسین تاجر کتب سے میری رائے کے موافق خاص طور پر معاہدہ کرلیا ہے ۔ کوئی شخص کسے باشد کسی حیلے سے میری کتابوں کے چھاپنے چھپوانے کا قصد نہ کرے ورنہ خسارۃ و تاوان دونوں بھگتنے پڑینگے اور جس شخص کو کتابوں کا لین دین کرنا ہو محمد نذیر حسین تاجر کتب دہلی دریبۂ کلاں سے کرے ۔ العبد محمد نذیر احمد ۔''

میں تھی ۔ مولوی صاحب کبھی کبھار پھرتے پھراتے سہ پہر کو
ان کی دکان پر جا بیٹھتے تھے ۔ ایک دن ان کی موجودگی میں کوئی
خریدار آگیا اور اس نے کہا کہ ''اب نے الو۔قت دیدیجئے ۔''
شیخ صاحب نے بے سوچے سمجھے کہدیا کہ یہ کتاب موجود
نہیں ہے۔ اس پر مولوی صاحب نے چپکے سے فرمایا :— ''میاں ،
وہ ابن الوقت مانگ رہا ہے ۔'' اس پر شیخ صاحب نے اس
شخص کو زور سے آواز دے کر بلایا اور کہا :— ''میاں ،
اب نے الو۔قت نکل آئی ہے ، آکے لے لیجئے ۔'' یہ نظارہ دیکھ کر
بازار کے دوسرے تاجران کتب ھنس رہے تھے ۔ جب خریدار
کتاب لے چکا تو مولوی صاحب نے اس سے بآھستگی فرمایا :—
''میاں ، کتاب کا نام اب نے الو۔قت نہیں ہے، ابن الوقت ہے ۔''

مولوی صاحب کی زندگی بہت سادہ تھی ۔ ان کی ذاتی ضرورتیں
بھی بہت محدود تھیں ۔ اپنی ذات پر وہ صرف چند روپے ماھانہ
صرف کرتے تھے ۔

مولوی صاحب کو ان کی علمی خدمات کے صلہ میں ایڈنبرا
یونیورسٹی کی طرف سے ایل ایل ۔ ڈی کی ڈگری دی گئی تھی ۔
اس میں اینڈریوز کی کوششوں کو دخل تھا جو مولوی صاحب
کے بیحد عقیدت مند تھے ۔ ڈگری دھلی بھیجی گئی تھی ۔
یونیورسٹی کے چانسلر نے ڈگری کے ساتھ ایک خط بھی بھیجا
تھا جس میں لکھا تھا کہ ''ڈگری سے مولوی صاحب کی
عزت افزائی نہیں ھوئی بلکہ خود ڈگری کی عزت افزائی ھوئی ہے ۔''

مولوی صاحب کا انتقال ۱۹۱۲ میں دھلی میں ھوا ۔ میں
جنازہ میں شرکت نہ کرسکا اس لئے کہ ان دنوں میں بی۔اے کے
امتحان کے سلسلہ میں لاھور میں مقیم تھا اور انتقال کی خبر میں
نے وھیں اخبارات میں پڑھی تھی ۔ ان کی وفات کے بعد میں اس
عربی مثل کا صحیح صحیح مفہوم سمجھ سکا : ''موت العالم موت
العالم'' (عالم کی موت درحقیقت عالم کی موت ہے ۔)

مولانا عبیدُاللہ سندھی

مولوی صاحب کے نام نامی سے میں زمانۂ طالب علمی سے واقف تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ۱۹۰۸ میں انہوں نے مسجد فتحپوری دہلی میں انگریزی دان مسلمانوں میں مذہبی تعلیم پھیلانے کے لئے جو درسگاہ قائم کی تھی اس میں میرے چند ہم جماعت (جن میں مصباح الدین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں) شریک ہوگئے تھے ۔ لیکن ان کی خدمت میں مجھے نیاز دسمبر ۱۹۳۹ میں حاصل ہوا جب کہ وہ میری دوسری شادی کے موقع پر دعوت ولیمہ میں شریک ہوئے اور اپنی شرکت سے میری عزت افزائی فرمائی ۔ وہ میرے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر کے دوست تھے ۔

میں نے سن رکھا تھا کہ ان کی درسگاہ بعض طلبا کی خفیہ کارروائیوں کی وجہ سے بند ہوئی جو در پردہ برطانوی حکومت کے جاسوس تھے ۔ میں نے یہ بھی سن رکھا تھا کہ انیس احمد* مولوی صاحب کی گرفتاری کا باعث بنے تھے ۔ چنانچہ سب سے پہلے میں نے یہی پوچھا کہ ”کیا یہ صحیح ہے کہ انیس احمد کی وجہ سے آپ کی گرفتاری عمل میں آئی تھی ؟“ مولوی صاحب نے تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ ”درسگاہ کے بند ہونے کے جہاں اور بہت سے اسباب تھے وہاں حکومت کا رویہ بھی کسی حد تک ذمہ دار تھا ۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ مسلمانوں

---

* انیس احمد خاں بہادر ادریس احمد (ہیڈ ماسٹر گورنمنٹ ہائی اسکول، بجنور) کے بیٹے تھے ۔ انہوں نے حکومت کی تحریک پر کانگریس اور لیگ کے خلاف سائیمن کمیشن کی پذیرائی کے لئے آل انڈیا مسلم فیڈریشن کے نام سے ایک انجمن بھی بنائی تھی ۔

میں صحیح اسلامی روح پھیلے ۔ لیکن میری گرفتاری یا مدرسہ کے بند ہونے کا انیس احمد کی ذات سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ ‘‘ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ ’’ میں اپنی پرانی درسگاہ کے اصول پر ایک نئی درسگاہ کا آغاز کرنا چاہتا ہوں ۔‘‘ لیکن افسوس ہے کہ عمر نے وفا نہ کی اور یہ ارادہ تشنۂ تکمیل رہ گیا ۔

اس موقع پر جتنی باتیں ہوئیں ان سے میں مولوی صاحب کے بے پناہ خلوص کا احساس کرسکا ۔ کھانے کے دوران میں گفتگو زیادہ تر مسلمانوں کی سیاسی ، اخلاقی اور معاشی حالت پر ہوتی رہی ۔ مولوی صاحب مسلمانوں کی حالت سے مایوس نہ تھے ۔ وہ ان کے مرض اور علاج سے واقف تھے ۔ انہوں نے زور دیکر فرمایا کہ ’’مسلمانوں کی فلاح اسی میں ہے کہ وہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رہیں اور محمد (ص) عربی کی طرف پھر سے لوٹ جائیں ۔ محض مادی ترقی سے ہمارے امراض کا مداوا نہیں ہوسکتا ۔‘‘

مولوی صاحب کے منہ سے جو الفاظ نکلے ان سے مجھے اس آگ کا کچھ کچھ اندازہ ہوسکا جو آن کے سینہ میں دھک رہی تھی ۔

***

منشی سیّد احمد دہلوی

منشی صاحب دھلی میں اجمیری دروازہ کے قریب گلی شاہ تارہ میں رھا کرتے تھے۔ زمانۂ طالب علمی سے میں ان کی خدمت میں حاضر ھوا کرتا تھا۔ ایک دفعہ انھوں نے میرے ذمہ یہ خدمت سپرد کی کہ میں ان کی ساری کتابوں پر انگریزی میں مختصر سے تشریحی نوٹ لکھدوں تاکہ پڑھنے والے کو معلوم ھوسکے کہ وہ کتابیں کن کن موضوعات سے تعلق رکھتی ھیں۔ چنانچہ انھوں نے مجھے اردو میں نوٹ لکھدئے اور میں نے ان کی بنیاد پر کتابوں پر تبصرہ لکھدیا۔ اس خدمت کے صلہ میں انھوں نے از راہ شفقت مجھے پانچ روپے عنایت فرمائے حالانکہ میں کہتا رہ گیا کہ مجھے معاوضہ کی ضرورت نہیں ھے۔ بات یہ تھی کہ ان کے بعض ھواخواھوں نے چیف کمشنر (دھلی) سے کہا تھا کہ حکومت کو چاھئے کہ وہ منشی صاحب کی علمی و ادبی خدمات کا عملی اعتراف کرے۔ چیف کمشنر نے جواب میں کہا کہ ''اگر ھمیں ان کے کارناموں کا حال معلوم ھوجائے تو پھر ھم حکومت ھند سے سفارش کرسکتے ھیں۔'' کتابوں پر تشریحی نوٹ لکھوانے کا مقصد یہی تھا کہ اسے چیف کمشنر تک پہنچا دیا جائے۔ دوستوں کی تگ و دو کا یہ نتیجہ نکلا کہ انھیں محض ''خان صاحب'' کے خطاب سے نوازا گیا حالانکہ وہ ھر طرح ''شمس العلما'' کے مستحق تھے۔ دوستوں کو اور خود انھیں بھی اس خطاب سے ایک گونہ مایوسی ھوئی، مگر یہ امر باعث امتنان ھے کہ میر محبوب علی خاں (نظام دکن) نے بر وقت ان کی سرپرستی کی ورنہ ''فرھنگ آصفیہ'' طبع نہ ھوسکتی۔

۱۹۱۲ کی ایک سہ پہر کا قصہ ھے کہ میں کالج سے واپس

آرہا تھا کہ ایک دوست نے راستہ میں اطلاع دی کہ منشی صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ گھر پہنچتے پہنچتے جتنے دوست ملے میں نے یہ رنجدہ خبر ان تک پہنچا دی۔ شدہ شدہ منشی صاحب کو بھی خبر ہو گئی اور وہ دوسرے ہی دن صبح سویرے اپنا موٹا ڈنڈا (جسے میں عصائے موسوی کہا کرتا تھا) سنبھالے میرے والد سے ملنے کے لئے تشریف لائے اور شکایتاً فرمایا کہ ''آپ کے لڑکے نے تو مجھے قبل از وقت مار ڈالا۔'' یہ کہکر پھر اس اجمال کی تفصیل بتائی۔ میرا کمرہ مکان کی بالائی منزل پر تھا۔ چنانچہ مجھے نیچے طلب کیا گیا اور میں نے حاضر ہو کر سارا واقعہ من و عن سنا دیا اور انہیں یقین دلایا کہ اس کی تہ میں کسی طفلانہ شرارت کو دخل نہیں ہے۔ اس کے بعد میں نے ان سے معافی مانگی اور منشی صاحب نے مجھے نہایت فراخدلی سے معاف کردیا۔ اس کے بعد میں متعدد دفعہ ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کی طرف سے وہی پہلی سی بزرگانہ شفقت کا اظہار ہوتا رہا۔ وہ سب کچھ بھول چکے تھے۔ ان کے پاکیزہ دل پر نام کو بھی ملال نہ تھا۔

۱۹۱۴ میں ''ہمدرد'' سے علیحدگی کے بعد میں نے حکومت ہند میں ملازمت کی کوشش کی۔ اس سلسلہ میں منشی صاحب مجھے اپنے دوستوں کے پاس لئے لئے پھرے، مگر ان کی کوششیں بارور نہ ہوئیں۔ مجھے اس وقت معلوم نہ تھا کہ چیف کمشنر دھلی نے احکام جاری کر رکھے ہیں کہ ''ہمدرد'' و ''کامریڈ'' کے وابستگان کو حکومت کے کسی محکمہ میں جگہ نہ دی جائے۔ اگر مجھے اس وقت یہ بات معلوم ہوجاتی تو میں ہر گز ہر گز منشی صاحب کو زحمت نہ دیتا۔ مجھے اس کا علم بہت عرصہ بعد مرزا عبدالرحمن بیگ کے ذریعہ ہوا جو چیف کمشنر کے دفتر میں پریس برانچ کے انچارج تھے۔ آج بھی جب کبھی مجھے خیال آجاتا ہے کہ میں نے انہیں باربار کیوں زحمت دی تو

بیحد رنج ہوتا ہے - بہر صورت مجھ پر ان کے احسان کا جو بوجھ ہے اس سے میں زندگی بھر سبکدوش نہیں ہوسکتا -

منشی صاحب بھاری ڈیل ڈول کے آدمی تھے - ان میں اور ڈاکٹر سیموئیل جانسن* میں جسمانی اور دماغی مماثلت بدرجۂ اتم موجود تھی - جس طرح جانسن کا قابل فخر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے تن تنہا انگریزی زبان کی سب سے پہلی ڈکشنری مرتب کی اسی طرح منشی صاحب کا قابل قدر کارنامہ بھی ان کی فرہنگ ہے جو اردو لٹریچر میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے - مگر افسوس ہے کہ برطانوی حکومت ہند نے ان کی کچھ قدر نہ کی -

منشی صاحب اپنے زمانہ کے اخبارات اور رسائل میں بھی کبھی کبھار مضامین لکھا کرتے تھے - " دارالعلوم " میں جو دہلی سے میرے والد کی ادارت میں ۱۹۰۱ سے نکلنا شروع ہوا تھا ، ان کے متعدد مضامین شائع ہوئے - " مخزن " کے دہلی والے دور میں بھی ان کے چند مضامین شائع ہوچکے ہیں - ان کی سب کتابیں طبعزاد ہیں اور ایسے موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں جن پر ان سے پہلے کسی نے خامہ فرسائی نہیں کی - وہ اردو زبان کے سچے خدمت گزار تھے اور ہر لحاظ سے حالی ، نذیر احمد اور عبدالحق کی طرح بابایان اردو میں شمار کئے جانے کے اہل اور حقدار -

وہ طبعاً نہایت منکسرالمزاج آدمی تھے - ان میں نمود یا گھمنڈ نام کو نہ تھا - انہیں لوگوں کی خدمت کرنے میں مزا آتا تھا - جہاں جہاں وہ رہے اپنے گرد و پیش والوں کے لئے خیر و برکت کا سرچشمہ بنے رہے - لوگ ان کی خدمت میں آکر اپنے دکھوں کا مداوا ڈھونڈتے تھے - وہ نہ صرف یہ کہ اپنی عظمت سے بالکل ناواقف تھے ، بلکہ ان میں آج کل کی سی اشتہار بازی بھی

---

* جانسن نے اپنی ڈکشنری ۱۷۴۰ میں لکھنی شروع کی اور ۱۷۵۵ میں اسے شائع کیا - ۱۷۶۲ میں شاہ انگلستان نے جانسن کے لئے ۳۰۰ پونڈ سالانہ کی ادبی پنشن تا حیات مقرر کی -

نہ تھی۔ وہ بالعموم پیدل چلنے کے عادی تھے، البتہ جب دور جانا ہوتا تو تانگے میں سوار ہو کر جاتے۔ ان کی زندگی بہت سادہ تھی۔

منشی صاحب تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔ یہ حقیقت ہے کہ انہوں نے اس کی جانب ایسے زمانہ میں توجہ کی جب کہ ماحول ناسازگار تھا۔ اس اہم مقصد کی تبلیغ کے لئے انہوں نے ''اخبارالنسا'' بھی جاری کیا تھا۔

ان کا انتقال ۱۱ مئی ۱۹۱۸ کو ۷۲ برس کی عمر میں ہوا اور وہ دھلی میں قطب روڈ کی باغیچی میں دفن کئے گئے۔

***

مسٹر آصف علی

آصف علی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۰۶ یا ۱۹۰۷ میں ہوئی ۔ ہم دونوں ہم محلہ بھی تھے ۔ میں نے ۱۹۰۸ میں انٹرنس کا امتحان پاس کیا ۔ اس وقت آصف علی سینٹ اسٹیفنز کالج میں تھرڈ ایر میں پڑھتے تھے ۔ انہی کے مشورہ سے میں نے بھی اسی کالج میں داخلہ لے لیا ۔ نہ صرف یہ بلکہ آصف علی نے اپنی کچھ درسی کتابیں بھی مجھے دیں ۔ ان کتابوں میں سے ایک کے ٹائیٹل پیج پر لکھا ہوا تھا : ''آصف علی ، فیوچر ڈپٹی کمشنر آف دھلی۔'' ڈپٹی کمشنر کے الفاظ لکھدینے سے نہ صرف ان کی حوصلہ مندی ظاھر ہوتی تھی بلکہ اس امر کا بھی اظہار ہوتا تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی کی راہ مقرر کرلی ھے اور یہ کہ وہ آئی ۔سی ۔ ایس بننا چاھتے ھیں۔ ان دنوں دھلی کے ڈپٹی کمشنر کے بڑے ٹھاٹھ ہوا کرتے تھے ۔ عام لوگ اسے دیکھکر یہی سمجھتے تھے کہ وہ گورنر سے بھی بڑا ھے ۔

آصف علی کا انداز گفتگو ابتدا ھی سے عام لڑکوں سے بالکل مختلف تھا ۔ وہ دوسروں سے اس طرح باتیں کرتے تھے گویا وہ ان سب میں بزرگ ھیں ۔ شروع ھی سے وہ بہت سنجیدہ واقع ہوئے تھے اور بہت عرصہ میں جا کر بے تکلف ہوتے تھے ۔ وہ ھر موقع پر اپنا وقار قائم رکھتے تھے ، اگرچہ وہ خود بھی ھنستے تھے اور دوسروں کو بھی ھنساتے تھے ۔

ان دنوں دھلی میں ایک انقلابی لیڈر تھے جن کا نام تھا سید حیدر رضا ۔ وہ اپنی آتشیں تقریروں کے لئے دور دور مشہور تھے ۔ ایک دفعہ دھلی کی حکومت نے شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگادی تاکہ وہ شہر کے حدود میں تقریر نہ کرسکیں۔ چنانچہ شہر کے

باھر جلسہ ھوا اور فاصلہ کے باوجود ھزارھا آدمی ان کی تقریر
سننے کو جمنا پار پہنچ گئے ۔ آصف علی ، واحدی اور راقم الحروف
بھی وھیں پہنچے ۔ میں نے کئی بار دیکھا کہ ان کی تقریر سننے
کے لئے خود کوتوال شہر سینڈھے خاں پہنچا کرتے تھے ۔ ایک
دفعہ ان کی تقریر دھلی دروازہ اور اجمیری دروازہ کے درمیانی
میدان میں ھوئی ۔ میں بھی کالج سے سیدھا وھیں پہنچا ۔ دیکھتا
کیا ھوں کہ سینڈھے خاں بھاگم بھاگ چلے آرھے ھیں ۔ وہ والد
کے دوست تھے اور اس لئے انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ " تم
یہاں کہاں ؟ " میں نے جواب دیا کہ " طالب علم ھوں ، سب
باتیں سننی چاھئیں ۔ " مسکرا کر آگے بڑھ گئے ۔

کالج میں آصف علی کے دو گہرے دوست تھے سید محمد رؤف علی
ر سید محمد تقی ۔ رؤف بیرسٹر تھے اور تقی بی اے ۔ ایل ایل ، بی
۔ تینوں کی وکالت خوب زوروں سے چلتی تھی ۔ ھم ان تینوں
۔ تگڈم کے نام سے یاد کرتے تھے ۔ ان کی باھمی دوستی قدیم
سعداری کا بہترین نمونہ تھی ، اس لئے کہ وہ سب ایک دوسرے
دکھ درد میں شریک رھتے تھے ۔ ان تینوں میں اب فقط تقی
حب بقید حیات ھیں ۔ رؤف صاحب کے انتقال کے بعد آصف علی
ف تک ان کے بچوں کی خبر گیری کرتے رھے ۔

سید حیدر رضا ۱۹۰۸ میں بیرسٹری کے لئے ولایت گئے ۔
کی روانگی کے چند ھی دن بعد آصف علی اور رؤف علی بھی
انگلستان ھو گئے ۔ واپسی پر دھلی کے اسٹیشن پر جو لوگ
لینے کے لئے پہنچے ان میں ملا واحدی بھی تھے اور
الحروف بھی ۔ وہ ھر ایک کا نام لے کر بغلگیر ھوتے تھے ۔
حسن نظامی بھی پذیرائی کرنے والوں میں تھے ۔

آصف علی کا قاعدہ تھا کہ وہ ولایت سے اپنی والدہ کو
باقاعدگی سے ھفتہ وار خط بھیجا کرتے تھے ۔ ان دنوں
سروس نہ تھی اور ولایتی ڈاک بذریعۂ جہاز ھفتہ میں صرف

ایک بار آتی تھی۔ اتفاقاً ایک ہفتہ خط نہیں آیا۔ میں جب خیریت دریافت کرنے کے لئے ان کے گھر پہنچا تو اندر رونا پیٹنا ہورہا تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ خط نہیں آیا۔ میں نے ان کے عزیزوں سے کہا کہ وہ رؤف علی کے یہاں جا کر صورت حال دریافت کریں۔ اگر وہاں بھی خط نہیں آیا تو سمجھ لیں کہ ڈاک ہی کے آنے میں دیر ہوگئی ہے۔ وہاں بھی کوئی خط نہیں آیا تھا۔ دوسرے ہی دن خط آگیا اور سب کی جان میں جان آئی۔ آصف علی کی والدہ عین جوانی میں بیوہ ہوگئی تھیں، اور ان کی ساری زندگی صرف اپنے بیٹے کے لئے وقف ہو کے رہ گئی تھی۔ انہی کی تربیت کا نتیجہ تھا کہ آصف بچپن اور جوانی میں ہر بری صحبت سے بچے رہے۔ ان کی غیر معمولی مادرانہ محبت کی یہی وجہ تھی کہ آصف علی آن کی تمامتر امیدوں کا مرکز تھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آصف بھی پوری طرح اپنی ماں کے کہنے میں تھے۔

جون ۱۹۱۷ میں دھلی کی حکومت نے تا حکم ثانی انہیں پبلک جلسوں میں تقریر کرنے سے روک دیا تھا۔ اس بندش کے کچھ دنوں بعد انہوں نے ایک پرائیویٹ جلسہ میں تقریر کی اور گرفتار کر لئے گئے۔ اس موقع پر آصف علی کی والدہ نے جو بیان شائع کیا وہ اپنے اندر کافی جان رکھتا ہے۔ اس کے جستہ جستہ فقرے یہ ہیں :— ''میں بیس سال کی عمر سے بیوگی میں زندگی گزار رہی ہوں۔ . . . . میرا بیٹا ہندوستان کی آئینی آزادی کے لئے کام کر رہا ہے۔ . . . . آج میرے لئے انتہائی مسرت کا دن ہے اس لئے کہ میں اپنے بڑھاپے کا واحد سہارا ملک و ملت کی نذر کر رہی ہوں۔'' بی اماں کی طرح یہ بھی بڑے دل گردہ کی عورت تھیں۔

طالب علمی کے زمانہ ہی سے آصف کی انگریزی بہت اچھی تھی۔ ولایت کے قیام کے بعد اس پر اور جلا ہوگئی۔ ''کامریڈ'' کے پہلے دور میں ان کے متعدد مضامین نکل چکے ہیں۔ راجہ

غلام حسین کے اخبار ''نیو ایرا'' میں بھی ان کی انگریزی نظمیں اور مضامین وقتاً فوقتاً نکلتے تھے۔ یہ چیزیں کبھی تو ان کے نام سے شائع ہوتی تھیں، اور کبھی ان پر صرف ''ایم۔اے۔اے'' لکھا ہوتا تھا۔ ان کی اردو بھی بہت اچھی تھی۔ اس زمانہ کے انگلستان دیدہ لوگ ایسی زبان بولتے تھے جسے آدھا تیتر آدھا بٹیر کہنا چاہئے۔ اردو بولتے بولتے انگریزی بولنے لگتے تھے اور انگریزی بولتے بولتے اردو۔ آصف علی کو ایسی مخلوط زبان بولنے سے سخت چڑ تھی۔ انہوں نے ٹیگور کے ایک ڈرامے ''چترا'' کا بھی اردو میں ترجمہ کیا تھا۔ آصف علی کے مضامین خواہ وہ اردو میں ہوں یا انگریزی میں، زبان کے اعتبار سے بہت جاندار ہوتے تھے۔

انگلستان سے واپسی پر آصف علی نے ایک نہایت عبرت انگیز واقعہ سنایا۔ وہ آتے وقت مصر ٹھہرے تھے۔ وہاں کسی ہوٹل سے نکل رہے تھے کہ ایک مصری فقیر نے ان سے بھیک مانگی۔ انہوں نے اسے ایک نوٹ دیا جس کی قیمت پانچ روپے کے برابر تھی۔ اتنی بڑی رقم دیکھکر مصری فقیر نے پوچھا کہ ''آپ کون سے ملک کے رہنے والے ہیں؟'' انہوں نے جواب دیا: ''ھندوستان۔'' یہ سنتے ہی اس نے حقارت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر نوٹ واپس کرتے ہوئے کہا کہ ''میں غلام ملک کے کسی فرد سے بھیک قبول نہیں کیا کرتا۔'' آصف علی کہتے تھے کہ ''اس طنز کا میرے دل پر بہت گہرا اثر ہوا اور میں نے اسی وقت طے کرلیا کہ ھندوستان پہنچتے ہی میں اسے آزاد کرانے کی کوششیں شروع کردونگا۔''

آصف علی بہت اچھے مقرر تھے۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے بیان کیا کہ ''جس مقام سے روسہ الکبریٰ کے مقنن تقریریں کیا کرتے تھے، میں بھی اس پر برکت حاصل کرنے کے لئے چڑھ گیا اور کچھ دیر تک تقریر کی۔'' دھلی میں رؤف اور آصف

باغوں میں چلے جاتے تھے اور گھنٹوں تقریر کرنے کی مشق کرتے تھے۔ پبلک میں تقریر کرتے وقت وہ حاضرین کو متاثر کردیا کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ عوام کی نفسیات سے خوب واقف تھے۔

آصف دھلی کی قدیم تہذیب و شایستگی کا ایک بہت اچھا نمایندہ تھے۔ ان کا کمرہ سلیقہ سے سجا رہتا تھا، باہر بیسیوں گملے رکھے رہتے تھے جن میں طرح طرح کے پھول دار پودے تھے۔ جب کسی کی دعوت یا ٹی پارٹی کرتے، وہیں آگے کے صحن میں میزیں بچھ جاتی تھیں۔ ایک دن سہ پہر کو میں ان کے یہاں جا پہنچا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ میزوں پر انواع و اقسام کی چیزیں نہایت قرینے سے چنی ہوئی ہیں اور مولانا محمد علی کی آمد کا انتظار کیا جا رہا ھے، مگر عین وقت پر انہوں نے کہلا بھیجا کہ وہ نہیں آسکینگے۔ اس پر میں نے ہنس کر کہا کہ "انہوں نے اپنی بجائے مجھے بھیج دیا ھے۔" یہ سن کر آصف علی مسکرائے اور فرمایا :— "You Are Always Welcome."

جیسا کہ اوپر کہا جاچکا ھے ایک مرتبہ دھلی کے چیف کمشنر نے انہیں پبلک جلسوں میں تقریر کرنے سے حکماً روک دیا تھا۔ انہی دنوں میں ہوم رول لیگ کے ممبروں کا ایک جلسہ ہوا جہاں آصف علی نے بھی تقریر کی۔ خلاف ورزی احکام کی پاداش میں حکومت نے انہیں گرفتار کرلیا۔ اب بحث فقط اتنی تھی کہ آیا وہ جلسہ جس میں انہوں نے تقریر کی تھی، پبلک تھا یا پرائیویٹ۔ حکومت نے اپنے ایک دو جاسوس وزیٹر کی حیثیت سے بھیج دئے تھے اور اس بنا پر وہ کہتی تھی کہ جلسہ پبلک ھے۔ صفائی کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ وزیٹر ووٹ نہیں دے سکتے اسلئے جلسہ پرائیویٹ تھا۔ آصف علی کی طرف سے بمبئی ہائی کورٹ کے مشہور جج جسٹس ڈاور کے بیٹے پیش ہوئے تھے انہوں نے استغاثہ کی دھجیاں بکھیردی تھیں۔ ان کی وکالت

اس زور کی تھی کہ یوروپین جج کو بالآخر یہ ماننے ہی بنی کہ وہ جلسہ پرائیویٹ تھا اور آصف علی رہا کردئے گئے۔

آصف علی کی شادی ایک خاندانی ہندو خاتون (ارونا دیوی) سے ہوئی۔ بمبئی میں مسز نائیڈو نے مجھ سے فرمایا تھا کہ "آصف علی بہت خوش نصیب ہیں کہ انہیں ارونا جیسی بیوی ملی۔" واحدی لکھتے ہیں کہ "آصف صاحب کو صحیح معنوں میں مسرور میں نے شادی کے بعد دیکھا۔"

طالب علمی کے زمانہ میں آصف علی دھلی کا ڈپٹی کمشنر بننے کا خواب دیکھا کرتے تھے، مگر قدرت نے اس سے کہیں اونچے عہدے ان کے لئے مقرر کر رکھے تھے۔ وہ پہلے مرکز میں وزیر بنے، پھر امریکہ میں ہندوستان کے پہلے سفیر مقرر ہوئے، اس کے بعد آسام کی گورنری پر فائز ہوئے اور آخر میں سوئٹزرلینڈ میں بھارت کے سفیر بنا کر بھیجے گئے۔ جن دنوں وہ آسام میں تھے میں سی۔ ایف۔ اینڈریوز کی لائف کا ترجمہ کر رہا تھا۔ میں نے انہیں لکھا کہ "آپ اینڈریوز کے شاگرد رہ چکے ہیں اس لئے اگر آپ ان کے متعلق کچھ یادیں لکھ کر بھیج دیں تو میں انہیں شامل کتاب کرلونگا۔" چنانچہ انہوں نے ایک طویل خط بھیجا جس کے جستہ جستہ اقتباسات درج ذیل ہیں:-

"گورنمنٹ ہاؤس۔ کیمپ پوری۔

۹ اپریل ۱۹۵۱-

مائی ڈیر ضیاء الدین۔ .... اینڈریوز سینٹ اسٹیفنز کالج کے سر بر آوردہ شخص تھے۔ ھبرٹ ویئر کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد وہ پرنسپل کے عہدہ پر فائز ہونے والے تھے، لیکن وہ پیچھے ہٹ گئے تاکہ ردرا کے لئے جگہ خالی کردیں۔ ... اینڈریوز جانسن کی فضول عبارت آرائی کو یا ایسی طرز نگارش کو پسند نہیں کرتے تھے جس میں تصنع ہو یا الفاظ

پرستی سے کام لیا گیا ہو، بلکہ وہ سلیس اور آسان
طرز تحریر پر زور دیا کرتے تھے۔ وہ نام و نمود کے
سخت خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ جذبات اور اظہار
جذبات میں خلوص ہو۔ وہ سیرت کی تعمیر پر زور
دیا کرتے تھے۔ ... وہ اعلیٰ درجہ کے کھلاڑی
تھے اور اچھے اسٹائل کے ساتھ کھیلا کرتے تھے۔
... میرے دل و دماغ میں ان کی قابل تقلید سیرت
کی اور ان کی دلوں کو موہ لینے والی ذاتی محبت کی
انمٹ یاد محفوظ ہے۔ ... ایک لحاظ سے گاندھی جی
کو چھوڑ کر وہ بلاشبہ سب سے زیادہ حضرت عیسیٰ سے
مشابہت رکھتے تھے۔ ... بہترین دعاؤں کے ساتھ۔

مخلص

ایم۔ آصف علی"

لارڈ ویول کے زمانۂ حکومت میں ارونا دیوی قید میں تھیں۔ جب آصف علی دوسرے ہندوستانی لیڈروں کی طرح لارڈ ویول کی دعوت پر ان سے ملنے کے لئے گئے تو ان کے دوستوں کو خیال ہوا کہ وہ لارڈ موصوف سے اپنی بیگم کی رہائی کے لئے بالضرور کچھ نہ کچھ کہینگے، لیکن انہوں نے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ غالباً اسی کا اثر تھا کہ وہ بہت جلد رہا کردی گئیں۔ آصف بیحد خود دار انسان تھے اور کسی کا احسان اٹھانا نہیں چاہتے تھے۔

ان سے میری آخری ملاقات ۱۹۴۵ میں ہوئی جب کہ وہ بغرض علاج بمبئی آئے ہوئے تھے۔ اس وقت وہ محض مضغۂ گوشت بن کر رہ گئے تھے۔ بہرحال ملاقات ہوئی اور اشاروں میں باتیں ہوئیں۔ اسکے بعد میری ان سے ملاقات نہ ہوسکی اگرچہ خط و کتابت وقتاً فوقتاً ہوتی رہتی تھی۔

آصف علی اعلیٰ ذہانت اور شگفتہ طبیعت کے مالک تھے۔

ان کی زندگی کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ زندہ دل لوگ کس طرح جیا کرتے ہیں۔ کبھی کبھی وہ قہقہہ مار کر بھی ہنستے تھے اور ان کے قہقہوں میں عجیب دل آویزی ہوتی تھی، ویسے سنجیدگی کے ساتھ ساتھ موہ لینے والی مسکراہٹ تو ہر وقت ان کے چہرے پر رقصاں رہتی تھی۔

خدا نے انہیں اچھی صورت اور اچھی سیرت عطا کی تھی۔ ان کا جسم ایسا تھا کہ ہر لباس (خواہ وہ ٹھیٹھ ہندوستانی ہو خواہ انگریزی) ان پر خوب پھبتا تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں بھی وہ خوش پوشاک مشہور تھے، عدم تعاون کے بعد سے وہ ہمیشہ کھدر پوش رہے۔

ان کا انتقال برن (سوئٹزرلینڈ) میں جمعہ کے دن ۳ اپریل ۱۹۵۳ کو ہوا اور ان کی نعش ۶ اور ۷ اپریل کی درمیانی رات کو ہوائی جہاز سے دہلی لائی گئی۔ جنازہ میں پنڈت نہرو اور ان کی کابینہ کے وزرا کے علاوہ ایران، عراق اور سوئٹزر لینڈ کے سفیر بھی موجود تھے۔ اجمیری دروازہ سے جنازہ توپ گاڑی پر رکھا گیا اور وہاں سے اسے درگاہ نظام الدین اولیا میں لیجایا گیا۔ قبر میں اتارتے وقت توپوں کی سلامی دی گئی اور انہیں پورے فوجی اعزازات کے ساتھ سپرد خاک کیا گیا۔ جنازہ کے ساتھ تقریباً ۱۵ ہزار اشخاص تھے:

پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ان کی قبر پر راجندر پرشاد، راج گوپال اچاریہ، فضل علی (گورنر اڑیسہ) کی جانب سے Wreaths چڑھائے گئے۔ راج گوپال اچاریہ کے Wreath پر Au Revoir کے الفاظ لکھے ہوئے تھے، یعنی "خدا حافظ اس وقت تک کے لئے کہ ہم دوبارہ ملیں۔"

***

عارف ہسوی

تیس چالیس سال پہلے کی بات ہے کہ دھلی میں خواجہ حسن نظامی کے یہاں ایک دبلے پتلے لمبے آدمی سے ملاقات ہوئی ۔ یہ عارف ھسوی تھے ۔ وہ اس وقت نئے نئے اپنے گاؤں سے آئے تھے۔ چند ہی دنوں میں ہم دونوں بے تکلف ہو گئے ۔ خدا جانے ان میں کیا بات تھی کہ میں نے انہیں ہمیشہ اپنے دل کے قریب پایا ۔ بہر حال ہماری دوستی کا سلسلہ اس وقت ٹوٹا جب وہ ایک طویل علالت کے بعد اس دار فانی سے گزر گئے ۔

وہ علم کے زور سے اپنی روزی کماتے تھے ، کبھی اس کے یہاں ملازمت کرلی کبھی اس کے یہاں ۔ لیکن تنخواہ تقریباً ایکساں رہی ۔ وہ بہت قناعت پسند آدمی تھے اور جو کچھ ملتا ، صبر و شکر کے ساتھ اسی میں گزارہ کر لیتے ۔ جس رسالہ سے وہ آخر وقت تک وابستہ رہے وہ ”مولوی“ تھا ۔ انہوں نے متعدد روزانہ اخبارات میں بھی کام کیا تھا ۔ ” ہمدرد “ سے بھی وہ کچھ عرصہ تک وابستہ رہے تھے ۔

تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں انہیں جیل ہوئی اور وہ آگرہ کے قید خانہ میں رکھے گئے ۔ اتفاق سے انہی دنوں میرا آگرہ جانا ہوگیا ۔ جب مجھے معلوم ہوا کہ عارف یہاں رکھے گئے ہیں تو میں سیدھا جیل خانہ کے سپرنٹنڈنٹ سے ملا اور عارف سے ملنے کی اجازت مانگی۔ وہ انگریز تھا ۔ کہنے لگا کہ ”تم سرکاری ملازم ہوکر عدم تعاون کرنے والے کانگریسی سے ملتے ہو ! “ میں نے کہا کہ ” ہماری دوستی سیاسی نوعیت کی نہیں ہے ، بلکہ جو چیز ہم میں مشترک ہے وہ ہمارے ادبی مشاغل ہیں اور بس ۔ “ چنانچہ اس نے فوراً پندرہ منٹ کے لئے ملنے کی اجازت

دیدی مگر ھماری ملاقات کا سلسلہ دو گھنٹہ تک جاری رھا ۔ جیلر نے اسسٹنٹ جیلر میرے ساتھ کردیا تھا ۔

جیل میں انہوں نے اپنے کانگریسی دوستوں سے ملایا اور پھر کہا : — ”خدا کا شکر ھے کہ آج اتنے عرصہ کے بعد ایک دوست کی صورت تو نظر آئی ۔“ یہ کہتے ھی وہ مجھ سے لپٹ گئے اور ھم دونوں میں اس وقت تک کشتم کشتا ھوتی رھی جب تک کہ ھم تھک نہ گئے ۔ اسسٹنٹ جیلر اور عارف کے دوسرے رفقا حیران تھے کہ یہ کیا معاملہ ھے ۔ عارف نے کہا کہ ”یہ ھماری بے تکلفی کا کھلا ھوا مظاھرہ ھے ۔“ اس کے بعد اطمینان کے ساتھ ھم مشترکہ دوستوں کے بارے میں بات چیت کرتے رھے ۔ میں نے جب جیل کی زندگی کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے کہا : — ”بڑے آرام سے کٹ رھی ھے ۔ ھم میں سے ھر ایک کو مقررہ رقم مل جاتی ھے اور ھم خود اپنے کھانے پینے کا انتظام کرلیتے ھیں ۔“

مگر متھرا جیل میں وہ معمولی قیدیوں کی طرح رھتے تھے اور جیل کا لباس پہنتے تھے ۔ جو تصویر دی جارھی ھے وہ اسی دور سے تعلق رکھتی ھے ۔ یہ حقیقت ھے کہ عارف صاحب کی زندگی کا بہت بڑا حصہ جیل میں گزرا ۔

عارف بہت لکھاڑ تھے ، لیکن ان کی تحریریں زیادہ تر منجانب ایڈیٹر ھوتی تھیں ، البتہ خصوصی مقالات پر ان کا نام چھپتا تھا ۔ ان کی تحریروں میں شگفتگی تھی اور وہ کافی زور دار ھوتی تھیں ۔

وہ پان کثرت سے کھاتے تھے اور شاید اسی لئے ایک نظریہ کے مطابق انہیں منہ کا سرطان ھو گیا تھا ۔ واقعہ یہ ھے کہ چونے کی زیادتی کی وجہ سے ان کا منہ ھمیشہ مجروح رھتا تھا ۔ وہ مدت تک ڈاکٹر جوشی کے ھسپتال میں زیر علاج رھے ۔ ھسپتال میں وہ لوگوں سے لکھکر بات چیت کرتے تھے ۔ ھسپتال میں ان سے ملنے کے لئے میں جب کبھی جاتا مجھے یہی محسوس

ہوتا کہ خود میری قوت گویائی سلب ہوگئی ہے ۔ وفات سے چند دل قبل انہوں نے مجھے ایک مایوس کن خط لکھا جس کے کچھ اقتباسات درج ذیل ہیں۔ اس خط سے ان کی سیرت پر بھی روشنی پڑتی ہے ۔ و ھو ھذا :-

''برادرم ۔ ڈاکٹروں کے تمام قیاسات غلط نکلے۔ پہلے آپریشن کے بعد کچھ عرصہ تک حالت ٹھیک رہی ۔ اس کے بعد مرض نے پھر حملہ کیا ۔ چنانچہ پھر آپریشن ہوا اور اب میں ایک ماہ سے ہسپتال ہی میں ہوں گو ایک دو روز کے بعد شہر جانے والا ہوں ۔ مرض برابر بڑھ رہا ہے اور سوائے اس کے کہ خداتعالیٰ اپنا فضل فرمائے، بظاہر چند ہفتوں یا چند مہینوں کا قصہ اور رہ گیا ہے کیونکہ اب تک کوئی علاج کارگر نہیں ہوا ۔ امید ہے کہ تم میرے لئے دعا کرو گے کہ اگر صحت میری قسمت میں نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ مرض کے آلام اور اس کی کرب و تکلیف برداشت کرنے کی ہمت و توفیق عطا فرمائے اور خاتمہ بخیر کرے۔ ۔۔۔۔'' (۲٦ نومبر ۱۹۳۵)۔

عارف بہت یارباش تھے اور آخر وقت تک کانگریسی رہے۔ وہ فرقہ وارانہ خیالات سے کبھی متاثر نہیں ہوئے حالانکہ اس دور میں اچھے اچھے کارکن فرقہ پرستی کی بھینٹ چڑھ گئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوستوں کا دائرہ بہت وسیع تھا ۔ ان کے خصوصی مسلم دوستوں میں خواجہ حسن نظامی، آصف علی، ملا واحدی، راشدالخیری، عبدالحمید (مالک ''مولوی'')، بیدل شاہ جہانپوری اور خلیقی دہلوی قابل ذکر ہیں۔

دوران علالت میں وہ ڈاکٹر جوشی کے ہسپتال سے اٹھ کر واحدی کے یہاں آگئے اور انہی کے مکان میں دسمبر ۱۹۳۵ میں یا جنوری ۱۹۳٦ میں ان کا انتقال ہوا ۔ ان کی قبر کا کتبہ

ملک کے مشہور اهل قلم ایل۔ احمد اکبرآبادی نے تحریر کیا تھا اور کتبہ کی عبارت انہوں نے مجھے آگرہ میں سنائی تھی۔

دهلی کی علمی ، سیاسی اور ادبی زندگی میں جو خلا ان کی موت سے واقع هوا اس کا احساس آج تک ان کے دوستوں کو ھے۔ اب بھی جب کبھی وہ یاد آجاتے ھیں، دل سے بے اختیار آہ نکل جاتی ھے اور ان کی مسکراتی هوئی صورت نظروں کے سامنے آجاتی ھے۔

هسوہ میں مرحوم کے عزیزوں اور دوستوں نے ان کی یاد میں ''عارف نیشنل لائبریری'' قائم کر رکھی ھے۔ اور یہی ان کی واحد یادگار ھے۔

***

ڈاکٹر سیّد سجّاد دہلوی

ڈاکٹر سید سجاد میرے بچپن کے دوستوں میں تھے۔ وہ دھلی میں پنڈت کے کوچہ میں رہا کرتے تھے اور پھر نقل مکان کرکے کوچۂ چیلاں میں آن رہے تھے۔ یہیں ان کی جائداد تھی اور اسی محلہ میں میرا مکان بھی تھا۔ بی۔اے پاس کرنے کے بعد وہ اسلامیہ ھائی اسکول کانپور میں ملازم ھوگئے اور اتفاق سے مجھے بھی وھیں کے تھیوسوفیکل ھائی اسکول میں ملازمت ملی۔ ۱۹۱۷ میں ھم دونوں نے فارسی میں الہ‌آباد یونورسٹی سے ایم۔اے کے پہلے سال کا امتحان پاس کیا۔ چونکہ میں بہ سلسلۂ ملازمت بمبئی چلا گیا تھا اسلئے مجھے فائنل میں امتحان دینے کا موقع نہ ملا مگر سجاد صاحب نے ۱۹۱۸ میں فائنل کرلیا۔

کچھ عرصہ بعد بابائے اردو عبدالحق انہیں انجمن ترقی اردو میں لے گئے جس کا صدر دفتر ان دنوں اورنگ آباد میں تھا۔ وہ دو تین سال تک انجمن سے وابستہ رہے۔ اس اثنا میں انہوں نے ''لٹریری ھسٹری آف پرشیا'' کی ابتدائی تین جلدوں کا ترجمہ کیا اور تاریخ ایران مصنفہ سر سائیکس کی دونوں جلدوں کو اردو میں منتقل کیا۔ رھس ڈیوڈ کی کتاب ''بدھسٹ انڈیا'' کا ترجمہ انہوں نے دارالترجمہ کے لئے کیا۔ اس کے علاوہ انہوں نے دھلی کے ۱۰۱ پیشوں کی کوئی دس ھزار اصطلاحات جمع کرکے انجمن کو دیں۔ ایک زمانہ میں مولوی عبدالحق ان سے اس قدر مانوس تھے کہ وہ محبت میں انہیں ''سید سجاد علیہ السلام'' کہا کرتے تھے اور خط و کتابت میں بھی یہی لقب استعمال کرتے تھے۔

یہاں سے وہ جامعۂ عثمانیہ چلے گئے جہاں بابائے اردو کی

سبکدوشی پر وہ ان کی جگہ پر چیئرمین مقرر کردئے گئے۔ اس دوران میں انہوں نے اردو کی بیشمار مطبوعہ کتابیں یونیورسٹی کے لئے خریدیں۔ ان میں بعض نادر ہیں۔

سجاد صاحب کی شادی حیدرآباد میں ہوئی۔ جس خاتون سے ان کا نکاح ہوا وہ ریاست کے چیف جسٹس ضیا یار جنگ کی دختر نیک اختر تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کے اچھے برتاؤ، ان کے اعلیٰ اخلاق اور ان کی نیک سیرت کی تعریفیں مجھ سے بیان کیا کرتے تھے۔ وہ جن صاحب کی صاحبزادی تھیں، وہ حیدرآبادی کلچر کے زبردست نمایندہ تھے اور اس لئے لازمی تھا کہ اُن کا رنگ ان میں آتا۔ ۱۹۲۵ میں وہ کچھ عرصہ بیمار رہ کر داغ مفارقت دے گئیں۔ سجاد صاحب کی ازدواجی زندگی بہترین مسرتوں کی آئینہ دار تھی۔

۱۹۳۳ میں سجاد صاحب انگلستان گئے تا کہ وہاں سے پی ایچ۔ ڈی۔ کی ڈگری لیں۔ انہوں نے وہاں کافی عرصہ تک قیام کیا اور اس مدت میں انہوں نے یورپ کی مختلف لائبریریوں کو (جہاں تک اردو مطبوعات اور مخطوطات کا تعلق ہے) کچھ اس طرح سے کھنگالا کہ ان سے بیشتر کسی اور نے اس قدر محنت نہ کی ہوگی۔ ان کی ڈگری کے مقالہ کا موضوع تھا ”ہندی و آریائی فلسفہ۔“ اس کے علاوہ انہوں نے انگریزی میں ”تاریخ نثر اردو“ بھی لکھی جس میں ابتدا سے لے کر ۱۷۷۵ تک کی تصانیف زیر بحث آگئی ہیں۔ یہ کتاب ان کتابوں کے اقتباسات پر مشتمل ہے جو یورپ کے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ ان اقتباسات کی مدد سے پڑھنے والا زبان کی تدریجی ترقی سے بآسانی واقف ہوسکتا ہے۔ انہوں نے میر محمد حسین عطا خاں تحسین کی مشہور و معروف کتاب ”نوطرز مرصع“ کو بھی ایڈٹ کیا اور اس کا متن دنیا کے موجودہ قلمی نسخوں سے مقابلہ کرنے کے بعد تیار کیا۔ خوش قسمتی سے انہیں جرمنی میں ایک ایسا

نسخہ مل گیا جس میں پوری ایک کہانی ایسی تھی جو کسی دوسرے نسخہ میں موجود نہ تھی۔ انہوں نے ان صفحات کے فوٹو لے لئے۔ ''نو طرز مرصع'' کے متعلق ڈاکٹر صاحب کہا کرتے تھے کہ ''وہ دبستان لکھنؤ کی پہلی نثری تصنیف ہے اور اس کے بعد لکھنؤ میں جس قدر نثری لٹریچر تیار ہوا اس کے لئے یہی کتاب چراغ ہدایت کا کام دیتی رہی۔'' اپنے مقالہ میں انہوں نے میر امن کی ''باغ و بہار'' سے بھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ایک ہسپانوی فاضل نے اصل کتاب فارسی میں تحریر کی تھی، اسی کو سامنے رکھ کر تحسین نے اپنی کتاب لکھی اور بعد کو میر امن نے اسے ''باغ و بہار'' کی شکل دیدی۔ متن کے ساتھ تقریباً سو صفحات کا دیباچہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اس نظریہ سے متفق نہ تھے کہ ''باغ و بہار'' امیر خسرو کی مفروضہ کتاب کا ترجمہ ہے، اس لئے کہ اس میں بعض ایسی باتیں آگئی ہیں جو حضرت نظام الدین اولیا کے سمع اقدس پر یقیناً گراں گزرتیں۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کتاب بڑی کاوش سے لکھی ہے۔

جامعۂ عثمانیہ میں انہوں نے پوسٹ ریسرچ اسٹڈیز قائم کیں اور اپنے طلبا و طالبات سے ڈاکٹری کے لئے مقالے لکھوائے۔ ان مقالوں کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں لیکن وہ تیس چالیس سے کسی طرح کم نہ ہونگے۔ اگرچہ وہ مقالے طلبا کے تحریر کردہ ہیں لیکن استاد کی روح ان سب میں جلوہ گر ہے۔ اگر ان کی فاضلانہ رہنمائی شامل حال نہ ہوتی تو طلبا کے لئے ناممکن تھا کہ وہ ایسے پر مغز مقالے تحریر کرسکتے۔ چند کے عنوانات یہ ہیں:—

(۱) سر سید کے لکچر — از رشیدالحسن
(۲) اکبر الہ آبادی — از ابرار احمد
(۳) بہادر شاہ ظفر — از تسنیم بانو
(۴) گارسن دتاسی — از عباس علی رضوی
(۵) اردو غزل — از زینت ساجدہ

(٦) حسرت موہانی — از رابعہ بیگم
(٧) اقبال اور تصوف — از حبیب النسا بیگم
(٨) دبستان لکھنؤ — از عذرا سیف الدین
(٩) محمد حسین آزاد — از جہاں بانو
(١٠) نثر نذیر احمد — از معین الدین

یورپ کے زمانۂ قیام میں انہوں نے کولون کی رہنے والی ایک شریف جرمن خاتون (مس ہیلین شنائیڈر) سے شادی کرلی تھی۔ مجھے فخر ہے کہ میں بمبئی میں ان کا اور ان کی بہن کا دو تین ہفتے تک میزبان رہا۔ مسز سجاد اور ان کی بہن میری پہلی بیوی کے ساتھ خوب ھل مل گئی تھیں اور حقیقت یہ ہے کہ اس پر مسرت زمانہ کی یاد آج بھی میرے دماغ میں محفوظ ہے۔

تقسیم کے بعد ڈاکٹر صاحب کراچی تشریف لے آئے، ترک وطن کرکے نہیں بلکہ ایک کاروبار کے سلسلہ میں، اور پھر یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ ڈاکٹر صاحب پانچ چھہ سال تک یہاں مقیم رہے۔ اس دوران میں وہ کچھ عرصہ تک بیکار رہے، پھر حیدرآباد کے ٹرسٹ سے انہیں کچھ رقم بطور پنشن ملنے لگی۔ اس اثنا میں دو نیم سرکاری اسامیاں نکلیں جن کے انٹرویو میں ڈاکٹر صاحب کو بھی بلایا گیا۔ پہلی کا تعلق اقبال اکیڈیمی کی ڈائرکٹری سے تھا اور دوسری کا کراچی یونیورسٹی کی اردو پروفیسری سے۔ ان دونوں اسامیوں کی امیدواری کی داستان اس قدر تکلیف دہ اور دل خراش ہے کہ میں تماماً اس کا اعادہ نہیں کرسکتا۔ لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر ھماری نوزائیدہ مملکت میں اسامیاں اسی طریقہ سے پر ہوتی رہیں تو پھر ھماری سروسیز کا خدا ھی حافظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو ایک نہ ایک جگہ ضرور مل جاتی، لیکن برا ہو ذاتی رنجشوں کا جو پاکستان بن جانے کے بعد بھی دلوں سے دور نہ ہوسکیں اور ان کی وجہ سے ایک قابل شخص وہ پھل پانے سے محروم رہا جس کا وہ پورے طور پر اھل تھا۔

سجاد صاحب دہلی کے رہنے والے تھے۔ ان کی گفتگو ، ان کی نشست و برخاست ٹھیٹھ دہلی والوں کی سی تھی۔ ان کی بات چیت میں بہت لوچ تھا۔ وہ لوگوں سے ایسی شایستگی سے گفتگو کرتے تھے کہ وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکتے تھے۔ میں نے متعدد دفعہ لوگوں کو یہ کہتے سنا ہے کہ ڈاکٹر صاحب گفتگو کئے جائیں اور ہم سنا کریں۔ وہ بہت آہستگی سے بات چیت کرنے کے عادی تھے۔ ان کے مزاج میں عجلت مطلق نہ تھی۔

طلبا کے ساتھ ان کا برتاؤ غیر معمولی طور پر مشفقانہ تھا۔ وہ طلبا کا احترام کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ دوسرے اساتذہ بھی ان کا احترام کرنا سیکھیں۔ وہ ان سے ''آپ'' اور ''جناب عالی'' کر کے بات چیت کرتے تھے۔ مراد یہ تھی کہ طلبا بھی سیکھیں کہ بڑوں سے کس طرح گفتگو کی جاتی ہے یا کی جانی چاہئے۔ زبانی امتحان کے وقت اگر کوئی طالب علم گھبرا جاتا تو وہ اس سے اس وقت تک سوال نہ پوچھتے جب تک کہ اس کی گھبراہٹ دور نہ ہوجاتی۔ گھبراہٹ دور کرنے کی غرض سے وہ طالب علم سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے تاکہ اسے یقین ہو جائے کہ ممتحن انسان ہے اور وہ طالب علم کی کمزوری سے ناجائز فائدہ اٹھانا نہیں چاہتا ، بلکہ وہ اس کا ہمدرد اور غم گسار ہے۔

ایک دفعہ بہار میں ہندوستانی اصطلاحات کی ترویج کے سلسلہ میں ایک کمیٹی مقرر ہوئی اور اس کی جانب سے سوالات جملہ یونیورسٹیوں کو بھیجے گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ان کا جو جواب دیا اسے جامعۂ عثمانیہ کی طرف سے سرکاری جواب کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا، اور بعد کو وہ یونیورسٹی میگزین میں بھی چھپا تھا۔ جواب بہت جامع تھا۔ اسے پڑھکر ڈاکٹر صاحب کی وسیع معلومات ، علمی قابلیت اور اعلیٰ انشا پردازی کا اعتراف کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اس کا عنوان تھا :— '' ہندوستانی ٹیکنیکل ٹرمز۔''

علم السنه پر ان کی گہری نظر تھی۔ وضع اصطلاحات ان کا خاص مضمون تھا۔ وحید الدین سلیم کی کتاب ''وضع اصطلاحات'' کے بعض حصوں پر انہوں نے کڑی نکته چینی کی تھی اور بتایا تھا که علمی اصطلاحات کن اصولوں پر وضع ہونی چاہئیں۔ حیدرآباد کے دارالترجمه کی کمیٹی اصطلاحات کے لئے بھی ڈاکٹر صاحب نے قابل قدر خدمات انجام دی تھیں۔ علم‌الحیوانات، علم نباتات، ریاضی، علم هندسه، طب اور انجینیری کی اصطلاحات وضع کرنے کے سلسله میں انہوں نے خصوصیت کے ساتھ مفید کام کیا تھا۔

ریاست حیدر آباد کے واقعات سے ڈاکٹر صاحب بہت متاثر تھے۔ اس کی وجه یه تھی جیسا که وہ خود فرماتے تھے که ''جس قسم کا کلچر حیدرآباد نے گذشته سو سال میں پیدا کیا اور جس کی وجه سے وہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات ہمیشه برادرانه رہے، وہ اب ختم ہو گیا۔'' وہ نظام کو اس کلچر کی ظاہری علامت قرار دیتے تھے اور سجھے ان کے ذاتی قصے سنایا کرتے تھے که کس طرح وہ اپنی جمله رعایا کی مذہبی تقریبات میں به نفس نفیس شریک ہوتے تھے اور ان کی خوشیوں کو دوبالا کیا کرتے تھے۔ وہ ہمیشه دوران گفتگو میں نظام کے متعلق ''اعلیٰ حضرت'' کا لقب استعمال کرتے تھے اور بتایا کرتے تھے که کس طرح سے ''حضور نظام'' ان کو اور ان کی جرمن بیگم اور سالی کو دعوتوں میں شریک کر کے ان کی عزت افزائی کا موجب ہوا کرتے تھے۔ وہ نظام کے دل و جان سے وفادار تھے اور جہاں تک جذبهٔ وفاداری کا تعلق ہے اس میں وہ قدرے قدامت پسند واقع ہوئے تھے۔ انہیں اس بات کا اعتراف تھا که حیدرآباد کی تعمیر میں ''غیر ملکیوں'' نے ''ملکیوں'' سے کہیں زیادہ حصه لیا ہے اور اس نقطهٔ نظر سے وہ ''ملکی'' و ''غیر ملکی'' کی بحث کو بہت برا سمجھتے تھے۔ ساتھ ہی انہیں یه کہنے

میں مطلق باک نہ تھا کہ حیدرآباد کی پہلی ”ملکی وزارت“ ہی کی کوتاہیوں کی وجہ سے ریاست کو یہ روزبد دیکھنا پڑا۔

کراچی میں انہوں نے اردو-بنگالی کی بحث میں حصہ لیا تھا۔ ان کی رائے تھی کہ قومی زبانیں اکثریت کے بل بوتہ پر نہیں بنا کرتیں، دوسرے یہ کہ بنگالی میں وہ اسلامی لٹریچر موجود نہیں ہے جو اردو میں گزشتہ ساڑھے تین سو سال میں پیدا ہوگیا ہے اور تیسرے یہ کہ اردو مسلمانوں کی مذہبی زبان کی حیثیت رکھتی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو بنگالی کو صدیوں میں نصیب نہیں ہوگی۔ اس بنا پر وہ اردو کو پاکستان کی واحد قومی زبان تصور کرتے تھے۔

ریڈیو پاکستان سے بھی ان کی چند تقریریں نشر ہوئی تھیں۔ میں مرحوم کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میری کتاب ”تذکرہ مولوی ذکاءاللہ دہلوی“ کا پیش لفظ تحریر فرمایا اور ایک ریڈیائی تقریر میں میری کتاب ”لطائف ملا نصرالدین“ پر تبصرہ بھی فرمایا۔

مرحوم سرسید کے بیحد مداح تھے اور انہیں ہندوستان کے مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھتے تھے۔ انہیں سرسید کی اس رائے سے بھی اتفاق تھا کہ مغربی تعلیم نے ہمیں عربی گھوڑا بنانے کے بجائے محض خچر بنا کر چھوڑدیا ہے۔

اسی طرح ڈاکٹر صاحب غالب کے بھی بیحد مداح تھے اور ان کے خطوں کی تعریف میں ہمیشہ رطب اللسان رہا کرتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے انہیں لکھا کہ ”آپ غالب کے زبردست مداحوں میں ہیں لیکن آپ کے پاس غالب کے نامناسب الفاظ کا کیا جواز ہے جو انہوں نے بعض اشخاص کے متعلق اپنے رقعات میں استعمال کئے ہیں؟“ جواب میں انہوں نے لکھا:—

”غالب کی زبان مستند ہے لیکن غالب کی تہذیب مستند نہیں، تاہم لفظ—یا اس قسم کے اور الفاظ پر جو غالب نے استعمال کئے ہیں، گرفت نہیں کرنی چاہئے۔

> اول تو یہ الفاظ بہ پیرایۂ بول چال لکھے گئے ہیں، دوسرے ان میں بیحد بے تکلفی برتی گئی ہے اور بے تکلفی کے موقعوں پر مہذب سے مہذب آدمی بھی نامہذب ہوجاتا ہے، تیسرے لٹریچر میں خیالات اور زبان دونوں میں رندی و بدمستی جائز ہے، چوتھے رقعات میں غالب اور ان کے دوستوں کے پرائیویٹ معاملات بھی درج ہیں۔ اسی بنا پر جب غالب کے ایک دوست منشی شیو نراین نے غالب کی حیات ہی میں ان خطوط کو شائع کرنے کا ارادہ کیا تو غالب نے انہیں روک دیا اور اپنے جواب کے آخر میں لکھا کہ۔۔۔۔ کیا ضرور ہے کہ ہمارے آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔"

مرنے سے کچھ عرصہ پیشتر انہوں نے شغل کی خاطر اپنے آپ کو اسلامیہ کالج سے وابستہ کرلیا تھا۔ کالج کے طلبا سے پوچھئے تو وہ آپ کو بتائینگے کہ بہ حیثیت پروفیسر کے وہ کس شان کے مالک تھے۔ انہیں اپنے مضمون سے جو انہماک تھا وہ بہت کم اساتذہ میں دیکھنے میں آتا ہے۔ انہوں نے طلبا کو اپنے گھر پر آنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ کالج میں بھی طلبا انہیں گھیرے رہتے تھے۔ انہوں نے کالج کی ریشہ دوانیوں میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا، وہ سب سے الگ تھلگ رہتے تھے اور محض اپنے کام سے کام رکھتے تھے۔ ان میں خوشامد نام کو نہ تھی، لیکن طلبا کی خدمت کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ لڑکے بھی ان کا سچا احترام کرتے تھے اور کبھی کوئی حرکت ایسی نہ کرتے تھے جس سے ڈاکٹر صاحب کو کوفت ہو۔

ڈاکٹر صاحب بہت شریف الطبع انسان تھے، حقیقی معنوں میں جنٹلمین۔ میں نے ۳۵ برس کی مدت میں ان کے منہ سے کبھی

کوئی ناشایستہ کلمہ نہیں سنا ۔ اپنے مخالفین کا ذکر بھی وہ احترام سے کیا کرتے تھے ۔ انہوں نے زندگی بھر کسی کو دکھ نہیں دیا اور نہ کسی اور صورت سے کسی کے مفاد کو گزند پہنچایا ۔ جب کبھی خود ان کے مفاد کو نقصان پہنچایا گیا اس وقت بھی انہوں نے صرف اپنی مدافعت کی اور مدافعت کے دوران میں بھی کبھی کوئی ناشایستہ لفظ اپنے مخالفین کے لئے استعمال نہیں کیا۔

ڈاکٹر صاحب کو فلسفہ سے خاص شغف تھا ۔ اسی وجہ سے انہوں نے پہلے تو کلام اقبال کی روشنی میں مغربی فلسفہ کا مطالعہ کیا اور پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ اقبال نے مغربی فلسفہ کے طلسم کو توڑ کر اپنی راہ الگ نکالی ھے جس کا واحد سرچشمہ اسلام اور صرف اسلام ھے ۔ چنانچہ وفات سے دس پندرہ برس پہلے انہوں نے اردو میں ''اقبال اور مغرب'' کے عنوان سے جو مبسوط مقالہ لکھا تھا وہ ان کے خیالات کا پوری طرح آئینہ دار ھے ۔ اس مقالہ میں جہاں مغربی فلاسفروں کے فلسفہ سے بحث کی گئی ھے وہاں یہ بھی دکھایا گیا ھے کہ اقبال نے کس طرح سے اس کے تاروپود بکھیرے ۔ وہ اس خیال کے شدت سے مخالف تھے کہ اقبال کا فلسفہ کسی یورپین مفکر کا رھین منت ھے ۔ وہ اقبال پر بہت کچھ لکھنا چاھتے تھے ، لیکن انہیں نہ تو مہلت ملی اور نہ موقع ھی میسر آیا ۔

وہ ''گلیم خویش بروں می برد زموج'' کے قسم کے انسان نہ تھے ۔ انہوں نے سیکڑوں ایسے طلبا پیدا کرنے میں مدد دی جن کی ذات پر ریاست حیدرآباد کو ھمیشہ فخر رھیگا ۔ وہ ''وہی سعی می کند کہ بگیرد غریق را'' کے قسم کے لوگوں میں تھے اس لئے کہ وہ خوب جانتے تھے کہ ملک ایسے ھی طلبا کی وجہ سے ترقی کرسکتا ھے اور اپنی نجات کا باعث بن سکتا ھے ۔

ڈاکٹر صاحب کی ذات جامع صفات تھی ۔ وہ صاحب فکر تھے ۔ ان کی موت سے علمی دنیا کو جو نقصان عظیم پہنچا ھے

اس کا اندازہ صرف وہ لوگ کرسکتے ھیں جو ایک مرتبہ یا ایک سے زیادہ دفعہ ان سے مل چکے ھوں ۔

وفات سے چند سال پیشتر انہیں عالم ارواح سے بہت شغف ھو گیا تھا اور وہ میڈیموں کی تلاش میں دور دراز مقامات پر بھی جانے سے نہیں چوکتے تھے ۔ ان کا ارادہ تھا کہ ''عالم ارواح'' کے نام سے اردو میں ایک چھوٹا سا ماھوار پرچہ بھی نکالیں لیکن سابقہ حکومت کے افسروں نے اس سلسلہ میں جو جو تاخیریں برتیں اور جو جو رکاوٹیں ڈالیں اسی کا نتیجہ تھا کہ مہینوں کی تگ و دو کے بعد بھی سرکاری اجازت نہ مل سکی ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے انگریزی میں ''میڈیم شپ'' پر ایک معرکۃ الآرا مضمون سپرد قلم کیا تھا جو نومبر ۱۹۵۳ کے ''ٹائمز آف کراچی'' (سنڈے ایڈیشن) میں شائع ھوچکا ھے ۔

یہ میری انتہائی بدقسمتی تھی کہ ان کی آخری علالت کے دوران میں میں بمبئی میں مقیم تھا ۔ ان کی وفات کی خبر بھی مجھے وھیں ملی اور اس طرح میں ان کی آخری خدمت کرنے سے محروم رھا جس کا افسوس مجھے تا زندگی رھیگا ، بالخصوص اس وجہ سے کہ کراچی میں اکیلا میں ھی ایسا شخص تھا جس کے یہاں وہ اوسطاً تیسرے چوتھے دن تشریف لایا کرتے تھے اور گھنٹوں اپنے خیالات سے مستفید کیا کرتے تھے ۔ وہ میرے بچوں سے بہت مانوس تھے اور انہیں طرح طرح کی دلچسپ کہانیاں اور تاریخی واقعات سنایا کرتے تھے ۔ افسوس کہ یہ بلبل ھزار داستان اب ھمیشہ کے لئے خاموش ھے ۔

خدا ڈاکٹر صاحب کی روح کو جس کے راز معلوم کرنے کے لئے وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں بیحد متجسس رھا کرتے تھے ، ابدی سکون عطا فرمائے !

ان کا انتقال ۲۳ فروری ۱۹۵۵ کو ھوا ۔

***

خلیل خالد بک

پہلی جنگ عظمیٰ سے قبل خلیل خالد بک ترکی حکومت کی طرف سے بمبئی میں قونصل کے عہدہ پر سرفراز تھے۔ قونصل بننے سے پہلے وہ آکسفورڈ یا کیمبرج یونیورسٹی میں ترکی کے پروفیسر تھے۔ غالباً ۱۹۱۲ میں ہلال احمر کی نمائش کے سلسلہ میں وہ دہلی تشریف لائے اور میڈنز ہوٹل میں قیام پزیر ہوئے۔ ایک سہ پہر کو مولانا محمد علی نے اپنے دفتر واقع کوچۂ چیلاں میں ان کے اعزاز میں پرتکلف ٹی پارٹی دی۔ اس تقریب کا فوٹو جو اچھی خاصی تاریخی اہمیت رکھتا ہے، درج کتاب کیا جا رہا ہے۔

ان دنوں میں ''ہمدرد'' سے وابستہ تھا۔ ایک دن خیال آیا کہ چل کر ترکی قونصل سے انٹرویو لینا چاہئے۔ چنانچہ میں دو تین گھنٹے تک مختلف امور پر ان سے باتیں کرتا رہا۔ اثنائے گفتگو میں انہوں نے افسوس کے ساتھ کہا کہ ''میں غیر ملک کا رہنے والا ہوں اور مجھے آپ لوگوں کے مقامی امُور سے کوئی واسطہ نہیں ہے، لیکن پھر بھی دہلی کے اکثر لیڈروں نے مجھ سے ایک دوسرے کی برائیاں بیان کیں، سوائے ڈاکٹر انصاری، مولانا محمد علی اور حکیم اجمل خاں کے۔'' میں نے جواب میں کہا کہ یہ یقیناً ہماری ۱۵۰ سالہ غلامی کا ایک نہایت مکروہ پہلو ہے۔'' باتوں باتوں میں انہوں نے کہا کہ ''پچھلی اتوار کو میں دہلی کے آثار قدیمہ دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ میری آنکھوں سے بے اختیار آنسو نکل پڑے۔ کون ایسا سخت دل ہوگا جو اس عظمت رفتہ پر ماتم کناں نہ ہو؟''

میں نے انٹرویو کا حال ''ہمدرد'' کے لئے تین چار کالم میں لکھا۔ اس کی اشاعت کے چند دن بعد مولانا محمد علی نے مجھے

مہمان خانہ میں بلایا۔ اس وقت ان کے پاس مولانا ابوالکلام آزاد اور توفیق بک (مدیر ''تصویر افکار'' قسطنطنیہ) بیٹھے ہوئے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی مولانا مجھ پر برس پڑے اور کہا کہ ''بھوپال کے ایک شخص کا خط آیا ہے جس میں لکھا ہے کہ انٹرویو میں بعض ایسی باتیں آگئی ہیں جن کی وجہ سے ترکی قونصل کی پوزیشن نازک ہو گئی ہے۔ تمہیں ایسی باتیں تحریر میں نہیں لانی چاہئے تھیں۔'' میں نے عرض کیا کہ ''آپ پہلے اس مضمون کو پڑھ لیں اور اس کے بعد اگر آپ اس میں کوئی بات قابل گرفت دیکھیں تو مجھے ڈانٹ سکتے ہیں۔'' مولانا ابوالکلام آزاد نے از خود میری تائید کرتے ہوئے فرمایا کہ ''پہلے مضمون پڑھ لیا جائے۔'' چنانچہ وہ پرچہ منگوا کر پڑھا گیا مگر اس میں کوئی بات بھی قابل گرفت نہ نکلی۔ مضمون سن کر مولانا محمد علی خاموش ہو گئے اور پھر قدرے سکوت کے بعد فرمایا:۔ ''اچھا تو تم اس انٹرویو کا انگریزی میں ترجمہ کر کے قونصل صاحب کو بھیجدو تا کہ وہ اصل حقیقت سے آگاہ ہو جائیں اس لئے کہ شکایت کا خط انہی کی وساطت سے مجھ تک پہنچا ہے۔'' چنانچہ میں نے انٹرویو کا ترجمہ کر کے بمبئی بھیجدیا۔ چند دن کے بعد ترکی قونصل کے پاس سے جواب موصول ہو گیا جس میں لکھا تھا کہ ''مضمون میں کوئی بات بھی قابل اعتراض نہیں ہے۔''

خلیل خالد بک The Diary of a Turk (ایک ترک کا روزنامچہ) اور ''ہلال و صلیب'' کے مصنف تھے۔ ان کی دونوں کتابیں یورپ میں بہت مقبول ہوئیں۔

یہ پہلے ترک تھے جن سے میری ملاقات ہوئی۔ میں ان کے اخلاق اور اسلامی جذبات سے بیحد متاثر ہوا۔ اپنے قد و قامت اور رنگ و روپ کے اعتبار سے وہ بالکل یوروپین معلوم ہوتے تھے، مگر تھے پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگے ہوئے۔

***

وحید الدین بیخود دہلوی

کوئی ساٹھ ستر سال پہلے کی بات ہے کہ میرے والد نے محلہ مٹیا محل دھلی میں بیخود صاحب کا مکان کرایہ پر لیا۔ اس زمانہ میں بیخود کے خاندان کے لوگ گوالیار میں ملازم تھے، اگرچہ دھلی ان کا آنا جانا رهتا تھا۔ بیخود کے بھائی امین‌الدین میرے هم مدرسہ تھے۔ ان کے دوسرے بھائی امیرالدین سے میرے اور میرے بھائیوں کے گہرے مراسم تھے اور آج بھی ہیں۔ امین‌الدین اسکول کے زمانہ سے نہایت اچھی فٹ بال کھیلتے تھے، اتنی اچھی کہ ان کا دور دور شہرہ تھا۔ بیخود باعتبار پیشہ ”منشی“ تھے یعنی انگریزوں کو اردو پڑھایا کرتے تھے۔

بیخود کو کبوتر اڑانے کا بھی شوق تھا۔ یہ شوق کم و بیش اس زمانہ میں دھلی والوں میں عام تھا۔ وہ دوسروں کی ٹکڑیوں سے اپنے کبوتروں کو لڑایا کرتے تھے اور اس تفریح کے دوران میں اگر کوئی ملنے والا آجاتا تو وہ بہت بگڑتے اور طرح طرح کی صلواتیں سناتے۔ حج کے بعد سے یہ چیز موقوف ہو گئی تھی۔

ایک دن اقبال کی شاعری پر گفتگو ہو رہی تھی۔ میں نے کہا کہ ”آپ بھی ان کی طرح قومی نظمیں کیوں نہیں لکھتے؟ آپ نے ساری عمر عشقیہ مضامین باندھنے میں صرف کردی ہے حالانکہ عشق و محبت انسانی زندگی کا صرف ایک جزو ہے۔“ فرمایا:— ”میں تو اساتذہ کی تقلید میں غزلیں لکھتا ہوں اور ان میں ہر قسم کے مضامیں بندھ جاتے ہیں، سیاسی بھی اور غیرسیاسی بھی۔ یہ قومی نظمیں تو حال کی پیداوار ہیں۔ اس سے پہلے کی شاعری گل و بلبل، عشق و محبت اور تصوف تک محدود تھی۔ میری شاعری میں یہ سب چیزیں آپ کو ملینگی۔ شاعری کا رنگ

زمانہ کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے ۔ آج کل بلا شبہ قومی و ملی نظموں کی ضرورت ہے تا کہ حب الوطنی اور ملت پرستی کے جذبات ابھریں ۔ مگر عشقیہ مضامین بھی اپنا الگ مقام رکھتے ہیں اور یہ بھی زندگی ہے ۔''

بیخود داغ کے چہیتے شاگرد تھے ۔ استاد کے انتقال پر بیخود ، سائل ، شاعر اور نوح کے شاگردوں نے الگ الگ اپنے استادوں کو داغ کا جانشین قرار دے دیا ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے ہر ایک داغ کا جانشیں بننے کا اہل تھا ۔ مگر میں نے ایک بات دیکھی کہ جہاں بیخود اور سائل کے ایسے بھی شاگرد تھے جو باہم دست و گریباں رہا کرتے تھے وہاں کچھ ایسے بھی تھے جو دونوں کا یکساں احترام کرتے تھے ۔ بمبئی میں بیخود کے ایک شاگرد محشر امروہوی ہیں ، وہ سائل کی غزلوں کو ہو بہو انہی کے انداز میں پڑھکر محفل میں سماں باندھ دیتے ہیں ۔ خود بیخود اور سائل میں خلوص و محبت کے تعلقات تھے ۔ شاعرانہ نوک جھوک کبھی ان تعلقات میں حائل نہیں ہوئی ۔ میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ مجھے ان چاروں '' خلفا '' کی خدمت میں نیاز حاصل رہ چکا ہے ۔

بیخود بیحد لسان تھے ۔ ان کی لسانی اس وقت عروج پر پہنچ جاتی تھی جب وہ اپنی شکار کی مہموں یا جنوں کے قصے بیان کیا کرتے تھے ۔ اس وقت ان کی گفتگو میں مبالغہ ہی مبالغہ ہوتا تھا ۔ لیکن سامعین ان کی کہانیوں کو بہت شوق سے سنتے تھے اور بڑا مزا لیتے تھے ۔ مہاراجہ گوالیار اور کونجوں والا قصہ اس قدر مشہور ہے کہ اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں ۔ دہلی میں مشکل سے ان کا کوئی دوست ایسا ہوگا جس نے ان کی زبانی یہ قصہ نہ سنا ہو ۔ وہ غپیں یا ڈینگیں اس لئے نہیں مارتے تھے کہ دوسرے لوگ ان کے رعب میں آجائیں ، بلکہ مقصد یہ ہوتا تھا کہ تھوڑی دیر تک احباب کے لئے سامان تفریح مہیا کر دیا جائے

اور بس ۔ مگر جب وہ شیروں کے شکار کے قصے بیان کرتے تھے تو بلاشبہ لوگ یہ سمجھتے تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں سیکڑوں ھی شیر مارے ہونگے ۔ مگر یہ حقیقت نہ تھی۔ ان کے پاس دو نالی ضرور تھی اور وہ شکار کو کبھی کبھار جاتے تھے اور شکار مار کر لایا بھی کرتے تھے ۔ مگر یہ کہ وہ شیر کے بچوں کو اپنے شکاری کوٹ کی جیبوں میں ڈال کر لے آیا کرتے تھے ، محض افسانے ھی افسانے ھیں جن کی کوئی بنیاد نہیں۔

چونکہ ملازمت کے سلسلہ میں میرا قیام بمبئی میں رھتا تھا اس لئے چھٹیوں کے زمانہ میں جب کبھی میں دھلی جاتا تو بیخود صاحب کے یہاں ضرور حاضری دیا کرتا تھا ۔ میں ان سے عمر میں بہت چھوٹا تھا لیکن وہ مجھ سے بالکل دوستوں کی طرح بے تکلفی سے ملتے تھے ۔ آخری عمر میں وہ رعشہ کی وجہ سے لکھنے سے معذور تھے ، مگر اس سے قبل وہ خطوں کا جواب خود دیا کرتے تھے ۔ میرے پاس ان کے کچھ خطوط ھیں ۔ اردو کے کسی محاورہ کے بارے میں یا تذکیر و تانیث کے معاملہ میں جب کبھی مجھے الجھن ھوتی تو میں انہی سے رجوع کرتا تھا ۔ جنوری ۱۹۴۹ میں انہوں نے میری درخواست پر اپنے دونوں ھاتھوں کی مدد سے مجھے ذیل کی رباعی پنسل سے لکھکر عنایت فرمائی تھی :-

بوڑھا ھوں مگر طبع جواں رکھتا ھوں
صورت پہ نہ جا حسن بیاں رکھتا ھوں
ملتی ھے مجھے داد فصاحت بیخود
میں قلعۂ دھلی کی زباں رکھتا ھوں

۱۱-۱۹۱۰ میں میرے دوست فضل الٰہی قریشی کے والد ماجد صوبیدار عبدالغنی کا انتقال ھو گیا ۔ اس وقت انہوں نے مجھ سے کہا کہ ”بیخود صاحب سے ایک قطعۂ تاریخ لکھوا دو جو والد کی قبر پر کتبہ کی شکل میں لگایا جائیگا ۔“ چنانچہ میں بیخود صاحب کی خدمت میں پہنچا ۔ انہوں نے پہلے تو مرحوم

کے متعلق کچھ باتیں دریافت کیں اور پھر بیٹھے بیٹھے برجستہ ایک قطعۂ تاریخ موزوں کر دیا ۔ انہیں مطلق فکر یا جستجو نہیں کرنی پڑی ۔ معلوم ہوتا تھا کہ شعر ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑے ہیں ۔

بیخود کی آواز بڑی کڑاکے دار تھی ۔ نوے برس کی عمر میں بھی ان کی آواز جوانی کے زمانہ کی طرح گرجدار تھی ۔ آواز سے معلوم ہوتا تھا کہ ان میں کتنی زندگی ہے ۔ میں نے متعدد بوڑھوں کو دیکھا ہے جو مرنے کی دعائیں مانگتے رہتے ہیں، لیکن بیخود میں یہ بات نہ تھی ۔ وہ جئے جاتے تھے اور آخر وقت تک شغل شاعری جاری تھا ۔ ۱۹۴۷ میں انہوں نے پنڈت نہرو کی دعوت پر قلعۂ معلیٰ میں بڑی شاندار نظم پڑھی تھی ۔ یہ سر تا پا قومی جذبات سے مملو تھی اور آزادی کے موضوع پر لکھی گئی تھی ۔ معلوم نہیں کہ وہ انگریزوں کے چلے جانے سے کہاں تک خوش تھے، لیکن نظم سے یہی معلوم ہوتا تھا کہ وہ خوش ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ ملک ”آزاد“ ہو گیا ہے ۔

بیخود بڑے خوش مزاج آدمی تھے ۔ میں نے انہیں کبھی پریشان ہوتے نہیں دیکھا ۔ آخری عمر میں وہ لوگوں سے مل کر بہت خوش ہوتے تھے اور دیر تک باتیں کرتے تھے ۔ جنوری ۱۹۴۹ میں میرے کئی گھنٹے ان کی خدمت میں صرف ہوئے ۔ ان سے یہ میری آخری ملاقات تھی ۔

بہت کم لوگ ایسے ہونگے جن سے ہمارے گھروالوں کی طرح بیخود والوں سے اتنے پرانے روابط ہوں ۔ جب کبھی میری ان سے ملاقات ہوتی وہ گھر کے ایک ایک فرد کا نام لے کر احوال دریافت فرماتے ۔

ان کا انتقال ۹۲ برس کی عمر میں ہوا ۔

***

حکیم اجمل خاں

میرا طالب علمی کا زمانہ تھا کہ ایک دن معلوم ہوا کہ آج حکیم صاحب کے یہاں عمائدین شہر کا جلسہ ہوگا۔ چنانچہ چیلوں کے کوچہ سے آصف علی، ملا واحدی اور راقم الحروف جلسہ میں شریک ہوئے۔ قصہ یہ تھا کہ ہندوؤں کا کوئی تہوار ایسے دن آ گیا تھا جس دن مسلمانوں کا بھی تہوار پڑتا تھا۔ حکیم صاحب کی تمام تر کوشش یہی تھی کہ معاملہ خوش اسلوبی سے نپٹ جائے اور کسی قسم کی آویزش نہ ہونے پائے۔ حکیم صاحب کے یہاں جو مسلمان جمع تھے وہ بہت دیر کے بحث و مباحثہ کے بعد اس بات پر راضی ہو گئے تھے کہ مسلمان اپنا جلوس الگ راستہ سے لے جائینگے۔ ابھی جلسہ ختم نہ ہوا تھا کہ ایک مولوی نما حضرت جو خیر سے ایک اخبار کے ایڈیٹر بھی تھے، نازل ہوگئے اور زور زور سے چلا کر کہنے لگے کہ ''ہمیں کفار کے ساتھ اتحاد کرنے سے مذہباً روکا گیا ہے۔ ہم ان سے ہرگز اتحاد نہ کرینگے۔'' اہل جلسہ پریشان تھے کہ کہیں سارے کئے کرائے پر پانی نہ پھرجائے، مگر حکیم صاحب نے ایسی خوبصورتی سے اس شخص کو رام کیا کہ سب عش عش کرنے لگے۔ بعد کو معلوم ہوا کہ وہ شخص حکومت کا آدمی تھا اور جلسہ میں اسی لئے بھیجا گیا تھا کہ مذہب کے نام پر گڑبڑ کرائے۔ سیاسیات میں داخل ہونے سے قبل بھی حکیم صاحب ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ ان کا مکان دونوں فرقوں کے افراد کے باہمی مشوروں کے لئے ہمیشہ کھلا رہتا تھا اور وہیں اس اتحاد کی اینٹیں تیار ہوتی تھیں۔ اہل دھلی کو حکیم صاحب سے گہری محبت اور عقیدت تھی۔

حکیم صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے طب یونانی کے مردہ جسم میں ازسر نو جان ڈالی اور طب اور وید ک کو جدید سائنٹفک بنیادوں پر قائم کیا ۔ ان کی زندگی کا مقصد خدمت الناس تھا ۔ آمدنی کا معتدبہ حصہ جو راجاؤں اور نوابوں سے وصول ہوتا تھا ، ہمیشہ غربا کی خدمت کے لئے وقف رہا ۔ انفلوئنزا کے ہولناک ایام میں حکیم صاحب ، ان کے رفقائے کار اور ہزارہا شاگردوں نے ہندوستان بھر میں بیماروں کی خدمت جس تندھی ، انہماک اور محبت سے انجام دی وہ آپ اپنی نظیر ہے ۔ یہ سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے ۔ یہ حکیم صاحب کی مسیحائی تھی کہ تقریباً ۸۵ فیصدی مریض اس مہلک وبا سے جانبر ہوسکے ۔ بقول مولانا محمد علی ''حکیم صاحب نے کم و بیش ۵۰ لاکھ انسانوں کا مفت علاج کیا ہوگا اور انہیں قیمتی سے قیمتی دوائیں اپنے پاس سے مفت دی ہونگی ۔''

خاندان شریفی کا یہ طرۂ امتیاز رہا ہے کہ اس کا کوئی فرد دھلی کی چار دیواری کے اندر کسی مریض سے کوئی فیس نہیں لیتا ۔ یہ خصوصیت امیر غریب سب کے لئے ہے ۔ خواہ آپ ان کے مطب میں جائیں ، خواہ آپ انہیں اپنے گھر پر بلائیں ، مریض کو دیکھنے کی کوئی فیس نہیں لی جاتی ۔ یہی طریقۂ کار حکیم اجمل خاں کا تھا ۔ ان کا قاعدہ تھا کہ وہ اپنے زیر علاج مریضوں کو مطب میں آنے سے قبل اپنی گاڑی میں بیٹھ کر خود ان کے گھروں پر جا کر دیکھ آتے تھے ۔ یہ ان کا روز کا معمول تھا اور اس میں فرق اس وقت آتا تھا جب وہ خود جانے سے معذور ہوں یا دھلی میں موجود نہ ہوں ۔

اس سلسلہ میں میں ایک واقعہ بیان کرونگا جسے میری پہلی بیوی محمودہ بانو نے بیان کیا تھا ۔ وہ کہتی تھیں کہ ''میں بیمار رہا کرتی تھی اور کبھی کبھی ہلکا بخار بھی چڑھ جاتا تھا ۔ گھر والوں کا خیال تھا کہ میں ٹی بی میں مبتلا ہوں ، اسی لئے

میں نے حکیم صاحب کے نام خط لکھ بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ کسی دن آکر مجھے دیکھ جائیں۔ اس واقعہ کے چند دن بعد کیا دیکھتی ہوں کہ ایک دن صبح سویرے حکیم صاحب ڈھونڈتے ڈھانڈتے مکان پر آگئے اور مجھے خوب اچھی طرح سے دیکھ کر فرمایا کہ ٹی۔ بی کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس کے بعد نسخہ لکھدیا جس کے چند روزہ استعمال سے میں بالکل اچھی ہوگئی۔"

لوگ دور دور سے انہیں خط بھیجا کرتے تھے جن میں اپنی بیماریوں کا حال لکھ کر نسخہ طلب کیا کرتے تھے۔ حکیم صاحب کا قاعدہ تھا کہ وہ ان خطوں کا جواب دینے کے لئے ایک منتہی حکیم اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ معمولی خطوں کا جواب وہ خود لکھ بھیجتا تھا، اور پیچیدہ امراض میں حکیم صاحب سے مشورہ کرکے نسخہ تجویز کردیتا تھا۔

دسمبر ۱۹۱۹ میں مجھے آٹھ دن تک حکیم صاحب کے ساتھ ایک جگہ رہنے کا اتفاق ہوا۔* بات یہ تھی کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ امرتسر کے صدر تھے اور اپنا خطبہ تیار کرنے کی غرض سے دوجانہ تشریف لے گئے تھے جو دھلی سے ۵۰ میل کے فاصلہ پر ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ میرا کام یہ تھا کہ میں خبروں، اھم تقریروں، مضمونوں یا بیانوں کا اردو ترجمہ حکیم صاحب کے گوش گزار کردیا کروں۔ یہ خدمت صبح کے ناشتہ کے بعد انجام دی جاتی تھی۔ اس کے بعد حکیم صاحب ایڈریس لکھنے میں مشغول ہوجاتے تھے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا کہ حکیم صاحب کو ترجمہ سننے کی فرصت نہیں ہوئی یا یہ کہ وہ نواب صاحب سے ملنے کے لئے تشریف لے گئے تو وقت کی بچت کے خیال سے میں قابل توجہ

---

* اس سفر میں حکیم ذکی احمد (مالک جید پریس، دھلی) بھی پارٹی میں شامل تھے۔

مضامین کا خلاصہ اردو میں تیار کرلیتا تھا تا کہ حکیم صاحب جب چاہیں، ملاحظہ فرمالیں۔ حکیم صاحب نے دوجانہ چھوڑنے سے قبل اپنا خطبہ مکمل کرلیا تھا اور اس کے وہ حصے جن کا تعلق جنرل ڈایر سے تھا، مجھے پڑھ کر سنائے بھی تھے۔

جب ایڈریس تیار ہو گیا تو حکیم صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ ''اس کا انگریزی میں ترجمہ کردو۔'' میں نے عرض کیا کہ ''میں اس خدمت کے لئے بالکل تیار ہوں، لیکن اگر آپ چاہتے ہیں کہ جس پایہ کی اس کی اردو ہے اسی شان کی انگریزی بھی ہو تو آصف علی صاحب سے اس کا ترجمہ کرائیے۔'' چنانچہ حکیم صاحب نے میرا مشورہ قبول فرما لیا اور ترجمہ آصف علی ہی سے کرایا۔

حکیم صاحب کو ہمیشہ سے اس بات کا شوق تھا کہ وہ جس ریاست میں جاتے وہاں کی قدیم چیزوں کو دیکھتے، پرانی کتابیں ملاحظہ کرتے، شاہی فرامین پر نظر ڈالتے اور دیگر نوادرات کا بھی مشاہدہ فرماتے۔ چنانچہ دوجانہ پہنچنے پر جب انہیں ذرا سکون ملا تو نواب خورشید علی خاں نے جو حکیم صاحب کے مذاق سے خوب واقف تھے، ان کے ملاحظہ کے لئے ریاست کے گھوڑے پیش کئے۔ یہ نہایت قدآور اور قیمتی تھے۔ پہلی جنگ عظمیٰ میں نواب صاحب نے گھوڑوں سے اور روپے پیسے سے برطانیہ کی مقدور بھر امداد کی تھی۔ نواب صاحب نے حکیم صاحب کو وہ سند بھی دکھائی جو لارڈ کیننگ نے غدر کے بعد ان کے بزرگوں کو عطا کی تھی۔

ایک دن اثنائے گفتگو میں حکیم صاحب نے فرمایا:۔ ''جب میں پہلی مرتبہ ریاست ٹیکم گڑھ میں بغرض علاج گیا تو اس وقت راجہ نے بڑے فخر کے ساتھ مجھے وہ تلوار دکھائی جس سے ابوالفضل کو قتل کیا گیا تھا۔'' (یہ قتل شہزادہ سلیم کے اشارہ سے ہوا تھا۔) اس ایک واقعہ سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ

حکیم صاحب جب کبھی ریاستوں میں جاتے تو وہ اپنے وقت کا بہترین استعمال کیا کرتے تھے۔ اس قسم کی باتیں وہ بالعموم رات کا کھانا کھانے کے بعد سنایا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ رات کے دس ساڑھے دس بجے تک رھتا تھا۔ ان نشستوں میں وہ کبھی کبھی اپنے اشعار بھی سناتے تھے۔ ان کا تخلص ''شیدا'' تھا۔ ان کا کلام نہایت خوبصورت جلد میں جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی طرف سے شائع ھو چکا ھے۔

ایک دن لارڈ ھارڈنگ کی مہربانیوں کا ذکر تھا۔ فرمانے لگے:۔ ''علم طب پر لارڈ موصوف کا بڑا احسان ھے اس لئے کہ انھوں نے طبیہ کالج (قرول باغ، دھلی) کی زمین محض برائے نام قیمت پر دلوادی۔'' میں نے جب اس اجمال کی تفصیل دریافت کی تو فرمایا:۔''طبیہ کالج کی زمین کا مسئلہ مدتوں سے چیف کمشنر کے زیر غور تھا۔ وہ فی گز بہت زیادہ قیمت طلب کرتا تھا۔ اسی زمانہ میں دھلی میں لارڈ ھارڈنگ کے اعزاز میں ایک گارڈن پارٹی ترتیب دی گئی۔ وھاں وہ مہمانوں سے ملتے ملاتے میرے پاس بھی آنکلے اور باتوں باتوں میں پوچھا کہ زمین کا قصہ طے ھوا یا نہیں؟ میں نے کہا کہ جو قیمت طلب کی جارھی ھے، وہ ھماری بساط سے باھر ھے۔ ھمیں زمین اول تو مفت ملنی چاھئے ورنہ برائے نام قیمت پر۔ لارڈ موصوف نے اسی وقت چیف کمشنر سے بتاکید فرمایا کہ زمین کا فیصلہ حکیم صاحب کے حسب منشا جلد سے جلد طے کردو۔ نتیجہ یہ ھوا کہ جو قیمت بالآخر طلب کی گئی وہ ھمارے اندازہ سے بھی بہت کم نکلی۔'' لارڈ موصوف حکیم صاحب کی بیحد عزت کرتے تھے اور اپنے افسروں سے کہا کرتے تھے کہ ''وہ دھلی کے بے تاج بادشاہ ھیں۔''

حکیم صاحب اردو، فارسی اور عربی کے زبردست ادیب تھے۔ ایک زمانہ میں وہ مختلف رسائل میں بھی مضامین لکھا کرتے تھے۔ بوعلی سینا پر ان کے سلسلہ وار مضامین ''دکن ریویو'' میں

شائع ہوچکے ہیں۔ ان کے انتقال پر استاذی سی۔ ایف۔ اینڈریوز نے جو مضمون لکھا تھا اس میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا کہ ”اردو میں انہیں گفتگو کرتے ہوئے سننا نہایت مسرت انگیز منظر ہوتا ہے۔“

ان کی طبیعت میں بیحد مزاح تھا لیکن بغایت درجہ لطیف۔ جس زمانہ میں ہم دوجانہ میں مقیم تھے ان ہی دنوں کا مذکور ہے کہ نواب صاحب نے ان سے کہا :- ”حکیم صاحب، انفلورا انزا (انفلوئنزا) نے تو ریاست میں غضب ڈھا دیا تھا۔“ پھر کہا کہ ”میں نے اپنے محل میں ٹاؤن ہال بنوایا ہے۔ اسے چلکر دیکھ لیجئے۔“ حکیم صاحب نے واپسی پر یہ گفتگو مجھ سے دھرائی اور فرمایا کہ ”نواب صاحب کے منہ سے انفلونزا کی بجائے انفلورا انزا اور اپنے بڑے کمرے کو ٹاؤن ہال کہنا بڑا لطف دیتا ہے۔ سہ پہر کو جب میں تمہیں ان سے ملواؤں تو تم بھی ان سے اس بیماری کی تباہ کاریوں کا حال پوچھنا اور یہ بھی دریافت کرنا کہ آپ نے اپنے محل میں کن کن چیزوں کا اضافہ کیا ہے۔ پھر وہ خود ہی ٹاؤن ہال کا ذکر کرینگے۔“ چنانچہ باریابی کے موقع پر بہت دیر تک گفتگو ہوتی رہی۔ اثنائے گفتگو میں نواب صاحب نے انفلوئنزا کی ہولناکیوں کا اور اپنے محل میں ٹاؤن ہال کے اضافہ کا ذکر کیا۔ میں نے دیکھا کہ حکیم صاحب خوب لطف لے رہے ہیں اور مسکراتے جاتے ہیں۔

رات کے کھانے کے بعد حکیم صاحب اپنی سیاحت انگلستان و ٹرکی کے واقعات بھی سنایا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن فرمایا کہ ”باوجود حکومت ہند اور وزیر ہند کی زبردست سفارشوں کے انگلستان کے بہت سے دوا ساز کارخانوں نے مجھے اپنے مخصوص طریقے نہیں دکھائے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جن باتوں کو اپنی تجارت کا راز سمجھتے ہیں، ان کے بتانے پر وہ کسی نوع تیار نہیں ہوتے۔“ واپسی پر حکیم صاحب قسطنطنیہ بھی

تشریف لے گئے، فرماتے تھے: کہ "جب میں قسطنطنیہ کے اسٹیشن سے روانہ ہو کر اپنی قیام گاہ پر اترا تو گاڑی والے نے میرے اندازے سے بہت زیادہ کرایہ مانگا جس پر میں نے کہا کہ "یہ کرایہ تو بہت زیادہ ہے۔ میں نے اتنے ملکوں کی سیاحت کی ہے لیکن کہیں بھی اس قدر کرایہ طلب نہیں کیا گیا۔" ابھی گاڑی والے سے گفتگو ہورہی تھی کہ ایک ہندوستانی طالب علم آ نکلا جس نے مجھے پہچان لیا اور بات چیت شروع کردی۔ میں نے اس سے سارا واقعہ بیان کردیا۔ اس پر لڑکے نے ترک گاڑیبان سے (جو شروع ہی سے نہایت مہذب انداز میں گفتگو کر رہا تھا) کہا:— "تمہیں معلوم نہیں کہ یہ کون صاحب ہیں؟ یہ ہندوستان سے آئے ہیں اور ترکی میں ہم سب کے محترم مہمان کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لئے تمہیں ان سے مناسب کرایہ لینا چاہئے۔" گاڑیبان نے کہا کہ "اگر ایسا ہے تو پھر یہ میرے بھی مہمان ہیں اور اب میں ان سے ہرگز ہرگز کرایہ نہیں لے سکتا۔" چنانچہ حکیم صاحب کے اصرار کے باوجود اس نے کرایہ لینے سے صاف انکار کردیا اور چلا گیا۔ جب تک حکیم صاحب قسطنطنیہ میں رہے یہ لڑکا ان کے بڑے کام آیا۔ چلتے وقت حکیم صاحب کو خیال ہوا کہ مستورات کے لئے کچھ برقعے تیار کرالیں، لیکن وقت کم تھا اور اس لئے انہوں نے چند اشرفیاں اس لڑکے کو دے دیں اور فرمایا کہ "اتنے برقعے سلوا کر بھیجدینا۔" دہلی آ کر حکیم صاحب اشرفیوں والا واقعہ بالکل بھول گئے۔ لیکن ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کچھ عرصہ بعد ان کے نام پارسل آ گیا۔ حکیم صاحب اس لڑکے کی بہت تعریف کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ میں اس کی ایمانداری سے بہت متاثر ہوا۔

برطانوی حکومت نے حکیم صاحب کو "حاذق الملک" کا خطاب دیا تھا جسے انہوں نے پنجاب کے مارشل لا کی

سفا کیوں سے متاثر ہو کر ''عطائے تو بہ لقائے تو'' کہکر حکومت کو واپس کر دیا تھا ۔ مگر شکر گزار قوم نے انہیں اس کے بدلہ میں ''مسیح الملک'' کا خطاب دیا ۔ آج بھی لوگ انہیں اسی واجب الاحترام خطاب سے یاد کرتے ہیں ۔

حکیم صاحب کے متعلق ایک واقعہ بیان کرنا چاہتا ہوں جس کا علم مجھے علامہ راشدالخیری سے ہوا ۔ میں اسے اس لئے سپرد قلم کرتا ہوں تاکہ ان کے بلند کردار کا یہ پہلو بھی سامنے آجائے ۔

دھلی میں ایک صاحب تھے جو حکیم صاحب کے ہم محلہ ہونے کے علاوہ بدقسمتی سے اخبار نویس بھی تھے ۔ وہ بڑے آدمیوں پر چھینٹے پھینکنے کے عادی تھے ۔ حکیم صاحب پر بھی کبھی کبھی بارش کرم ہوجاتی تھی ۔ اس شخص کے کسی ریاست پر چند ہزار روپے نکلتے تھے ، اور باوجود کوشش بسیار کے مطلوبہ رقم اسے نہ مل سکی ۔ حکیم صاحب کے اس ریاست سے بہت اچھے تعلقات تھے ۔ شدہ شدہ اس شخص کو خیال ہوا کہ حکیم صاحب کے توسل سے مقصد برآری ہوسکیگی ۔ مگر وہاں جاتا کس منہ سے ؟ لیکن کامیابی کی اور کوئی صورت ممکن نہ تھی ۔ آخر جی کڑا کر کے حکیم صاحب کی خدمت میں پہنچ ہی گیا اور عرض مدعا کیا ۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ''کل آکر خط لیجائیے ۔ '' دوسرے دن یہ صاحب وقت مقررہ پر پہنچے ۔ حکیم صاحب نے فرمایا کہ ''آپ جانتے ہیں کہ میرے سارے خطوط میرا سیکریٹری* لکھتا ہے ، لیکن چونکہ آپ کا یہ معاملہ نجی ہے اور غالباً آپ بھی پسند نہ کرتے اگر میں خط اپنے سیکریٹری سے لکھواتا اس لئے میں نے اسے خود اپنے ہاتھ سے

---

* ان کا نام بابو سردار بہادر تھا ۔ وہ حکیم صاحب کے نہایت معتمد سیکریٹری تھے ۔ مجھ پر بہت مہربان تھے ۔ انہی کی سفارش پر حکیم صاحب مجھے اپنے ساتھ دوجانہ لے گئے تھے ۔

لکھا ھے تا کہ آپ کا راز باھر نہ جانے پائے۔ لیکن یہ خط ایک شرط سے آپ کے حوالہ کرتا ھوں۔'' اس نے عرض کیا :— ''بہت خوب''۔ حکیم صاحب نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ھوئے فرمایا :— ''اور وہ شرط یہ ھے کہ آپ جو کچھ اب تک میرے متعلق لکھتے آئے ھیں اس میں مطلق فرق نہ آنے پائے۔ اگر آپ نے لکھنا بند کردیا تو لوگ خدا جانے کیا کا کیا سمجھیں۔ اگر آپ وعدہ کریں تو یہ خط دیتا ھوں، ورنہ نہیں۔'' اخبار نویس کی سٹی گم تھی اور طرح طرح کے خیالات دل میں آرھے تھے، ایک طرف اخلاق کا تقاضا تھا اور دوسری طرف چند ھزار روپے مارے جارھے تھے۔ بہر حال کسی نہ کسی طرح اس نے وعدہ کرلیا اور خط لے لیا۔ چند دن کے بعد حکیم صاحب کو معلوم ھو گیا کہ روپے کی ادائگی عمل میں آچکی ھے۔ اب یہ اخبار نویس پھر حکیم صاحب کے در دولت پر پہنچے، شاید اس لئے کہ احسان کا شکریہ ادا کریں، مگر حکیم صاحب نے ملاقات کرنے سے معذوری کا اظہار کردیا۔ بہرحال وہ شخص آج تک ان کا کلمہ پڑھتا ھے اور انہیں یاد کرکے آنسو بہاتا ھے۔

میری آخری ملاقات اس وقت ھوئی جب کہ وہ شاہ امان اللہ خاں کو جامعۂ ملیۂ اسلامیہ کی طرف سے سپاسنامہ دینے کے سلسلہ میں بمبئی تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہ بہت نحیف ھو گئے تھے، لیکن یہ گمان بھی نہ تھا کہ وہ ھم سے اس قدر جلد جدا ھوجائینگے۔ یہ ان کی آخری پبلک خدمت تھی۔ حکیم صاحب کا ارادہ تھا کہ وہ اپنے بڑھاپے کی اولاد (جامعۂ ملیۂ اسلامیہ) کے لئے ریاستوں کا دورہ کرکے روپیہ جمع کریں، مگر اس سے پہلے کہ یہ ارادہ عملی شکل اختیار کرے وہ اپنے رب سے جا ملے۔

ان کی موت رام پور میں بالکل اچانک طور سے ھوئی۔ حکیم صاحب جس طرح اپنی زندگی میں بڑے تھے موت کے بعد بھی بڑے رھے اس لئے کہ آج بھی کروڑوں قلوب میں ان کی محبت

جا گزیں ہے ۔ ان کا انتقال ۲۷ دسمبر ۱۹۲۷ کو ۶۲ برس کی عمر میں ہوا۔

حکیم صاحب نہایت متین اور باخلاق آدمی تھے۔ وہ اس مشرق تہذیب کے نمایندہ تھے جس پر پاک و ہند دونوں فخر کرسکتے ہیں اور جو اب ختم ہو رہی ہے ۔ ان کی مسکراہٹ حد درجہ موہ لینے والی تھی ۔ میں نے انہیں کھل کھلا کر ہنستے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ ان میں مخصوص قسم کی تمکنت تھی اور جن لوگوں نے انہیں انگریزی محاورہ کے مطابق قریب سے دیکھا ہے وہ میرے ہم‌نوا ہونگے کہ تمکنت اور کوہ وقاری کے باوجود وہ حد درجہ متواضع بھی تھے۔

ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
ملک میں اک چراغ تھا نہ رہا

***

سی - ایف - اینڈریوز

۱۹۰۸ میں انٹرنس کا امتحان پاس کرتے ہی میں اپنے دوست سید آصف علی کے مشورہ سے دھلی کے سینٹ اسٹیفنز کالج میں داخل ہو گیا۔ اینڈریوز شروع ہی سے ہماری جماعت کے ٹیوٹر تھے اور اس وجہ سے مجھے ان کا بہت قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ زمانۂ طالب علمی میں میرے دوست ملا واحدی نے مجھ سے فرمایش کی کہ ''اینڈریوز صاحب سے 'نظام المشائخ' کے لئے کوئی مضمون لکھوا کر دو۔'' چنانچہ میری درخواست پر انہوں نے ایک مضمون ''سیکریٹ آف پریئر'' (Secret of Prayer) لکھ کر دیا جس کا ترجمہ ''سر الدعا'' کے نام سے رسالہ میں شائع ہوا۔ پھر خواجہ حسن نظامی کے ارشاد پر میں نے اینڈریوز صاحب سے اسی رسالہ کے ''رسول نمبر'' کے لئے ایک مضمون لکھوایا جس میں انہوں نے واقعۂ ہجرت کو نہایت خوبصورت انداز میں پیش کیا تھا۔ ان کے مضمون کا عنوان تھا: ''رسول (ص) کا تیسرا ساتھی۔'' یہ مضمون اسلامی حلقوں میں بیحد پسند کیا گیا تھا اور فروری۔ مارچ ۱۹۱۱ میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون ''ان اللہ معنا'' کی تفسیر ہے۔

۱۹۱۱ میں مولوی ذکاء اللہ کا انتقال ہوا۔ آن سے اینڈریوز کے بہت گہرے مراسم تھے۔ چونکہ میں مولوی صاحب کا ہم محلہ تھا اس لئے اینڈریوز صاحب نے میرے ذمہ یہ خدمت سپرد کر دی تھی کہ میں ان کی بیماری کی کیفیت روزانہ ان کے گوش گزار کر دیا کروں ۔ ان کی وفات کی اطلاع بھی انہیں میرے ہی ذریعہ سے ملی۔ مجھے خوب یاد ہے کہ وہ ان کی موت سے اس طرح متاثر ہوئے گویا خود ان کے والد کا انتقال ہو گیا ہو۔

مولوی صاحب اینڈریوز کو بیٹا کہکر پکارا کرتے تھے جس سے اینڈریوز بیحد خوش ہوتے تھے -

۱۹۱۲ میں اینڈ ریوز نے مولوی صاحب کے سوانح حیات لکھنے شروع کئے - اسی زمانہ میں میں نے بھی انہیں مولوی صاحب پر ایک طویل مضمون لکھ کر دیا جس سے خوش ہو کر انہوں نے مجھے سوان پین Swan Pen عنایت فرمایا - ان کی کتاب ۱۹۱۴ میں شائع ہو جاتی لیکن جنگ کی وجہ سے وہ نہ چھپ سکی - اس کے کچھ عرصہ بعد انہوں نے ''ماڈرن ریویو'' (کلکتہ) میں اس لائف کو بالا قساط چھپوانا شروع کیا اور مجھے حکم دیا کہ میں اس کا ترجمہ کسی اچھے رسالہ میں شائع کروں - چنانچہ یہ کتاب ''زمانہ'' میں ماہ بماہ چھپتی رہی - اس کے بعد اینڈریوز صاحب نے ساری کتاب پر نظرثانی کی اور اسے کتابی صورت میں ۱۹۲۹ میں شائع کرایا - مگر میرا ترجمہ ''تذکرہ مولوی ذکاء اللہ دہلوی'' کتابی صورت میں ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکا جس کا مجھے ہمیشہ ملال رہیگا -

کالج کے زمانہ کا ایک معمولی سا واقعہ ہے لیکن میں اسے بیان کئے بغیر نہیں رہ سکتا - میرا ایک سرحدی ہم جماعت اس پرچہ میں فیل ہو گیا جسے اینڈریوز نے جانچا تھا - اس پر وہ بیحد بگڑا اور لگا ان کی شان میں اول فول بکنے - اس نے قتل کی دھمکی بھی دی تھی - چنانچہ اینڈریوز صاحب نے میرے ذریعہ اسے اپنے پاس بلوایا - وہ غریب اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا - آخر مجھے ترجمانی کے فرائض ادا کرنے پڑے - وہ اپنی حرکت پر بیحد نادم تھا اور اس نے بغیر کسی پس و پیش کے معافی مانگ لی ، اور اینڈریوز صاحب نے ''مسیح کے سچے پیرو'' کی حیثیت سے اسے بالکل معاف کردیا - اس واقعہ کے چند ہی دن بعد وہ اپنے وطن مالوف چلا گیا -

ایک دن اینڈریوز نے ہماری جماعت کے تختۂ سیاہ پر یہ

عبارت لکھوادی :— "Mr. Andrews will not take his classes today." ایک لڑکے کو جو شرارت سوجھی تو اس نے "کلاسیز" کا ابتدائی حرف "سی" مٹادیا۔ دوسرے دن جب اینڈریوز جماعت میں آئے تو انہوں نے بورڈ پر یہ عبارت لکھی ہوئی دیکھی :— "Mr. Andrews will not take his *lasses* today." اینڈریوز نے کسی سے کچھ نہیں کہا بلکہ مسکراتے ہوئے بورڈ کی طرف بڑھے اور لفظ "لیسیز" کا ابتدائی حرف "ایل" مٹادیا اور اب عبارت یہ رہ گئی :—
"Mr. Andrews will not take his *asses* today."
جماعت کے سب لڑکے اس لطیفہ سے بیحد لطف اندوز ہوئے۔

اینڈریوز ایک دن شیکسپیئر پڑھا رہے تھے۔ اتفاق سے اس میں ایک ایسا مقام آگیا جس کے مفہوم کے بارے میں انہیں شبہ تھا۔ انہوں نے جماعت کے لڑکوں سے کہا کہ "اس کا مطلب کل بتاؤنگا۔ مجھے اس کے صحیح مفہوم کے بارے میں کچھ شک ہے۔" اور کوئی پروفیسر ہوتا تو وہ اسے اپنی سبکی خیال کرتا اور ہرگز اسقدر صفائی نہ برتتا۔ مگر اینڈریوز نے انکساری سے وہ بات کہدی جسے صرف وہی کہہ سکتے تھے۔

نومبر ۱۹۳۷ میں مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے دہلی سے اپنی نشری تقریر "میری کالج کی زندگی" میں بیان کیا :—
"مسٹر اینڈریوز کا پڑھانا غضب کا پڑھانا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک دریا بہ رہا ہے۔ ٹینی سن کی In Memorium کا پڑھانا آن کے ذمہ تھا۔ ان کی پڑھائی کا اس سے اندازہ کرلیجئے کہ اس کتاب کے شروع میں جو افتتاحی نظم ہے، اس کو انہوں نے سو دن میں پورا کیا تھا۔ تصوف اور ویدانت کے اصول بیان کر کے اور حضرت امام غزالی، ابن عربی، مولانائے روم اور گیتا کے حوالے دیکر جب وہ ان کا مقابلہ ٹینی سن کے مصرعوں سے کرتے تھے تو آنکھیں کھل جاتی تھیں اور معلوم ہوتا تھا

کہ اُن کی واقفیت عامہ کس قدر ہے اور ٹینی سن نے کس محنت سے ان چیزوں کو ایک جگہ جمع کیا ہے اور کس خوبی سے اپنی کتاب میں داخل کیا ہے۔ اور ساتھ ساتھ یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ ان باتوں میں ابھی یورپ والے ہم ایشیا والوں سے کتنے پیچھے اور ہمارے کس قدر خوشہ چین ہیں۔ اس طرح پڑھاتے ہوئے میں نے دو ہی اشخاص کو دیکھا ہے: ایک مسٹر اینڈریوز اور دوسرے مولوی نذیر احمد مرحوم۔ مولوی صاحب کا بھی یہی حال تھا۔ وہ حماسہ، معلقات اور متنبی کے ہر شعر کے ساتھ یورپ کے مختلف ادیبوں کے مقولے بیان کرتے تھے اور بتاتے تھے کہ دیکھو اس مضمون کو یورپ والوں نے ہم سے لیکر اس طرح ادا کیا ہے۔ دونوں کا پڑھانا صرف امتحان پاس کرانے کے لئے نہیں تھا، عالم بنانے کے لئے تھا اور اُن سے پڑھنے کے بعد ہم سمجھتے تھے کہ دنیا میں ان دونوں کی عزت ان کی علمیت کی وجہ سے ہے نہ کہ شخصیت کی وجہ سے۔"

ایک دن اینڈریوز نے کالج میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ "شادی شدہ زندگی عیسائیت کی تعلیم کے خلاف ہے اور مسیحی نقطۂ نظر سے پاکیزہ زندگی کہلانے کی مستحق نہیں ہے" اور اس سلسلہ میں انہوں نے تجرد کی بہت تعریف کی اور کہا کہ "بہترین زندگی وہی ہے جو ہمارے یسوع مسیح نے بسر کی تھی۔" بعض پروفیسروں نے اس کا مطلب یہ لیا کہ شادی شدہ زندگی گناہ کی زندگی ہے۔ چنانچہ اس پر کافی ہیجان ہوا۔ چند دن بعد انہوں نے دوسری تقریر میں اس کی تردید کردی اور فرمایا: "مزید غور و فکر کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ شادی شدہ زندگی بھی تجرد کی زندگی کی طرح پاک ہے۔" وہ مذہبی امور میں بیحد غور و فکر کرنے کے عادی تھے اور اپنی آرا کا برملا اور بیباکی سے اظہار کیا کرتے تھے۔

اینڈریوز صاحب شروع ہی سے مجھ پر بہت مہربان تھے

ایک موقع* پر انہوں نے عبداللہ المامون سہروردی کی کتاب The Sayings of Muhammad مجھے تحفہ کے طور پر دی ۔ اس پر ان کے دستخط ثبت ھیں اور ۳۰ نومبر ۱۹۱۱ کی تاریخ درج ھے ۔ ۱۹۳۲ میں انہوں نے اپنی مشہور کتاب What I owe to Christ ? کا آخری مسودہ جس میں کچھ حصہ تو ٹائپ شدہ ھے اور باقی سارے کا سارا خود ان کے دست خاص کا لکھا ھوا ھے ، بمبئی میں مجھے عنایت فرمایا ۔

کالج کے زمانہ میں اینڈریوز ، سی ۔ بی ۔ ینگ اور دوسرے یوربین پروفیسر طلبا کے ساتھ ھاکی ، کرکٹ اور ٹینس کھیلا کرتے تھے ۔ اس قسم کے کھیلوں میں شریک رہ کر وہ نہ صرف طلبا کو کھیلنا سکھاتے تھے بلکہ ان میں نظم و نسق بھی پیدا کرتے تھے ۔ وہ ھمیں سکھاتے تھے کہ ''ھارنے کی حالت میں کبھی مایوسی کو پاس نہ آنے دو ۔'' جیتنے کی حالت میں وہ ھمیں سکھاتے تھے کہ ''جیت سے اس قدر خوش نہ ھو کہ بالکل آپے سے باھر ھو جاؤ ۔'' وہ ھمیں اس امر کی بھی تعلیم دیتے تھے کہ ''اچھا کھیل کھیلو اور اچھے کھیل کی داد دو خواہ اچھے کھیل کا مظاھرہ فریق مخالف کی طرف سے کیوں نہ کیا جائے ۔''

ان کی آخری علالت سے چند سال قبل میرے دل میں خیال آیا کہ میں ان کی لائف لکھوں ۔ لیکن مجھے مکمل مواد نہ مل سکا ۔ اسی اثنا میں میرے دوست بنارسی داس چترویدی ایم ۔ پی نے انگریزی میں حیات اینڈریوز شائع کردی ۔ اسے دیکھ کر میں نے

---

* ایک مرتبہ چند طلبا نے ''اسٹرائک'' کرنے کی دھمکی دی اور ارادہ کیا کہ وہ فلاں پروفیسر کی جماعت میں نہیں جائینگے ۔ چونکہ اینڈریوز وایس پرنسپل تھے اس لئے قدرتی طور پر طلبا کے فیصلہ سے انہیں تشویش ھوئی ۔ میں نے طلبا سے اپنے طور پر کہا کہ وہ ایسا نہ کریں اور تھوڑی دیر کی رد و قدح کے بعد میں اپنے مقصد میں کامیاب ھوگیا ۔ اینڈریوز صاحب کو جب یہ بات معلوم ھوئی تو وہ بیحد خوش ھوئے اور سہروردی کی کتاب مجھے تحفتاً عنایت فرمائی۔

یہی مناسب سمجھا کہ میں اسے اردو میں منتقل کردوں۔ چنانچہ اس کے پبلشرز جارج ایلن اینڈ انون کی اجازت سے میں نے ''سی-ایف-اینڈریوز،، کے نام سے اس کا ترجمہ شائع کردیا۔ یہ ان کی مکمل سوانح عمری ہے۔

اینڈریوز کی زندگی کا کافی حصہ جنوبی افریقہ میں گزرا جہاں رہ کر انہوں نے ہندوستانی باشندوں کے لئے بہت سے مفید کام کئے۔ انہی کی وجہ سے جنرل اسمٹس اور گاندھی جی میں باعزت معاہدہ ہوسکا۔ اسی ایک سفر سے جب وہ جنوبی افریقہ سے لوٹے تو بمبئی میونسپل کارپوریشن نے ان کی خدمت میں ۲۳ اگست ۱۹۲۷ کو ایک سپاسنامہ پیش کیا جس میں ان کی خدمات کو نہایت شاندار الفاظ میں سراہا گیا تھا اور خدا سے دعا کی گئی تھی کہ وہ انہیں عرصۂ دراز تک زندہ و سلامت رکھے تاکہ ''امن کے پیغامبر'' کی حیثیت سے جو کام وہ کر رہے ہیں اسے پایۂ تکمیل تک پہنچا سکیں۔ اس ایڈریس میں بالتصریح ان خدمات کا اعتراف کیا گیا تھا جو انہوں نے جنوبی افریقہ، گائنا، فجی، کینیا، یوگنڈا اور ٹانگانیکا میں ہندوستانیوں کے لئے انجام دی تھیں۔

مسلم لیڈروں میں مولانا محمد علی، حکیم محمد اجمل خاں، سر علی امام وغیرہ سے ان کے تعلقات بیحد دوستانہ اور صمیمانہ تھے۔ جس زمانہ میں مولانا محمد علی بیجاپور جیل میں قید تھے اُس وقت اینڈریوز نے انہیں ایک خط بھیجا تھا جس میں لکھا تھا کہ ''چونکہ میں ایمانداری کے ساتھ کلیسائے انگلستان کے بعض عقائد کو نہیں مانتا اس لئے میں نے پادری کے فرائض بجا لانے سے دست برداری کرلی ہے۔'' ان عقائد میں یہ عقیدہ بھی شامل تھا کہ نجات صرف مسیح کے ماننے والوں کے لئے ہے اور جو لوگ انہیں نہیں مانتے وہ سب جہنم میں جھونک دئے جائینگے۔ اینڈریوز کہا کرتے تھے کہ ''میں یہ کیسے مان لوں کہ مہاتما گاندھی،

رابندرا ناتھ ٹیگور اور ذکاء اللہ جیسے آدمی جہنم میں ڈالے جائینگے ؟ " اینڈریوز کی یہ اخلاقی جرأت حد درجہ قابل تعریف ہے۔

اینڈریوز کو اپنی ماں سے بیحد محبت تھی۔ ہندوستان میں رہ کر وہ ہمیشہ انہیں اپنی زندگی کے تمام واقعات سے باقاعدگی کے ساتھ مطلع کرتے رہتے تھے۔جب انہیں اپنی ماں کی وفات کی خبر ملی تو وہ بچوں کی طرح بلبلا بلبلا کر روئے۔ انہیں آخر وقت تک اپنی ماں کا صدمہ رہا اور اس کے بعد انہوں نے " میری ماں" " My Mother " کے عنوان سے بہت دل گداز مضمون لکھا ۔ زندگی بھر جس شخصیت کا ان پر سب سے زیادہ اثر رہا وہ ان کی ماں تھی ۔

جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں اینڈریوز اٹلی اور بلقانی ریاستوں کے مظالم سے بیحد متاثر تھے۔ وہ ان مظالم کو عیسائیت کے دامن پر بدنما داغ سے تعبیر کرتے تھے ۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم چند مسلمان طالب علم صبح کے " پانیر " میں سقوط ایڈریانوپل کی خبر پڑھکر پریشانی کے عالم میں کھڑے تھے کہ اتنے میں اینڈریوز نے ہمارے غم دیدہ چہروں کو دیکھ کر کہا : "میرے بیٹو! آپ کی اس قومی مصیبت میں میری دلی ہمدردی آپ کے ساتھ ہے ۔ بہر حال میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ صورت حالات زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہیگی۔ عظیم المرتبت ترکی قوم کو خدا تعالیٰ نے حیرت انگیز طاقت اور لچک عطا فرمائی ہے ۔ وہ بہت جلد اپنے ملک اور اپنے وقار کو دوبارہ حاصل کرلیگی جسے وہ اپنے نا اہل لیڈروں کی ضرورت سے زیادہ خود اعتمادی کی بدولت کھوچکی ہے ۔" اینڈریوز ترکوں کی شرافت کے بیحد مداح تھے اور اس امر کے بھی معترف تھے کہ انہوں نے نہایت پامردی سے شکستوں کو برداشت کیا ہے ۔

۱۹۳۴ میں میں نے از راہ محبت اینڈریوز صاحب کی کتاب

(Ideas of Mahatma Gandhi) کو اردو میں ''خیالات مہاتما گاندھی'' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ اسی طرح میں نے ان کے بہت سے دوسرے مضامین کا ترجمہ بھی شائع کیا تاکہ اهل هند کو آن کی خدمات کا پورا پورا علم رہے۔ ''خیالات مہاتما گاندھی'' کو میں نے بلبل هند مسزنائیڈو کے نام ڈیڈیکیٹ کیا تھا جو اینڈریوز کی گہری دوست تھیں۔

اینڈریوز کالج میں همیشه سیرت کی تعمیر پر زور دیا کرتے تھے۔ وہ شیکسپیئر کے ماهر تھے اور اسے پڑھاتے وقت وہ جس انہماک کا اظہار کرتے تھے اس کا اندازہ ان کے شاگرد هی لگا سکتے هیں۔ وہ شیکسپیئر کے جذبۂ آزادی کے بڑے قدردان تھے اور چاهتے تھے کہ طلبا ان جذبات کو اپنا لیں۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''شیکسپیر کی زبان بولنے والا کبھی غلام نہیں رہ سکتا۔''

وہ خود اچھے کھلاڑی تھے۔ کھیل کے میدان میں وہ بائیں هاتھ سے کرکٹ کھیلتے تھے، لیکن لکھتے وقت وہ سیدھے اور اُلٹے دونوں هاتھوں سے صاف اور اعلیٰ درجہ کی تحریر لکھنے کے عادی تھے۔ وہ صفحے کے صفحے بغیر کسی رد و بدل کے لکھتے چلے جاتے تھے۔ ان کا خط بہت پاکیزہ تھا۔

دهلی کے مشن کالج میں چند سال کام کرنے کے بعد وہ ۱۹۱۴ء میں شانتی نکیتن چلے گئے جہاں انہیں رابندرا ناتھ ٹیگور کی رفاقت میسر آئی۔ اس کے بعد انہیں انگلستان اور هندوستان کے درمیان غیر سرکاری سفیر کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے دوران میں وہ انگلستان کے سفر میں ہر جگہ گاندھی جی کے ساتھ ساتھ رہے۔ وهاں رہ کر انہوں نے آن بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا جو گاندھی جی کے متعلق برطانوی حکومت اور عوام کے دل میں پیدا ہو گئی تھیں۔

ذاتی طور پر اینڈریوز نہایت پاکیزہ خصائل کے مالک تھے۔

وہ انتہائی مذہبی آدمی تھے۔ ان کا مقصد حیات محض یہ تھا کہ مسیح کی زندگی کے مطابق اپنی زندگی بسر کریں ۔ چنانچہ مرنے سے پیشتر جب ایک صاحب ان سے ملنے کے لئے گئے توانہوں نے ان سے پوچھا کہ ''آپ بتائیے کہ آیا میری زندگی حضرت مسیح کی زندگی کے مطابق بسر ہوئی ہے یا نہیں؟'' انہیں جواب دیا گیا کہ ''یہ بات تو آپ کے نام ہی سے ظاہر ہے کہ آپ حضرت عیسیٰ کی تعلیمات پر عامل رہے ہیں۔ آپ کے نام کے ابتدائی حروف ہیں :— سی ۔ ایف ۔ اے یعنی کرائسٹس فیتھفل الائی (Christ's Faithful Ally) ۔'' یہ سن کر انہوں نے فرمایا : ''میرےلئے یہ احساس کافی ہے کہ غیر عیسائی بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میری زندگی حضرت عیسیٰ کی تعلیمات کے عین مطابق گزری ہے ۔ اب میں اطمینان کے ساتھ جان دے سکونگا ۔'' ہم میں سے کتنے ہیں جو مرتے وقت اپنے دل سے یا دوسروں سے اس قسم کا سوال کرتے ہوں! اینڈریوز کی شکل و صورت بھی مسیح کی مروجہ تصویر سے کافی حد تک مشابہ تھی ۔

اینڈریوز نے قرآن مجید کا بھی گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اپنی مختلف کتابوں میں انہوں نے جا بجا قرآنی آیات درج کی ہیں ۔ انہوں نے دوسرے پادریوں کی طرح کبھی اسلام کو برا بھلا نہیں کہا بلکہ اسلام کے بعض عقائد سے وہ پورے طور پر ہم آہنگ رہے ۔ وہ اسلام کی جملہ اصلاحی کوششوں کو بہ نظر استحسان دیکھتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ان کے ذریعہ اسلام نے بنی نوع انسان کی بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اینڈریوز نے شملہ میں مولوی شمس الدین سے اردو پڑھی تھی اور بڑی حد تک انہی سے اسلام کی باتیں معلوم کی تھیں ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ ''مولوی نذیر احمد اور منشی ذکاءاللہ نے اسلام کو سمجھانے میں میری سب سے زیادہ امداد کی ہے اور انہی کی وجہ سے میں اس کی عظمت سے واقف ہو سکا ہوں۔''

اینڈریوز کی آمدنی کا ذریعہ زیادہ تر ان کی کتابیں تھیں یا وہ مضامین تھے جو مختلف جرائد میں نکلتے تھے ۔ وہ اپنی ذات پر بہت کم روپیہ صرف کرتے تھے ۔ بمبئی میں وہ مختلف جگہ ٹھہرتے تھے ، کبھی انڈین سٹی زن شپ ایسوسی ایشن کے سیکریٹری ایس۔ اے۔ واعظ کے یہاں ، کبھی جے۔ بی۔ پیٹٹ کے یہاں اور کبھی ڈاکٹر کھمباٹا کے یہاں ۔ وہ کہیں ٹھہریں سائل ان کا پیچھا نہیں چھوڑتے تھے ۔ اینڈریوز ان سب کی امداد کرنے میں دلی مسرت محسوس کرتے تھے ۔ وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے اور جو لوگ ان کی اس کمزوری سے واقف تھے وہ پورا پورا فائدہ اٹھاتے تھے ۔ اینڈریوز بیحد بھولے انسان تھے۔

متحدہ ہندوستان کو آزادی دلانے میں اینڈریوز کا کچھ کم حصہ نہیں ہے ۔ وہ ان انگریزوں میں سے تھے جنہوں نے ہندوستان کو آزادی سے ہم کنار کرنے میں اپنی ساری زندگی قربان کردی ۔ ایک طرف وہ انگریزی حکومت کو بتاتے تھے کہ اس کے نااهل افسر ہندوستانیوں پر کیا کیا ظلم ڈھا رہے ہیں اور دوسری طرف وہ ہندوستانیوں کو تیار کرتے تھے کہ وہ جلد سے جلد غلامی کا جوا اتار پھینکیں اور مکمل آزادی حاصل کریں ۔

انہوں نے جس تن دھی ، انہماک اور خلوص سے ہند و پاکستان کی خدمت کی ہے اس کی دوسری مثال نہیں ملتی ۔ ان کی ذات پر یہ براعظم سدا فخر کریگا ۔ انہوں نے ۳۶ برس تک متحدہ ہندوستان کی خدمت کی اور خدمت کرتے کرتے ان کا جسم تھک گیا اور آخرکار وہ ۵ اپریل ۱۹۴۰ کو اپنی آخری آرام گاہ میں پہنچ گئے ۔ ان کی موت کلکتہ کے ایک ہسپتال میں جمعہ کے دن ہوئی اور ان کی خواہش کے مطابق انہیں سینٹ پال کے گرجا میں دفن کیا گیا ۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے !

نوابِ وقارالملک

نواب مشتاق حسین الملقب بہ وقارالملک علیگڈھ کالج کے سیکریٹری تھے۔ وہ تھے تو پرانی وضع کے بزرگ لیکن جس دبدبہ سے انہوں نے علیگڈھ میں اپنا زمانہ گزارا اور جس استقلال اور پامردی سے انہوں نے علیگڈھ کالج کے بد دماغ پرنسپل (آرچ بولڈ) کو عہدے سے برطرف کیا اس نے اہل ملک پر ثابت کردیا کہ یہ آہنی انسان برطانوی حکومت سے بھی نہیں ڈرتا۔

غالباً ۱۹۱۰ کا واقعہ ہے کہ نواب صاحب علالت کے سلسلہ میں بغرض علاج دہلی تشریف لائے۔ جب تک وہ دہلی میں رہے حاذق الملک حکیم محمد اجمل خاں کے زیر علاج رہے۔ اسی زمانہ میں ایک دن خواجہ حسن نظامی، ملا واحدی اور راقم الحروف مزاج پرسی کے لئے ان کی خدمت میں کالکا پہنچے جو دہلی سے چند میل کے فاصلہ پر ایک صحت بخش مقام ہے۔ جب ہم اس کمرے میں داخل ہوئے جہاں نواب صاحب لیٹے ہوئے تھے، اس وقت مجھے ایسا معلوم ہوا کہ ایک شیر ہے جو محو استراحت ہے۔ خواجہ صاحب نے پہلے تو ہمارا تعارف کرایا اور پھر نواب صاحب سے باتوں میں مشغول ہوگئے۔ مجھے نواب صاحب کی صرف ایک بات یاد رہ گئی ہے۔ انہوں نے فرمایا:— ”خواجہ صاحب، آج کل مسلمانوں کی معاشی حالت اس درجہ زبوں ہوگئی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی مسلمان کو پندرہ روپے ماہوار کی بھی جگہ دلوادے تو سمجھ لیجئے کہ اس نے بہت بڑی خدمت انجام دی ہے۔“ ان الفاظ کو کانوں میں پڑے زمانہ بیت گیا ہے مگر آج بھی وہ میرے دماغ میں جوں کے توں محفوظ ہیں۔

***

عبدالرحمٰن صدّیقی

جس زمانہ میں راقم الحروف ''ہمدرد'' سے وابستہ تھا انہی دنوں صدیقی صاحب سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ آخری ملاقات جناح ہاسپٹل میں ہوئی جہاں وہ اپنی وفات سے قبل زیر علاج تھے۔ وہ اسپیشل وارڈ میں رکھے گئے تھے، مگر بہترین طبی امداد کے باوجود جانبر نہ ہوسکے۔ ان کا دماغ بری طرح ماؤف ہو گیا تھا۔

صدیقی مولانا محمد علی کے ابتدائی دوستوں میں تھے اور انہوں نے ۱۹۱۰ میں ''کامریڈ'' جاری کرنے میں ان کی پوری پوری امداد کی تھی۔ صدیقی نے ایک مضمون میں ان مشکلات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو ''کامریڈ'' کی ابتدائی زندگی میں پیش آئی تھیں۔ راجہ غلام حسین اور ولایت علی بمبوق کی طرح صدیقی بھی مولانا کے جاں نثاروں میں تھے اور ان سے والہانہ محبت رکھتے تھے۔

جب ۱۹۱۲ میں مولانا محمد علی نے پہلی جنگ بلقان میں ترکوں کی امداد کے لئے طبی مشن بھیجنے کی تجویز کی تو جن نوجوان مسلمانوں نے اس وقت اپنی خدمات پیش کیں ان میں صدیقی بھی تھے۔ رضا کاروں کا یہ قافلہ دسمبر ۱۹۱۲ میں بمبئی سے روانہ ہوا اور جنگ بلقان کے اختتام پر بے لوث انسانی خدمت کا شاندار ریکارڈ قائم کرکے واپس ہندوستان آگیا۔ اس زمانہ کے تمام ترکی مشاہیر سے صدیقی کے مراسم قائم ہو گئے تھے بالخصوص انور بک سے جو ان دنوں اپنی غیر معمولی شجاعت، جرأت اور پاکیزہ زندگی کی وجہ سے تمام دنیائے اسلام کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔

اخبارات کے لئے رپورٹیں بھیجنے کا کام صدیقی صاحب کے ذمہ

تھا - ایک اعتبار سے وہ مشن کے سیکریٹری تھے - مجھے خوب یاد ہے کہ وہ اپنی طویل رپورٹیں پنسل سے کاغذ کے دونوں طرف لکھ کر بھیجا کرتے تھے - ان کی تحریر کی عمدگی کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کانٹ چھانٹ مطلق نہ ہوتی تھی - وہ بے تکان لکھتے چلے جاتے تھے - ان کی رپورٹیں بہت شگفتہ اور دلچسپ ہوا کرتی تھیں - صدیقی حقیقی معنوں میں قلم کے بادشاہ تھے -

دوسری جنگ بلقان کے دوران میں جو بلقانی اتحادیوں میں مال غنیمت کی تقسیم پر برپا ہوئی ، ایک وقت ایسا بھی آیا کہ غازی انور بک نے ۸۰ ہزار فوج لے کر نہایت تیزی سے یلغار کرتے ہوئے ادرنہ (ایڈریانوپل) پر قبضہ کرلیا - یہ قبضہ دول یورپ کی خواھشات کے سراسر خلاف تھا اور اس لئے انگلستان اور دوسری طاقتوں نے ترکوں کو طرح طرح کی دھمکیاں دیں اور ادرنہ خالی کردینے پر اصرار کیا - مگر چونکہ اس محیرالعقول کارنامہ نے ترکوں میں اور ساری دنیائے اسلام میں ایک نئی روح اور ایک نئی زندگی پیدا کردی تھی اس لئے دول یورپ کو خطرہ لاحق ہوا کہ کہیں ٹرکی اپنے کھوئے ہوئے علاقے پھر سے واپس لینے کی کوشش شروع نہ کردے ، اور اسی بنا پر انہوں نے بہ جبر و اکراہ ادرنہ پر ترکوں کا قبضہ تسلیم کرلیا - یہ مئی ۱۹۱۳ کا واقعہ ہے - اس قبضہ کے دوسرے دن صدیقی صاحب شعیب قریشی کی معیت میں سلٹری ٹرین میں بیٹھ کر ایڈریانوپل پہنچے - وہاں سے انہوں نے ''کامریڈ'' کے لئے مفصل رپورٹ بھیجی جس میں بتایا گیا تھا کہ چند دن کے قبضہ کے دوران میں بلغاریوں نے وہاں کی مسلمان آبادی پر کیسے کیسے مظالم ڈھائے تھے اور کس جوش و خروش کے ساتھ فاتح ترکوں کا خیر مقدم کیا گیا تھا -

عبدالرحمن سورت کے رہنے والے تھے اور چونکہ وہ تعلیم کے سلسلہ میں اپنے ماموں علی محمد خاں دھلوی کے ساتھ رہتے تھے

جو حیدرآباد (سندھ) میں قانونی پریکٹس کرتے تھے ، اس لئے وہ سب جگہ عبدالرحمن سندھی کے نام سے مشہور ہو گئے - علیگڈھ کالج میں ۱۹۰۷ میں جو زبردست اسٹرائک ہوئی تھی ، اس میں عبدالرحمن صدیقی بھی شریک تھے - بچپن ہی سے وہ بہت سرخ و سفید اور وجیہ تھے اور بالکل ترک معلوم ہوتے تھے - وہ بیحد ذہین ، ذکی اور طباع تھے - اس کے ساتھ وہ بلا کے محنتی بھی تھے - علیگڈھ کالج کی یونین میں وہ زوردار تقریریں کیا کرتے تھے اور رفتہ رفتہ وہ اس کے پریسیڈنٹ بھی بن گئے تھے -

صدیقی کی ساری عمر ملک و ملت کی خدمت میں گزری - وہ جہاں جہاں رہے ، زبان و قلم سے جہاد کرتے رہے - ایک زمانہ میں وہ ''مارننگ نیوز'' کے ایڈیٹر تھے اور انہوں نے اس کے ایک خصوصی نمبر میں جو کسی عیدالفطر کو شائع کیا گیا تھا، سید جمال الدین افغانی پر نہایت روح پرور طویل مقالہ تحریر کیا تھا جسے میں نے باجازت اپنی کتاب ''سید جمال الدین افغانی'' کا جزو بنالیا - اس سے بہتر مضمون سید صاحب کے مشن پر آج تک نہیں لکھا گیا - ان کی تحریروں میں بیحد خلوص تھا ، ''مارننگ نیوز'' کی ایڈیٹری انہوں نے جس شان سے کی اس کی یاد مدتوں رہیگی -

وہ بہت دبنگ آدمی تھے اور کبھی کسی سے مرعوب نہیں ہوئے - درحقیقت وہ اعلائے کلمۃ الحق کی وجہ سے ہر جگہ ''بدنام'' تھے - اقبال کی طرح انہوں نے بھی چمگادڑ کو کبھی ''شہپر شب'' نہیں کہا - افسوس اس کا ہے کہ باوجود صلاحیت اور قابلیت کے انہیں پاکستان میں کوئی عہدہ نہ مل سکا ، البتہ مرنے سے چند ماہ پیشتر وہ مشرق پاکستان کے گورنر بنا دئے گئے تھے - اسی زمانہ میں وہ بیمار پڑے اور کراچی لائے گئے جہاں جناح ہاسپٹل میں وہ کچھ عرصہ تک اسپیشل وارڈ میں زیر علاج رہنے کے بعد اپنے رب سے جاملے -

وفات سے چند دن قبل میں جناح ہاسپٹل میں ان سے ملنے کے لئے گیا۔ میرے ساتھ میرے بھتیجے علاءالدین خالد بھی تھے۔ ہر چند ڈاکٹر قاضی نے مجھ سے کہ دیا تھا کہ ”وہ اب کسی کو نہیں پہچانتے اور اس لئے آپ کا جانا بیکار ہوگا،“ مگر میں گیا اور ان سے ملا۔ ملتے ہی انہوں نے کہا :۔”کل رات ان ڈاکٹروں نے مجھے لندن کے ہسپتال میں بھیج دیا تھا مگر میں بھلا وہاں کیسے ٹکتا، لہذا فوراً یہاں چلا آیا۔“ یہ دیکھ کر مجھے بہت رنج ہوا کہ ان کا دماغ بری طرح سے متاثر ہوا ہے۔ پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد میں نے اپنا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ”میں مولانا محمد علی کے ساتھ ’ہمدرد‘ میں کام کرچکا ہوں۔“ یہ سنتے ہی کہنے لگے کہ ”یہ کیوں نہیں کہتے کہ بمبئی سیکریٹریٹ میں تھے؟“ اس کے بعد تھوڑی دیر تک اور باتیں ہوئیں اور پھر میں خدا حافظ کہ کر ان سے رخصت ہوگیا۔ بہرحال مجھے یہ دیکھ کر دلی مسرت ہوئی کہ انہوں نے مجھے اس حالت میں بھی پہچان لیا۔

میں اپنے تئیں خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ میں ان کے جنازہ میں شریک ہوسکا۔ ان کی تجہیز و تکفین کا انتظام ان کے قدیم دوست شعیب قریشی نے کیا تھا جو آن دنوں وزیر مہاجرین تھے۔ صدیقی خود بھی مہاجر تھے۔

انہوں نے عمر بھر شادی نہیں کی، لیکن اس کے باوجود وہ نہایت پاکیزہ سیرت کے مالک تھے۔ درحقیقت انہوں نے عروس ملت سے شادی کرلی تھی اور اپنی ساری عمر اسی کی خدمت میں گزاردی۔ وہ صوم و صلوۃ کے بیحد پابند تھے اور نہایت دیندار مسلمان تھے۔

خدا رحمت کند بر عاشقان نیک طینت را

***

خواجہ کمال الدّین

خواجه صاحب کو میں نے سب سے پہلے دسمبر ۱۹۱۱ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقده دهلی میں دیکھا تھا اور وهیں ان کی روح پرور تقریر سنی تھی ۔ اجلاس میں دور دور کے مسلمان شریک هوئے تھے ۔ صدارت کے فرائض هزهائینس سر آغا خاں ادا کر رهے تھے ۔ اسی کانفرنس کے ایک بھرے جلسه میں علامه شبلی نعمانی نے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں مسلمانان هند کی طرف سے ''ترجمان حقیقت'' کا خطاب پیش کرنے کی تحریک کی تھی ۔ خواجه صاحب کے ذمه اس تحریک کی تائید تھی اور انھوں نے نہایت جوشیلے الفاظ میں اقبال کو یوں مخاطب فرمایا تھا :—

> ''اقبال ، اٹھ ، تو ان خطابات سے کہیں بلند ھے ۔ تیرا اصلی کام یه ھے که تو مغرب کے سامنے اسلام کی صحیح تعلیم پیش کرے اور وهاں مادیت پسند لوگوں کو اسلام کی دعوت دے ۔ تبلیغ کے کام کے لئے تجھ سے زیاده اور کوئی شخص موزوں نہیں ۔ تو نے فلسفه میں مغرب کی شاگردی کی ھے ۔ اب مذهب میں اهل مغرب کا استاد بن ۔ اقبال ، تو اپنی خداداد قابلیتوں سے کام لے اور مغرب والوں کو هدایت کا راسته دکھا ، وغیره وغیره ۔''

تقریر کیا تھی ، ایسا معلوم هوتا تھا که خواجه صاحب جادو کر رهے هیں ۔ سارا مجمع مسحور تھا اور معلوم هو رها تھا که الفاظ خواجه صاحب کے منه سے نہیں بلکه دل کی عمیق ترین گہرائیوں سے نکل رهے هیں :—

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے

جلسہ کے اختتام پر جہاں اور لوگوں نے خواجہ صاحب سے ہاتھ ملائے، وہاں میں نے بھی نہایت عقیدت مندی سے ان سے مصافحہ کیا۔ تقریر سننے کے بعد سے میرے دل میں خواجہ صاحب کے مشن کی عظمت جاگزیں ہوگئی۔ ان کا مشن کیا تھا؟ ان کا مشن یہ تھا کہ مغرب کی مادیت کو اسلام کی روحانیت سے فتح کیا جائے۔ اور کون کہ سکتا ہے کہ وہ اپنے اس مشن میں کامیاب نہیں ہوئے؟ اس بیسویں صدی میں انہوں نے انگلستان میں اپنی کتابوں اور تقریروں کے ذریعہ اسلام کی جو شاندار خدمات انجام دی ہیں، وہ امٹ ہیں۔ انہوں نے اور ان کے رفقائے کار نے مغرب کے سامنے انگریزی زبان میں جو بیش بہا اسلامی لٹریچر پیش کیا ہے وہ اس وقت تک تبلیغ کا کام دیتا رہیگا جب تک انگریزی زبان زندہ ہے۔ خواجہ صاحب اور ان کے مشن نے اپنی زندگی میں متعدد انگریز مردوں اور عورتوں کو دائرۂ اسلام میں داخل کیا اور یہ حقیقت ہے کہ وہ سب لوگ ان کی زندگی کی خوبصورتی کو دیکھ کر مسلمان ہوئے تھے۔ وہ اہل مغرب کے روبرو اسلام کو اس طرح سے پیش کرتے تھے کہ ان کے دلوں میں اس کی طرف سے گرویدگی پیدا ہو جاتی تھی۔ انہوں نے اپنے عمل سے وہاں کے لوگوں کو صحیح اسلامی زندگی سے روشناس کرایا۔ جو اشخاص ان کی کوششوں سے مشرف بہ اسلام ہوئے ان میں اعلیٰ طبقہ کے افراد بھی تھے اور ادنیٰ طبقہ کے بھی۔ قبل الذکر میں الحاج لارڈ ہیڈلے کا نام نامی قابل ذکر ہے۔

خواجہ صاحب کے مشن کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس نے اہل یورپ کے سامنے کسی خاص اسلامی فرقہ کی نمایندگی نہیں کی۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فرقہ اور خیال کے لوگوں نے ان کی مالی امداد کرنے سے کبھی دریغ نہیں کیا۔ یہ خواجہ صاحب

کی دینی فراست تھی جس نے انہیں آمادہ کیا کہ وہ مغرب کے سامنے اسلام کے پیغام کو اس کی ابتدائی سادگی اور دل آویزی کے ساتھ پیش کریں ، ورنہ ممکن نہ تھا کہ انہیں اتنی کامیابی ہوتی جتنی بالآخر انہیں نصیب ہوئی ۔

خواجہ صاحب کی زندگی سرتا پا اخلاص اور ایثار مجسم تھی ۔ وہ ولایت جانے سے پہلے لاہور کے ایک کامیاب وکیل تھے اور اچھی خاصی دولت کے مالک بھی ۔ یکایک ۱۹۱۲ میں انہوں نے اپنا وسیع کاروبار چھوڑ چھاڑ محض ضمیر کی آواز پر اپنی زندگی کا حقیقی مشن ڈھونڈھ لیا اور اس کے بعد سے انہوں نے اپنے آپ کو مغرب میں اسلام کی خدمت کے لئے ہمہ تن وقف کردیا ۔ انہوں نے مغرب میں تقریر و تحریر کے ذریعہ اسلام کی بہت سی لڑائیاں سر کیں ۔ آج کی مادیت نواز دنیا میں ایسے اشخاص خال خال نکلینگے جو دنیا پر لات مار کر والہانہ انہماک کے ساتھ اپنی عمر دینی خدمت میں گزاردیں ۔

خواجہ صاحب سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۴ میں بمبئی میں ہوئی جب کہ وہ اپنے نوجوان صاحبزادے کے انتقال کے بعد ولایت تشریف لے جارہے تھے ۔ اس وقت میں نے ان کے مشن کے بارے میں بہت سی باتیں پوچھی تھیں اور خصوصیت کے ساتھ مارماڈیوک پکتھال کے بارے میں دریافت کیا تھا کہ کیا وہ ان کے مشن کی کوششوں سے دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ہیں ؟ خواجہ صاحب نے نہایت دیانتداری سے کام لیتے ہوئے فرمایا : ”حقیقت یہ ہے کہ پکتھال ان لوگوں میں سے ہیں جو اپنے مطالعہ کے زور سے اسلام کی صداقت پر ایمان لائے ۔ البتہ انہیں بعض امور کے بارے میں کچھ شبہات تھے جنہیں میں نے اور مشن کے بعض افراد نے دور کردیا ۔“ ایک اور سوال کے جواب میں خواجہ صاحب نے فرمایا : — ” پکتھال کے اسلام لانے سے انگلستان کے ادبی حلقوں میں ہلچل سی مچ گئی تھی ۔ وہاں کے ادیبوں کا

خیال تھا کہ جس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کرسکتا ہے وہ بالضرور قابل احترام ہونا چاہئے ۔ یہ حقیقت ہے کہ ان کے مسلمان ہوجانے سے ہمارے مشن کو بیحد تقویت پہنچی ۔''

خواجہ صاحب بڑی سوجھ بوجھ کے آدمی تھے ۔ ایک مرتبہ وہ لندن میں تقریر کر رہے تھے اور فرمارہے تھے :- '' اسلام آزادی کا مذہب ہے اور بنی نوع انسان کو آزادی کی طرف لے جاتا ہے ۔ اس کا ماننے والا کبھی کسی دوسرے کا غلام نہیں بن سکتا، وغیرہ وغیرہ ۔'' یہ سننا تھا کہ مجمع میں سے ایک انگریز نے پوچھا : ''اگر یہ سچ ہے تو پھر ہندوستان کے مسلمان مٹھی بھر انگریزوں کے غلام کیوں ہیں ؟ '' خواجہ صاحب نے برجستہ جواب دیا : '' ہندوستان کے موجودہ مسلمانوں کی مثال ان یہودیوں کی سی ہے جنہیں فرعون نے وقتی طور پر غلام بنالیا تھا ، اور جس طرح حضرت موسیٰ اپنی قوم کو فرعون کی غلامی سے نجات دلانے کے لئے بھیجے گئے تھے اسی طرح آج اللہ تعالیٰ نے مجھے بھیجا ہے تاکہ میں ان مسلمانوں کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلاؤں ۔ یہ غلامی کا زمانہ محض عارضی ہے اور انشاء اللہ تعالیٰ ایک دن وہ آزاد ہوکر رہینگے ۔ '' وہ انگریز تو خیر چپ ہوگیا مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب نے کیسا اچھا اور مسکت جواب دیا ۔ ان کے الفاظ یقیناً الہامی تھے ! یہ واقعہ خود خواجہ صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا اور فرمایا تھا کہ '' انگلستان کے سامعین بہت چھبتے ہوئے سوالات پوچھتے ہیں ۔ اگر ان کا بروقت اور مسکت جواب نہ دیا جائے تو بہت برا اثر پڑتا ہے ۔ میں خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس نے مجھے فرعون اور یہودیوں کی تمثیل سجھادی ۔ ''

ایک مرتبہ خواجہ صاحب نے اپنے مشن کی ابتدائی مشکلات کا ذکر کرتے ہوئے مجھ سے فرمایا تھا کہ ''جہاز ران کمپنیاں عیسائی مشنریوں کو رعایتی ٹکٹ دیا کرتی ہیں ۔ ہم نے بھی جب

کام شروع کیا تو ان کمپنیوں سے کرایہ کی رعایت طلب کی۔ ابتدا میں انہوں نے یہ رعایت دینے سے صاف انکار کردیا، لیکن بے حد جد و جہد کے بعد انہوں نے ہمیں بھی مشنریوں کے زمرہ میں داخل کرلیا اور اس وقت سے ہم بھی اس رعایت سے مستفید ہورہے ہیں۔ اس رعایت کی وجہ سے ہمیں کافی بچت ہوجاتی ہے۔‘‘

خواجہ صاحب نے ایک دفعہ مولانا محمد علی کو لکھا کہ ’’ایک اشتہار کے جواب میں ہندوستان سے دو مبلغین کی درخواستیں موصول ہوئی ہیں۔ آپ ذرا ان دونوں کا امتحان لیجئے اور بتائیے کہ ان میں سے کون صاحب ہمارے کام کے لئے موزوں ہونگے۔‘‘ یہ حضرات محمد علی شاہ (سندھ) اور انیس احمد (یو۔ پی) تھے۔ مولانا نے خواجہ صاحب کو لکھ بھیجا کہ ’’یہ دونوں حضرات اپنے ’سرکاری تعلق‘ کی وجہ سے اس قابل نہیں رہے ہیں کہ آزادی کے ساتھ اسلام کی تبلیغ کرسکیں۔‘‘ چنانچہ ان دونوں اصحاب کی درخواستیں رد کردی گئیں۔ مگر ان دونوں بزرگوں نے اس واقعہ کے بعد سے مولانا محمد علی کو کبھی نہیں بخشا۔

خواجہ صاحب نے یوں تو اسلام پر متعدد کتابیں لکھی ہیں اور سب کی سب اپنی جگہ پر انتہائی مفید اور کارآمد ہیں، مگر ذاتی طور پر مجھے جو کتاب ان سب میں زیادہ عزیز ہے وہ سورسیز آف کرسٹی اینیٹی (Sources of Christianity) ہے یعنی ’’عیسائیت کے ماخذ۔‘‘ یہ ایسی فاضلانہ کتاب ہے کہ ایک مرتبہ پڑھ لینے کے بعد کوئی سمجھدار عیسائی تثلیث جیسے عقیدہ پر قائم نہیں رہ سکتا۔ میں تو اس کتاب کو بھی ایک گونہ اسلام ہی کی خدمت سمجھتا ہوں۔

ان کا انتقال ۲۷-۲۸ دسمبر ۱۹۳۳ کی درمیانی رات کو سوا بارہ بجے باسٹھ برس کی عمر میں ہوا۔ ان کی موت سے اسلام کا ایک زبردست شیدائی اور خدمت گزار ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

مسز اینی بیسنٹ

مسز اینی بیسنٹ ۱۸۹۳ میں ہندوستان آئیں اور اس کے بعد سے انہوں نے ٹھیٹھ ہندوآنہ طریقہ سے اپنی زندگی بسر کرنی شروع کردی اور بنارس کے مقدس شہر کو جس کے متعلق شیخ علی حزیں لکھتا ہے :—

از بنارس نروم لطف قیام است اینجا
هر برهمن بچهٔ لچهمن و رام است اینجا

اپنا مستقر بنالیا ۔ مرحومہ کے انتقال کے بعد تھیوسوفیکل سوسائٹی کے صدر جارج ایس ۔ ایرنڈیل نے لکھا : ”میں گواہی دیتا ہوں کہ شانتی کنج بنارس میں مرحومہ کی زندگی ہر لحاظ سے ہندو یوگی کی طرح گزری ۔ وہ ہندوستانی لباس زیب تن کرتی تھیں اور ہندوآنہ طرز کا کھانا کھاتی تھیں ۔ وہ عبادت بھی ہندوآنہ طریقہ پر کرتی تھیں ۔“

وہ ساری عمر سچائی کی پرستار رہیں ۔ عیسائی گھرانے میں پیدا ہونے اور ایک پادری کی بیوی بننے کے باوجود انہوں نے بعض کلیسائی رسوم کو ماننے سے صاف انکار کردیا جس کا نتیجہ طلاق کی صورت میں نکلا ۔ انہوں نے ریاکاری کے حضور میں خراج تحسین ادا کرنا کبھی پسند نہیں کیا ، بلکہ مذہب کے معاملہ میں اپنی والدۂ محترمہ کی منت سماجت کی بھی پروا نہ کی ۔ وہ ضمیر کی آواز کو ہر چیز پر مقدم رکھتی تھیں ۔

ہندوستان آنے کے بعد انہوں نے ہندو دھرم کا مطالعہ کیا وہ بھی اس شان سے کہ تھوڑی سی مدت میں انہوں نے سنسکرت جیسی ادق زبان میں مہارت تامہ حاصل کرلی ، اور ۱۹۰۷ میں بھگوت گیتا کا انگریزی میں ترجمہ کیا ۔ یہ ترجمہ اپنی سلاست

اور دلآویزی کے اعتبار سے انگریزی علم ادب میں اپنا خاص مقام رکھتا ہے۔

انہوں نے ۱۸۹۸ میں سنٹرل ہندو کالج قائم کیا اور ۱۹۱۳ میں اسے پنڈت مدن موہن مالوی کے حوالہ کردیا تاکہ وہ بنارس ہندو یونیورسٹی کا گہوارہ بنے۔ انہوں نے سارے ہندوستان میں قومی اصولوں پر تعلیم دینے کی غرض سے تھیوسوفیکل ہائی اسکول قائم کئے۔ ان مدارس میں نہ تو طلبا کو جسمانی سزا دی جاتی تھی اور نہ خوف و ہراس کے ذریعہ ان کی ذہنی بالیدگی کو ٹھٹھرنے دیا جاتا تھا۔ ان مدارس میں شادی شدہ لڑکوں اور لڑکیوں کو داخل نہیں کیا جاتا تھا۔ ہندوؤں میں صغر سنی کی شادی کی قبیح رسم کو محدود کرنے کا یہ بہت اچھا طریقہ تھا۔ ان مدارس کے اساتذہ طلبا کے والدین سے بھی میل جول رکھتے تھے تاکہ بچوں کی تربیت کے دشوار کام میں گھریلو اثرات سے بھی کام لیا جائے۔ ان میں کا ایک اسکول کانپور میں تھا اور مجھے وہاں تین سال تک ٹیچر کی حیثیت سے کام کرنے کی عزت حاصل رہ چکی ہے۔ وہیں مسز بیسنٹ کی خدمت میں مجھے پہلی مرتبہ نیاز حاصل ہوا۔

انہوں نے اسلام کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور اس سلسلہ میں انہوں نے اسلام پر دو لکچر بھی دئے تھے۔ ان دونوں لکچروں میں انہوں نے مسلمانوں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ وہ مسلمانوں کی موجودہ حالت سے مطمئن نہ تھیں بلکہ وہ انہیں اسی بلندی پر دیکھنا چاہتی تھیں جس کے وہ اپنے مذہب کی اعلیٰ تعلیمات کے اعتبار سے حقدار ہیں۔ ان لکچروں میں وہ مسلمانوں کو ان کے ماضی کا واسطہ دے کر ان سے درخواست کرتی ہیں کہ ”وہ مسلمان بنیں، جہالت کے داغ کو اپنی پیشانی سے دھوئیں اور اپنے بزرگوں کے علمی کارناموں کو اجاگر کریں۔“ ایک لکچر میں وہ مسلمانوں کی غیر معمولی شجاعت کا ذکر یوں

فرماتی ھیں :-

,, اپنے پیغمبر پر اعتقاد رکھنے نے ان کے دلوں سے موت کے خوف و ھراس کو دور کردیا ھے۔ افریقہ کے درویشوں سے بڑھ کر آپ کو بہادری کہاں مل سکتی ھے ؟ انہوں نے اس مقام پر حملہ کیا جہاں کیٹلنگ توپیں گولہ باری کر رھی تھیں۔ اور پھر وہ ایک دوسرے پر مرتے چلے گئے اس سے پہلے کہ وہ دشمن تک پہنچ سکیں۔ وہ موت کے منہ میں اس طرح سے جارھے تھے گویا کہ کوئی شخص دلہن کے کمرے میں جاتا ھو۔ وہ یہ کام محض پیغمبر عرب کی محبت اور اسلام پر ایمان رکھنے کی وجہ سے کر رھے تھے۔ ایسے بہادر مذھب کے لئے بالضرور دنیا میں زبردست مستقبل موجود ھے۔ ایسا مذھب اس سے بہت زیادہ بلند جگہ پر قائم ھونا چاھئے جتنی بلندی پر وہ آج پایا جاتا ھے۔''

دوسرے لکچر میں انہوں نے اسلامی تعلیمات کو نہایت دلکش انداز میں پیش کیا ھے اور ان اعتراضات کو دور کیا ھے جو غیر مسلم بالخصوص پادری صاحبان اسلام پر کیا کرتے ھیں اور آخر میں ھندو مسلم اتحاد کی اپیل کی ھے۔ اس سادہ اور موثر اپیل کا ایک اقتباس ملاحظہ ھو:-

'' اس طرح ایک گھنٹے تک تقریر کرنے سے میرا مقصد یہ ھے کہ میں ھندوؤں اور مسلمانوں کو قریب تر لے آؤں۔ کیا ھم یہ محسوس نہیں کرسکتے کہ ھم ایک دوسرے کے بھائی ھیں؟ . . . ھر مذھب سچائی کے سورج کی ایک کرن ھے۔ ھم اسی گھر کی طرف لوٹ رھے ھیں جہاں سے ھم آئے تھے۔ . . . قرآن مجید میں ھے : سب کے سب خدا کی طرف لوٹنے والے ھیں۔ یہ بھی لکھا ھے کہ ساری چیزیں فنا ھونے والی ھیں

سوائے اس کے چہرے کے ۔ اسے خواہ اللہ کہکر
پکاریے ، خواہ جیہووا کہئے ، خواہ آھر مزدا کے نام
سے یاد کیجئے ، خواہ ایشور کہئے ، نام تو بہت ھیں
اور ایک دوسرے سے بالکل مختلف ، مگر وہ ایک
ھی ھے ۔ ھم سورج کو مختلف مقامات سے دیکھتے
ھیں لیکن وہ آسمان میں ایک نہ بدلنے والی روشنی کی
طرح جلوہ فگن ھے اور ھم سب پر اس کی کرنیں
یکساں طریقہ سے پڑ رھی ھیں ۔ ھم سب ایک ھی
باپ کے بچے ھیں ۔ پھر کیا ضرورت ھے کہ گھر جاتے
وقت ایک دوسرے سے جھگڑا کریں ؟ "

اگرچہ مسز بیسنٹ کانگریس میں شامل تھیں ، لیکن انہوں نے اپنے طور پر ھوم رول کی تحریک بھی چلائی اور اس کے ذریعہ ملک بھر میں سیاسی بیداری پھیلائی ۔ ھارنیمین ، جناح اور بعض دوسرے مسلم اکابر اس تحریک میں ان کے رفقائے کار تھے ۔ جون ۱۹۱۷ میں مدراس کے گورنر لارڈ پینٹلینڈ کے حکم سے وہ نظر بند کی گئیں ۔ ستمبر میں جب وہ رھا ھوئیں تو انہیں کانگریس کی صدارت پیش کی گئی ۔ چنانچہ دسمبر میں جو ایڈریس انہوں نے پڑھا اسے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھی عام جلسوں میں پڑھ کر سنایا گیا تھا ۔ کانپور میں ان کا اردو ایڈریس پڑھنے کی عزت مجھے دی گئی تھی ۔ تحریک عدم تعاون کے سلسلہ میں گاندھی جی سے ان کے شدید اختلافات ھو گئے جو آخر وقت تک نہ مٹ سکے ۔ انہوں نے اس تحریک کی یہ کہ کر مخالفت کی تھی کہ وہ بالآخر تشدد پر منتج ھوگی اور جب عوام حقیقتاً تشدد پر اتر آئے تو انہوں نے حکومت کو مشورہ دیا کہ "وہ پتھر کا جواب گولی سے دے اور عدم تعاون کرنے والوں کو ڈاک اور تار وغیرہ کی سہولتوں سے یکسر محروم کردے ۔" اس مشورہ کی وجہ سے ان کی ھر دل عزیزی میں بڑا فرق آگیا تھا ۔ اس سلسلہ میں

ایک واقعہ بیان کرونگا جو میرا آنکھوں دیکھا ہے۔ امپائر تھیٹر بمبئی میں ایک جلسہ میں جو گاندھی جی کی صدارت میں منعقد ہوا تھا، مسز بیسنٹ بھی بولنے والی تھیں۔ جب وہ تقریر کرنے کے لئے کھڑی ہوئیں تو کچھ نوجوانوں نے ہڑبونگ مچائی اور انہیں تقریر کرنے سے روک دیا۔ یہ دیکھ کر گاندھی جی اٹھے اور انہوں نے پہلے تو مسز موصوفہ کی قومی و ملی خدمات کو سراہا اور گڑبڑ کرنے والوں کو خوب ڈانٹا اور آخر میں ان سے مطالبہ کیا کہ وہ کھڑے ہوکر مسز موصوفہ سے معافی مانگیں "جن کے بال ہندوستان کی خدمت میں سفید ہوگئے ہیں۔" چنانچہ گڑبڑ مچانے والے کھڑے ہوئے اور انہوں نے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی۔ اس کے بعد ان کی تقریر ہوتی رہی۔ یہ اس ہیجان انگیز دور کا واقعہ ہے جب کہ فضائے ہند پر گاندھی جی چھائے ہوئے تھے اور دوسرے لیڈروں کی لیڈری ماند پڑچکی تھی۔

لکھنؤ پیکٹ کی تکمیل میں بھی انہوں نے نمایاں حصہ لیا تھا۔ اسی زمانہ میں لکھنؤ کے ایک جلسہ میں انہوں نے دوران تقریر میں فرمایا کہ "اکیلا اسلام ھی وہ مذھب ہے جو مایوسی نہیں سکھاتا۔" اس پر زور و شور سے تالیاں بجائی گئیں اور وہ مسلمانوں میں بیحد ھر دل عزیز ہوگئیں۔

"کامریڈ" کے بند ہوجانے پر اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر راجہ غلام حسین نے لکھنؤ سے "نیو ایرا" نکالنا شروع کیا۔ جب کچھ عرصہ بعد ایک دردناک حادثہ کے نتیجہ میں ان کی موت واقع ہوگئی تو مسز بیسنٹ نے ان کے بال بچوں کی امداد کے لئے ایک فنڈ کھولا اور جتنی رقم اس میں جمع ہوگئی تھی اسے مرحوم کی بیوی کے نام بھیج دیا۔ راجہ غلام حسین بھی "ہوم رول لیگر" تھے۔

اپنی نظر بندی سے* رہائی پانے کے بعد مسز بیسنٹ سید ھی

---

* مسز بیسنٹ جون ۱۹۱۷ میں گورنر مدراس لارڈ پینٹ لینڈ کے حکم سے نظربند کی گئی تھیں اور چار مہینے کے بعد رہا کردی گئی تھیں۔

شملہ گئیں تاکہ علی برادران کی رہائی کی کوشش کریں ۔ وہ شملہ سے ناکام لوٹ رہی تھیں کہ کانپور کے اسٹیشن پر تھیوسوفیکل اسکول کے چند اراکین نے ان کی پذیرائی کی ۔ چونکہ پذیرائی کرنے والوں میں اکیلا میں ھی مسلمان تھا ، اس لئے انہوں نے مجھے علیحدگی میں اس گفتگو کا خلاصہ بتایا جو وہ چمیسفورڈ سے علی برادران کی رہائی کے متعلق کرچکی تھیں اور پھر فرمایا :—" ان کی رہائی کی راہ میں جو سب سے بڑی دشواری حائل ھے وہ مولانا محمد علی کا مفروضہ فارسی خط ھے جس میں انہوں نے امیر افغانستان کو ھندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی تھی ۔ یہ خط دیکھ کر میں سٹ پٹا گئی اور علی برادران کی رہائی کے لئے زیادہ لب کشائی نہ کرسکی ۔ تم یہ سارا معاملہ پریس میں دے دو ، تاکہ مسلمانوں کو معلوم ھو جائے کہ صورت حال کیا ھے ۔ بہرحال میں غافل نہیں ھوں اور میں ان کی رہائی کے لئے برابر جد وجہد کرتی رھونگی ۔ " چنانچہ مسز موصوفہ کے ارشاد کے مطابق میں نے اردو اور انگریزی اخبارات میں ایک بیان شائع کر دیا ۔ بیان کا شائع ھونا تھا کہ ملک بھر میں ھنگامہ برپا ھوگیا ، اور یہ بحث چھڑ گئی کہ آیا مولانا محمد علی نے امیر افغانستان کے نام کبھی کوئی خط بھیجا بھی تھا یا نہیں ۔ ساتھ ھی یہ بحث بھی چھڑ گئی کہ آیا مسز بیسنٹ کو اس بات کا حق پہنچتا ھے کہ وہ علی برادران کی رہائی کی کوششیں کریں ۔ بعض اخبارات نے جن میں لکھنؤ کا "نیو ایرا" بھی پیش پیش تھا ، یہ لکھا کہ " ھمیں مسز بیسنٹ کی خدمات کی ضرورت نہیں ۔ ھم مسلمان اپنی لڑائیاں خود لڑلینگے ۔ "یہ نوٹ ہمبوق نے لکھا تھا اور اس کا جواب میں نے "لیڈر" (الہ آباد) کے ذریعہ دیا جس میں لکھا گیا تھا کہ " کسی شخص کو مسز بیسنٹ کی نیت پر حملہ کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا ، بلکہ الٹا ھمیں شکر گزار ھونا چاھئے کہ انہوں نے از خود علی برادران کی رہائی

کے لئے کوششیں کی۔" اس کے بعد سے "نیوایرا" نے مخالفت ترک کردی ۔ بعد کو ۱۹۱۸ کی ابتدا میں جب میں چھندواڑہ گیا تو مولانا محمد علی سے اس فارسی خط کے بارےمیں تفصیلی گفتگو ہوئی ۔ مولانا نے فرمایا :—" میں نے ساری زندگی میں کبھی کسی کو فارسی میں خط نہیں لکھا اور اگر یہ خط میرا ہے تو حکومت مجھ پر کھلی عدالت میں مقدمہ کیوں دایر نہیں کرتی ؟ " یہ امر قابل ذکر ہے کہ (مفروضہ) خط کے باوجود علی برادران دسمبر ۱۹۱۹ کے آخری ہفتہ میں رہا کردئے گئے ۔ بعد کو معلوم ہوا کہ یہ خط سی ۔ آئی ۔ ڈی کا اختراعی کارنامہ تھا ۔

یہ ملاقات صرف چند منٹ رہی مگر آج تک میرے کان اس " نقرئی زبان والی خاتون" کی آواز سے لذت گیر ہیں۔ میں اپنے تئیں خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ مجھے ان سے دو تین مرتبہ ہم کلای کا شرف حاصل ہوا ، ویسے مجھے ان کی متعدد تقریریں سننے کی سعادت بھی حاصل رہ چکی ہے ۔

تقریباً ۸۷ برس تک بھر پور زندگی گزارنے کے بعد جو تمامتر خدمت انسانی میں بسر ہوئی ، مسز بیسنٹ ۲۰ ستمبر ۱۹۳۳ کو طویل علالت کے بعد عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت فرما گئیں اور مدراس کے مقام ادیار میں جسے انہوں نے بنارس کے بعد اپنی تحریکات کا مرکز بنا لیا تھا ، ان کی نعش ہندو دھرم کے مطابق سپرد آتش کردی گئی ۔

جب وہ اپنے رب سے ملی ہونگی تو وہ اس خیال سے یقیناً مسرور ہونگی کہ ان کی ساری ارضی زندگی ذات پات کی قیود سے بالاتر ہو کر خالصۃً بنی نوع انسان کی خدمت میں صرف ہوئی ۔ ان کی زندگی درحقیقت "افضل الا شغال خدمت الناس" کی تفسیر تھی۔

***

سید فضل الحسن حسرت موہانی

حسرت موہانی زندگی بھر ''رئیس الاحرار'' کے قابل احترام لقب سے مشہور رہے ۔ وہ ۱۹۰۴ میں کانگریس میں شامل ہوئے اور جب ۱۹۰۷ میں سورت میں کانگریس دو ٹکڑیوں میں بٹ گئی تو انہوں نے بال گنگا دھر تلک کی رہنمائی میں اس سے وقتی طور پر علیحدگی اختیار کرلی ۔ مولانا سیاسیات اور سودیشی کے معاملہ میں آخر وقت تک تلک مہارج ھی کے مقلد رہے ۔ وہ سودیشی کے معاملہ میں اپنے عقیدہ میں اس قدر پختہ تھے کہ ایک مرتبہ وہ کسی کے مہمان تھے اور سردی کا زمانہ تھا ۔ میزبان نے ولایتی کمبل اوڑھنے کو دیا ۔ یہ رات بھر سردی کھاتے رہے مگر انہوں نے کمبل کو ھاتھ تک نہیں لگایا ۔

ان کی زندگی ''عبارت تھی ظلم و جہل ، نا انصافی اور استبداد کے خلاف مسلسل اور انتھک جد وجہد سے ۔'' وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے سیاسی قیدی کی حیثیت سے جیل کو زینت بخشی ۔ پھر تو وہ متعدد مرتبہ جیل گئے ۔ پہلی مرتبہ انہیں جیل اس لئے ہوئی تھی کہ انہوں نے اپنے رسالہ (آردوئے معلیٰ) میں مصر کے بارے میں برطانوی پالیسی پر کڑی تنقید کی تھی ۔ یہ آرٹیکل جس کا عنوان تھا ''مصر میں انگریزی سیاست'' دراصل ترجمہ تھا کسی عربی مضمون کا اور مولانا نے سچے صحافی کی حیثیت سے لکھنے والے کا نام حکومت کو بتانے سے صاف انکار کردیا تھا ۔ اس بنا پر ان کے خلاف ایڈیٹر ، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے مقدمہ چلایا گیا اور دو سال کی سزا دے دی گئی ۔ اس زمانہ میں اے ۔ بی ۔ سی کلاسیں نہ بنی تھیں ۔ یہی سبب ھے کہ انہوں نے معمولی قیدیوں کی طرح جیل کی سختیاں سہیں اور

ماریں کھائیں، لیکن اُف تک نہ کی۔ اور کوئی کمزور طبیعت کا آدمی ہوتا تو معافی مانگ کر جیل سے کبھی کا باہر نکل آتا۔ مگر مولانا جو پیکر ایثار و قربانی تھے، صبر و سکون سے غیر ملکی حکومت کے مظالم برداشت کرتے رہے۔ ذیل کے اشعار اسی دور کی یادگار ہیں:۔

ہے مشق سخن جاری چکی کی مشقت بھی
اک طرفہ تماشا ہے حسرت کی طبیعت بھی
کٹ گیا قید میں ماہ رمضاں بھی حسرت
گرچہ سامان سحر کا تھا نہ افطاری کا

مولانا سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۶—۱۷ میں کانپور میں ہوئی تھی۔ اس کے کچھ عرصہ بعد میں بہ سلسلۂ ملازمت بمبئی چلا گیا۔ مولانا حج اور بعض اوقات دوسرے کاموں کے سلسلہ میں بمبئی آتے رہتے تھے۔ ان موقعوں پر میں انہیں ''بزم خیال'' کے مشاعروں میں کھینچ کھانچ کر لے آتا تھا جہاں ہم نے یہ التزام کر رکھا تھا کہ پہلے چند مقامی شعرا اپنا کلام سنائیں اور پھر مولانا۔ اس طرح یہ سلسلہ آخر وقت تک جاری رہتا۔ اس ترکیب سے حاضرین کو موقع مل جاتا کہ وہ مولانا کا زیادہ سے زیادہ کلام انہی کی زبان فیض ترجمان سے سن سکیں۔ مولانا اچھے شعر کی ''ہاں'' اور ''ٹھیک ہے'' کہکر داد دیا کرتے تھے۔

مولانا کی زندگی بہت سادہ تھی، کھانا پینا بھی سادہ اور لباس بھی سادہ۔ ان کی ضروریات بھی بہت محدود تھیں۔ ہمیشہ تیسرے درجہ میں سفر کرتے تھے۔ ۱۹۲۳ میں جب وہ خلافت کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اس وقت بھی انہوں نے تیسرے ہی درجہ میں اپنے خرچ سے سفر کیا حالانکہ مولانا شوکت علی کہتے ہی رہ گئے کہ وہ کم سے کم دوسرے درجہ میں بی اماں کے ساتھ خلافت کے خرچ پر سفر کریں۔ یہ میرے سامنے کا واقعہ ہے۔ مگر مولانا برابر اپنی ضد پر قائم رہے اور تیسرے ہی درجہ میں

سفر کیا اور خلافت کمیٹی سے ایک پیسہ بھی نہیں لیا ۔ سفر میں وہ ٹاٹ کا تھیلا ضرور اپنے ساتھ رکھتے تھے ۔ اس کے بغیر ان کا تصور نہیں کیا جاسکتا ۔

مولانا مکمل آزادی کے حامی تھے اور ملک کے دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح ڈومی نین اسٹیٹس (Dominion Status) پر اکتفا کرنے والے نہ تھے ۔ انہوں نے سب سے پہلے کامل آزادی کی تجویز انڈین نیشنل کانگریس کے سامنے رکھی جسے اس نے خاص مصلحتوں کے ماتحت مسترد کردیا ۔ حسرت جس چیز کو اپنے ملک کے لئے اچھا سمجھتے تھے اسی کی تبلیغ بھی کرتے تھے خواہ اس کے نتائج و عواقب کچھ ھی کیوں نہ نکلیں ۔ وہ بڑی سے بڑی ھستی سے بھی کبھی مرعوب نہیں ھوئے ۔ وہ حق بات کہنے میں بالکل نڈر اور بے باک تھے ۔ حقیقت یہ ھے کہ ان کی ساری زندگی اسی قسم کے جہاد میں گزری ۔ ایسے مرد قلندر قرنوں میں دنیا میں آتے ھیں ۔

ایک مقدمہ سے جو حکومت بمبئی کی طرف سے ایک تقریر کے سلسلہ میں ان پر قائم کیا گیا تھا راقم الحروف کا بھی تعلق تھا اس لئے کہ ان کی تقریر کے انگریزی ترجمہ کا کام میرے سپرد تھا اور مقدمہ کے سارے کاغذات بھی اتفاق سے میری ھی تحویل میں تھے ۔ حکومت نے حکم دے دیا تھا کہ مولانا جہاں کہیں بھی ھوں گرفتار کرلئے جائیں ۔ مجھے معلوم تھا کہ مولانا کی صاحبزادی کی شادی ھونے والی ھے ، لیکن مجھے یہ ڈر تھا کہ اگر مولانا یا ان کی بیگم صاحبہ کو اطلاع دے دی گئی تو کہیں یہ بات ظاھر نہ ھوجائے ۔ چنانچہ میں نے اطلاع نہ دی اور مولانا گرفتار کرلئے گئے ۔ مگر اس کے باوجود ان کی صاحبزادی کی شادی ان کی غیرحاضری میں گرفتاری سے دو تین دن بعد مقررہ تاریخ کو کردی گئی ۔ بہرحال بیگم مجھ سے خفا سی رھیں ۔

مقدمہ میں مترجم کی حیثیت سے مجھے ھی جانا چاھئے تھا ،

لیکن ایک بات ہوگئی جس کی وجہ سے میری بجائے ہمارے دفتر کے افسر اعلیٰ (شیخ ....) جملہ دفتری روایات کے خلاف بہ نفس نفیس گواہی دینے کے لئے احمد آباد پہنچ گئے حالانکہ ان کا ترجمہ سے صرف اتنا تعلق تھا کہ انہوں نے بے پڑھے اس پراپنے دستخط ثبت کئے تھے اور بس۔ چونکہ عدم تعاون کا زمانہ تھا اور ملزمین عدالتی کارروائیوں میں مطلق حصہ نہ لیتے تھے اس لئے انہوں نے سمجھا ہوگا کہ مفت میں فرسٹ کلاس کا کرایہ اور ڈیلی الاؤنس ملیگا اور نام بھی ہوجائیگا۔ چنانچہ مترجم کی حیثیت سے جب وہ پیش ہوئے تو مولانا نے جنہیں معلوم تھا کہ ترجمہ کس نے کیا ہے، ان سے پوچھا کہ ''کیا یہ ترجمہ آپ نے کیا ہے؟'' انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر مولانا نے سی۔ آئی۔ ڈی کی تحریر کردہ تقریر طلب کی۔ وہ پنسل کی لکھی ہوئی تھی اور بار بار کے ھاتھ لگنے سے کئی جگہ سے مٹ سی گئی تھی۔ مولانا نے وہی خراب حصہ گواہ کو پڑھنے کے لئے دیا۔ گواہ نے بات بناتے ہوئے کہا کہ ''ترجمہ اگرچہ میرے اسسٹنٹ نے کیا ہے لیکن میں نے اس کا لفظاً لفظاً مقابلہ کیا ہے۔ یہ حصہ مٹا ہوا سا ہے اور اس لئے مجھے کچھ وقت ملنا چاہئے تاکہ میں اس کا مطالعہ کرسکوں۔'' چنانچہ عدالت کچھ دیر کے لئے برخاست ہوگئی۔ جب عدالت دوبارہ بیٹھی تو گواہ نے کہا کہ ''میں اب اس حصہ کو پڑھ سکتا ہوں۔'' اس پر مولانا نے فرمایا کہ ''میں محض یہ دکھانا چاھتا ہوں کہ یہ گواہ اردو سے کس قدر نابلد ہے۔'' بہرحال عدالت میں میں مفروضہ مترجم کی بہت کرکری ہوئی اور ایسوشی ایٹیڈ پریس کی طرف سے اس مقدمہ کی جو روداد اخبارات کو بھیجی گئی اس نے بھی اس واقعہ کو مزید شہرت دے دی۔ شعیب قریشی نے جو مقدمہ کی کارروائی دیکھنے کے لئے عدالت میں موجود تھے، گواہ سے طنزاً کہا:— ''شیخ صاحب، میرا اخبار (ینگ انڈیا)

انگریزی میں نکلتا ہے اور اس لئے آپ کو اس کے مضامین کا ترجمہ کرنے کی زحمت اٹھانی نہ پڑتی ہوگی۔'' وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر رہ گئے۔ ۱۹۵۱ کے شروع میں جب مولانا کراچی میں تھے، میں نے دوران گفتگو میں پوچھا تھا کہ کیا آپ کو اپنے مقدمہ والا واقعہ یاد ہے تو انہوں نے ہنس کر فرمایا :— '' ہاں یاد ہے۔''

احمدآباد کے مقدمہ کے کچھ عرصہ بعد مولانا پر ایک اور مقدمہ بمبئی ہائی کورٹ میں چلا تھا جو قواعد جیل کے کسی قاعدہ کی خلاف ورزی سے متعلق تھا۔ چونکہ مولانا سیاسی مسلک کے پیرو تھے اور اس کا علم مراٹھے سپاہیوں کو تھا بالخصوص ان کو جو جیل میں وارڈر وغیرہ کی حیثیت سے متعین تھے، اس لئے وہ مولانا کا بیحد احترام کرتے تھے اور ان کے لئے ہر قسم کی سہولت مہیا کرتے تھے۔ وہ مولانا کے لئے اخبار لا کر دیتے تھے جس کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ یہ چیز جیل کے قواعد کے خلاف تھی۔ چنانچہ ان پر مقدمہ چلایا گیا مگر وارڈر نے جرم کو اپنے اوپر اوڑھ لیا اور مولانا پر آنچ نہ آنے دی۔ حکومت کی بندش کے باوجود مولانا کو برابر اخبارات ملتے رہے۔

مدتوں مولانا کے پیچھے سی۔آئی۔ڈی کے سپاہی لگے رہے۔ شروع شروع میں مولانا نے انہیں بہت پریشان کیا۔ لیکن جب سپاہیوں نے ان کے سامنے گڑگڑا گڑگڑا کر کہا کہ ''ہماری ملازمت خطرے میں پڑجائیگی'' تو مولانا نے ستانا بند کردیا اور ان دونوں میں باہم ایک گونہ سمجھوتہ ہو گیا کہ وہ آیندہ مولانا کے دوست اور خادم بن کر رہینگے۔ چنانچہ ایک مرتبہ میرے استفسار پر انہوں نے فرمایا :— ''نہیں، مجھے ان کی موجودگی سے ہمیشہ آرام پہنچا۔ دوران سفر میں وہ میرا سامان اٹھا کر چلتے تھے۔ ان کی وجہ سے مجھے اور بھی آرام ملتے تھے۔ وہ میرے باڈی گارڈ بن کر رہا کرتے تھے۔''

ایک مرتبہ میں نے مولانا سے کہا کہ ''آپ تلک مہاراج کے مقلد ہیں حالانکہ انہوں نے اس اتحاد کو توڑ دیا جس کی وجہ سے مہاراشٹر کے ہندو مسلمان مل کر محرم منایا کرتے تھے اور پھر ہندوؤں کو گنپتی کے تہوار میں لگادیا تاکہ وہ دوسری طرف مشغول نہ ہوں۔'' فرمایا کہ ''میں اسی حد تک ان کے مسلک کو پسند کرتا ہوں جس حدتک وہ ہندوستان سے انگریزوں کو نکالنے کے حامی ہیں۔ باقی امور میں میں ان کے مسلک کا پابند نہیں ہوں۔'' اتنا کہا اور پھر اپنا یہ شعر پڑھا:—

میں اور ولائے کفار گمراہ استغفر اللہ استغفر اللہ

مولانا حسرت کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کرتے وقت میں بیگم حسرت کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ جو مکمل ہم آہنگی مولانا میں اور ان میں زندگی بھر قائم رہی وہ بہت کم دیکھنے میں آتی ھے۔ وہ صحیح معنوں میں مولانا کی رفیق حیات تھیں اور ان کے ہر جہاد میں دل وجان سے شریک۔ وہ اتنی بہادر خاتون تھیں کہ انہوں نے اپنے خاوند کو جیل جاتے دیکھ کر کبھی آنسو نہیں بہائے بلکہ ہمیشہ صبر ایوبی سے کام لیا۔ مولانا خوش قسمت تھے کہ انہیں ان کے کاموں میں دل و جان سے شریک ہونے والی ایسی نڈر اور جری بیوی ملی۔

تقریباً بیس سال سے مولانا نے یہ التزام کر رکھا تھا کہ وہ ہرسال حج کے لئے جائیں۔ اس سفر میں کبھی کبھار ان کی بیگم بھی ہمراہ ہوتی تھیں۔ صحیح تعداد تو معلوم نہیں مگر انہوں نے کم و بیش ۱۸ حج کئے ہونگے۔ حجاز میں وہ ایک ہی معلم کے یہاں قیام کیا کرتے تھے جو مرحوم سلطان ابن سعود کی طرف سے ان کی مہمان داری کے فرائض انجام دیا کرتا تھا۔

ایک ثقہ راوی کی زبانی مجھے معلوم ہوا ھے کہ ستمبر ۱۹۴۷ میں جبکہ دھلی میں چاروں طرف آگ ھی آگ لگی ہوئی تھی اور مسلمانوں پر زندگی حرام ہورھی تھی، مولانا دن کے

کسی نہ کسی حصہ میں کناٹ پلیس پہنچ جاتے تھے اور تن تنہا ادھر آدھر گھومتے پھرتے تھے - خدا جانے آن کے دل میں اس وقت کیا کیا خیالات موجزن رہتے ہونگے - دھلی کی حکومت نے خفیہ طریقہ سے سی - آئی - ڈی کے چند مسلح سپاھی ان کی دیکھ بھال کے لئے مقرر کردئے تھے جو ھر جگہ ان کی حفاظت کرتے رہتے تھے - کانپور میں ھندو مسلمانوں کے فسادات کے زمانہ میں بھی وہ بے دھڑک ھندو محلوں میں جا کر روزانہ ترکاری خرید کر لایا کرتے تھے - انہیں خطرہ میں رہ کر زندگی بسر کرنے میں لطف آتا تھا اور یہی وجہ ھے کہ وہ خطرات سے متاثر ہونے کے عادی نہ تھے -

۱۹۵۱ میں مولانا نے حج سے لوٹتے وقت کراچی میں کچھ دن قیام فرمایا - اس زمانے میں ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں - ایک دو مرتبہ انہوں نے اپنی تازہ نعتیں بھی سنائیں جو مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں لکھی گئی تھیں - کراچی میں ان کا ایک بہترین فوٹو بھی کھینچا گیا تھا اور وھی فوٹو اب اس کتاب کی زینت بن رھا ھے - جب مولانا کراچی سے جانے لگے تو میں نے عرض کیا کہ ”مجھے بھی اسٹیشن پر آنے کی اجازت دی جائے -“ فرمایا کہ ”تکلیف کرنے کی مطلق ضرورت نہیں - خواہ مخواہ جمگھٹا کیوں ہو -“ چنانچہ آنہیں پہنچانے کے لئے میں اسٹیشن پر نہیں گیا - کراچی کے دوران قیام میں کسی کو وھم و گمان بھی نہ تھا کہ مولانا اس قدر جلد ھم سے جدا ہو جائینگے -

مرتے وقت مولانا کی عمر ۷۵ سال کے لگ بھگ ہوگی - وہ ۶ شعبان ۱۳۷۰ ھجری (۱۳ مئی ۱۹۵۱) کو بہ مقام لکھنؤ اس دار فانی سے راھی عالم جاودانی ہو گئے -

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا !

***

بیگم حسرت

بیگم حسرت موہانی ان خواتین میں سے ھیں جن کا میں حقیقی معنوں میں احترام کرتا ھوں۔ یہ آن عورتوں میں سے ھیں جن پر ھند و پاکستان سدا فخر کرینگے۔ اگرچہ یہ سیاسیات میں پیش پیش نہ تھیں تاھم وہ اپنے بہادر خاوند کا ساتھ دینے کے لئے ھر آس تحریک سے دلچسپی رکھتی تھیں جس سے حسرت کو دلچسپی تھی۔ حسرت سودیشی کے معاملہ میں بال گنگا دھر تلک کی پالیسی پر گامزن تھے اور انہی کی پیروی میں انھوں نے عہد کیا تھا کہ ھمیشہ سودیشی چیزیں استعمال کرینگے۔ ان کی بیگم بھی اپنی زندگی کے آخری دن تک اسی مسلک پر قائم رھیں اور کبھی اس راستہ سے نہیں ھٹیں۔ وہ ھمیشہ موٹے جھوٹے سودیشی کپڑے استعمال کرتی تھیں۔

ھماری عورتیں جب کبھی اپنے عزیزوں کو اور بالخصوص اپنے خاوندوں کو سیاسی تحریکات میں جیل جاتے دیکھتی ھیں تو وہ بے اختیار رونے لگتی ھیں، مگر بیگم حسرت خدا جانے کس دل گردہ کی خاتون تھیں کہ وہ اپنے خاوند کے جیل جاتے وقت کبھی نہیں روئیں۔ اس بارے میں ان کا تقابل ٹرکی کی مجاھد خاتون خالدہ ادیب خانم سے کیا جاسکتا ھے۔

جس زمانہ میں (۱۹۲۲) مولانا حسرت یروڈا جیل (پونا) میں قید تھے، بیگم حسرت اپنی صاحبزادی اور داماد کی معیت میں پونا تشریف لائیں۔ آن دنوں ان کی مالی حالت قدرے سقیم تھی اور جب پونا کے مسلمانوں کو یہ حقیقت معلوم ھوئی تو انھوں نے اپنی طرف سے مالی امداد کی پیش کش کی، مگر غیور بیگم نے جواب میں صرف یہ کہا کہ ”اگر آپ میرے خاوند کے مداح

ھیں تو آپ کو چاھئے کہ ان کی کتابیں خریدیں ۔ لیکن میں روپیہ قبول کرنے سے قطعاً معذور ہوں ۔" پونا میں جب تک قیام پذیر رھیں وہ آپ اپنی کفیل رھیں اور اس بارے میں انہوں نے کسی کا احسان لینا گوارا نہیں کیا ۔ وہ صحیح معنوں میں اپنے بہادر خاوند کا تتبع کرتی تھیں جنہوں نے ہمیشہ خود اعتمادی کی زندگی بسر کی ۔ بیگم حسرت اپنے خاوند کی سچی رفیق تھیں۔ وہ کتابیں چھپوانے ، ان کے پروف پڑھنے ، پریس کی دیکھ بھال کرنے اور سودیشی اسٹور چلانے میں ہمیشہ اپنے خاوند کا ھاتھ بٹاتی رھیں۔ الغرض مولانا حسرت کا کوئی مشغلہ ایسا نہ تھا جس میں وہ دل وجان سے شریک نہ رھی ہوں۔

بیگم حسرت کی طبیعت میں بیحد مزاح تھا ۔ ایک دفعہ کا ذکر ھے کہ پولیس تلاشی کی غرض سے علیگڈھ میں ان کی قیام گاہ پر آئی ۔ بیگم حسرت نے چپہ چپہ دکھادیا ، مگر ایک مقفل صندوق کے بارے میں کہا کہ "اسے ھاتھ نہ لگائیےگا ۔ اگر اندر کا بم پھٹ گیا اور آپ لوگ ھلاک یا زخمی ھوگئے تو اس کی ذمہ داری مجھ پر نہ ھوگی ۔" پولیس انسپکٹر نے سپاھی سے کہا کہ "صندوق کھول کر دیکھو کہ اس میں کیا ھے۔" سپاھی خود خوفزدہ تھا اور اس لئے اس نے اپنے افسر سے کہا کہ "ذرا اور انتظار کرلیجئے ۔ اس صندوق کو مولانا ھی سے کھلوائینگے۔" جب تھوڑی دیر میں حسرت آگئے تو ان سے کہا گیا کہ وہ اس صندوق کو کھولیں۔ جب اسے کھولا گیا تو وہ اندر سے بالکل خالی نکلا ۔ مولانا کو جب سارا واقعہ بتایا گیا تو انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں ھنستے ھوئے کہا : "بیگم نے مذاق کیا ھوگا ۔"

بیگم حسرت کئی اعتبار سے اپنے زمانہ کی مسلم عورتوں سے بہت آگے تھیں۔ انہوں نے رواجی پردہ چھوڑا لیکن حیا اورسادگی کو ھاتھ سے جانے نہیں دیا ۔ ان کے ھاتھوں میں میں نے کبھی کوئی زیور

نہیں دیکھا۔ وہ چوڑیوں سے بھی بے نیاز تھیں۔ ان کے لباس میں میں نے کبھی بھڑک یا نمود نہیں دیکھی۔ وہ سیدھی سادی خاتون تھیں اور بس۔ وہ پردہ سے اس لئے باھر آئی تھیں کہ ان کے خاوند کی رفاقت متقاضی تھی کہ وہ ایسا کریں۔

ایک مرتبہ مولانا حسرت اپنی بیگم کے ساتھ بمبئی تشریف لائے اور وہاں کرافورڈ مارکیٹ کے قریب حاجیوں کے مسافر خانہ میں قیام پذیر ہوئے۔ میں نے ان دونوں کی دعوت کرنی چاہی، مگر حسرت نے اپنی معذوری کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: "تم اپنی بہن کو لے جاؤ۔" چنانچہ وہ میرے مکان پر تشریف لائیں اور مجھے اور میری مرحوم بیوی دونوں کو مفتخر فرمایا۔ اس کے بعد مجھے پھر کبھی موقع نہ ملا کہ میں انہیں اپنے یہاں مدعو کرتا۔

جب مولانا حسرت پونا میں قید تھے، بیگم حسرت ان کے نام کتابیں بھیجتی رہتی تھیں۔ یہ سب کتابیں منظوری کے لئے میرے پاس آتی تھیں۔ بیگم حسرت ان کتابوں کے حاشیوں پر نجی خط لکھ کر بھیجتی تھیں۔ پونا آنے کے بعد بھی وہ یہی کرتی رہیں۔ ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ "آخر آپ ان کتابوں کے حاشیوں پر خط کا مضمون کیوں لکھ دیا کرتی ہیں؟ آپ ان کے نام الگ خط کیوں نہیں بھیجتیں؟" کہنے لگیں: "نہ تو میرا کوئی خط مولانا تک پہنچ پاتا ہے اور نہ مجھے ملاقات ھی کی اجازت ملتی ہے، اس لئے خطوں کی باتیں حاشیوں میں لکھ بھیجتی ہوں۔" میں نے انہیں بتایا کہ "آپ اس طریقہ سے میری پوزیشن کو خطرناک بنا رہی ہیں۔" بہرحال میں نے اپنے مہربان اور شریف دوست اور افسر جے۔ میکڈانل کے ذریعہ جو ہوم ڈیپارٹمنٹ میں اسسٹنٹ سیکریٹری تھے، ملاقات کی اجازت دلوادی اور اجازت بھی ایسی کہ جب چاہیں، مل لیا کریں۔ اس کے بعد جا کر کہیں حاشیہ نویسی کا سلسلہ ختم ھوا اور

میری جان میں جان آئی۔

مسز سروجنی نائیڈو نے بیگم حسرت کی جرأت رندانہ کا ایک دلچسپ واقعہ مجھ سے بیان کیا تھا جسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔ جب وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اصلاحات کی اسکیم مرتب کرنے کے لئے ہندوستان تشریف لائے تو اس وقت یہ بھی طے پایا تھا کہ عورتوں کا ایک وفد ان کی خدمت میں پیش ہوگا۔ اس وفد میں بیگم حسرت بھی شامل تھیں۔ ان وفود میں وہی باتیں ہوا کرتی ہیں جو پہلے سے طے پاجاتی ہیں اور پروگرام میں سرمو فرق نہیں آتا۔ مگر دوران ملاقات میں بیگم حسرت نے مولانا کی گرفتاری، قید میں سختی اور دوسرے متعلقہ امور کے بارے میں تحریری شکایت وزیر ہند کے ہاتھ میں تھما ہی دی۔ مسز نائیڈو فرماتی تھیں کہ ”میں نے پیچھے سے چٹکیاں لے لے کر انہیں اس کام سے روکنا چاہا، لیکن وہ بالکل نہ رکیں اور جب تک انہوں نے زبانی بھی حسرت کے بارے میں باتیں نہ کہ ڈالیں اس وقت تک دم نہ لیا۔ وفد کے دیگر افراد اور متعلقہ حکام سب حیرت میں تھے مگر چپ تھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔“

بیگم حسرت کا انتقال اپریل ۱۹۳۷ء میں بمقام کانپور ہوا۔ ان کی وفات سے برصغیر ہند و پاکستان ایک غیر معمولی بہادر اور جری خاتون کی خدمات سے محروم ہوگیا۔

***

منشی پریم چند

منشی پریم چند سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۵ یا ۱۹۱۶ میں دفتر رسالہ ''زمانہ'' (کانپور) میں ہوئی جہاں وہ لالہ دیا نرائن نگم سے ملنے کے لئے وقتاً فوقتاً آیا کرتے تھے۔ میں ان دنوں تھیوسوفیکل ہائی اسکول میں ٹیچر تھا۔ اس کے بعد کانپور میں ان سے چند اور ملاقاتیں ہوئیں۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے ان دنوں وہ کسی اسکول میں ملازم تھے اور پرائیویٹ طور پر بی۔ اے کے امتحان کی تیاری کررہے تھے۔ اس وقت بھی وہ اپنے افسانوں کی وجہ سے کافی مشہور ہوچکے تھے۔ ان کا اصلی نام دھنپت رائے تھا۔ ''پریم چند'' قلمی نام ہے۔ پھر تو وہ اتنے مشہور ہوئے کہ ان کی سی شہرت زمانۂ حاضرہ کے کسی اور ادیب کے حصہ میں مشکل سے آئی ہوگی۔

جون یا جولائی ۱۹۳۴ میں پریم چند اجنٹا سنے ٹون نامی فلم کمپنی میں ملازم ہوکر بمبئی تشریف لائے۔ مگر وہاں ان کے قیام کا زمانہ مختصر رہا، مشکل سے ایک سال۔ ۱۹۳۵ کے وسط میں وہ بمبئی کو خیرباد کہہ کر عازم بنارس ہوگئے۔ بمبئی کی آب و ہوا انہیں راس نہ آئی۔ انہوں نے ایک خط میں مجھ سے آب و ہوا کی شکایت بھی کی تھی۔

جب وہ بمبئی آئے تو ان کی شان یہ تھی کہ وہ شدہ کھدر کا کرتا اور دھوتی زیب تن کئے ہوئے تھے۔ پاؤں میں سادہ وضع کی چپل تھی۔ مگر پہلی ملاقات کے موقع پر وہ اگرچہ کھدر پوش تھے، لیکن سر پر بہت بڑا پگڑ تھا اور پاؤں میں انگریزی وضع کا جوتا۔ بمبئی میں کبھی کبھار کھدر کی ٹوپی اوڑھتے تھے، لیکن زیادہ تر ننگے سر ہی رہتے تھے۔

قیام بمبئی کے زمانہ میں میں کبھی ان کے یہاں چلا جاتا اور کبھی وہ میرے دفتر تشریف لے آتے۔ سہ پہر کا وقت وہ کسی نہ کسی تفریح گاہ میں صرف کیا کرتے تھے۔ چنانچہ جب کبھی گیٹ وے آف انڈیا (اپالو بندر) کی طرف نکل جاتے تو راستہ میں سیکریٹریٹ میں مجھ سے ملنے کے لئے ضرور قدم رنجہ فرماتے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی قیام گاہ پر اپنا تازہ افسانہ بھی سنایا تھا جو ہلاکو خاں کی زندگی سے متعلق تھا۔

بمبئی آنے سے پہلے انہوں نے اپنا ایک ناول مہا لکشمی منسے ٹون کو فلمانے کی غرض سے دیا تھا۔ چنانچہ وہ ناول "سیوا سدن" کے نام سے پردۂ سیمین پر جلوہ گر ہوا۔ صحیح معاوضہ کی تو خبر نہیں لیکن سننے میں آیا تھا کہ کمپنی نے دو ہزار روپے میں کہانی فلمانے کے حقوق خریدے تھے۔ اس زمانہ میں معاوضہ کی شرح زیادہ نہ تھی۔

اجنٹا سنے ٹون سے وابستہ ہوجانے کے بعد انہوں نے دو ڈرامے لکھے، ایک کا نام تھا "مل" اور دوسرے کا "جیون۔" اول الذکر میں مزدوروں کی حالت زار کا نقشہ کھینچا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ سرمایہ دار کس کس طرح سے ان کا خون چوستے ہیں۔ دوسرے میں راجپوتوں کی بہادری کے کچھ کارنامے دکھائے گئے تھے۔ حکومت بمبئی نے "مل" کو قابل اعتراض ٹھہرایا اور اس کی نمایش بند کردی۔ پنجاب میں کچھ دنوں تک یہ فلم چلی، مگر وہاں بھی بمبئی کی دیکھا دیکھی اس کی نمایش پر بندش عائد کردی گئی۔ باربار کے تغیر و تبدل سے اس کا حلیہ بگڑ گیا تھا، مگر مالک کمپنی (بھونانی) ڈیڑھ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد اسے "غریب مزدور" کے نام سے دکھانے میں کامیاب ہوگئے۔ "مل" میں خود پریم چند جی نے بھی کردار ادا کیا تھا۔ اس میں وہ یونین کے پریسیڈنٹ کی حیثیت سے نظر آتے ہیں جو مزدوروں اور سرمایہ داروں کے مابین

تنازعات کا تصفیہ کرانے کے لئے قائم کی گئی تھی۔ اس فلم کا ڈھانچہ کمپنی نے تیار کیا تھا اور اس پر گوشت پوست منشی صاحب نے منڈھا تھا۔ دونوں فلموں کی زبان سلیس اور موثر تھی۔ جب اس فلم کی ''شوٹنگ'' ہو رہی تھی تو پریم چند کی وجہ سے میں بھی اس کے کچھ حصے دیکھ سکا بالخصوص وہ جن میں خود ان کا کردار تھا۔

چونکہ بمبئی میں پریم چند کی صحت اچھی نہ رہتی تھی اور دوسرے اجنٹا کمپنی بھی بند ہونے والی تھی اس لئے انہوں نے مزید قیام کا ارادہ ترک کردیا۔ میرے پوچھنے پر بھونانی نے بتایا تھا کہ کمپنی منشی صاحب کو سات سو روپے ماہانہ دیتی تھی۔

جب بمبئی ٹاکیز کے منیجنگ ڈائرکٹر ہمنسو رائے اور ان کی بیگم دیوکا رانی کو خبر ہوئی کہ پریم چند اجنٹا چھوڑ رہے ہیں تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ پریم چند صاحب کو بمبئی ٹاکیز سے وابستہ کرادو۔ چنانچہ میں نے منشی صاحب سے ان کی ملاقات کرادی۔ دوران ملاقات میں انہوں نے بمبئی کی خراب آب و ہوا کا عذر کیا اور فرمایا کہ ''میں اجنٹا سے علیحدگی کے بعد بنارس میں قیام کرنا چاہتا ہوں۔'' میں نے ان کی طرز گفتگو سے اندازہ لگایا کہ وہ فلمی زندگی سے بھی اکتا گئے ہیں اس لئے کہ جب ہمنسو رائے نے ان سے درخواست کی کہ ''آپ بنارس ہی سے فلمی افسانے لکھ کر بھیج دیا کریں'' تو اس وقت بھی انہوں نے اپنی معذوری کا اظہار کیا۔ اس پر ہمنسو رائے نے کہا کہ ''اچھا تو کسی اور شخص کا نام تجویز کردیجئے تاکہ وہ یہاں ہماری کمپنی میں آکر کام کرے۔'' اس پر پریم چند نے کیشپ کی سفارش کردی اور وہ بمبئی ٹاکیز میں فلمی افسانے لکھنے پر مقرر ہو گئے۔

ایک مرتبہ دوران گفتگو میں انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''اردو رسم الخط میں میری ایک ہزار کتابیں تین سال میں نکلتی

ہیں، بر خلاف اس کے ہندی رسم الخط میں میری تین ہزار کتابیں ایک سال میں نکل جاتی ہیں۔" انہی باتوں کو دیکھ کر وہ کہا کرتے تھے کہ "میں اب ہندی میں لکھا کرونگا۔"

بمبئی میں پریم چند کی زندگی انتہائی سادہ تھی، اتنی سادہ کہ اس سے زیادہ سادگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی ذاتی ضروریات اس درجہ کم تھیں کہ انہیں چھوٹے پیمانہ پر سہاتما کہا جاسکتا ہے۔ وہ ہر شخص سے خواہ وہ بڑا ہو یا چھوٹا، خندہ پیشانی سے ملتے تھے۔ ان کی شرافت نفس کا اس سے بڑھ کر اور کیا ثبوت ہوگا کہ انہوں نے اپنی زبان قلم سے کبھی کسی کا دل نہیں دکھایا۔ سہربانی اور منکسر المزاجی ان کی فطرت ثانیہ تھی۔ وہ ہندوستان اور غیر ممالک میں بھی عزت و توقیر کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کے باوجود ان میں خود نمائی نام کو نہ تھی۔ مذہبی رواداری اور بے تعصبی کا وہ مجسمہ تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے "زمانہ" میں ہندو مسلم اتحاد پر ایک معرکہ الآرا مضمون لکھا تھا جس کی تعریف ملک کے گوشہ گوشہ سے ہوئی تھی۔ تعریف کرنے والوں میں حضرت اکبر الہ آبادی بھی تھے۔ الغرض ان میں وہ تمام صفات پائی جاتی تھیں جو انسان کو حقیقی معنوں میں قابل احترام بناتی ہیں۔

ان کا انتقال ۱۸ اکتوبر ۱۹۳۹ کو ہوا اور سارے ہندوستان میں اس ادیب شہیر کا ماتم کیا گیا۔ اردو ادب پر جو نقش وہ چھوڑ گئے ہیں، وہ اسٹ ہے۔ جرمن شاعر گوئٹے نے نپولین کی وفات پر کہا تھا: (What a man!) وہ بھی کیا آدمی تھا! پریم چند کے بارے میں بعینہ یہی الفاظ کہے جاسکتے ہیں۔

***

سیماب اکبرآبادی

سیماب تقسیم ھند کے فوراً بعد ھی کراچی آ گئے تھے اور آتے ھی انہوں نے اپنی ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ ان کی اکیلی ذات ایک ادارہ کی حیثیت رکھتی تھی ۔ آگرہ میں انہوں نے اردو کی خدمت کے لئے ''قصرالادب'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا تھا اور یہ حقیقت ھے کہ اس کے ذریعہ انہوں نے برسوں اردو ادب کی ٹھوس خدمات انجام دیں۔ ان کے پاکستان آجانے سے ھم سب خوش تھے کہ پورے کا پورا ادارہ یہاں آگیا ھے ، لیکن قدرت خداوندی کو یہی منظور تھا کہ اھل پاکستان صرف تھوڑی سی مدت کے لئے ان کی ادبی کاوشوں سے مستفید ھوں اس لئے کہ وہ بہت جلد ھم سے جدا ھوگئے۔

علامہ کو اپنے وطن اکبرآباد سے والہانہ محبت تھی۔ تاج محل پر انہوں نے جتنی نظمیں لکھی ھیں وہ سب ثبوت ھیں اس بات کا کہ وہ اپنے وطن کے کس قدر شیدائی تھے ۔ ان کی تاج والی نظمیں شاھکار کی حیثیت رکھتی ھیں۔

وہ بہت پر گو تھے ، اتنے پر گو کہ مشکل سے یقین آئیگا۔ نہ صرف یہ کہ وہ ایک ایک غزل میں دو دو سو ڈھائی سو شعر کہہ لیتے تھے ، بلکہ شاعری کی کوئی صنف ایسی نہ تھی جس میں ان کی تخلیقات موجود نہ ھوں ۔ ان کی شاعری کا ایک امتیازی پہلو یہ ھے کہ انہوں نے زمانۂ حال کے بعض ایسے مضامین کو بھی باندھ دیا ھے جن کی طرف کسی دوسرے شاعر کی نظر نہیں پہنچی۔ آج کو اگر ان کا سارا کلام ضائع ھوجائے اور آیندہ کسی زمانہ میں مل جائے تو تلاش کرنے والے کو ان کا صحیح صحیح زمانہ متعین کرنے میں کسی دشواری کا سامنا کرنا

نہیں پڑیگا۔ ان کی شاعری کا دوسرا امتیازی پہلو یہ ہے کہ انہوں نے اس میں سیاسیات کو بھی پوری طرح دخیل کرلیا تھا۔ چنانچہ غزلوں تک میں وہ دور رس سیاسی مضامین بے تکلفی سے باندھ جاتے تھے۔ ان کا ایک مشہور شعر جو اسی قبیل کا ہے، یہ ہے:—

بربادی چمن میں ہے شاید کسی کا ہاتھ
شاخوں پہ انگلیوں کے نشاں دیکھتاہوں میں

اس لافانی شعر کو بار بار پڑھئیے اور اس کی وسعت مضمون کی داد دیجئیے۔ یہ اکیلا شعر کتنے ہی واقعات پر حاوی ہے یا ہوسکتا ہے۔

موجودہ دور میں جتنے شاگرد سیماب کو نصیب ہوئے ہیں اتنے شاید کسی اور استاد کو میسر نہ آئے ہونگے۔ ان کی تعداد تین ہزار کے لگ بھگ ہے اور وہ سب اپنے آپ کو سیمابی کہتے ہیں۔

اساتذہ میں سیماب بہت عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس کا ایک واضح ثبوت یہ ہے کہ جب مولانا حسرت موہانی حج سے واپسی پر کراچی ٹھہرے تو وہ خاص طور پر سیماب سے ملنے کے لئے تشریف لیگئے۔ اگرچہ ان دونوں میں باتیں نہ ہوسکیں لیکن حسرت کا تھوڑی دیر تک ان کے پاس بیٹھنا ہی ظاہر کرتا ہے کہ ان کی نظر میں سیماب کا کیا مقام تھا۔ پاکستان میں اپنے دوران قیام میں ساغر بھی ان کی خدمت میں بار بار حاضر ہوئے۔ سیماب اور ساغر میں تو خیر استادی شاگردی کا رشتہ ہے۔

سیماب سے میرے تعلقات بہت قدیمی تھے۔ میرا معمول تھا کہ جب کبھی زمانۂ تعطیلات میں آگرہ جاتا تو ان کی خدمت میں ضرور حاضری دیتا، ادھر ادھر کی باتیں کرتا اور ان کے کلام سے مستفید ہوتا۔ جس گرم جوشی، خلوص اور محبت سے وہ مجھ سے پیش آتے اسے میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ میری پہلی

بیوی آگرہ کی رہنے والی تھیں اور اس لئے میں ہر سال چند دن کے لئے ضرور آگرہ جایا کرتا تھا۔

علامہ کی متعدد تصانیف ہیں۔ نظموں اور غزلوں کے مجموعوں کے علاوہ انہوں نے مثنوی مولانا روم کے تمام دفتروں کو آردو نظم میں منتقل کر دیا تھا۔ قرآن مجید کا منظوم ترجمہ (وحی منظوم) بھی وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں۔ یہ بجائے خود اردو کی بہت بڑی خدمت ہے۔ یہ دونوں عظیم الشان کام انہوں نے تن تنہا انجام دئے ہیں۔ "وحی منظوم" کا ایک پارہ منظر عام پر آ بھی چکا ہے۔

سیماب متوسط درجہ سے تعلق رکھتے تھے اور چونکہ وہ غربا کی حالت سے اچھی طرح باخبر تھے اس لئے ان کی شاعری میں غربا سے سچی ہمدردی اور محبت کے جذبات کی ترجمانی کافی حد تک ملتی ہے جو پڑھنے والے کے دل کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ ایک اعتبار سے وہ غریبوں کے شاعر تھے۔

بمبئی میں "بزم خیال" کی زیر سرپرستی جو دو تین آل انڈیا مشاعرے ہوئے ان سب میں انہیں آگرہ سے بمبئی تشریف لانے کی زحمت دی گئی تھی۔ ایک دفعہ روشناس ہو جانے کے بعد بمبئی والے انہیں بلانے پر ہمیشہ اصرار کرتے تھے۔ ان کے شاگرد رشید ساغر نظامی بھی جنہیں ان دنوں سیماب "پیغمبر سخن" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے، بمبئی کے ہر بڑے مشاعرہ میں بلائے جاتے تھے۔ اس سلسلہ میں مجھے "بزم خیال" کی طرف سے سیماب کی مہمانداری کرنے کی سعادت بھی کئی مرتبہ نصیب ہوچکی ہے۔

جی چاہتا تھا کہ ان کے کلام کا کچھ انتخاب بھی پیش کروں، لیکن میری کتاب کے محدود صفحات طویل اقتباسات کے متحمل نہ ہوسکینگے اور اس لئے صرف چند اشعار پر اکتفا کی جاتی ہے:-

محبت میں اک ایسا وقت بھی آتا ہے انساں پر
ستاروں کی چمک سے چوٹ لگتی ہے رگ جاں پر

مری تباہی کے ذکر سے وہ اثر بہت آج لے رہے ہیں
نہ جانے کیاحال ہوجو کہدوں کہ ہے یہ سب کام آپ ہی کا

کہانی مری روداد جہاں معلوم ہوتی ہے
جو سنتا ہے اسی کی داستاں معلوم ہوتی ہے

جلال مشرب منصور اے معاذاللہ
کسی نے پھر نہ کہا آج تک خدا ہوں میں

حوادث سے کیوں تو نے دامن کشی کی
حوادث سے ہے پرورش زندگی کی
سہمات ہستی میں جیت ہے اسی کی
جو دم توڑ دے اور ہمت نہ ہارے

سیماب چار ساڑھے چار مہینے بیمار رہے۔ ان پر فالج کا زبردست حملہ ہوا تھا اور اس حملہ میں خاص طور پر ان کی زبان متاثر ہوئی تھی مگر بیماری کی ساری مدت میں ان کا دماغی توازن حیرت انگیز طریقہ پر درست رہا۔ وہ دیر تک اپنے احباب سے لڑکھڑا لڑکھڑا کر گفتگو کرتے تھے اور اگرچہ الفاظ ان کا ساتھ نہ دیتے تھے، تاہم ان کی یہ کوشش ضرور قابل داد تھی۔ مرنے سے چند دن پیشتر انہوں نے ایک غزل میں اصلاح بھی دی تھی۔ یہ اصلاح ان کی آخری تھی۔

سیماب کی قابلیت اور شہرت کا اگر کوئی اور شاعر کسی دوسرے ملک میں بیمار پڑتا تو نامی گرامی ڈاکٹر اس کی مفت

خدمت کو اپنے لئے طرہ افتخار سمجھتے ۔ مگر ھمارے اونچے ڈاکٹروں میں ابھی تک یہ جذبہ نہیں ابھرا ۔ یہی وجہ ھے کہ جب کبھی کسی نامچین ڈاکٹر کو طلب کیا گیا تو اس نے ھمیشہ اپنی پیشہ ورانہ حیثیت ھی کو مد نظر رکھا ۔ مگر اس طویل علالت میں ڈاکٹر یاور عباس لکھنوی اور حکیم حافظ محمد سعید دھلوی نے جس محبت ، خلوص اور شفقت سے ان کا بغیر فیس لئے مسلسل اور مفت علاج کیا وہ اپنی جگہ پر قابل صد تشکر ھے ۔

علامہ کی اس طویل بیماری کے صبر آزما ایام میں ان کے صاحبزادوں نے جس انہماک سے ان کی خدمت کی اس کا مشاھدہ میں نے بارھا اپنی آنکھوں سے کیا ۔ خدا سے دعا ھے کہ وہ ھر باپ کو ایسی ھی خدمت گزار اولاد دے !

سیماب کا انتقال ۳۱ جنوری ۱۹۵۱ کو ان کے مکان واقع آفندی روڈ ، کراچی ، میں ھوا ۔ دیکھنے والے کہتے ھیں کہ انتقال کے وقت ان کی حالت پر سکون تھی ۔

***

لالہ دیا نرائن نگم

۱۹۱۴ میں "ہمدرد" سے علیحدگی کے بعد میں کچھ عرصہ تک بیکار رہا۔ جولائی ۱۹۱۵ میں مجھے اپنے دوست ڈاکٹر محمد حفیظ سید کے ذریعہ تھیوسوفیکل ھائی اسکول (کانپور) میں مدرسی کی جگہ مل گئی۔ وھاں جن اصحاب سے ملاقات ہوئی ان میں دیا نرائن نگم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ملاقات سے چند سال پہلے سے میں نے ان کے رسالہ "زمانہ" میں مضامین لکھنے شروع کردئے تھے اور اس لئے ہم ایک دوسرے کے لئے اجنبی نہ تھے۔ فروری ۱۹۱۸ میں میں کانپور چھوڑ کر بمبئی چلا گیا۔ مگر ان سے گاہ گاہ خط و کتابت رہتی تھی۔ حقیقت یہ ھے کہ میں نے "زمانہ" میں جتنے مضامین لکھے اتنے کسی اور رسالہ کے لئے نہیں لکھے۔ نہ صرف یہ بلکہ میری کتاب "تذکرۂ مولوی ذکاءاللہ دھلوی" کتابی صورت میں اشاعت پذیر ہونے سے قبل ان کے رسالہ میں بالاقساط شائع ہوئی تھی۔

انہی کے یہاں منشی پریم چند اور گنیش شنکر ودیارتھی سے ملاقات ہوئی۔ نگم صاحب کی عادت تھی کہ جب کبھی کوئی بڑا ادیب یا قومی کارکن ان کے یہاں آتا تو وہ مجھے ضرور بلوا لیتے۔ اکثر ہندو اکابر سے انہی کے یہاں نیاز حاصل ہوا۔ ان کی یہ مخصوص ادا مجھے بہت پسند تھی۔

نگم صاحب محسنین اردو میں شمار کئے جانے کے قابل ہیں اس لئے کہ انہوں نے اپنی زندگی کے کم و بیش ۵۰ سال اردو کی آبیاری کرنے میں گزارے - ان کی وفات کے بعد امید تھی کہ ان کے صاحبزادے اپنے باپ کے ترکہ کو سنبھال لینگے اور ان کی طرح اردو کی خدمت میں لگے رہینگے۔ مگر معلوم ایسا

ہوتا ہے کہ ان پر ہندی رسم الخط غالب آگیا اور انہوں نے اردو کا سارا کاروبار ہمیشہ کے لئے بند کردیا۔ بہرحال نگم صاحب اپنے رسالہ کے ذریعہ اردو علم ادب کی جو وقیع خدمات انجام دے چکے ہیں وہ ہند و پاک کی تاریخ صحافت میں سنہری حروف سے لکھی جائینگی۔

وفات سے چند سال پیشتر وہ آنکھیں بنوانے کے لئے بمبئی آئے۔ انہوں نے اپنی آمد کی اطلاع مجھے پہلے سے کردی تھی۔ چنانچہ میں ان سے ملنے کے لئے ہسپتال وقتاً فوقتاً جاتا رہتا تھا۔ آنکھیں بنجانے کے بعد وہ بمبئی کے مضافات میں اپنے ایک عزیز کے یہاں قیام۔پذیر ہوگئے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ مجھے وہیں بلوایا اور کئی گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ جب رخصت ہونے لگا تو فرمایا:۔ ”اب پوری طرح طبیعت سیر ہو گئی ہے۔ مدت سے باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا۔“

دیا نرائن بہت روشن خیال بزرگ تھے۔ وہ شکر گذاری کے جذبہ کے ساتھ تسلیم کرتے تھے کہ مذہب اسلام نے ہندوستان کی زندگی، تہذیب، ثقافت اور رسم و رواج پر نہایت گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ ایک دن انہوں نے کہا کہ ”آریا سماجی بت پرستی (مورتی پوجا) کے خلاف جو عملی جہاد کر رہے ہیں اسے بھی اسلام کی برکات میں شمار کرنا چاہئے۔“ اثنائے گفتگو میں انہوں نے فرمایا:۔ ”میں نے دنیا کے مختلف مذاہب کا مطالعہ کیا ہے۔ لیکن اسلام نے خدا تعالیٰ کی وحدانیت کا جو تصور دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، وہ کسی دوسرے مذہب سے بن نہیں آیا۔“ ایک دن میں نے پوچھا کہ ”اگر اسلام ہندوستان میں نہ آتا تو اس ملک کی کیا حالت ہوتی؟“ انہوں نے نہایت کشادہ دلی سے اسلام کے احسانات گنوائے اور کہا کہ ”اگرچہ وہ حملہ آور کی حیثیت سے آیا تھا مگر اس نے ہندوستان کو اپنا وطن بنالیا تاکہ اس ملک کے باشندوں کی خدمت کرے۔“

وہ اسلام کے نظریہ تعدد ازدواج کے خلاف تھے۔ لیکن میں نے کافی بحث و مباحثہ کے بعد ان کے نظریات وسیع حد تک تبدیلی پیدا کردی۔ ایک دفعہ بحث کے دوران میں میں نے جرمن مفکر میکس نارڈو (Max Nordau) کی رائے کو دھرایا جس نے اپنی کتاب ''کنونشنل لائز آف اورسوی لائیزیشن'' میں لکھا ھے کہ ''مرد فطرتاً کثیرالازدواج واقع ہوا ھے۔ یورپ کے ایک لاکھ مردوں سے مرتے وقت قسم دے کر پوچھو کہ کیا زندگی بھر تمہارا تعلق صرف ایک عورت سے رہا ھے تو ۹۹۹۹۹ نفی میں جواب دینگے؟'' ایسی حالت میں اسلام کی تعلیم عین فطرت کے منشا کے مطابق ھے اس لئے کہ وہ ایسی یک زوجگی کا خاتمہ کردینا چاہتا ھے جس کے ساتھ ساتھ اور ناجائز تعلقات بھی ہوں۔'' انہوں نے مجھ سے پوری طرح اتفاق فرمایا۔

ایک دن سوامی دیانند سرسوتی کی کتاب ''ستیارتھ پرکاش'' پر گفتگو ہوئی۔ انہوں نے فرمایا کہ ''عیسائیت اور اسلام کے بارے میں اس کے آخر میں جو دو باب ہیں وہ الحاقی ہیں اس لئے کہ اصل کتاب سے ان کا کوئی تعلق نہیں ھے اور دوسرے یہ کہ خود سوامی جی کی زندگی میں جو ایڈیشن شائع ہوا تھا اس میں بھی یہ باب موجود نہیں تھے۔'' مسئلہ نیوگ سے انہیں انتہائی بیزاری تھی، مگر وہ آریوں کی دوسری اصلاحی سرگرمیوں کے بیحد مداح تھے۔

لالہ صاحب بیحد ملنسار، شایستہ اور با اخلاق بزرگ تھے۔ ان کے اکثر دوست مسلمان تھے اور یہی ثبوت ھے اس امر کا کہ ان میں غیر معمولی روا داری تھی۔ ان کے رسالہ میں لکھنے والے بھی زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔

***

مسز سروجنی نائیڈو

آخرکار وہ شیریں آواز ۲ مارچ ۱۹۴۹ کو ہمیشہ کے
لئے خاموش ہوگئی جسے سننے کے لئے نوجوان اور
بوڑھے یکساں طور پر بیتاب رہا کرتے تھے ۔ اب
بلبل ہند کی ترنم ریزیاں سننے میں نہ آئینگی ۔ ان کی
زندگی کا مقصد پورا ہوگیا ۔

مسز نائیڈو سے میری پہلی ملاقات ۱۹۱۷ میں ہوئی تھی
جب کہ میں کانپور میں مسز بیسنٹ کے قائم کردہ تھیوسوفیکل ھائی
اسکول میں مدرس تھا ۔ وہ کسی جلسہ کی صدارت کے سلسلہ میں
کانپور تشریف لائی تھیں ۔ ہمارے اسکول میں بھی انہوں نے طلبا
کے سامنے تقریر کی تھی ، تقریر کیا تھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ
وہ نثر میں شاعری کر رہی ہیں ۔ انہی دنوں ہمارے ہیڈ ماسٹر
این ۔ جی ۔ پرانجپے نے انہیں رات کے کھانے پر مدعو کیا ۔
خوش قسمتی یا حسن اتفاق سے میری نشست ان کے برابر رکھی
گئی اور ہم بہت دیر تک مشترکہ دوستوں کے بارے میں گفتگو
کرتے رہے جن میں مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، سی ۔ ایف
اینڈریوز اور آصف علی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ یہی
مختصر سی ملاقات بعد کو صمیمانہ تعلقات کی بنیاد بنی ۔ اس واقعہ
کے کوئی ڈیڑھ سال بعد جب میں کانپور کی ملازمت سے سبکدوش
ہوکر بمبئی پہنچا اور تاج محل ہوٹل میں مسز موصوفہ کی خدمت
میں حاضری دی تو میری حیرت کی کوئی حد نہ رہی جب
انہوں نے دیکھتے ہی میرا نام لے کر مجھے پکارا ۔ فی الحقیقت
ان کا حافظہ حیرت انگیز طور پر قوی تھا ۔

۱۹۳۴ میں میں نے استاذی اینڈریوز کی کتاب ''آئیڈیاز آف

مہاتما گاندھی ’’ کو ’’ خیالات مہاتما گاندھی ‘‘ کے نام سے اردو کا جامہ پہنایا اور اردو ترجمہ کو عقیدت اور خلوص کے جذبات کے ساتھ بلبل ہند کے اسم گرامی سے نسبت دی ۔ وہ مجھ پر بیحد کرم فرماتی تھیں اور مجھے اپنا بیٹا کہتی تھیں ۔ اس لئے قدرتاً ان کی اچانک اور بے وقت وفات سے جو صدمہ مجھے پہنچا ہے اسے الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے ۔

ایک زمانہ میں مسز نائیڈو نے بمبئی کو اپنا گھر سا بنا رکھا تھا ۔ وہ تاج محل ہوٹل کے کمرہ نمبر ۳۱۸ میں رہتی تھیں ۔ یہ کمرہ تاریخی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ وہیں تمام سیاسی و علمی امور زیر بحث رہا کرتے تھے ، اور نت نئے پروگرام تیار ہوتے تھے ۔ ان کے یہاں ہر وقت لیڈروں کا ٹھٹھ لگا رہتا تھا ۔ ملکی اور غیر ملکی اکابر اور فضلا کے جو اجتماع میں نے ان کے یہاں دیکھے ، بہت کم دیکھنے میں آئینگے ۔ ان کی موجودگی سے تاج محل ہوٹل کی زندگی میں جو گہما گہمی تھی ، ان کے چلے جانے کے بعد سے وہ پھر کبھی نظر نہیں آئی :-

تھی کسی شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں؟

بعد کو وہ بھولا بھائی دیسائی کے دولتکدہ پر یا کبھی کبھار ڈاکٹر خواجہ عبدالحمید آف سپلا کے یہاں ٹھہرا کرتی تھیں ۔ یہ بھولا بھائی وہی ہیں جنہوں نے دھلی کے لال قلعہ میں ’’ ہندوستانی باغیوں ‘‘ (انڈین نیشنل آرمی) کی بہادرانہ مدافعت کی تھی اور اپنی خدا داد قابلیت اور زبردست وکالت سے ان میں سے بہتوں کو بچالیاتھا ۔ ۱۹۴۲ کی تحریک ’’ ہندوستان چھوڑ کر چلے جاؤ ‘‘ کے دوران میں مسز نائیڈو انہی کے مکان سے گرفتار ہوئی تھیں ۔ میرے دوست پولیس انسپکٹر نولکر کہتے تھے کہ ’’میں جب رات کے آخری حصہ میں انہیں گرفتار کرنے کے لئے پہنچا تو دیکھا کہ وہ جاگ رہی ہیں ۔ انہوں

نے مسکراتے ہوئے میرا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ میں نے اسی گرفتاری کی توقع میں اپنا سارا سامان باندھ رکھا ہے۔ میں اب آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔''

وہ ۱۹۱۹ میں پہلی مرتبہ کانگریس میں شامل ہوئیں اور اپنی زندگی کے آخری لمحے تک مہاتما گاندھی کی وفادار پیرو رہیں۔ گاندھی جی کی رہنمائی میں حصول آزادی کے سلسلہ میں جتنی تحریکیں شروع ہوئیں وہ ان سب میں پیش پیش تھیں۔ ۱۹۱۹ میں وہ بمبئی کے بازاروں میں ضبط شدہ لٹریچر فروخت کرکے راؤلیٹ ایکٹ کے خلاف اظہار ناراضگی کرتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ ۱۹۳۰ میں ستیا گرہیوں کی جماعت کے ساتھ انہوں نے دھراسنا کے نمک کے گوداموں پر ''حملہ'' کیا اور اپنے پیشوا کے حکم کی مطابقت میں نمک کے قانون کو توڑا۔ عدم تعاون کی تحریک میں بھی انہوں نے معمولی سپاہی کی طرح حصہ لیا اور قید و بند کے حکم کی صعوبتوں کو برداشت کیا۔ وہ زندگی کو ایک نغمۂ مسلسل سمجھتی تھیں اور اسی لئے کبھی ہراساں نہیں ہوئیں۔

مسز نائیڈو ایک معزز ہندو گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ وہ ہر اعتبار سے ہندو تھیں لیکن ان کے دل میں دنیا کے سب مذاہب کے لئے گنجایش تھی۔ کسی مذہب کی طرف سے تعصب یا نفرت کا جذبہ ان کی سرشت میں نام کو نہ تھا۔ باعتبار خیالات وہ اسلام کے قریب تھیں۔ وہ اخوت، مساوات اور جمہوریت کے اسلامی تخیل کی دل سے قدردان تھیں۔ ان میں روا داری کا جذبہ بھی بدرجۂ اتم تھا۔ اس کی ایک معمولی سی مثال یہ ہے کہ انہوں نے اپنے ایک بھائی سے جنہوں نے عیسائی مذہب اختیار کرلیا تھا، بدستور بہناپا قائم رکھا حالانکہ تبدیلی مذہب کے بعد ہوتا یہی ہے کہ گھروالوں اور دوسرے رشتہ داروں سے ناتہ تک ٹوٹ جاتا ہے۔ اسی قبیل کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ میں

ایک مرتبہ چھٹیوں میں دھلی گیا ہوا تھا ۔ رمضان کا مہینہ تھا ۔ سہ پہر کو پھرتے پھراتے میں ان کے یہاں جانکلا ۔ مجھے دیکھتے ھی فرمایا :۔ ''خوب آئے۔ چلو میرے ساتھ ایک ٹی پارٹی میں۔'' میں نے پہلے تو میلے کپڑوں کا عذر کیا اور پھر کہا کہ میں روزے سے ہوں مگر انہوں نے کہا :۔ ''کوئی ھرج نہیں۔ چلے چلو۔'' چنانچہ ھم ٹی پارٹی میں پہنچے ۔ وھاں کوئی ڈیڑھ سو مہمان تھے اور مسز نائیڈو مہمان خصوصی کی حیثیت رکھتی تھیں۔ روزہ کھلنے میں ابھی کوئی پندرہ منٹ کی دیر تھی ۔ جاتے ھی انہوں نے کہا :۔ ''میرے ھمراہ بمبئی کے ایک مسلمان دوست آئے ھیں جو روزے سے ھیں ۔ اس لئے میں چاھتی ھوں کہ آپ سب تھوڑی دیر انتظار کرلیں تاکہ روزہ کھلنے کا وقت ھوجائے ۔'' چنانچہ ٹی پارٹی مغرب کے بعد شروع ھوئی ۔ تھوڑی دیر کے لئے میں حاضرین کی توجہات کا مرکز بن گیا تھا اور میری حالت یہ تھی کہ میں گردن جھکائے بیٹھا تھا ۔ دوسروں کے جذبات کا یہ احترام مسز نائیڈو کی ایسی خصوصیت تھی جس میں وہ منفرد تھیں۔

محض بارہ برس کی عمر میں مدراس سے میٹرک کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ''کنگز کالج'' لندن میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بھیجدی گئیں جہاں وہ تین سال تک مقیم رھیں ۔ وھاں کی تہذیب اور خیالات نے ان کے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا ۔لیکن وہ آخر وقت تک مشرق کی نسوانی خصوصیات کی حامل رھیں۔

انہوں نے ۱۱ برس کی عمر سے شاعری شروع کردی تھی ۔ انگلستان کے زمانۂ قیام میں مقابلتاً نو عمری ھی میں انہوں نے مشہور انگریزی شعرا کا مطالعہ شروع کردیا تھا جن میں شیلے، براؤننگ ، کیٹس اور ایلفرڈ ٹینی سن خصوصیت سے قابل ذکر ھیں ۔ ان کی ابتدائی نظمیں قریب قریب انھی موضوعات پر ھیں جن پر عام طور پر انگریزی شعرا خامہ فرسائی کرتے رھتے ھیں ۔ ایڈمنڈ

گوس نے ان کے غیر معمولی ذوق شاعری کو دیکھ کر انہیں ترغیب دی کہ وہ ہندوستانی عنوانات کو اپنائیں اور انگریزی شعرا کی اندھی نقالی چھوڑ دیں ۔ اگر ایڈمنڈ گوس نوعمر شاعرہ کو صحیح ڈگر پر نہ ڈال دیتے تو وہ محض شیلے وغیرہ کی مقلد بن کر رہ جاتیں۔ ان کی نظموں نے انگریزی ادب کو بھی بہت مالا مال کردیا ہے ۔

اسلامی موضوعات پر بھی ان کی کچھ نظمیں ہیں جو نہایت موثر اور حسین انداز میں لکھی گئی ہیں۔ ایک نظم میں انہوں نے اسمائے الٰہی کو نہایت خوبصورتی سے باندھا ہے۔ یہ نظم ''لائٹ آف ایشیا'' کی طرح غایت درجہ روح پرور ہے ۔ بعد کو سیاسی مصروفیات نے انہیں عالم خیال میں آڑنے کے بہت کم مواقع بہم پہنچائے لیکن اس کے باوجود وہ شاعری کے لئے وقت نکال لیتی تھیں۔ وہ اپنے پیچھے غیر مطبوعہ نظموں کا اچھا خاصا ذخیرہ چھوڑ گئی ہیں جو ان کی صاحبزادی مس پدماجا نائیڈو (گورنر بنگال) کے پاس محفوظ ہے۔

مسز نائیڈو حافظ ، اقبال ، عمر خیام اور دوسرے شعرا کی بیحد مداح تھیں ۔ انہوں نے بعض اردو شعرا کے کلام کا بھی مطالعہ کیا تھا ۔ انہیں ان سب شعرا کے اشعار یاد تھے جنہیں وہ اپنے مخصوص انداز میں پڑھ کر حاضرین میں خاص ولولہ پیدا کر دیا کرتی تھیں۔ ۱۹۱٦ میں انہوں نے آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ لکھنؤ میں سوراج والے ریزو لیوشن کی تائید کی تھی ۔ اس جلسہ میں راقم الحروف بھی موجود تھا ۔ انہوں نے پہلے تو اس ریزولیوشن پر مسلمانوں کو مبارکباد دی اور اور پھر فرمایا :— ''یاد رکھئے کہ یہ مردانہ ریزو لیوشن ہے ۔ اگر آپ مرد ہیں تو اسے منظور کیجئے ۔ لیکن منظور کرنے سے پہلے اس کی ذمہ داریوں کو اچھی طرح سے سمجھ لیجئے ۔'' اس کے بعد حافظ کا یہ شعر پڑھا جو اپنی موزونیت کے اعتبار سے

قابل داد ہے :-

درره منزل لیلیٰ که خطرهاست بسے
شرط اول قدم آنست که مجنوں باشی

ان کی تقریر اور فارسی شعر نے حاضرین میں غیر معمولی جوش پیدا کردیا تھا اور جلسه کی کارروائی بار بار کے چیئرز کی وجه سے بہت دیر تک رکی رهی۔ صوبه کے لفٹنٹ گورنر سر جیمز میسٹن بھی ڈائس پر براج رہے تھے اور وہ یہ دیکھکر دل ھی دل میں کڑھ رہے ھونگے که مسز موصوفه کی وجه سے هندو مسلمان کیوں ایک دوسرے کے اس قدر قریب آرہے ھیں۔

اقبال سے ان کے بہت گہرے روابط تھے ۔ ان کی وفات سے کچھ عرصه قبل وہ ان کی مزاج پرسی کے لئے بھی لاهور تشریف لے گئی تھیں۔ ۹ جنوری ۱۹۳۸ کو بمبئی کے ایک جلسهٔ عام میں جو سر کاؤس جی جہانگیر هال میں اقبال ڈے کے سلسله میں منعقد ھوا تھا ، انہوں نے میری درخواست پر اقبال پر ایک تقریر بھی کی تھی جس میں انہوں نے فرمایا تھا :— ''یه کہنا بالکل غلط ھے که اقبال حکومت پرست ھے۔ جو شخص خدا کو چیلنج دے سکتا ھو وہ کبھی حکومت پرست نہیں ھوسکتا۔'' اقبال خود بھی کبھی کبھی اپنا کلام انہیں بھیجتے رهتے تھے۔ راقم الحروف بھی کبھی کبھار اقبال کا تازہ کلام انہیں سناتا رهتا تھا جس سے وہ بہت محظوظ ھوتی تھیں۔

اردو زبان سے انہیں عشق تھا۔ تاج محل ھوٹل میں آن کےدم سے متعدد مشاعرے منعقد ھوئے۔ اپریل ۱۹۳۴ میں ''بزم خیال'' کی سرپرستی میں پہلا آل انڈیا مشاعرہ ٹاؤن هال میں منعقد کیا گیا تھا جس میں نوح ناروی ، سیماب اکبرآبادی ، احسن مارهروی ، بسمل اله آبادی ، ساغر نظامی ، حکیم ناطق وغیرہ نے حصه لیا تھا۔ چونکه میں ''بزم'' کا صدر تھا اس لئے مسز نائیڈو بھی میری درخواست پر شریک مشاعرہ ھوئیں۔ ایک مرتبه تاج محل

میں انہی کے کمرے میں مشاعرہ ہوا جس میں شعرا کے علاوہ راجہ پرتاب گیر جی ، نواب نذیر یار جنگ بہادر ، عبدالرزاق (قونصل افغانستان) وغیرہ بھی شریک ہوئے تھے ۔

مسز نائیڈو ایک اعتبار سے تمام دنیا کی شہری تھیں ۔ انہوں نے دنیا کے بہت بڑے حصہ کی سیاحت کی تھی اور ہر جگہ ہندوستانی باشندوں کے حقوق کی حمایت کی تھی ۔ جب انہیں ایک بھرے جلسہ میں جو کاؤس جی جہانگیر ہال میں منعقد ہوا تھا ، غیر سرکاری سفیر بنا کر امریکہ بھیجا گیا تو اس وقت راقم الحروف بھی وہیں موجود تھا ۔ اس تاریخی موقع پر مسز اینی بیسنٹ نے صدارت کی تھی ۔ انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا :— ”میں نہیں جانتی کہ اس موقع پر اپنی تقریر کی ابتدا کیونکر کروں ، لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتی کہ مجھے ہندوستان کے اس سفیر کو جس پر سارے ملک کو فخر ہے ، الوداع کہتے ہوئے دلی مسرت ہوتی ہے ۔ “ امریکہ کے زمانۂ قیام میں ٹرکی کی مشہور مجاھد خاتون خالدہ ادیب خانم نے خاص طور پر مسز موصوفہ سے درخواست کی تھی کہ وہ وطن پہنچنے پر ہندو مسلم مناقشات کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کردیں ۔ اس سفر سے واپسی پر میں نے ان کے اعزاز میں ایک عصرانہ دیا جس میں کوئی ۸۰ اصحاب موجود تھے ۔ خواتین میں اکیلی وہی تھیں ۔ انہوں نے اپنے ھاتھ سے سب کے لئے یہ کہکر چائے بنائی کہ ”بہ حیثیت خاتون کے یہ میرا خصوصی حق ھے اور میں اس سے کسی نوع دست بردار نہیں ہوسکتی ۔“

جیسا کہ کہا جاچکا ھے ایک زمانہ میں مسز نائیڈو بمبئی ھی میں رہا کرتی تھیں ۔ اس کے بعد وہ وقتاً فوقتاً بمبئی آتی رہتی تھیں ۔ انہوں نے میرے ذمہ یہ خدمت سپرد کر رکھی تھی کہ دوران سفر کے لئے ان کے کھانے کا اہتمام کردیا کروں ۔ جب کبھی میں بمبئی میں نہ ہوتا صرف اس وقت میں اس خدمت سے محروم رہتا ۔ میری موجودگی میں وہ کسی اور شخص کی آفر قبول

نہیں کرتی تھیں ۔ میں اپنے تئیں خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ انہوں نے اس خدمت کے لئے مجھے منتخب فرمایا :—

منت منہ کہ خدمت سلطان ھمی کنم
منت شمار ازو کہ بہ خدمت گزاشتت

مسلم لیگ اور کانگریس میں شامل ہونے سے پہلے مسز نائیڈو زیادہ تر سوشل کاموں میں حصہ لیا کرتی تھیں۔ ۱۹۰۹ میں اس وقت کی انگریزی حکومت نے ان کی خدمات کے اعتراف میں انہیں قیصر ہند (درجۂ اول) کا طلائی تمغہ عطا کیا ۔ بمبئی کے ایک مشہور گجراتی اخبار ''سانج ورتمان'' نے اس اعزاز پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ ''طلائی تمغہ کی اس پیش کش سے مسز نائیڈو کی کوئی عزت افزائی نہیں ہوئی بلکہ خود تمغہ کو چار چاند لگ گئے ہیں۔'' مگر مارشل لا کے مظالم سے متاثر ہو کر مسز نائیڈو نے یہ تمغہ ذیل کے خط کے ساتھ حکومت ہند کو واپس کردیا تھا :—

''جو کمینے مظالم میرے ملک پر اور ملک والوں پر کئے گئے ہیں ان پر اپنے دلی رنج و افسوس کے اظہار کے طور پر میں اس تمغہ کو واپس کرنے پر مجبور ہوں ۔ جو ذلتیں ایک کمزور و بیکس قوم پر حال میں روا رکھی گئی ہیں وہ دروغ بیانی کے دوہرے جرم کے ارتکاب کی شکل میں اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہیں اس لئے کہ ایک طرف ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہے اور دوسری طرف پنجاب کے باشندوں کا خون بہایا گیا ہے۔ . . . . میں ایک ایسی حکومت کے افعال اور پالیسیوں کو برداشت کرنا ناجائز سمجھتی ہوں جس نے برطانوی انصاف اور آزادی کی اعلیٰ روایات کی بے حرمتی کی ہے ۔''

مسز نائیڈو ہندو مسلم اتحاد کا پیکر تھیں ۔ وہ کہا کرتی

تھیں کہ ’’جس طرح رات کے بعد دن نکلتا ھے اسی طرح موجودہ جھگڑوں کے بعد صلح کے سورج کا جلوہ گر ھونا یقینی ھے۔‘‘ ۱۹۴۷ کے ھنگامہ خیز ایام میں جب کہ اچھے اچھوں کے دماغی توازن بگڑ گئے تھے ، وہ بدستور سابق پر امید رھیں۔ اسی زمانہ میں انھوں نے اغوا شدہ عورتوں کی بحالی کے لئے ھندوستان اور پاکستان کے لیڈروں کے ساتھ ملکر اپیل شائع کی ۔ وہ اغوا کی وارداتوں کو انسانیت کے چہرے پر بدنما داغ قرار دیتی تھیں۔

وہ اسلامی تعلیمات کی دل سے قدردان تھیں۔ اسلام کے متعلق ان کا خیال تھا کہ :-

’’یہ پہلا مذھب ھے جس نے جمہوریت کی تعلیم دی اور اسے عملی جامہ پہنایا اس لئے کہ مساجد میں جہاں میناروں سے اذان دیجاتی ھے ، اسلام کی جمہوریت دن میں پانچ مرتبہ عملی صورت اختیار کرتی ھے جب کہ دھقان اور بادشاہ پہلو بہ پہلو نماز میں کھڑے ھوجاتے ھیں اور اعلان کرتے ھیں کہ خدا ھی کی ذات ارفع و اعلیٰ ھے۔‘‘

جلیان والے باغ کے قتل عام اور اس کے متعلقہ مظالم کی دادرسی کے سلسلہ میں مسز نائیڈو نے بہت کچھ کام کیا تھا ، ھندوستان میں بھی اور انگلستان میں بھی۔ انگلستان میں انھوں نے اس موضوع پر متعدد تقریریں کیں۔ ایک تقریر میں انھوں نے اپنے مخصوص بیباکانہ انداز میں مارشل لا کی بعض بہیمانہ اور ناقابل ذکر حرکات کی سخت سے سخت الفاظ میں مذمت کی۔ اس پر وزیر ھند مسٹر مانٹیگو نے فوراً ایک خط لکھکر پوچھا کہ آپ کا ذریعۂ معلومات کیا ھے ؟ مسز نائیڈو نے جواب میں لکھا کہ یہ ساری باتیں اس ضخیم رپورٹ میں شائع ھوچکی ھیں جسے کانگریس نے جلیان والے باغ کے واقعۂ ھائلہ کی غیر سرکاری تحقیقات کے طور پر شائع کیا ھے۔ اس کے بعد مانٹیگو چپ سادہ گئے۔ وہ برطانوی

حکومت کے طرز عمل سے بہت بددل تھیں۔ ایک خط میں جو انہوں نے گاندھی جی کے نام انگلستان سے بھیجا تھا، وہ لکھتی ہیں:—

"۔۔۔۔ میری صحت خراب ہے، لیکن پنجاب اور خلافت کے مسائل نے میری تمام قوتوں اور جذبات کو اپنی طرف متوجہ کر رکھا ہے۔۔۔۔۔ میں اس وقت تک دم نہ لونگی جب تک کہ میں دنیا کا دل نہ ہلا دونگی اور شہید ہندوستان کی ٹریجڈی پر اس میں جذبۂ ندامت نہ پیدا کر لونگی۔"

جب ۱۹۲۰ میں وفد خلافت انگلستان پہنچا تو حسن اتفاق سے مسز نائیڈو بھی وہیں موجود تھیں۔ انہوں نے متعدد تقریروں میں وفد کے مطالبات کی تائید کی۔ ایک تقریر میں انہوں نے فرمایا:۔ "میں جمہوریت پسند اسلام کا احترام کرتی ہوں۔ میں اس عظیم الشان مذہب کی عزت کرتی ہوں جس نے انسانی ترقی کے لئے متحرک طاقت کا اضافہ کیا ہے۔ میں اس فاتح اعظم مذہب کا ادب کرتی ہوں جس نے یورپ میں اس وقت علم کی روشنی پھیلائی جب کہ وہ قعر جہالت میں ڈوبا ہوا تھا۔۔۔۔۔ اور پھر وہاں سے فتح کے قافلہ کی صورت میں دریائے سندھ کی وادی میں پہنچا اور فتح کرنے کے ارادہ سے آنے کے باوجود وہ میرے ہندوستان کے بچوں کی مدد کرنے اور ان سے محبت کرنے کے لئے ٹھہر گیا۔"

مسز نائیڈو کو بچوں سے جنہیں وہ فرط محبت سے "مستقبل کا شہری" کہا کرتی تھیں، بڑی گہری دلچسپی تھی۔ ان میں رہ کر وہ بچہ بن جاتی تھیں۔ طرح طرح کی نقلیں کرکے انہیں ہنساتی اور ان کی دعوتیں کرتی تھیں۔ یو۔ پی کا گورنر بن جانے کے بعد بھی ان کی زندگی کے بعض بہترین لمحات بچوں کی معیت میں گزرے۔ وہ ان میں رہ کر بہت بشاش نظر آتی تھیں۔ وہ بچوں

کے سامنے اپنے آقا گاندھی جی کی نقلیں کیا کرتی تھیں اور اپنے مخصوص مگر محبت بھرے انداز میں "اس چھوٹے بوڑھے آدمی" کی مختلف شکلیں بنا کر بچوں کو ھنساتی تھیں۔

وہ ھر ملنے والے کے دکھ درد کو نہایت توجہ سے سنا کرتی تھیں۔ لوگ ان سے گھریلو معاملات میں بھی صلاح و مشورہ کے طالب ہوتے تھے۔ حقیقت یہ ھے کہ وہ ھر ایک کی مونس و غمخوار تھیں۔ ان کی غیر معمولی مقبولیت کے جہاں اور بیشمار وجوہ ھیں، ان میں ایک یہ بھی ھے۔

ان کی زندگی بھر پور تھی۔ میں جب کبھی ان کی مصروفیات پر غور کرتا ھوں تو مجھے ایک گونہ تعجب ھوتا ھے کہ وہ کس طرح ان تمام مشاغل سے عہدہ برآ ھوتی تھیں۔ گھریلو زندگی کی ذمہ داریاں سنبھالنا، ملکی لیڈروں سے ملاقاتیں کرنا، غیر ملکی سیاست دانوں سے تبادلۂ خیالات کرنا، پارٹیوں اور مشاعروں وغیرہ میں شرکت کرنا، نظمیں لکھنا، خطوں کا جواب دینا، دوستوں اور عزیزوں کی شادی اور غمی کی تقریبوں میں شامل ھونا، بیواؤں کو امید کا پیغام پہنچانا، مزدوروں کو منظم کرنا، جہازوں اور ریلوں کے ذریعہ لمبے لمبے سفر کرنا، ھریجنوں کو بلند سطح پر لانے کی کوشش کرنا، گری ھوئی بہنوں کے سدھار کا کام کرنا، جنوبی افریقہ اور دوسرے ممالک کے مقیم ھندوستانیوں کے حقوق کے لئے جنگ کرنا، امریکہ اور انگلستان جا کر ان اثرات کو دور کرنا جو مس کیتھرائن میو کی گمراہ کن کتاب "مدر انڈیا" (Mother India) کی وجہ سے پیدا ھو گئے تھے، جلسوں کی صدارت کرنا، کانگریس کا کام کرنا، گاندھی جی کے برت اور ان کی علالت کے ایام میں نرس اور پہرہ دار کے فرائض ادا کرنا، مختلف سرکاری کمیٹیوں اور حکام کے روبرو شہادت دینا — یہ اور اس قسم کے سیکڑوں مشاغل تھے جن میں وہ مصروف رہا کرتی تھیں۔ اس کے باوجود وہ ھر نئی کتاب

کے مطالعہ کے لئے وقت نکال لیتی تھیں اور اپنے آپ کو لٹریچر کے جدید ترین رجحانات سے واقف رکھتی تھیں۔

مسز نائیڈو کی ایک نمایاں خصوصیت یہ تھی کہ وہ اپنے خیالات ایسے دل آویز پیرایہ میں اور ایسے شاعرانہ انداز میں ادا کرتی تھیں کہ اس کی دوسری نظیر ملنی مشکل ہے۔ انہیں انگریزی زبان پر جو غیر معمولی قدرت حاصل تھی وہ اس براعظم کے رہنے والوں میں سے کسی دوسرے شخص کے حصہ میں نہیں آئی۔ وہ نثر میں شاعری کیا کرتی تھیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

(۱)

۱۹۴۵ میں یوم آزادی (۲۶ جنوری) کے موقع پر تقریر کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا :-

"ہم خواہ ٹھوکریں کھائیں، خواہ ہمارے قدم ڈگمگائیں، لیکن اگر ہمارے دلوں میں روشنی جلوہ گر ہے تو ہم مشعل کو تاریکی کے زمین دوز راستوں میں سے افق تک لے جائینگے جہاں صبح ارغوانی اور سنہری رنگوں کے ساتھ طلوع ہورہی ہے۔"

(۲)

گاندھی جی کو ایک انگریز جج نے عدم تعاون کے زمانہ میں ۱۹۲۲ میں چھ سال کی سزائے قید کا حکم سنایا۔ اس موقع پر مسز نائیڈو نے ایک روح پرور پیغام شائع کیا جس کے کچھ ٹکڑے پڑھئے :-

"قانون کی نظر میں مجرم — لیکن جس وقت کمرے کے اندر ایک دبلا پتلا پر سکون اور ناقابل تسخیر ہیکرجو موٹے جھوٹے کپڑے کی لنگوٹی میں ملبوس تھا، داخل ہوا تو اس وقت ساری عدالت خود بخود احتراماً کھڑی ہو گئی۔ ...."

آخر کار اس عجیب و غریب مقدمہ کی سماعت شروع
ہوئی اور جب میں نے وہ غیر فانی الفاظ سنے جو میرے
محبوب آقا کے ہونٹوں سے پیمبرانہ جوش کے ساتھ
نکلے تھے تو میرے خیالات کئی صدی پیچھے لوٹ
گئے جبکہ ایک روحانی اور شریف معلم کو پھانسی
دی گئی تھی اس لئے کہ اس نے بھی جرأت رندانہ سے
کام لے کر اس قسم کی تعلیم لوگوں کو دی تھی۔ ۔ ۔ ۔ ۔
وہ اسے زمین کے انتہائی کونوں میں لیجائیں ، مگر
اس کی منزل مقصود اس کے اپنے لوگوں کے دلوں میں
غیر متغیر ہے جو اس کے وارث بھی ہیں اور اس کے
حسین خوابوں اور کارناموں کے رکھوالے بھی۔"

(۳)

۱۹۳۶ کی دیوالی کے موقع پر انہوں نے ملک کے نام جو پیغام بھیجا تھا اس کے کچھ حصے یہ ہیں :۔

"آزادی کے عظیم مجاھد ، انسانی قسمت کے غیب دان ،
دنیا کی امیدوں کے پیغامبر ، آپ کی آنکھوں کے عارفانہ
مزاج میں مستقبل کے بارے میں کیا کیا خیالی پیکر
محفوظ ھیں ! روحانی تجربہ اور تکمیل کے کون کون
سے عمیق رازوں کی وہ بند لب حفاظت کر رہے ھیں ،
جن سے ھمیشہ دانائی ، حسن اور طاقت کے الفاظ ادا
ھوتے رہے ھیں ! دنیا کی بے چینیوں اور ھنگاموں میں
پر سکون ، متعدد دفعہ کے شکست خوردہ لیکن اعتقاد
میں ھمیشہ سے ناقابل تسخیر ، عمر کے اعتبار سے
بوڑھے مگر اسپرٹ کے لحاظ سے سدا جوان — آپ موت
پر فتح پانے والی سچائی کی زندہ علامت ھیں۔"

(۴)

گاندھی جی کے سفاکانہ قتل پر آن کا پیغام شکوہ مطالب

کے اعتبار سے ایک نادر شاہکار ہے۔ وہ فرماتی ہیں:۔

'' ہم گاندھی جی کی ظاہری نشانیاں ہیں۔ ہم ان کے سپاہی ہیں۔ ہم اس جنگ بھری دنیا میں ان کے جھنڈوں کو اٹھانے والے ہیں۔ ہمارا جھنڈا سچائی ہے۔ ہماری ڈھال اہمسا ہے۔ ہماری تلوار خون گرائے بغیر فتوحات کرتی ہے۔ کیا ہم اپنے باپو کے احکام پر نہ چلینگے اور ان کی جنگ کو فتح تک نہ لیجائینگے؟ اگرچہ ان کی آواز اب دوبارہ سنائی نہ دیگی، لیکن کیا ہمارے پاس کروڑھا کروڑ آوازیں ایسی نہیں ہیں جو ان کے پیغام کو دنیا میں لیجائیں؟ .... نجی رنج کرنے کا وقت گزر گیا۔ اب وقت ہے کہ ہم کھڑے ہو کر یہ کہیں کہ ہمیں ان لوگوں کا چیلنج منظور ہے جنھوں نے مہاتما گاندھی کے خلاف کھلم کھلا علم بغاوت بلند کیا ہے۔''

گورنر بن جانے کے بعد انہوں نے اپنے مخصوص دوستوں کو آزادی کی خوشی میں اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا (مطبوعہ) پیغام تہنیت بھیجا جس میں لکھا تھا کہ اس آزادی کے حاصل کرنے میں ہم سب کا مساوی حصہ ہے۔ یہ خط مجھے بھی بھیجا گیا تھا۔

میری ان سے آخری ملاقات جولائی ۱۹۴۷ میں ہوئی جب کہ وہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے جلسہ کے بعد عازم حیدرآباد ہورہی تھیں اور میں انہیں الوداع کہنے کے لئے اسٹیشن گیا تھا۔ وہاں کمپارٹمنٹ میں پنڈت نہرو، مسز پنڈت اور ان کی صاحبزادی اور ڈاکٹر سید حسین بھی تھے۔ جس محبت اور خلوص سے مسز نائیڈو نے پنڈت جی کو بغل گیر کر کے پیار کیا اس سے مجھے ان دونوں کی بے پایاں محبت کا پہلی مرتبہ احساس ہوا۔ ریل کے ڈبہ میں انہوں نے پنڈت جی سے میرا تعارف بھی کرایا۔ اس واقعہ سے چند دن پہلے میں ان کے یہاں دوپہر کے کھانے پر مدعو

تھا۔ اس وقت ڈاکٹر سید حسین، ڈاکٹر حمید آف سپلا، عثمان سوبانی بھی شریک تھے۔

محمد علی جناح کے ساتھ مسز نائیڈو کے تعلقات زندگی بھر دوستانہ رہے۔ ایک زمانہ میں وہ جناح کو ہند و مسلم اتحاد کا پیغامبر کہا کرتی تھیں۔ انہیں جناح سے اس قدر محبت تھی کہ انہوں نے اپنی چیدہ نظموں کا ایک مجموعہ اپنے دست خاص سے لکھ کر اور خوبصورت جلد میں بندھوا کر انہیں پیش کیا تھا۔ جب مس رتی پیٹٹ کے ساتھ جناح کی شادی ہوئی اس وقت گنتی کے جو چند افراد اس تقریب میں شریک ہوئے، ان میں مسز نائیڈو نمایاں تھیں۔ قائد اعظم کے گورنر جنرل بن جانے پر انہوں نے ذیل کا پیغام بھیجا تھا :-

> ''خدا سے دعا ہے کہ آپ کی دانشمندانہ رہنمائی میں پاکستان کا نیا ڈومی نین سب کے لئے آزادی، مساوات اوراخوت کا شریفانہ اسلامی مطمح نظر حاصل کرلے !''

اور جب ۱۱ ستمبر ۱۹۴۸ کو قائد اعظم وفات پا گئے تو اس وقت جو پیغام تعزیت انہوں نے ارسال کیا، وہ نثر میں شاعری کا زبردست نمونہ ہے۔ و ہو ہذا :-

> ''میں اپنے غم کی تکلیف دہ خاموشی میں پرانی یاد اور محبت کا ایک غیر فانی پھول اپنے پیارے محبوب اور دوست کی قبر پر چڑھاتی ہوں۔''

مسز نائیڈو ایک مسلم والیٔ ملک (اعلیٰ حضرت نظام دکن) کی رعایا تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ سقوط حیدرآباد سے بہت متاثر ہوئیں۔ انہوں نے اپنے بیان میں کہا تھا کہ ''میں خوش ہوں کہ حیدر آباد ہندوستان کا جزو بن گیا ہے لیکن جس طریقہ سے اسے ہندوستان میں شامل کیا گیا ہے وہ بہت ہی افسوسناک ہے۔''

۱۹۵۰ میں میں نے ایک انگریزی کتاب شائع کی جس کا نام تھا : Romance of the Oriental Translator's

* Office Bombay - اسے میں نے مسز نائیڈو کے نام پر حسب ذیل الفاظ میں ڈیڈیکیٹ کیا تھا :-

To the Sacred Memory of
Mrs. SAROJINI NAIDU
who out of motherly love and affection
twice saved the author from
the clutches of an unscrupulous
officer.

مسز نائیڈو اوائل عمر ھی سے دل کی مریض تھیں- ۱۹۲۰ میں جب وہ انگلستان میں تھیں ، ان کی حالت یکایک خراب ہو گئی تھی اور ڈاکٹروں نے برملا کہدیا تھا کہ دل کی حالت خطرناک حد کو پہنچ چکی ھے- مگر اس کے باوجود وہ برابر کام کرتی رھیں- بمبئی اور حیدرآباد میں بھی ڈاکٹروں نے انہیں مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا تھا ، لیکن انہوں نے اسے کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا - آخر یہی بیماری جان لیوا ثابت ہوئی :-

دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا !

مسز نائیڈو کی موت ایک اعتبار سے ساری دنیا کا نقصان ھے ، اس لئے کہ وہ بین الاقوامی حیثیت کی مالک تھیں- مسلمان ان کی خدمات جلیلہ کو یاد کرکے ہمیشہ محبت کے آنسو بہائینگے اس لئے کہ وہ شہزادی جہاں آرا کی طرح ساری عمر ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنے میں مصروف رھیں :-

قرنہا باید کہ تا یک کودکے از لطف طبع
عاقل کامل شود یا فاضل صاحب سخن

***

---

* یہ کتاب 'تعلیمی مرکز' کراچی ا نے شائع کی ہے

مجید لاہوری

جب میں نے اخبارات میں مجید لاھوری کے انتقال کی خبر پڑھی تو میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مرتے وقت ان کی عمر صرف ۴۰ سال تھی ، یہ بھی کوئی مرنے کے دن ھیں !

مجید سے میری پہلی ملاقات کراچی میں ھوئی۔ وہ ''جنگ'' میں مزاحیہ کالم لکھتے تھے۔ خدا نے انہیں مخصوص رنگ کا لٹریچر پیش کرنے کے لئے پیدا کیا تھا۔ جو کچھ انہوں نے لکھا اس میں نیاپن ھے اور یہی وجہ ھے کہ ھر طبقہ کے لوگ ان کی تخلیقات کو شوق سے پڑھتے تھے۔

وہ مزاحیہ رنگ میں حکومت اور عمال پر کڑی تنقیدیں کرنے کے عادی تھے۔ حقیقت یہ ھے کہ وہ کسی کو نہیں بخشتے تھے۔ ایک مرتبہ تو حکومت کی مشینری ان کے خلاف حرکت میں آ بھی گئی تھی مگر—

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گذشت

انہوں نے خواجہ ناظم الدین کو کہیں ''قائد قلت'' لکھدیا تھا۔ اس ریمارک کی وجہ سے وہ زد میں آچلے تھے۔ چونکہ ان کے تعلقات خواجہ صاحب کے بھائی خواجہ شہاب الدین سے بہت صمیمانہ تھے ، اس لئے وہ ان کے شفیع بن گئے۔ اس سلسلہ میں انہیں اچھی خاصی بھاگ دوڑ بھی کرنی پڑی تھی۔ یہ واقعہ خود انہوں نے مجھے بتایا تھا۔

''فسانۂ آزاد'' اردو زبان اور ادب کا مایۂ ناز شاھکار ھے۔ اس میں مصنف نے آزاد ، خوجی وغیرہ کے جو کردار پیش کئے ھیں وہ ھمیشہ زندہ رھینگے۔ ھمارے مجید صاحب نے بھی رمضانی ، گل شیر خان وغیرہ کے کردار پیش کئے ھیں جو دلچسپی کے

اعتبار سے فسانۂ آزاد کے کرداروں سے کسی طرح کم نہیں ھیں۔
ایک دن میں ''نمکدان'' کے دفتر میں گیا۔ وھاں انہوں نے کسی ''پہنچے ہوئے'' معمر شخص سے میرا تعارف کرایا اور پھر اس سے کہا: ''ھاں تو اپنا واقعہ خود اپنی زبان سے انہیں بھی سنادو۔'' اس نے کہا: '' واقعہ تو کوئی زیادہ اھم نہیں ھے۔ صرف اتنا ھے کہ ملکۂ الزبتھ نے ڈیوک آف ایڈنبرا سے شادی رچانے سے پہلے مجھ پر بہت ڈورے ڈالے تھے، مگر میں قابو میں نہیں آیا۔'' یہ سن کر میں ھنس دیا اور گرد و پیش کے دوسرے لوگ بھی ھنس پڑے۔ مجید کے چاروں طرف طرح طرح کے لوگ جمع رہتے تھے، جو کچھ ان کے منہ سے سنتے اسی کو نمک مرچ لگا کر دسترخوان پر ''جنگ'' کے قارئین کے سامنے رکھدیتے۔ ایک دن وہ بیحد مصروف تھے اور میں ان سے محو گفتگو تھا کہ اتنے میں انہوں نے اپنے اسسٹنٹ ایڈیٹر سے کہا کہ ''آج کے کالم میں برنی صاحب کی کتاب 'لطائف ملا نصرالدین' کے کچھ لطیفے نقل کرکے بھیجدو۔'' چنانچہ وہ لطیفے ''حرف و حکایت'' والے کالموں میں بغیر نام اور حوالہ کے شائع کردئے گئے۔ بالفاظ دیگر تمہیدی نوٹ میں یہ نہیں بتایا گیا تھا کہ کتاب کس نے لکھی ھے اور کس نے شائع کی ھے یا یہ کہ لطیفے کہاں سے نقل کئے جارھے ھیں۔

ایک مرتبہ انہوں نے پاکستان میں حرامی بچوں کی روز افزوں پیدایش پر مزاحیہ انداز میں مضمون لکھا جسے دیکھ کر میں نے بھی اسی موضوع پر سنجیدہ طریقہ سے بحث کی اور اسے اشاعت کی غرض سے ان کے حوالہ کردیا۔ انہوں نے ذیل کے نوٹ کے ساتھ اسے ''جنگ'' کے مزاحیہ کالموں میں شائع کیا۔ وھو ھذا :-

'' تہذیب کی اولاد!

اس سے پہلے میں اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ اظہار

خیال کرچکا ہوں، لیکن آج میرے محترم دوست
ضیاءالدین احمد برنی نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا
ہے وہ من وعن آپ کی نذر ہے۔'' (۲۹ جولائی ۱۹۵۴)

مجید مفکر تھے۔ وہ خود سوچتے تھے۔ وہ اپنی نظموں کے خود ہی خالق تھے۔ پاکستان کے شاعروں میں وہ پہلے شاعر تھے جنہوں نے چور بازاری، نفع خوری، رشوت ستانی اور اسمگلنگ جیسی بداخلاقیوں کے خلاف ایسے زمانہ میں جہاد کیا جب کہ لوگوں کی توجہ ان برائیوں کی طرف نہ جاتی تھی۔ وہ اس بارے میں پیش‌رو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی نظمیں بہت سے نوادرات پر مشتمل ہیں۔ ان میں ندرت بھی ہے اور رنگینی بھی، مزاح بھی ہے اور طنز بھی۔ اردو کا کوئی طالب علم ان کے پیش کردہ لٹریچر کو نظر انداز نہیں کرسکتا۔ اسی قبیل کا ایک شعر ملاحظہ ہو:—

گدھوں پہ لاد کے ہم بوجھ ذمہ داری کا
یہ کہ رہے ہیں کوئی آدمی نہیں ملتا

وہ اپنے ڈیل ڈول اور قد و قامت کے اعتبار سے پیکر مزاح تھے۔ ان کی گفتگو بھی بیحد دلچسپ ہوتی تھی۔ وہ ہنس ہنس کے باتیں کرنے کے عادی تھے۔ ان کی باتوں میں اخلاص تھا جس سے ہر سننے والا متاثر ہوئے بغیر نہ رہتا۔ عارف ہسوی کی طرح وہ پان کے عاشق زار تھے۔ پان ہر وقت ان کے کلے میں دبا رہتا تھا۔

انہوں نے چند ہی سال میں پاکستان کے بڑے سے بڑے ''حاکم'' کے ''دربار'' میں رسائی پیدا کرلی تھی۔ حکومت کا کوئی ذمہ دار فرد ایسا نہ ہوگا جو اُن سے ذاتی طور پر (یا ان کے نام سے) نا واقف ہو۔ بعض وزرا سے تو ان کی گاڑھی چھنتی تھی۔ ان میں پیر علی محمد راشدی خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے جگری دوستوں میں مظفر حسین شمیم اور عبدالمجید

سالک قابل ذکر هیں۔ سالک تو خیر ان کے استاد بهی تهے۔

''حرف وحکایت'' پڑھنے والے اب مجید کو نه پائینگے۔ مجهے امید نہیں که اس پیشهٔ صحافت سے کبھی ان جیسا جری شخص نکلے جو صحیح معنوں میں آن کی جگه لے سکے ، اور اس لئے وہ جگه خالی هی رهیگی۔ مجید خود بهی اِس حقیقت کی طرف اشارہ کرگئے هیں:۔

دوسرا مجھ سا کوئی لا نه سکیگی دنیا

***

سیّد فضل شاہ

فروری ۱۹۱۸ کے وسط میں میں پہلی مرتبہ بمبئی گیا اور جاتے ہی انجمن اسلام ہائی اسکول میں مجھے ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ بمبئی کی زندگی سے میں بالکل ناواقف تھا اور اپنے خیال میں سمجھے بیٹھا تھا کہ وہ بھی دھلی کی طرح کوئی سستا سا شہر ہوگا۔ پہنچنے کے دو تین دن بعد میں نے بورڈنگ کے ایک ملازم کو چار آنے کے پیسے دئے اور کہا کہ شاہ جہاں پیلس ہوٹل سے جو قریب ہی تھا، سالن لے آئے۔ وہ سالن تو لے آیا مگر ساتھ ہی ایک رقعہ بھی لایا جس میں سید یوسف شاہ (مالک ہوٹل) نے لکھا تھا کہ: ''میں یہ معلوم کر کے بیحد خوش ہوا ہوں کہ آپ بمبئی آگئے ہیں۔ میں آپ کے نام سے واقف ہوں اور امید ہے کہ نیاز بھی حاصل ہوجائیگا۔ یہ چار آنے واپس کئے جاتے ہیں اس لئے کہ ہمارے یہاں آٹھ آنے سے کم میں سالن کی پلیٹ نہیں ملتی۔ آپ سالن کی پلیٹ میری طرف سے ھدیتاً قبول کریں۔'' اس واقعہ کے چند دن بعد میں ان سے ملنے کے لئے گیا اور سالن کا شکریہ ادا کیا۔ وہ بہت صاحب ذوق بزرگ تھے اور اس لئے یہ ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ سید صاحب نے اپنے وطن نور پور میں دو مدرسے (لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے) قائم کر رکھے تھے، بمبئی کے ہوٹل کی ساری کمائی انہی دو اداروں کی نذر ہوجاتی تھی۔ ان کی وفات کے بعد ہوٹل کا کاروبار ان کے بھتیجے فضل شاہ کے ھاتھ میں آگیا۔ تقسیم کے بعد وہ کراچی چلے آئے اور یہیں طویل بیماری کے بعد انہوں نے ۲۹ اکتوبر ۱۹۵۲ کو وفات پائی۔

چچا بھتیجے دونوں مسافروں کے لئے بہترین کھانے مہیا

کرتے تھے اور مسافروں کی خوشنودی کو اپنا بہترین انعام تصور کرتے تھے۔ کھانے ''پنجاب کے خالص گھی'' سے تیار کئے جاتے تھے اور صاف ستھری چیزوں کی بہمرسانی میں وہ کافی وقت صرف کیا کرتے تھے۔ وہ مسافروں کو ہر ممکن آسایش بہم پہنچاتے تھے۔

ان کے ہوٹل میں جن مشاہیر نے وقتاً فوقتاً قیام کیا ان میں سے چند کے نام یہ ہیں:— اکبر الہ آبادی، غلام بھیک نیرنگ، مولانا ظفر علی خاں، کرم شاہ (عرف کرنیل لارنس)، پروفیسر رشید احمد صدیقی، احمد شاہ بخاری، خواجہ ناظم الدین، سر ظفراللہ خاں، میر علی نواز خاں تالپور، خواجہ حسن نظامی، کرنیل مجید ملک، ماہرالقادری، احسن مارہروی، سر محمد سعداللہ، اختر علی خاں اور جوش ملیح آبادی۔ اکبر نے تو ہوٹل کی تعریف میں ذیل کا شعر بھی فرمایا تھا:—

از ہیبت شاہ جہاں لرزد زمین و آسماں
از ہوٹل شاہ جہاں آرام یابد یک جہاں

جوش کا شعر بھی ملاحظہ ہو:—

شان ہوٹل مکان کی سی ہے
یہ زمیں آسمان کی سی ہے

ریاست حیدرآباد کے متعدد اکابر یہیں ٹھہرا کرتے تھے۔

اس ہوٹل کے نظم و نسق کی ایک خوبی یہ تھی کہ وہاں کبھی چوری نہیں ہوئی۔ ۱۹۲۰ میں میں حکومت بمبئی کے ساتھ اس کے گرمائی مستقر مہابلیشور اور پونا گیا اور پانچ چھ مہینے تک باہر رہا۔ اس مدت میں میرا سارا سامان اسی ہوٹل میں رہا۔ واپسی پر وہ بغیر کسی ٹوٹ پھوٹ کے مجھے جوں کا توں مل گیا۔ مسافر ہزاروں روپے کے پرس بھول جاتے تھے، اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ ایک پیسہ کا بھی الٹ پھیر ہو گیا ہو۔ یہ میرے دیکھے کی باتیں ہیں۔

سید فضل شاہ بھی اپنے چچا کی قائم کردہ روایات کے مطابق ہوٹل کو نہایت نیکنامی سے چلاتے رہے ۔ نہ صرف یہ کہ وہ مسافروں کے ساتھ غیر معمولی اخلاق سے پیش آتے تھے بلکہ ان کے دکھ درد میں بھی کام آتے تھے ۔ ان کی یہ وضعداری مجھے بیحد پسند تھی ۔ وہ مسافروں کی خدمت اس طرح سے کرتے تھے گویا وہ ان کے عزیز ہیں ۔ وہ دوسروں پر بھروسہ کرنے کے عادی تھے ۔ متعدد دفعہ مسافروں کے پاس روپے کی کمی ہو جاتی تھی اور وہ بل کی پوری رقم ادا کئے بغیر وعدہ فردا کرکے چلے جاتے تھے ۔ مسافر بالعموم باقی ماندہ رقوم گھر پہنچ کر بھیجدیا کرتے تھے ، مگر ایسا بھی ہوا ہے کہ وہ رقمیں غیر وصول شدہ رہیں ۔ تلخ تجربات کے باوجود وہ لوگوں پر اعتماد کرتے تھے ۔

جہانتک شہری خدمت کا تعلق ہے وہ ہمیشہ پیش پیش رہے ۔ بعض بڑے بڑے مسلمان لیڈروں سے ان کے گہرے روابط تھے ، علی برادران کے عاشق زار تھے اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ مولانا شوکت علی ان کے پاس گئے ہوں اور خالی ہاتھ لوٹ آئے ہوں ۔ شاہ صاحب ان کے ہر حکم کی تعمیل کرنا اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے ۔ مولانا عرفان تو ہر مشکل میں ان کے پاس آتے اور ان سے اس طرح سے روپیہ وصول کرتے گویا کہ وہ کوئی سرکاری لگان ہے ۔

شاہ صاحب کی عادت تھی کہ وہ دوسروں کے دکھ درد کو اپنا لیتے تھے ۔ حافظ علی بہادر خاں پر دو ایک مرتبہ بپتا پڑی اور اس وقت یہی شاہ صاحب ان کے کام آئے ۔ جس آگ کے پاس دوسرے لوگ جاتے ہوئے ڈرتے تھے وہ اس میں بے تحاشا کود پڑتے تھے ۔ اس وضع کے آدمی بہت کم نکلینگے ۔ انہیں اپنا غم نہ تھا ، وہ دوسروں کا غم اٹھائے اٹھائے پھرتے تھے ۔

مہمان نوازی ان کا خاص شعار تھا ۔ دوستوں کی خدمت کرنے میں انہیں خاص لطف آتا تھا ۔ وہ اصرار کرکے ان کی

دعوتیں کرتے تھے اور ان مواقع پر وہ غیر معمولی اہتمام کرنے کے عادی تھے۔

شاہ صاحب دوستوں میں "چغم" کے نام سے مشہور تھے۔ اُن میں بیٹھکر طرح طرح کی ہنسنے ہنسانے کی باتیں کرتے تھے۔ وہ بیحد مذاقیے تھے۔ ان کی نجی زندگی بہت پاکیزہ تھی۔ بمبئی جیسے شہر میں اتنے عرصہ تک رہنے کے باوجود وہ وہاں کی رنگینیوں سے کبھی لطف اندوز نہ ہوئے۔ وہ ساحل پر کھڑے تماشا دیکھتے تھے مگر خود ایکٹر نہ بنتے تھے۔ وہ خوش قسمت تھے کہ انہیں متعدد سچے دوست ملے۔ وہ اپنے دوستوں میں "مخلص" کے لقب سے مشہور تھے۔

مرحوم میرے قریب ترین دوستوں میں تھے اور آج بھی جب کبھی ان کی یاد آجاتی ہے، ان کا ہنس مکھ چہرہ مع اپنی جملہ شادابیوں کے سامنے آجاتا ہے اور تھوڑی دیر کے لئے میں ان کی یادوں میں گم ہو جاتا ہوں۔

***

جگر مُرادآبادی

راقم الحروف جگر مراد آبادی کے نام نامی سے ۲۱-۱۹۲۰ سے واقف تھا اس لئے کہ ان کی غزلیں ''معارف'' میں نکلتی رہتی تھیں، لیکن ملاقات دہلی میں اس وقت ہوئی جب کہ وہ میرے دوست اور ہم جماعت مرتضیٰ علی خان کے یہاں مقیم تھے۔ پہلی ملاقات کے موقع پر ہم دونوں میں دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب میں چلنے لگا تو فرمایا کہ ''میں آپ سے مل کر حقیقی معنوں میں خوش ہوا ہوں، ویسے بہت کم اشخاص ایسے ہیں جن سے مل کر مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔'' میں نے ان کی اس محبت و شفقت کے اظہار پر دلی شکریہ ادا کیا۔ اس زمانہ میں ان سے روزانہ سہ پہر کو ملاقات ہوتی تھی۔ یہ ملاقات جامع مسجد کے قریب ایک بالاخانہ میں ہوتی تھی جہاں وہ خوب شراب پیتے تھے اور پیتے پیتے کبھی میری گود میں آ پڑتے تھے اور کبھی کسی دوسرے کی گود میں جا پڑتے تھے اور کبھی فرش پر لوٹنے لگتے تھے۔ یہ حالت گھنٹوں رہتی۔ یہ زمانہ ان کی شراب نوشی کے شباب کا تھا اس لئے کہ بوتل ہر وقت ان کی بغل میں دبی رہتی تھی۔ لیکن رندی میں بھی میں نے کبھی کوئی ناملائم لفظ ان کے منہ سے نہیں سنا۔

ایک دن میں صبح کے وقت اپنے دوست کے یہاں جا پہنچا۔ دیکھا کہ جگر اس وقت اپنے میزبان کے نسخہ پر اپنی یاد سے اپنی مختلف غزلوں کا سن اور تاریخ لکھ رہے ہیں۔ پھر انہوں نے میری درخواست پر شراب کے بارے میں اپنے چند اشعار لکھ کر مجھے عنایت فرمائے۔ وھو ھذا :-

بسم اللہ الرحمن الرحیم
(بہ خط طغریٰ)
ساقی ھے ، شراب ھے ، سبو ھے اول وہ بڑھے جو با وضو ھے

اے محتسب نہ پھینک ، مرے محتسب نہ پھینک
ظالم شراب ھے ، ارے ظالم شراب ھے

جب تک شباب عشق مکمل شباب ھے
پانی بھی ھے شراب ، ھوا بھی شراب ھے

ان لبوں کی جاں نوازی دیکھنا
منہ سے بول اٹھنے کو ھے جام شراب

امید ھے تری رحمت اسے بھی دھو ڈالے
وہ اک گناہ جو غرق شراب ھو نہ سکا

کدھر سے برق چمکتی ھے ، دیکھیں اے واعظ
میں اپنا ساغر اٹھاتا ھوں تو کتاب اٹھا
مجھے اٹھانے کو آیا ھے واعظ ناداں
جو اٹھ سکے تو مرا ساغر شراب اٹھا

یوں رند ھیں مست چاندنی میں جیسے شب ماھتاب پی لی
جگر مرادآبادی عفی عنہ

دھلی : ۲۹ اکتوبر ۱۹۳۸ (بہ خط طغریٰ)

اس کے بعد مزید ملاقاتیں بمبئی میں ھوئیں جہاں ھم ''اقبال ڈے'' کے موقع پر تقریروں کے علاوہ آل انڈیا مشاعرے بھی منعقد کرتے تھے ۔ جہاں تک مری یاد کام کرتی ھے یہ

دن تقسیم سے قبل تین مرتبہ منایا گیا تھا اور ہر موقع پر جگر خصوصی مہمان کی حیثیت سے مدعو ہوتے تھے۔ یہ اجتماعات ''پنجاب مسلم ایسوسی ایشن'' کی زیر سرپرستی منعقد کئے جاتے تھے۔ چونکہ راقم الحروف اس ایسوسی ایشن کا جائنٹ سیکریٹری تھا اس لئے باہر سے آنے والے حضرات سے خط و کتابت کے فرائض بھی میرے ہی سپرد تھے۔ بمبئی میں حضرت جگر یا تو حکیم مرزا حیدر بیگ دہلوی کے یہاں قیام فرماتے یا پھر یو۔پی۔ایسوسی ایشن کے صدر محمد طاہر کے یہاں جو باندرہ میں رہا کرتے تھے۔ یہ دونوں حضرات جگر کے بیحد قدردان تھے۔ بمبئی میں جس شان کے ساتھ یہ دن منایا جاتا تھا وہ آپ اپنی نظیر تھا۔

جگر شراب پیتے تھے اور ان کا شراب پینے کا زمانہ خاصا طویل ہے۔ مگر وہ صاحب عزم انسان بھی تھے۔ جب انہوں نے طے کرلیا کہ اب اس ام الخبائث کو منہ نہ لگائینگے تو وہ ہمیشہ کے لئے اس سے تائب ہوگئے۔ توبہ کے زمانہ میں میں نے ان سے کہا کہ ''شراب کے بارے میں اپنے دو تین شعر تو سنا دیجئے۔'' جواب میں فرمایا :—''ایسے شعر اب نہیں سناؤنگا۔ ایسا نہ ہو کہ طبیعت پھر اس طرف راغب ہوجائے۔''

۱۹۵۰ میں ''ڈان'' (کراچی) کے مشاعرہ میں جگر بھی شریک ہوئے تھے اور اس موقع پر انہوں نے معرکہ کی غزلیں سنائی تھیں۔ جب مشاعرہ ختم ہوگیا تو چند دوستوں نے انہیں گھیر لیا۔ باتوں باتوں میں میں نے کہا کہ ''آپ کی فلاں غزل نہایت مرصع اور بہترین اشعار پر مشتمل تھی، لیکن اس کا ایک شعر تو کم سے کم ایسا ہے جس کے سمجھنے والے سارے مجمع میں صرف دو شخص نکلینگے۔'' ایک صاحب نے جو کسی انگریزی روزنامہ سے وابستہ تھے، پوچھ ہی لیا کہ ''وہ دو خوش قسمت اشخاص کون ہیں؟'' میں نے جواب دیا : ''ایک خود جگر اور دوسرا یہ خادم۔'' اس پر قہقہہ بلند ہوا۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ ترک مے نوشی سے جگر کی شاعری کو زوال آ گیا، لیکن مجھے اس رائے سے اتفاق نہیں ہے۔ جو گھلاوٹ، لوچ اور نکھار ان کی آخری دور کی شاعری میں پایا جاتا ہے وہ نتیجہ ہے شراب چھوڑ دینے کا۔ اگر پیتے رہتے تو وہ ہرگز ہرگز تغزل کی ان بلندیوں پر نہ پہنچ پاتے جن پر وہ بالآخر پہنچے۔

بہ حیثیت انسان کے وہ بہت اونچے مقام کے مالک تھے۔ وہ حساس دل رکھتے تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ ۱۹۴۷ کے دل گداز واقعات سے بہت متاثر ہوئے۔ انہوں نے اپنی نظموں میں نہایت بیباکی سے اہل وطن پر تنقید کی ہے۔ وہ یہ دیکھ کر بیحد ملول رہتے تھے کہ انسان کس سرعت سے پستی کی جانب جا رہا ہے۔

میری بیوی کے ایک پھوپھی زاد بھائی عبداللطیف جگر کے اس زمانہ کے دوستوں میں سے ہیں جب کہ وہ آگرہ کے بی-این-بیچل (چشمے والے) کے ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ چند سال پیشتر جب جگر کراچی آئے تو میاں لطیف ان سے ملنے کے لئے اصطفیٰ خان کے مکان پر پہنچے۔ ان کی یہ ملاقات کوئی بیس سال کے بعد ہوئی تھی۔ جگر انہیں پہچاننے سے قاصر رہے۔ اس پر لطیف نے ہنس کر کہا کہ ''اگر تم مجھے نہ پہچان سکے تو تم پر اور تمہاری شاعری پر لعنت۔'' جگر یہ سن کر مطلق کبیدہ خاطر نہ ہوئے بلکہ برابر مسکرا مسکرا کر یاد کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ آخر تھک کر لطیف نے اپنا تعارف خود کرایا۔ پہچانتے ہی انہوں نے نہایت گرمجوشی سے انہیں سینہ سے لپٹا لیا اور دیر تک معذرت چاہتے رہے۔ نہ صرف یہ بلکہ تلافی کے طور پر وہ دو مرتبہ ان کے مکان واقع برنز روڈ پر آئے اور رات کو دیر تک اپنا کلام سناتے رہے۔ افسوس ہے کہ اس کے بعد پھر ان سے ملاقات نہ ہوسکی۔

***

جمشید جی نسروانجی مہتا

جمشید جی نسروانجی مہتا اچھے کھاتے پیتے پارسی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے والد تاجر تھے اور اپنی فیاضیوں کی وجہ سے غربا میں کافی مشہور تھے۔ ان کی والدہ بھی بہت خداترس اور عبادت گذار خاتون تھیں۔ جمشید ان دونوں کی زندگی سے بیحد متاثر تھے۔ ایک اور چیز جس نے ان کی زندگی کو متاثر کیا، وہ تھی تھیوسوفی اور اسی کے زیر اثر انہوں نے تمام مذاھب کا احترام کرنا اور بلا امتیاز مذہب و ملت بنی نوع انسان سے محبت کرنا سیکھا۔

وہ مدتوں کراچی شہر کے میئر رہے۔ میئری کے زمانہ میں انہیں متعدد مواقع ملے کہ وہ کراچی کے شہریوں کی طرف سے گاندھی جی اور بعض دوسرے اکابر کی خدمت میں ایڈریس پیش کریں۔ ۱۹۲۹ میں رائٹ آنریبل سرینواس شاستری کو جو ایڈریس دیا گیا تھا اس کے جواب میں شاستری صاحب نے فرمایا تھا کہ ”جمشید نسروانجی کا معیار خدمت اس قدر بلند ھے کہ ان کے جانشین مشکل سے اس تک پہنچ سکینگے۔“

جمشید نسروانجی ملک کی آزادی کے زبردست حامی تھے، مگر وہ اسے آئینی طریقہ سے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ھے کہ وہ مسز اینی بیسنٹ کی تحریک ھوم رول میں تو شریک ھوگئے مگر گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی سے کنارہ کش رہے، اس لئے کہ انہیں یقین تھا کہ سول نافرمانی کی تحریک بالآخر تشدد پر منتج ھوگی۔ راؤلیٹ ایکٹ کی بھی انہوں نے یہ کہکر مخالفت کی تھی کہ ”اگر انگریز جلد سے جلد ھندوستان کو ڈومی نین کا درجہ نہ دیدینگے تو وہ وقت دور نہیں

جب کہ ملک ان کے ہاتھوں سے نکل جائیگا۔ ہندوستان جن خرابیوں سے دو چار ہورہا ہے اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ بڑے بڑے لیڈروں کو جیلوں میں ٹھونس دیا جائے اور ملک پر آرڈیننسوں کے ذریعہ حکومت کی جائے۔'' سول نافرمانی کے زمانہ میں انہوں نے ''گاندھی ہاسپٹل'' قائم کیا تاکہ جو لوگ پولیس کے لاٹھی چارج سے زخمی ہوں انہیں علاج کے لئے وہاں پہنچادیا جائے۔ متعدد مواقع پر انہوں نے اپنی بروقت مداخلت سے پولیس اور عوام کے تصادم کو روک دیا۔

۱۹۳۱ میں انہوں نے سندھ کی علیحدگی کی تائید کی اگرچہ عام ہندو جن کی پشت پر کانگریس تھی، اس معصوم تجویز کے مخالف رہے۔ سندھ بالآخر پہلی اپریل ۱۹۳۶ سے علیحدہ صوبہ کی حیثیت سے نقشہ پر نمودار ہوگیا۔ ۴ اگست ۱۹۳۷ کو سندھ اسمبلی میں بجٹ پیش ہوا۔ اس وقت جمشید مہتا نے تجویز پیش کی کہ ممبروں کو الاؤنس قبول نہ کرنا چاہئیے۔ اگرچہ وہ اس مہم میں کامیاب نہیں ہوئے تاہم وہ یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ جو لوگ اسمبلیوں میں خدمت کے جذبہ سے جاتے ہیں انہیں اپنی خدمت کا معاوضہ طلب نہ کرنا چاہئیے۔ وہ ۱۹۴۰ میں سندھ اسمبلی سے مستعفی ہوگئے تاکہ ان کا دامن اقتدار کی ناپاک جنگ میں آلودہ نہونے پائے۔

جمشید مہتا کے والد کا کاروبار شراب کا تھا۔ برطانوی حکومت چونکہ جمشید مہتا کی سیاسیات سے ناخوش تھی اس لئے اس نے شراب کی غیر ملکی ایجنسیوں کو بند کرادیا جس کی وجہ سے انہیں زبردست نقصان اٹھانا پڑا۔ مگر وہ اپنے بیٹے کے طریقۂ کار سے خوش رہے۔ مہتا بھی مسرور تھے کہ انہیں اس لعنتی کام سے چھٹکارا ملا۔ وہ شراب کو مغربی تہذیب کی ''برکات'' میں شمار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ پاکستان اور ہندوستان دونوں میں اس کے لئے کوئی جگہ نہ ہونی چاہئیے۔ وہ ایسے روپے کو بھی

نفرت کی نظر سے دیکھتے تھے جو اس ’’داغی تجارت‘‘ سے حاصل ہوا ہو۔ وہ دنیا میں اسلام کو شراب بندی کا سب سے زبردست مبلغ سمجھتے تھے اور اسی وجہ سے وہ پاکستان میں شراب نوشی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کو اندیشناک قرار دیتے تھے۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے (مگر یہ حقیقت ہے) کہ جمشید مہتا پابندی سے قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے، ماہ رمضان میں روزے رکھتے تھے اور اپنے خرچ سے ہر سال چند مسلمانوں کو حج کے لئے بھی بھیجتے تھے۔ جمشید مہتا مالدار آدمی تھے مگر انہیں روپے پیسے سے مطلق محبت نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ اسے خدمت خلق میں خرچ کرتے رہتے تھے۔

ماما پارسی گرلز ہائی اسکول (کراچی) بھی انہی کی کوششوں سے معرض وجود میں آیا۔ انہوں نے اپنے ہم مذہب پارسیوں میں ڈانسنگ (رقص) کے رواج کو کم کرنے کی انتہائی کوشش کی۔ وہ اسے سوسائٹی کے لئے خطرہ کا سگنل قرار دیتے تھے۔ اس نصف صدی میں پارسیوں میں وقتاً فوقتاً جتنی اصلاحی تحریکیں اٹھیں وہ بڑی حد تک جمشید نسروانجی کی جد وجہد کی رہین منت ہیں۔

پاکستان بن جانے کے بعد جمشید مہتا نے حکومت سے ہر معاملہ میں تعاون کیا۔ وہ مہاجرین کے نہ بسائے جانے سے ملول رہتے تھے اور کہتے تھے کہ ’’اگر انہیں جلد نہ بسایا گیا اور انہیں اچھا شہری بنانے کے لئے ہر ممکن کوشش نہ کی گئی تو اندیشہ ہے کہ بچے آوارہ گردی میں مبتلا ہو کر پکے مجرم بن جائینگے۔‘‘ وفات سے چند دن پیشتر انہوں نے اے۔ کے۔ بروہی سے کہا تھا کہ ’’حکومت میری بات نہیں سنتی ورنہ میرے پاس ایک اسکیم ہے جس کے ذریعہ سارے مہاجرین بہت کم مدت میں آباد کئے جا سکتے ہیں۔‘‘ بروہی کہتے تھے کہ ’’ان کی صحت ایسی نہ تھی کہ میں اسکیم کی تفصیلات دریافت کرتا اور آج افسوس ہے کہ ان کی وفات کے

باعث وہ اسکیم ایک راز بن کر رہ گئی ھے۔''

میں بمبئی میں برسوں سے کراچی کے اس سینٹ (مقدس بزرگ) کا نام نامی سنتا چلا آتا تھا، اور اسی لئے کراچی آتے ھی اپنی اولین فرصت میں ان کی خدمت میں حاضر ھوا، اور ھر ملاقات میں ان کی شرافت اور خلوص سے گہرے طور پر متاثر ھوا۔ وہ ھندوستان اور اور پاکستان دونوں مملکتوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور یہی وجہ ھے کہ وزیر اعظم لیاقت علی خاں نے گاندھی جی کے مجسمہ کے متعلق خاص طور پر ان سے بیان دلوایا۔*

جمشید مہتا کی ساری زندگی خدمت الناس میں گزری اور انہوں نے اپنی پاکیزہ زندگی سے بتادیا کہ مادیت کے اس دور میں بھی بے غرضی، سچائی اور روحانیت کو روزمرہ کے کاموں میں کس طرح سمویا جاسکتا ھے۔

***

---

* ھندوستان والوں کا خیال تھا کہ مجسمہ جان بوجھ کر گرایا گیا ہے اور پاکستان والے کہتے تھے کہ تند ھواؤں کے جھوکوں سے یہ خود بخود گر گیا ہے۔ اس خیال سے کہ کہیں یہ واقعہ دونوں مملکتوں کے مابین مزید کشیدگی کا باعث نہ بنجائے، لیاقت علی خان نے جمشید مہتا سے ایک بیان دلوادیا جس کا ھندوستان پر خاطر خواہ اثر ھوا۔

مولانا ظفر علی خاں

منشی سراج الدین مولانا ظفر علی خاں کے والد تھے۔ جب اس صدی کے شروع میں انہوں نے ''زمیندار'' جاری کیا تو میرے دو تایا زاد بھائی (منشی محمد حسین اور منشی عبدالقادر) کاتب کی حیثیت سے اس سے وابستہ ہوگئے۔ ظفر علی خاں کے زمانہ میں بھی وہ بدستور اس سے منسلک رہے۔ یہ دونوں ظفر علی کے جاں نثاروں میں تھے اور یہی وجہ ہے کہ ان کے ہر ابتلا میں انہوں نے ثابت قدمی دکھائی۔ ایک اعتبار سے وہ ملازم تھے، لیکن چونکہ وہ سراج الدین صاحب کے زمانہ سے کام کر رہے تھے اس لئے مولانا آن سے خصوصی احترام سے پیش آتے تھے۔ جب برادرم محمد حسین نے ''زمیندار'' میں کام کرتے کرتے جان دیدی تو مولانا نے ان کی بیوہ کے لئے تا زندگی دس روپے ماہوار کی پنشن مقرر کردی۔ نہ صرف یہ بلکہ انہوں نے اپنے قلم سے ان کی وفات پر ایک طویل شذرہ لکھا جسے ضمیمہ کے طور پر درج کیا جارہا ہے۔ ان خصوصی تعلقات کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میرے تایا مولوی گنج بخش صاحب منشی سراج الدین کے استاد تھے۔

میرے ذاتی تعلقات ظفر علی خاں سے ۱۹۱۲ میں قائم ہوئے جب کہ میں بی اے کے امتحان کے سلسلہ میں دھلی سے لاھور گیا تھا۔ وھاں میں نے ایک مہینہ تک بلا تنخواہ '' زمیندار'' کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں کام کیا۔ اس تمام مدت میں میں نے مولانا سے صرف ایک لفظ پوچھا تھا اور وہ تھا ''میسو پوٹیمیا۔'' انہوں نے بتایا کہ اردو میں اسے ''عراق عرب'' کہتے ھیں۔ میرے زمانہ میں وجاھت حسین، جھنجھانوی بھی ایڈیٹوریل عملہ میں تھے۔ جھنجھانوی نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے

تھے۔ مجھے ''زمیندار'' سے اپنے اس تعلق پر ہمیشہ فخر رہیگا۔
ان دنوں مولانا جمعہ کی نماز جامع مسجد میں ادا کرنے کی بجائے دفتر کے قریب کی مسجد میں ادا کرتے تھے۔ چونکہ طرابلس (اور بعد میں بلقان کی) لڑائیوں میں مولانا ترکوں کی حمایت میں بہت کچھ کام کرچکے تھے اس لئے جب کبھی وہ پبلک میں نمودار ہوتے ہزارہا مسلمان فرط عقیدت سے ان سے مصافحہ کرنے کے لئے بے تاب نظر آتے۔ اکیلے ''زمیندار'' کی آواز پر ترکوں کے لئے لاکھوں روپے جمع ہوئے۔ ان دنوں ''زمیندار'' جس طرح ہاتھوں ہاتھ بکتا تھا اس کی دوسری مثال میرے دیکھنے میں نہیں آئی۔ ''الہلال'' کی طرح یہ اخبار بھی مسلمانان ہند میں صحیح قسم کی سیاسی بیداری پیدا کرنے میں پیش پیش تھا۔
اس زمانہ میں انڈین پریس ایکٹ کی دفعات نہایت سخت تھیں۔ مولانا نے اخبارات کو ''پریس لاز'' کے چنگل سے آزاد کرانے کے سلسلہ میں جو شاندار قربانیاں دیں وہ اتنی زبردست ہیں کہ کسی ایک شخص، اخبار یا ادارہ سے بن نہیں پڑیں۔ متعدد بار ''زمیندار'' سے بھاری ضمانتیں طلب کی گئیں اور ان کے پریس کو بحق ملک معظم ضبط کیا گیا۔* مولانا نے یہ سب مصائب خندہ پیشانی سے برداشت کیں اور شکر گزار قوم نے ہر موقع پر ان کی پشت پناہی کی۔ یہی وجہ تھی کہ گورنمنٹ کا ہر وار وہ اثر پیدا نہ کرسکا جو حکومت پیدا کرنا چاہتی تھی۔
مولانا ترجمہ کے بادشاہ تھے۔ ان کی کتابیں ''خیابان فارس''، ''سیر ظلمات'' اور ''معرکۂ مذہب و سائنس'' ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں۔ انہوں نے تن تنہا اردو ادب کو جتنا

---

* ''زمیندار'' سے مجموعی طور پر پندرہ دفعہ ضمانتیں لی گئیں۔ ایک مرتبہ محض اس بنا پر زمیندار پریس ضبط کیا گیا کہ اس کے ایک اداریہ کی ابتدا ذیل کے شعر سے ہوئی تھی:-

چار چیز است تحفۂ لندن   خمر و خنزیر و روز نامہ و زن

مالدار بنادیا اتنا شاید ھی کسی اور ادیب نے بنایا ہو۔ وہ نظم و نثر پر غیر معمولی قدرت رکھتے تھے، ایسی قدرت جسے دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان کو سنگلاخ زمینوں اور ادق قافیوں پر جو عبور حاصل تھا اس میں سوائے اکبر الہ آبادی کے ان کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ ان کی حسین نعتیں اپنا الگ مقام رکھتی ھیں اور وہ رھتی دنیا تک خراج تحسین حاصل کرتی رھینگی۔ انہوں نے اردو نثر میں متعدد نئی اصطلاحیں اور ترکیبیں جاری کیں، مثلاً ''رجعت قہقہری'' و قس علی ھذا۔

وہ صحیح معنوں میں بابائے صحافت تھے۔ ان کے بہت سے شاگرد تھے جن میں وجاھت حسین جھنجھانوی، مولوی عبداللہ عمادی، وحیدالدین سلیم، چراغ حسن حسرت، عبدالمجید سالک، نیاز فتحپوری، حفیظ جالندھری، مرتضیٰ خان میکش، حاجی لق لق اور غلام رسول مہر خصوصیت سے قابل ذکر ھیں۔ جالب کی طرح ظفر علی بھی ھر اعتبار سے صحافی گر تھے۔

مولانا نے اپنی زندگی میں متعدد رسالے اور اخبار جاری کئے۔ سب سے پہلے انہوں نے ''دکن ریویو'' نکالا اور اس کے بعد ''پنجاب ریویو''۔ اس شان کے پرچے آج تک نہیں نکلے۔ ان کا ایک نمایاں پہلو یہ تھا کہ ان میں مشاھیر اھل قلم لکھا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ھے کہ ''زمیندار'' بند تھا اور وہ اپنے گاؤں کرم آباد میں نظر بند تھے۔ حالت نظر بندی میں انہوں نے سر مائیکل او ڈوآیر کی خاص اجازت سے ایک غیر سیاسی ھفتہ وار اخبار نکالنا شروع کیا جس کا نام تھا ''ستارۂ صبح۔'' اس کی پیشانی پر ذیل کا شعر مرقوم رھتا تھا :—

من آں ستارۂ صبحم کہ در محل وقوع
ھمیشہ پیش رو آفتاب می باشم

ان سب جرائد نے اردو صحافت پر اپنا نہ مٹنے والا نشان چھوڑا ھے۔

مولانا نے جنگ طرابلس اور جنگ بلقان میں جو عظیم الشان

خدمات ترکوں کے لئے انجام دیں انہی کا اثر تھا کہ جب وہ ٹرکی گئے تو سلطان المعظم خلیفۃ المسلین سلطان محمد خامس نے انہیں شرف باریابی بخشا۔ اس موقع پر مولانا نے فارسی میں ایک معرکۃ الآرا قصیدہ بھی سلطان المعظم کی خدمت میں پیش کیا تھا جس کے صلہ میں وہ تمغۂ مجیدی سے نوازے گئے تھے۔

عوام میں مولانا کو جو مقبولیت حاصل تھی اس کا ایک ادنیٰ نمونہ یہ ہے کہ ٹرکی سے واپسی پر شہر دھلی میں ان کا نہایت شاندار جلوس نکالا گیا۔ لیکن جامع مسجد کے قریب لوگوں نے ان کی گاڑی کے گھوڑے کھول دئے اور اسے خود کھینچنا شروع کیا۔ اس روندن میں ایک نوجوان کی جان عزیز جاتی رہی۔ شام کو مولانا کے اعزاز میں روزہ کشائی تھی جہاں مولانا محمد علی، راجہ غلام حسین اور بہت سے دوسرے اکابر جمع تھے۔ مرحوم نوجوان کے والد ماجد بھی موجود تھے۔ انہوں نے ایک مختصر سی تقریر میں کہا کہ ”اگر میرے دس لڑکے بھی ہوتے اور وہ سب کے سب اسی طرح مولانا پر قربان ہو جاتے تو مجھے ذرا سا بھی غم نہ ہوتا۔ ہم سب مولانا کی شمع کے پروانے ہیں۔“ حاضرین ان کی تقریر سے بیحد متاثر ہوئے۔ آخر میں مولانا نے جوابی تقریر کی اور انتہائی درد انگیز لہجہ میں اس حادثۂ جانکاہ کا ذکر کیا اور پھر شکر گزاری کے جذبہ کے ساتھ انہوں نے اعلان کیا کہ میں مرحوم کی یادگار کے طور پر بیس روپے ماہوار کا ایک وظیفہ ایسے دھلی والے کو دونگا جو لاھور کے انجینیرنگ یا میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کریگا، اور یہ وظیفہ مرحوم کے نام سے موسوم ہوگا۔ اس واقعہ کو زمانہ ہوگیا ہے مگر اس کی یاد آج بھی دماغ میں محفوظ ہے۔

ظفرعلی خاں شاہ افغانستان امیر امان اللہ خاں کے آخر وقت تک یار وفادار رہے۔ انقلاب افغانستان کے زمانہ میں انہوں نے امان اللہ کا پورا پورا ساتھ دیا، اور جب سوخرالذکر خانہ جنگی کے نتیجہ

میں تاج و تخت سے دست بردار ہوکر بمبئی پہنچے تو اس وقت ظفر علی نے امان اللہ خاں کے لئے امدادی فنڈ جاری کیا اور تاج محل ہوٹل بمبئی میں جاکر بہ نفس نفیس شاہ مخلوع کی خدمت میں جمع شدہ رقم پیش کی۔ اس زمانہ میں مولانا شاہ جہاں ببلیس ہوٹل (عبدالرحمن اسٹریٹ) میں قیام پزیر تھے۔ وہاں دوران ملاقات میں میں نے پوچھا کہ ''افغانستان'' کی گتھی کا کیا حل ہوگا؟ '' فرمایا کہ'' جب تک افغانستان کے باشندے امان اللہ خاں کو بلا کر اپنا بادشاہ نہ بنائینگے، ملک کی حالت کبھی نہیں سدھر سکیگی۔ '' اس بارے میں انہیں اتنا غلو تھا کہ انہوں نے اس نظریہ کی تبلیغ کے لئے اپنے اخبار کے کالم وقف کر دئے تھے۔ یہ چیز حکومت ہند کے منشا کے خلاف تھی اس لئے کہ وہ جنرل نادر شاہ کی حامی تھی اور نہیں چاہتی تھی کہ ہندوستان میں شاہ مخلوع کا پروپیگنڈا کیا جائے۔ چنانچہ اس نے ''زمیندار'' سے ضمانت لیلی اور مولانا کو ان کا پروپیگنڈا کرنے سے روک دیا۔

مولانا نے اپنے زمانہ میں جتنی قلمی لڑائیاں لڑیں، ان کا کچھ حد و حساب نہیں۔ کبھی وہ خواجہ حسن نظامی سے الجھتے ہیں تو کبھی مولانا محمد علی سے، کبھی سالک و سہر سے نبرد آزما ہوتے ہیں تو کبھی آریا سماجیوں سے، کبھی مرزا بشیر الدین محمود سے بر سر جنگ ہوتے ہیں تو کبھی پنڈت مدن موہن مالوی سے، کبھی کانگریس سے جھگڑتے ہیں تو کبھی احرار سے، وقس علی ھذا۔ ایک زمانہ میں انہوں نے قتل مرتد کی حمایت میں متعدد مضامین لکھے محض اس لئے کہ مولانا محمد علی قتل مرتد کے خلاف لکھ چکے تھے۔ مگر وہ اپنے دور کی ایک مشہور ہستی سلطان عبدالعزیز ابن سعود کے تا زندگی وفادار رہے حالانکہ ان کے آجڈ سپاہیوں نے بزرگان دین کی قبریں اور ان کے قبے مسمار کردئے تھے جس کی وجہ سے سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں شدید غم و غصہ کی لہر دوڑ

گئی تھی اور انہوں نے سلطان کے خلاف طرح طرح کی تجاویز منظور کی تھیں۔ تنہا ظفر علی خاں سعودی حکومت کے حامی رہے اور ہندوستانی اخبارات کے حملوں کا جواب دیتے رہے۔

ان کی زندگی کا ایک امتیازی پہلو یہ ہے کہ اگر آج وہ دوست ہیں تو نظم و نثر دونوں میں اس کا اظہار کیا جارہا ہے، لیکن اگر خدا نخواستہ یہ دوستی مبدل بہ دشمنی ہوجاتی ہے تو پھر ان کے قلم کا سارا زور مخالفت میں صرف ہونا شروع ہوجاتا ہے۔ ایک زمانہ میں وہ گاندھی جی کے شیدائی تھے مگر کچھ عرصہ بعد وہ ان کی مخالفت پر اُتر آئے۔ ڈاکٹر اقبال بھی ان کی مخالفت کا نشانہ رہ چکے ہیں۔ وہ تقریباً زندگی بھر مولانا محمد علی کے مخالف رہے لیکن جب ان کا انتقال ہو گیا تو انہوں نے ان کی تعریف میں مرثیہ نگاری کا پورا حق ادا کردیا۔ ان کی کلیات میں اس قسم کے بہت سے متضاد نوادر ملینگے۔

ایک زمانہ میں ''ٹائمز آف انڈیا'' میں ''تھرو انڈین آئیز'' (Through Indian Eyes) * کے عنوان سے جمعرات کے جمعرات تنقیدی مضامین شائع ہوتے تھے جن میں ہندوستانی لیڈروں پر کیچڑ اچھالی جاتی تھی اور ان کی زندگی کا تاریک رخ بے نقاب کیا جاتا تھا۔ ہر شخص اس کوشش میں تھا کہ معلوم کرے کہ ان مضامین کا لکھنے والا کون شخص ہے، طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی جاتی تھیں مگر کوئی تیر نشانے پر نہ بیٹھتا تھا۔ ایک دن مولانا ظفر علی نے ''زمیندار'' میں لکھا کہ ''ان مضامین میں جہاں جہاں اُردو کے اقتباسات کا ترجمہ دیا جاتا ہے وہ 'خواجہ' گیسو دراز' کے ایک مرید کا کام ہے۔'' یہ محض قیاس آرائی تھی اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ واقعہ صرف اتنا تھا کہ ان مضامین کا لکھنے والا حکومت بمبئی کے اس سرکاری دفتر کا ایک افسر تھا جہاں میں

* یہ کالم ۱۹۲۰ء سے ۱۹۲۵ء تک یعنی تقریباً پانچ سال تک نکلتے رہے۔

کام کرتا تھا اور بس ۔ بہرحال میں نے انہیں لکھا کہ ان مضامین کا مجھ سے ذرا سا بھی واسطہ نہیں اور یہ بھی لکھا کہ ''آپ خواجہ حسن نظامی کو بیچ میں خواہ مخواہ لے آئے، حالانکہ اس کے بغیر بھی کام بن سکتا تھا ۔'' مولانا نے اس کے بعد پھر کچھ نہیں لکھا ۔

مولانا کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ وہ ہر وقت نظم لکھنے پر قادر تھے اور اس کے لئے وہ کسی خاص کیفیت کے طاری ہونے کے محتاج نہ تھے ۔ بسا اوقات ایسا ہوا کہ جب کبھی کوئی خاص نظم لکھنا ہوتی تو وہ فوراً حقہ بھرواتے اور کش لیتے ہی نظم لکھنا یا لکھوانا شروع کردیتے ۔ وہ حقہ کے بیحد رسیا تھے اور اس سے انہیں دماغی سکون ملتا تھا ۔

ظفر علی بدیہ گوئی اور برجستگیٔ کلام کے لئے مشہور ہیں ۔ ایک صحبت میں مولانا ابوالکلام آزاد کی برابر والی کرسی پر ظفر علی خاں براجمان تھے ۔ مولانا آزاد نے پینے کے لئے پانی مانگا ۔ اس پر ایک معمر سفید ریش بزرگ اٹھے اور پانی کا گلاس نہایت عقیدت سے ان کی خدمت میں پیش کیا ۔ مولانا نے گلاس ہاتھ میں لیتے ہی برجستہ فرمایا : ۔

لے کے خود پیرمغاں ساغر و مینا آیا

اس پر ظفر علی خاں نے فوراً گرہ لگائی :۔

مے کشو! شرم! تمہیں پھر بھی نہ پینا آیا

اس ادبی ظرافت اور برجستگیٔ کلام سے سارا مجمع بیحد محظوظ ہوا ۔

مولانا جب امان اللہ خاں سے مل کر لاہور جا رہے تھے تو میں بھی انہیں پہنچانے کے لئے اسٹیشن پر گیا ۔ وہاں میں نے مولانا سے عرض کیا کہ ''آپ کو اپنی آپ بیتی لکھنے کے لئے کچھ وقت نکالنا چاہئے ۔ یہ محض آپ کی سوانح عمری نہ ہوگی بلکہ ایک لحاظ سے وہ ملک و ملت کی گزشتہ صدی کی تاریخ ہوگی ۔'' مولانا نے سن کر فرمایا : ''خیال تو اچھا ہے ۔'' اس پر

میں نے کہا : ''تو پھر دیر نہ کیجئے ۔ لاہور پہنچتے ہی شروع کردیجئے ۔'' افسوس اس کا ہے کہ وہ خود اپنی آپ بیتی نہ لکھ سکے ، اگر لکھتے تو بڑے معرکہ کی چیز ہوتی ۔ لیکن یہ دیکھکر اطمینان ہوتا ہے کہ اس کام کو ان کے چھوٹے بھائی چودھری غلام حیدر خاں انجام دے رہے ہیں ۔

ظفر علی خاں بہت بے باک اور نڈر لیڈر تھے ۔ حالی انہیں ''شیر دل'' کہا کرتے تھے ۔ پنجاب کے لفٹنٹ گورنر سرمائیکل او ڈوآیر نے اپنی کتاب ''پنجاب میں ۵۰ سال'' میں انہیں ''مفسد'' (firebrand) کے لقب سے یاد کیا ہے ۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ مجسم آگ تھے ۔ وہ سید جمال الدین افغانی کی تعلیمات سے خاص طور پر متاثر تھے اور انہی کی بتائی ہوئی راہ میں وہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی نجات سمجھتے تھے ۔

مولانا کا انتقال ۲۷ نومبر ۱۹۵۶ کو دن کے بارہ بج کر تین منٹ پر ہوا ۔

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

***

عبدالمجید سالک

کوئی دس بارہ سال پہلے کی بات ہے کہ سالک صاحب سے کراچی میں ایک جلسۂ عام میں ملاقات ہوگئی ۔ یہ میرے والد منشی محمد الدین کے ملنے والوں میں تھے ، اور اس لئے ہماری ملاقات بہت جلد دوستی میں تبدیل ہوگئی ۔ سالک نے اپنی صحافتی زندگی ''زمیندار'' سے شروع کی تھی۔ وہ اپنے استاد مولانا ظفر علی خاں کا ذکر ہمیشہ احترام سے کرتے تھے ۔ اس کے بعد انہوں نے غلام رسول مہر کے اشتراک سے ''انقلاب'' جاری کیا جو برسوں چاند بن کر فضائے صحافت پر چمکتا رہا ۔ اس کے بند ہوجانے کے بعد سے وہ مختلف حیثیتوں سے حکومت سے وابستہ رہے ۔ جب یہ رشتہ ٹوٹا تو انہوں نے بزم اقبال اور مجلس ترقی ادب کے لئے کتابیں لکھنی شروع کیں جنہیں ان کی زندگی کا نچوڑ کہنا چاہئیے ۔ آخری زمانہ میں یہی کتابیں ان کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ تھیں ۔ ان کتابوں میں ''سر گزشت''، ''یاران کہن'' اور ''مسلم ثقافت ہندوستان میں'' خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ ۱۹۵۹ میں فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خاں نے جن چند ادیبوں کے لئے وظیفے مقرر کئے ان میں سالک بھی تھے ، اگرچہ وظیفہ کی رقم انہیں اپنی زندگی میں نہ مل سکی ۔

سالک کی شہرت ''افکار و حوادث'' کی بدولت ہوئی ۔ ان کالموں میں وہ مزاح کے رنگ میں سب کچھ کہہ جاتے تھے جو سنجیدہ مضامین میں کبھی نہ لکھ سکتے تھے ۔ ان کالموں میں انہوں نے متعدد دفعہ علی برادران کا بھی مذاق اڑایا ، لیکن اس کے باوجود وہ دونوں بھائیوں کے بے حد قدردان تھے ۔ ایک دن انہوں نے باتوں باتوں میں اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ

مولانا محمد علی کے بارے میں ان کی زبان سے ایسے شوخ مضامین نکلے۔ کہتے تھے کہ ''اس سلسلہ میں ایک دو دفعہ میں مولانا کی ڈانٹ بھی کھا چکا ہوں، مگر میں نے اُف تک نہ کی اور ان کا غصہ خود بخود ٹھنڈا ہو گیا۔''

قدرت نے سالک میں بے حد صلاحیتیں رکھی تھیں۔ پاکستان بننے کے بعد وہ صوبہ کی ہر حکومت کے منظور نظر رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر چھوٹے اہلکار سے لے کر بڑے تک سے ان کے ذاتی تعلقات تھے۔ مشکل سے کوئی بڑا افسر ایسا ہوگا جو انہیں نہ جانتا ہو۔ ان تعلقات سے انہوں نے اپنے دوستوں کو بہت فائدے پہنچائے۔ درحقیقت وہ اپنے دوستوں کی امداد کرنے سے کبھی پہلوتہی نہ کرتے تھے۔

ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اتنا وسیع کہ وہ ہر موضوع پر گفتگو کرسکتے تھے۔ وہ علم مجلسی سے خوب واقف تھے۔ یہی سبب ہے کہ وہ جس محفل میں جا بیٹھتے اپنی لطیفہ گوئی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی سے اسے باغ و بہار بنا دیتے۔ بوڑھوں میں، جوانوں میں، بچوں میں وہ یکساں مقبول تھے۔ ''بوڑھوں میں سنجیدہ و حکیم، جوانوں میں مست و ظریف'' اور بچوں میں بچہ۔ ان میں بیٹھ کر وہ ایسی ایسی کہانیاں سناتے کہ وہ ان کے پاس سے ہٹنے کا نام نہ لیتے۔ وہ بہت خوش مزاج آدمی تھے اور مسکراہٹ تو ان کے چہرے پر ہر وقت رقصاں رہتی تھی۔ یہ مسکراہٹ فطری تھی۔

ایک دن میں نے کہا کہ ''جب سے مجھے آپ کے متعلق ڈاکٹر اقبال کی رائے کا علم ہوا ہے، میں اپنے آپ کو آپ سے زیادہ قریب پاتا ہوں۔'' اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کسی ملنے والے نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا تھا کہ ''سالک اور مہر میں زیادہ . . . . کون ہے؟'' ڈاکٹر صاحب نے قدرے سکوت کے بعد فرمایا کہ ''سالک اب بھی دھوکا کھا جاتا ہے۔''

سالک نے کہا کہ ''یہ واقعہ صحیح ہے۔'' اس پر میں نے کہا کہ ''میں بھی متعدد دفعہ دھوکے کھا چکا ہوں اور اب مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوتا ہے کہ میرے رفیقوں میں آپ جیسے بزرگ بھی شامل ہیں۔'' اس پر وہ ہنس دئے۔ یہ واقعہ سننے کے بعد سالک نے کہا کہ ''ڈاکٹر صاحب کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے جو کسی پر گراں گزرے۔''

وہ بے تکان لکھتے تھے۔ ان کی تحریروں میں کانٹ چھانٹ بہت کم ہوتی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ خیالات ہاتھ باندھے خود بخود چلے آرہے ہیں۔ انہوں نے میری کتاب ''تذکرۂ مولوی ذکاءُ اللہ دہلوی'' پر نہایت اچھا اور حوصلہ افزا ریویو لکھا تھا جس کے لئے میں ان کا بےحد مشکور ہوں۔ ان کا خط بھی منشیانہ تھا۔ ان کے چند خطوط میرے پاس محفوظ ہیں۔ یہ بہت بڑی ادبی خدمت ہوگی اگر ان کے تمام خطوط کو یکجا کرکے کتابی صورت میں شائع کر دیا جائے اس لئے کہ وہ گوناگوں کیفیات، واقعات اور جذبات کے حامل ہیں اور ادبی نقطۂ نظر سے بھی پڑھنے کی چیز ہیں۔

ان کی سیرت بے داغ تھی اور باوجود مواقع کے وہ اپنی جوانی میں ہر بری صحبت سے بچے رہے۔

سالک اچھے شاعر تھے اور بین‌المملکتی مشاعروں میں بڑے چاؤ سے بلائے جاتے تھے۔ ان کی ایک غزل جس میں تغزل کا رنگ پورے طور پر موجود ہے، درج کی جاتی ہے مگر یہ معلوم نہ تھا کہ ان کی پیشین گوئی اس قدر جلد حقیقت کا جامہ اختیار کرلیگی۔ وھو ھذا:—

غزل

چراغ زندگی ہوگا فروزاں، ہم نہیں ہونگے
چمن میں آئیگی فصل بہاراں، ہم نہیں ہونگے

جوانو! اب تمہارے ہاتھ میں تقدیر عالم ہے
تم ہی ہوگے فروغ بزم امکاں ، ہم نہیں ہونگے
جیئیں گے جو وہ دیکھینگے بہاریں زلف جاناں کی
سنوارے جائینگے گیسوئے دوراں، ہم نہیں ہونگے
ہمارے ڈوبنے کے بعد ابھرینگے نئے تارے
جبین دھر پر چھٹکیگی افشاں ، ہم نہیں ہونگے
نہ تھا اپنی ہی قسمت میں طلوع مہر کا جلوہ
سحر ہوجائیگی شام غریباں ، ہم نہیں ہونگے
اگر ماضی منور تھا کبھی تو ہم نہ تھے حاضر
جو مستقبل کبھی ہوگا درخشاں ، ہم نہیں ہونگے
ہمارے دور میں ڈالیں خرد نے الجھنیں لاکھوں
جنوں کی مشکلیں ہونگی جب آساں ، ہم نہیں ہونگے
کہیں ہم کو دکھادو اک کرن ہی ٹمٹماتی سی
کہ جس دن جگمگائیگا شبستاں ، ہم نہیں ہونگے
ہمارے بعد ہی خون شہیداں رنگ لائیگا
یہی سرخی بنیگی زیب عنواں ، ہم نہیں ہونگے

سالک کی موت سے ایک صحیح الدماغ صحافی ، ایک بذلہ سنج ادیب ، ایک قابل مترجم ، ایک اچھا شاعر اور ایک تخلیقی مصنف ہم سے جدا ہو گیا ۔ انہوں نے اردو کے دامن کو طرح طرح کے خوشبودار پھولوں سے بھردیا ہے جو پڑھنے والوں کے دل و دماغ کو معطر کرتے رهینگے ۔

***

محمد رفیع کاشمیری

بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ انہیں بھلایا نہیں جاسکتا ان کی شخصیت ، ان کی بات چیت ، ان کی وضع قطع ، دل میں کھب جاتی ہے ، ان کا بار بار ذکر کیا جاتا ہے ، ان سے ملنے کی تڑپ پیدا ہوتی ہے اور وہ دل و دماغ پر (خواہ وقتی طور پرہی سہی) چھا جاتے ہیں۔ انہی لوگوں میں رفیع کاشمیری بھی تھے۔

۷ جولائی ۱۹۳۹ کو جمعہ کے دن محض ۳۹ برس کی عمر میں وہ کنگ ایڈورڈ میموریل ہاسپٹل (بمبئی) میں انتقال کر گئے۔ ہسپتال میں وہ تین چار مہینے رہے مگر ڈاکٹر آخر وقت تک ان کے مرض کی تشخیص نہ کرسکے۔ داخلہ کے وقت وہ ہٹے کٹے اور زبردست ڈیل ڈول کے مالک تھے ، لیکن طویل بیماری کی وجہ سے وہ گھل گھل کر ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گئے تھے۔

بیماری کا طول طویل زمانہ انہوں نے جس صبر و شکر کے ساتھ گزارا وہ آپ اپنی نظیر ہے۔ مرنے سے دو ہفتہ قبل انہیں احساس ہو گیا تھا کہ ان کا سفر زندگی اپنی آخری منزل میں ہے۔ مجھ سے جب انہوں نے پہلی مرتبہ کہا کہ ”مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا یہ دنیوی سفر ختم ہونے کے قریب آ گیا ہے“ تو میں نے انہیں تسلی و تشفی دیتے ہوئے کہا کہ ”کمزوری میں اس قسم کے خیالات دماغ میں پیدا ہوجاتے ہیں ، لیکن گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے ، آپ بہت جلد اچھے ہوجائینگے۔“ کہنے لگے کہ ”میں ایسی باتیں محسوس کررہا ہوں جو اس سے قبل کبھی محسوس نہ کی تھیں۔“ آخر وقت تک وہ یہی کہتے رہے کہ ”میری زندگی قریب الختم ہے“ اور اس لئے وہ ہروقت موت کا خیر مقدم کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار پاتے تھے۔

زمانۂ علالت میں وہ بصارت سے بھی محروم ہو گئے تھے۔

رفیع کشمیر کے رہنے والے تھے۔ ان کا خاندان کافی بڑا تھا اور چند رشتہ داروں کو چھوڑ کر باقی سب پنجاب میں آباد ہو گئے تھے۔ چنانچہ ان کی تعلیم وغیرہ سب کچھ پنجاب ہی میں ہوئی۔ وہ بی۔ اے کا امتحان پاس کرلیتے لیکن طالب‌علمی کی شادی نے انہیں کہیں کا نہیں رکھا۔ وہ اتنی جلد شادی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا نہ چاہتے تھے مگر ان کے والد مصر تھے کہ شادی ہوگی اور ضرور ہوگی۔ خاندانی بندھنیں کچھ ایسی آن پڑی تھیں کہ انہیں چار و ناچار اپنے والد کے سامنے اقرار کرتے ہی بنی۔ بظاہر شادی ہو گئی مگر وہ شادی والی رات کو فرار ہو کر بمبئی پہنچے۔ پہلی جنگ عظمیٰ کا زمانہ تھا اور وہ بھرتی ہو کر یورپ چلے گئے۔ جب لڑائی ختم ہو گئی تو انہوں نے اکاؤنٹنٹ جنرل (لاہور) کے دفتر میں ملازمت کرلی۔ ابھی بارہ تیرہ سال ملازمت کی ہوگی کہ ایک واقعہ کی وجہ سے جس کے ذمہ دار وہ نہ تھے ان کی ملازمت ختم کردی گئی۔ یہ واقعہ کہ انہوں نے کس طرح سے اپنے مسلمان افسر کی خاطر اپنی ملازمت کو قربان کردیا، بجائے خود ایک درد انگیز کہانی ہے اور میں مختصراً اسے بیان کرنا چاہتا ہوں تاکہ ان کی سیرت کا یہ خوبصورت پہلو اجاگر ہوجائے۔

ایک مسلم ڈپٹی اکاؤنٹنٹ جنرل چاہتے تھے کہ پنشن پر جانے سے قبل وہ اپنے ایک نہایت قریبی عزیز کو کسی اچھے عہدہ پر فائز کرادیں۔ اسی زمانہ میں اکاؤنٹنسی کا امتحان ہوا جس میں متعدد ہندو اور چند مسلمان امیدوار شریک ہوئے۔ ان افسر صاحب کی مہربانی سے ان کے عزیز نے بعض امیدواروں کے جوابات کو جوں کا توں نقل کرلیا۔ ممتحین نے جب پرچے ملائے تو جوابات کی یکسانیت نے انہیں یقین دلا دیا کہ نقل ہوئی ہے۔ چنانچہ حکومت ہند نے ایک تحقیقاتی کمیٹی بٹھائی

جو چند بڑے افسروں پر مشتمل تھی۔ یہ کمیٹی لاہور آئی اور اس نے امیدواروں سے واقعات کی چھان بین میں مدد چاہی۔ بد قسمتی سے تحقیقات کا مسئلہ ہندو مسلم سوال بن گیا۔ ہندوؤں نے سچائی کے ساتھ سارا الزام مسلم افسر کے سر تھوپ دیا اور صاف صاف کہدیا کہ وہ مختلف امیدواروں کے پرچے اٹھا اٹھا کر نقل کرنے کے لئے اپنے عزیز کے حوالہ کرتے جاتے تھے۔ جب مسلم افسر نے دیکھا کہ معاملات بگڑتے جارہے ہیں ہیں تو وہ مسلمان امیدواروں کے پاس جا کر گڑ گڑائے تاکہ وہ اس مصیبت میں ان کا ساتھ دیں اور انہوں نے اس خیال سے کہ کہیں یہ مسلم افسر برخاست نہ ہو جائے، اپنے آپ کو قربان کر دیا۔ چنانچہ حکومت کو آخر وقت تک اصل واقعات کا پورا پورا علم نہ ہوسکا، اور اس لئے اس نے مشتبہ حالات میں سب مسلم امیدواروں کو جو مختلف دفاتر میں ملازم تھے، ان کی مدت ملازمت کے تناسب سے پنشن دیکر قبل از وقت ریٹایر کردیا اور مسلم افسر کو بھی برائے نام پنشن دیکر عہدے سے الگ کر دیا۔ سارے معاملہ کی کنجی رفیع کاشمیری تھے اور اس موقع پر انہوں نے اپنا مستقبل تباہ کرلیا مگر ایک مسلم افسر کی عزت اور شہرت کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ عصبیت، شرافت اور پاس عہد کا جو نادر نمونہ انہوں نے اس بیسویں صدی میں پیش کیا، اس کی جتنی بھی تعریف کی جائے، کم ہے۔ اور کوئی ہوتا تو اس ایثار کی قیمت طلب کرتا اور اپنے مستقبل کو سنوار لیتا مگر رفیع بنیے نہ تھے جو سودا کرتے۔

ملازمت سے علیحدگی کے بعد وہ کچھ عرصہ تک پنجاب اورسرحدی صوبہ میں بیمہ کا کام کرتے رہے۔ اس کے بعد انہوں نے بمبئی کا رخ کیا۔ وہاں کی کالی مٹی کچھ اس طرح سے ان کے پیروں میں چمٹی کہ بالآخر وہ وہیں پیوند زمین ہو گئے۔ بمبئی میں انہوں نے چند فلم کمپنیوں میں ڈائرکٹر کی حیثیت سے

اور بعض میں ضمنی ایکٹر کی حیثیت سے بھی کام کیا ، بعض فلموں کے مکالمے بھی انہوں نے تحریر کئیے ۔ وہ اچھی اردو لکھتے اور بولتے تھے ۔ ان کی انگریزی بھی اچھی تھی ۔

لاھور میں جب تک رھے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں حاضر ھوتے رھے ۔ ''بال جبریل'' اور ''جاوید نامہ'' کی بعض نظموں کی کتابت کرنے کی سعادت انہیں حاصل رہ چکی ھے ۔ ڈاکٹر صاحب پر جب عالم کیف طاری ھوتا اس وقت وہ کسی نہ کسی شخص سے اشعار لکھواتے ، اس کے بعد وہ اپنے اشعار سنتے اور ان میں کانٹ چھانٹ کراتے ۔ رفیع کبھی کبھار مجھے ڈاکٹر صاحب کے وہ اشعار سنایا کرتے تھے جو ان کی کلیات میں آج ترمیم شدہ شکل میں نظر آتے ھیں ۔ رفیع کہتے تھے کہ ایک موقع پر ڈاکٹر صاحب نے چند اشعار لکھوائے اور چونکہ ان میں خدائے تعالیٰ کی ذات پر مخصوص انداز میں تنقید کی گئی تھی ، اس لئے ڈاکٹر صاحب نے انہیں مقامی مولویوں کے ''ڈر'' سے قلمزن کرادیا ۔ اس سے معلوم ھوتا ھے کہ ڈاکٹر صاحب بھی کبھی کبھار دب جایا کرتے تھے جس کا مزید ثبوت ان اشعار کو حذف کر دینے سے ملتا ھے جو ''اسرار خودی'' کے پہلے ایڈیشن میں حافظ شیرازی پر لکھے گئے تھے ۔ رفیع ڈاکٹر صاحب کے پرستاروں میں تھے اور وہ مجھے کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کے مخصوص انداز میں ان کے اشعار سنایا کرتے تھے ۔

''بانگ درا'' کے آخر میں ایک شعر ھے جس کا تعلق لاھور میں کسی مسجد کی تعمیر سے ھے اور جسے مقامی مسلمانوں نے شب بھر میں بنا لیا تھا ۔ وہ شعر یہ ھے :—

مسجد تو بنالی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے

من اپنا پرانا پاپی ھے برسوں میں نمازی بن نہ سکا

چونکہ اس مسجد کی تعمیر میں میونسپل اراضی کا کچھ حصہ

آ گیا تھا ، اس لئے میونسپلٹی نے پولیس یا فوج کی مدد سے اسے گروادیا ۔ یہ خبر جب رفیع صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو پہنچائی تو انہوں نے فوراً اپنے پرانے شعر میں ذرا سی تبدیلی کر کے اسے یوں پڑھا :—

مسجد تو گرادی دن بھر میں دفتر کی حکومت والوں نے
من ان کا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اس قسم کے متعدد اشعار انہیں یاد تھے اور میں انہیں معرض تحریر میں لے آنا چاھتا تھا مگر چونکہ رفیع ایک فلم کی تیاری میں منہمک تھے اس لئے انہیں اتنا موقع ھی نہ ملا کہ وہ مجھے بیک وقت چند گھنٹے دیتے ۔

ان سے میری پہلی ملاقات انتقال سے چند سال پیشتر ہوئی تھی ، اور اگرچہ ہم میں بہت زیادہ ملنا جلنا نہیں تھا پھر بھی جب ملتے تھے ان کے اخلاص کا عالم وھی ھوتا تھا ۔ وفات سے چند مہینے قبل میں ان کے مکان واقع پریل کے قریب سکونت پذیر تھا اور اس لئے اس زمانہ میں ان سے روزانہ ملاقات رھتی تھی ۔ ان کا معمول تھا کہ وہ شام کو آتے ، شطرنج کی ایک دو بازیاں کھیلتے اور چلے جاتے ۔ وہ والی بال کے بھی بیحد شائق تھے اور انہی کی وجہ سے مجھے بھی اس کھیل سے دلچسپی ھوئی ۔

۱۹۳۸ میں چند محسن کش دوستوں کی مہربانی سے میں ایک دفتری ابتلا میں گرفتار ھو گیا جس کا غیر معمولی اثر میری صحت پر بھی پڑا اور میں دمہ کے مرض میں بری طرح مبتلا ھو گیا ۔ میرا یہ چند ھفتے کا زمانہ سخت تکلیف میں گزرا ۔ اس بیماری میں رفیع بہت کام آئے ، رات گئے تک وہ اپنی بذلہ سنجیوں سے مجھے بہلائے رکھتے اور جب دیکھتے کہ دوروں کا اثر کم ھو گیا ھے اور غنودگی طاری ھوتی جارھی ھے تو وہ چلے جاتے ۔ ان کی یہ بے غرض ھمدردی زندگی بھر مجھے یاد رھیگی ۔

وہ یار شاطر تھے اور کبھی بار خاطر نہیں ہوئے۔ وہ زمانہ کے نشیب و فراز سے گزر چکے تھے، انہوں نے اچھا وقت بھی دیکھا تھا اور کڑا وقت بھی جھیلا تھا۔ لیکن جس بہادری اور استقلال سے انہوں نے برے وقتوں کا مقابلہ کیا وہ انہی کا حصہ تھا۔

انہوں نے اپنی پنج سالہ فلمی زندگی میں متعدد تصویریں بنائیں۔ وہ فلمی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے خوب واقف تھے۔ وہ ان سیاہ کاریوں سے بھی اچھی طرح سے آگاہ تھے جو پس پردہ ہوا کرتی ہیں۔ میں نے جب جب ان سے پوچھا کہ آیا شریف خواتین کو فلمی زندگی اختیار کرنی چاہئے یا نہیں، انہوں نے ہمیشہ نفی میں جواب دیا۔ وہ ملک کی اکثر فلم ایکٹریسوں کی نجی زندگی سے واقف تھے اور ایک ایک کا نام لیکر بتاتے تھے کہ اس کی زندگی کیسی رہی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ "مجھے موقع نہیں ملتا ورنہ میں اخبارات میں مضامین لکھ لکھکر شریف اور عصمت مآب عورتوں کو اس لائن میں آنے سے قطعاً روک دوں۔" وہ نہایت صفائی اور دیانت سے اس مسئلہ پر گفتگو کرتے تھے اور انہوں نے کبھی سخن پروری سے کام نہیں لیا۔

رفیع کی وفات سے مجھے ایسا محسوس ہوا کہ میرا ایک مخلص ترین دوست جاتا رہا۔ آج بھی جب کہ انہیں اس دنیائے آب و گل سے رخصت ہوئے اتنے سال گزر چکے ہیں، مجھے اپنی زندگی میں ایک خلا سا محسوس ہوتا ہے اور میں ان کے خیالات میں کھو جاتا ہوں۔

***

رستمِ زماں گاما پہلوان

کوئی پچیس تیس سال پہلے کی بات ھے کہ پاک و ھند کے مشہور پہلوان گاما بمبئی آئے ۔ وھاں حافظ علی بہادر خان نے ان کے اعزاز میں ایک پبلک جلسہ منعقد کیا جس میں راقم الحروف بھی مدعو تھا ۔ خوش قسمتی سے میری نشست گاما کے بالکل قریب تھی اور اس لئے میں ان سے بہت سی باتیں کرسکا ۔ حافظ صاحب نے شاندار الفاظ میں ان کا تعارف کرتے ہوئے بتایا کہ "یہ آھنی انسان وہ ھے جس نے پہلوانی میں یورپ تک سے خراج تحسین حاصل کیا ھے ۔ یہ اپنی زندگی میں کبھی کسی سے نہیں ھارا ۔ اس کی زندگی بہت سیدھی سادی اور پاکیزہ رھی ھے ۔ یہ خاموش انسان کبھی اپنے متعلق کچھ کہنا پسند نہیں کرتا ، وغیرہ وغیرہ ۔" اس کے بعد انہوں نے معزز مہمان سے درخواست کی کہ وہ نوجوانوں کو کچھ نصیحتیں فرمائیں ۔ چنانچہ گاما کھڑے ہوئے اور فرمایا : "آپ نوجوانوں کا فرض ھے کہ اپنی جسمانی تربیت سے غافل نہ رھیں ۔ زیادہ کھانے سے طاقت نہیں آتی ۔ جو کچھ آپ ھضم کرلیتے ھیں وھی آپ کے لئے طاقت کا سرچشمہ ھے ۔ سگرٹ ، شراب اور نشہ آور چیزوں سے پرھیز کیجئے ۔ یہ صحت کو تباہ و برباد کر دیتی ھیں ۔" جب وہ بیٹھ گئے تو ایک شخص نے پوچھا کہ "آپ کی طاقت کا راز کیا ھے ؟" انہوں نے جواب دیا : "پاکیزہ زندگی ۔ آپ کو بھی چاھئے کہ پاکیزہ زندگی بسر کریں ۔" اس کے بعد طلبا ان پر پل پڑے ۔ بعض نوعمر طلبا نے تو ان کی پیٹھ کو ھاتھ لگا لگا کر دیکھا کہ آیا وہ واقعی لوھے کے بنے ہوئے ھیں ۔ بہت سے نوجوانوں نے ان سے آٹو گراف لئے ۔ وہ بمشکل "گاما" لکھ پاتے تھے ۔

فروری ١٩٦٠ میں میرا لاهور جانا هوا ۔ اس زمانه میں وه بیمار تهے ۔ ملک بهر کے اخبارات نے اپنے کالموں میں یه آواز بلند کی تهی که حکومت کو چاهئے که وه ان کے گزاره کے لئے وظیفه مقرر کرے ۔ بالآخر هماری حکومت ملک کے متفقه مطالبه کے سامنے جهک گئی ۔ میں ان کے یہاں جس وقت پہنچا وه شیو کرا رهے تهے ۔ میں انهیں دیکهکر دم بخود ره گیا ۔ کہاں وه ڈیل ڈول جس کا مشاهده میں نے بمبئی میں کیا تها اور کہاں یه هڈیوں کا ڈهانچه جو اب میری نظروں کے سامنے تها ۔ میں نے انهیں پرانی ملاقات یاد دلائی ۔ وه بہت خوش هوئے ۔ اپنی جوانی کے زمانه میں عموماً وه بہت کم گو تهے اور اس موقع پر بهی وه زیاده تر میری هی باتیں سنتے رهے ۔ میں نے انهیں ''کتابی دنیا'' کا وه پرچه دیا جس میں خواجه محمد شفیع دهلوی کی کتاب ''گاما پہلوان'' پر تبصره کیا گیا تها اور انگلستان کی کشتی کی بعض ایسی باتیں درج کی گئی تهیں جن کا علم بہت کم لوگوں کو هے ۔ انهوں نے پرچه کا شکریه ادا کیا اور اسے رکھ لیا ۔

ان کے مضبوط قویٰ ، ان کا غیر معمولی چوڑا چکلا سینه ، ان کا بهاری بهرکم جسم ، ان کی مرعوب کرنے والی شخصیت آج بهی میری آنکهوں کے سامنے هے ۔ میں نے فردوسی کے پیدا کرده رستم* کو تو نہیں دیکها لیکن اپنے دور کے رستم کو نه صرف دیکها بلکه اس سے هم کلامی کا شرف بهی حاصل کیا ۔ آج بهی ان کے خاندان میں بہت سے پہلوان هیں ، لیکن گاما کی جگه خالی هے اور شاید خالی رهے ۔

***

* منم کرده ام رستم داستاں   وگر نه یلے بود در سیستاں

حکیم عبدالوہاب انصاری

ڈاکٹر انصاری کے بڑے بھائی حکیم عبدالوھاب المعروف به حکیم نابینا ریاست حیدرآباد میں میر محبوب علی خاں (نظام دکن) کے عہد حکومت میں شاھی طبیب تھے۔ عثمان علی خان کے زمانہ میں بھی وہ کئی برس تک اسی عہدہ پر فائز رہے، لیکن جب ان سے اختلافات پیدا ہو گئے تو وہ حیدرآباد چھوڑ کر "ھندوستان" آ گئے۔ سب سے پہلے انہوں نے پونا میں، پھر بمبئی میں اور آخر میں دھلی میں مطب جاری کیا۔ یہ میرے دیکھنے کی بات ھے کہ لوگ دور دور سے علاج کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے۔ خدا نے ان کے ھاتھ میں شفا دی تھی۔ وہ مریضوں سے کچھ پوچھے بغیر محض نبض* سے ان کے امراض کی تشخیص کرلیتے تھے، اور وہ تشخیص ایسی صحیح ہوتی تھی کہ مریض حیران رہ جاتے تھے۔

مجھے ان سے ۲۱-۱۹۲۰ میں پہلی بار پونا میں نیاز حاصل ہوا۔ مجھ پر وہ بیحد کرم کرتے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی

---

* خواجہ حسن نظامی نے ۱۳ ستمبر ۱۹۲۴ کے روزنامچہ میں لکھا تھا:۔ "حکیم نابینا صاحب مہاراج سر کشن پرشاد کے بچوں کی نبض دیکھنے کوٹھی پر تشریف لے گئے۔ میں حیران ہو گیا کہ رانیوں اور بیگمات اور بچوں کی نبض دیکھنے کے بعد حکیم صاحب نے کسی کا حال نہیں پوچھا، خود ھی ہر بیمار کی مفصل کیفیت نبض پر ھاتھ رکھ کر بتادی اور ہر بیمار نے تصدیق کی کہ بیشک یہی حال ہے۔ اس وقت مہاراجہ نے ایک قصہ بیان کیا کہ ایک دفعہ حیدرآباد میں ان حکیم صاحب کو میں نے اپنے گھر پر بلایا۔ رانی صاحبہ کی نبض دکھانی تھی مگر بجائے رانی صاحبہ کے میں نے اپنی نبض دکھا دی۔ حکیم صاحب نے نبض دیکھتے ھی مسکرا کر فرمایا: یہ 'نبض تو مہاراج کی ہے۔' میں نے اپنی زندگی میں ایسا کمال کسی طبیب میں نہیں دیکھا۔"

کہ ان کے صاحبزادوں کے ساتھ میرے دوستانہ روابط تھے۔ وہ مجھے بھی اپنے بچوں جیسا سمجھتے تھے۔

اطبا بالعموم پینے کے لئے قدحے دیا کرتے ہیں، لیکن حکیم نابینا نے طبی طریقۂ علاج میں حیرت انگیز انقلاب پیدا کردیا تھا۔ ان کی دوائیاں مقدار میں بیحد قلیل ہوتی تھیں مگر قدحوں سے زیادہ موثر۔ مجھے متعدد دفعہ ان سے علاج کرانے کے مواقع ملے اور ہر دفعہ میں ان کی غیر معمولی حذاقت کا اثر لیکر آیا۔ انہوں نے مجھ سے کبھی دوا کی قیمت نہیں لی اور ہمیشہ قیمتی سے قیمتی دوائیں اپنے پاس سے عنایت فرمائیں۔ ان کی تیار کردہ ادویہ کی دوسری خصوصیت یہ تھی کہ وہ صحیح اجزا پر مشتمل ہوتی تھیں۔ یہ کبھی نہیں ہوا کہ موتیوں کی بجائے ان میں سیپ ڈال دیئے گئے ہوں یا ان کے اوزان میں کمی کردی گئی ہو۔ خواجہ حسن نظامی نے انہیں "لقمان الملک" کا خطاب دے رکھا تھا۔

ان کا حافظہ بیحد قوی تھا۔ ایک دفعہ نبض دیکھنے کے برسوں بعد بھی وہ یہ دیکھ کر اپنے مریضوں کو پہچان لیتے تھے کہ "اتنے سال پیشتر میں آپ کی نبض دیکھ چکا ہوں۔" عام لوگوں کا خیال تھا کہ حکیم صاحب نے کسی جن کو مسخر کر رکھا ہے جو مریضوں کے بارے میں انہیں ساری باتیں بتادیتا ہے اور امراض کی تشخیص میں ان کی مدد کرتا ہے۔ مگر یہ سب کہنے کی باتیں ہیں اور حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں رکھتیں۔ وہ اپنے ملنے والوں سے دوائیوں کے دام نہیں لیتے تھے۔ یہ ان کی مخصوص وضعداری تھی۔ ان کا مطب مایوس اور بظاہر لاعلاج مریضوں کی آخری جائے پناہ تھا۔

حکیم صاحب نے پونا، بمبئی اور دہلی میں ایسے ایسے معرکے کے علاج کئے ہیں کہ اگر وہ سب معرض تحریر میں آجائیں تو اچھی خاصی کتاب بن جائے۔ ان کی بدولت ہر جگہ

یونانی طب کا نام بہت روشن ہوا ۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وفات سے ہندوستان میں طب یونانی کا آفتاب غروب ہو گیا ۔

اپنی آخری بیماری میں ڈاکٹر اقبال حکیم صاحب کے زیر علاج تھے جس سے انہیں غیر معمولی فائدہ ہوا ۔ انہوں نے اس سے متاثر ہو کر حکیم صاحب کی دوا ''روح الذہب'' کے بارے میں ۱۹۳۷ میں ذیل کا قطعہ لکھا :—

ہے دو روحوں کا نشیمن پیکر خاکی مرا
رکھتا ہے بیتاب دونوں کو مرا ذوق طلب
ایک جو اللہ نے بخشی مجھے صبح ازل
دوسری ہے آپ کی بخشی ہوئی روح الذہب

وہ بہت مذہبی آدمی تھے ۔ ان کا خالی وقت اوراد و وظائف میں صرف ہوتا تھا ۔ انہوں نے کناٹ پلیس (نئی دھلی) میں جو جایداد بنوائی تھی اس کی آمدنی کا ایک حصہ مدینہ کے مساکین کے لئے وقف کردیا تھا ۔ ۱۹۴۷ کی ھندو اور سکھا گردی میں اس مکان کو بھی لوٹ لیا گیا حالانکہ وھاں ڈاکٹر انصاری کے بھتیجے حکیم عبدالحئی رھتے اور مطب کرتے تھے ۔

مرحوم بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے ۔ ان میں خدمت الناس کی غیر معمولی لگن تھی ۔ زبان پر ھمیشہ اللہ اور رسول کا ذکر رھتا تھا ۔

ان کا انتقال دھلی میں ھوا اور ھزارھا اشخاص کی دعاؤں کے ساتھ انہیں سپرد خاک کیا گیا ۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے !

***

علامہ شبلی نعمانی

۱۹۰۹ کا ذکر ہے کہ علامہ شبلی نے خواجہ حسن نظامی کو لکھا کہ ”میں کام کرتے کرتے تھک گیا ہوں اور چاہتا ہوں کہ کسی ایسی جگہ جا کر رہوں جہاں مجھے کامل سکون ملے اور جہاں میں خاموشی کے ساتھ اپنا کچھ وقت گزار سکوں ۔“ خواجہ صاحب نے جواب میں لکھا کہ ”آپ دھلی آجائیے اور میرے ساتھ رہئیے ۔“ چنانچہ وہ تشریف لائے اور خواجہ صاحب نے انہیں نواب بڈھن کی محل سرائے واقع چتلی قبر میں ٹھہرایا ۔ وہاں وہ تقریباً ایک مہینے تک قیام پذیر رہے ۔ اس عرصہ میں انہیں کامل سکون ملا ۔ خواجہ صاحب لوگوں کو ان سے ملنے بھی نہیں دیتے تھے ۔ علامہ کا دستور تھا کہ وہ ہفتہ کے ہفتہ ایک تقریر کیا کرتے تھے۔ ایک تقریر انہوں نے جامع مسجد میں عشا کے بعد چاندنی رات میں حوض کے پاس کی تھی ۔ اس تمام عرصہ میں ملا واحدی علامہ کی خدمت کے لئے محلسرائے میں مقیم رہے ۔

نواب بڈھن کی محل سرائے کی ایک تقریر یاد رہ گئی ہے ۔ اس موقع پر صحن اور دالان کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے ۔ خواجہ صاحب نے مجھے اور تین چار دوسرے طلبا کو علامہ کی تقریر قلمبند کرنے پر مقرر کردیا تھا ۔ بعد میں سب کی یادداشتوں سے تقریر مرتب کی گئی اور ” نظام المشائخ “ میں شائع کی گئی ۔ تقریر کا موضوع تصوف تھا ۔

علامہ کھڑے ہو کر تقریر فرما رہے تھے کہ اتنے میں مجمع میں سے ایک شخص اٹھا اور اس نے بلند آواز میں علامہ سے درخواست کی کہ وہ بیٹھ کر تقریر فرمائیں ۔ غالباً اس شخص کو

علم تھا کہ علامہ کا ایک پاؤں کٹ چکا ہے اور اس لئے وہ برداشت نہ کرسکا کہ وہ کھڑے کھڑے تقریر فرمائیں۔ چنانچہ علامہ بیٹھ گئے اور تقریر جاری رکھی۔

تقریر سے قبل ہم میں سے بہت سوں کا خیال تھا کہ چونکہ علامہ صوفی منش بزرگ نہیں ہیں اس لئے تصوف جیسے موضوع پر ان کی تقریر بالکل خشک ہوگی، لیکن جب انہوں نے تقریر ختم کی تو سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور میں نے کم سے کم یہ محسوس کیا کہ علامہ تو چھپے رستم ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ جنید یا با یزید بسطامی کے پایہ کا کوئی درویش ہے جو تصوف کے رموز و نکات کے دریا بہائے چلا جارہا ہے۔ تقریر کے بعد جس عقیدتمندی سے حاضرین نے ان کے ہاتھ چومے، وہ سماں آج بھی میری آنکھوں کے سامنے ہے۔

ایک دن صبح کے ناشتہ پر مردانہ اور زنانہ حسن پر گفتگو ہوئی۔ علامہ نے فرمایا: ''نر قدرت کا بہترین شاہ کار ہے اور اس سلسلے میں انہوں نے شیر، مرغ، مور اور بعض دوسرے پرندوں اور جانوروں کی مثالیں دیکر ثابت کیا کہ ان کی مادائیں ان کے سامنے بالکل ہیچ ہیں۔ بعینہ یہی حالت مرد کی ہے جو وجاہت اور حسن کے اعتبار سے عورت سے کہیں بلند ہے۔''

علامہ ابھی دہلی ہی میں تھے کہ خواجہ صاحب کی پہلی بیوی اور ایک لڑکے کا انتقال ہوگیا۔ خواجہ صاحب نے ان کی اموات کا کم اثر لیا اور بدستور اپنے کاموں میں مشغول رہے۔ یہ دیکھ کر علامہ نے فرمایا: ''خواجہ صاحب، میری بیوی کا جب انتقال ہوا تھا تو میں پاگل سا ہوگیا تھا، لیکن آپ ہیں کہ برابر اپنے مشاغل میں مصروف ہیں، گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔ آپ واقعی بڑی مضبوط طبیعت کے انسان ہیں۔''

اس ایک مہینہ کی مدت میں علامہ نے صرف ایک شخص کی دعوت قبول کی اور وہ بھی خواجہ صاحب کے زور دینے سے۔

ان کا نام تھا لالہ چندو لال چانول والے۔ وہ دھلی کے رئیس تھے اور رسالہ ''زبان'' کے مالک۔ چندو لال، آغا شاعر قزلباش کے شاگرد تھے۔ انھوں نے دعوت میں کافی اھتمام کیا تھا۔ کھانے کے دوران میں چندو لال نے کہا: ''ذرا گرم زردہ لانا۔'' واپسی میں علامہ نے چندو لال کی مہمانداری اور وضعداری کی بہت تعریف کی مگر ایک جگہ ان کی زبان کی گرفت بھی کی۔ فرمایا: ''مجھے اس بات کا تعجب ھے کہ دھلی والے ھو کر انھوں نے 'گرم زردہ لانا' کیوں استعمال کیا؟ 'گرم' کا لفظ تو بریانی کے لئے بولا جاتا ھے۔'' چندو لال ویسے شستہ اور بامحاورہ اردو بولتے تھے۔

دسمبر ۱۹۱۱ میں دھلی میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ ھوا۔ یہ وھی اجلاس ھے جس میں ''ترجمان حقیقت'' کا خطاب قوم کی طرف سے ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا ان خدمات کے اعتراف میں جو وہ ملک و ملت کے لئے شاعری کے ذریعہ انجام دے رہے تھے۔ اس تجویز کی تحریک تو علامہ شبلی نے کی تھی اور تائید خواجہ کمال الدین نے۔ علامہ کی تقریر کے ایک دو جملے مجھے یاد رہ گئے ھیں۔ تحریک پیش کرتے وقت انھوں نے فرمایا:۔ ''میں نے جنگ طرابلس پر اردو، فارسی اور عربی کے متعدد مرثیے پڑھے ھیں۔ دوسری زبانوں کے مرثیوں پر بھی میری نظر ھے۔ لیکن ساری دنیا کا لٹریچر ان دو شعروں کا جواب پیش کرنے سے یکسر قاصر ھے۔ وھو ھذا:۔

مگر میں نذر کو ایک آبگینہ لایا ھوں
جو چیز اس میں ھے جنت میں بھی نہیں ملتی
جھلکتی ھے تری امت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ھے لہو اس میں''

۱۹۱۳ کا ذکر ھے کہ علامہ دھلی تشریف لائے۔ کانپور کی مسجد کا واقعۂ ھائلہ تازہ تازہ ختم ھوا تھا۔ مولانا محمد علی نے ان کے اعزاز میں اپنے دفتر میں رات کی دعوت کی جس میں

عملہ کے ارکان کے علاوہ اسلامیہ کالج پشاور کے پروفیسر محمد شفیع اور بعض دوسرے اکابر بھی موجود تھے۔ ان دنوں راقم الحروف ''ہمدرد'' سے وابستہ تھا۔ کھانے کے بعد علامہ نے حاضرین کے اصرار پر مسجد کانپور کے بارے میں اپنی رباعیاں سنائیں جن میں وہ رباعیاں بھی شامل تھیں جنہیں حکومت نے ممنوع الاشاعت قرار دیدیا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے مولانا محمد علی کی مساعی کا تشکر آمیز لہجہ میں، ذکر کیا جو انہوں نے مسجد کی بحالی کے سلسلہ میں انجام دی تھیں۔ پھر فرمایا :- ''آپ جس کسی شخص کے نام میں محمد اور علی کا اجتماع دیکھیں تو سمجھ لیں کہ وہ لازماً بڑا آدمی ہے،'' اور اس ضمن میں انہوں نے اپنے نظریہ کی تائید میں تاریخ اسلام سے چند نام پیش کرکے فرمایا کہ ''یہ بڑے لوگ وہ ہیں جن کے کارنامے تاریخ کے اوراق میں ہمیشہ محفوظ رہینگے۔'' مولانا محمد علی ایک طرف کونے میں سرجھکائے بیٹھے تھے۔ کچھ دیر تک تو وہ اپنی تعریف سنا کئے اور پھر یکایک بولے کہ ''محمد علی والیٔ ایران کا بھی تو ذکر کیجئے۔'' علامہ نے معاً جواب دیا کہ ''یہ تو کلیہ کی استثنا ہے۔'' اس پر خوب قہقہہ ہوا۔

۱۹۱۲ میں جب علامہ شبلی نے سیرت نبوی کے سلسلہ میں اپنا پروگرام شائع کیا تو اس وقت انہوں نے انگریزی داں حضرات کو بھی عملہ میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ راقم الحروف بھی درخواست دینے والوں میں تھا۔ اس سلسلہ میں میری ان سے کچھ خط و کتابت بھی ہوئی تھی۔ علامہ کا ایک خط میرے پاس محفوظ رہ گیا ہے جو حسب ذیل ہے :-

> مجبی۔ تسلیم۔ آپ تحریر فرمائیں کہ کسقدر ماہوار آپ منظور فرمائینگے اور کتنے دنوں تک کام اسٹاف میں رہ سکینگے؟ آج کل میں کئی مہینہ تک بمبئی میں رہونگا۔ کیا آپ بمبئی آنا پسند کرینگے؟

۳۱ مئی ۱۹۱۲ شبلی - از بمبئی - پالن جی کا ہوٹل

مجھے اب یاد نہیں رہا کہ میں نے اس آفر کو قبول کرنے سے کیوں انکار کر دیا تھا - لیکن مجھے آج تک افسوس ہے کہ میں نے کیوں نہ اپنے آپ کو ان کے دامن سے وابستہ کرلیا -

جب تک علامہ دھلی میں رہے ان کا دستور تھا کہ ناشتہ اور کھانے کے وقت موقع کے لحاظ سے سبق آموز لطائف اور تاریخی واقعات سنایا کرتے تھے جن سے سننے والے بیحد محظوظ ہوتے تھے - ان کی گفتگو انتہائی درجہ دلچسپ اور شگفتہ ہوتی تھی - وہ آہستہ آہستہ اور اطمینان کے ساتھ باتیں کرنے کے عادی تھے - عجلت پسندی ان کے مزاج میں مطلق نہ تھی - ان کا طرز تکلم اس قدر شیریں تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں -

یا وہ اک جوہر الگ تھا جوہر انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

***

ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کو میں نے پہلے پہل آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۱۹۱۱ میں دھلی میں دیکھا تھا جہاں انہیں ''ترجمان حقیقت'' کے خطاب سے نوازا گیا تھا۔ اس وقت انہوں نے بلاد اسلامیہ کی نظم کا وہ ٹکڑا بھی ترنم کے ساتھ پڑھ کر سنایا تھا جس کا تعلق مدینہ منورہ سے ھے اور ایک تقریر بھی کی تھی۔ اس کے بعد مجھے دوبارہ موقع نہ ملا کہ میں ترنم کے ساتھ ان کا کلام سن سکوں۔

دھلی یونیورسٹی کے قیام سے پیشتر دھلی کے طلبا اعلیٰ امتحانات کے لئے لاھور جاتے تھے۔ چنانچہ ۱۹۱۲ میں بی اے کے امتحان کے سلسلہ میں میں لاھور گیا۔ امتحان سے فارغ ھونے کے بعد میں ڈاکٹر صاحب کی قیامگاہ واقع انارکلی پہنچا۔ دھلی سے چلتے وقت میں نے خواجہ حسن نظامی سے تعارفی خط لے لیا تھا تاکہ ملاقات میں دشواری نہو۔ پہلی ھی ملاقات میں انہوں نے انتہائی محبت و شفقت کا اظہار فرمایا۔ انہوں نے لسی کے ایک گلاس سے میری تواضع بھی کی۔ میں بہت دیر تک ان کی خدمت میں بیٹھا باتیں کرتا رھا۔ اثنائے گفتگو میں میں نے پوچھا کہ ''کون کونسے شعرا کا کلام زیادہ تر آپ کے زیر مطالعہ رھتا ھے؟'' فرمایا: ''حافظ، مولانائے روم، غالب، گوئٹے، وغیرہ۔'' اس کے بعد فرقہ وارانہ مسائل زیر بحث آ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:— ''فرقہ وارانہ ذھنیت نے پنجاب کی فضا کو اس قدر مسموم کردیا ھے کہ اگر کسی ھندو مُمتحن کو یہ معلوم ھوجائے کہ جس لڑکے کے پرچے وہ جانچ رھا ھے، وہ مسلمان ھے تو وہ یا تو اسے فیل کردیگا یا اگر وہ اونچے نمبر

پر آنے والا ہے تو اسے اتنے کم نمبر دیگا کہ وہ غریب مشکل سے پاس ہوسکے۔ یہی حالت مسلمان ممتحن کی ہے۔ وہ بھی بے دریغ ہندو لڑکے کو یا تو فیل کردیگا یا اس کے نمبروں میں کتر بیونت سے کام لیگا بشرطیکہ اسے معلوم ہو جائے کہ وہ پرچہ ہندوطالب علم کا ہے۔'' اس سلسلہ میں انہوں نے فرمایا :۔ ''میں بھی بی، اے، اور ایم، اے میں فلسفہ کے مضمون میں ممتحن مقرر ہوتا ہوں، مگر میں نے کبھی کسی امیدوار کے ساتھ بے انصافی نہیں برتی۔'' جب مجھے معلوم ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب فلسفہ کے ممتحن ہیں تو میں نے طفلانہ جسارت سے کام لیکر رعایت حاصل کرنے کی غرض سے انہیں اپنا رول نمبر بتا دیا۔ اس پر ڈاکٹر صاحب بہت بگڑے اور غصہ کے لہجہ میں (مگر نہایت اخلاق سے) فرمایا :۔ ''آپ امید وار ہیں۔ آپ کو ممتحن سے ایسی بات نہیں کرنی چاہئے۔ اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی آپ کی گفتگو غیر مناسب ہے۔'' اتنا کہنے کے بعد انہوں نے فرمایا کہ ''اب آپ جاسکتے ہیں۔''

راستہ بھر مجھے سخت ندامت رہی، لیکن چھٹا ہوا تیر کیسے واپس آتا، اور اس لئے میں نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا جس میں اپنے رویہ کے بارے میں غیر مشروط معذرت درج تھی، اور ان سے درخواست کی گئی تھی کہ از خورداں خطا و از بزرگاں عطا، کو ملحوظ رکھتے ہوئے وہ میری بدتمیزی پر چشم پوشی فرمائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے خط کے جواب میں تحریر فرمایا :۔

> ''میں نے اس موقع پر جو کچھ عرض کیا تھا اس میں اخلاقی اعتبار سے بالکل حق بجانب تھا۔ اس کو آپ بخوبی سمجھتے ہیں۔ اگر کوئی اور معاملہ ہوتا یا اب ہو تو میں ہر طرح آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوں۔ والسلام۔

آپ کا خادم
محمد اقبال ، لاہور"

اس کے بعد میں نے ایک اور خط بھیجا جس کے جواب میں انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ :-

".... اس واقعہ کا کوئی اثر میرے دل پر نہ تھا اور نہ اب ہے - آپ بلا تکلف جب چاہیں میرے غریب خانہ پر تشریف لائیں - والسلام -

آپ کا خادم
محمد اقبال"

بی ، اے میں میرے تین مضامین تھے ، انگریزی ، فلسفہ اور فارسی - آخری مضمون میں مجھے غالباً ۹۸ فی صدی نمبر ملے ہونگے ، لیکن جس دن فلسفہ کا امتحان ہونے والا تھا ، اس دن یونیورسٹی نے یکایک امتحان کا مرکز بدل دیا - بہر حال میں بہت گھبرایا ہوا نئی جگہ پہنچا - افسران نے مجھے اس شرط پر امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دی کہ مقررہ وقت سے ایک منٹ زیادہ نہیں دیا جائیگا - جب پرچہ لکھنے بیٹھا تو معلوم ہوا کہ پورا آدھ گھنٹہ گزر چکا ہے - اگر مجھے پورا وقت مل جاتا تو یقیناً میرا پرچہ بہت ہی اچھا ہوتا ، مگر خدا بھلا کرے ڈاکٹر صاحب کا کہ انہوں نے میری توقعات سے بڑھکر مجھے نمبر دئے - اور کوئی ہوتا تو مذکورہ بالا واقعہ کے پیش نظر مجھے فیل کردیتا اور میرا نام تادیبی کارروائی کی خاطر یونیورسٹی کو بھیج دیتا - ڈاکٹر صاحب کی اس شرافت نفس کا سکہ آج تک میرے دل پر نقش ہے -

رفتہ رفتہ ڈاکٹر صاحب سے میرے تعلقات بہت صمیمانہ ہو گئے - کچھ عرصہ بعد میرا لاہور جانا ہوا - جب میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو ان کی طرف سے وہی پہلی سی محبت و شفقت کا اظہار ہوا - نہ صرف یہ بلکہ جب میں نے ۱۹۱۸ میں

اخبار بین حضرات کے لئے ''کلید اخبار بینی'' لکھی اور اسے ان کے اسم گرامی سے منسوب کرنا چاہا تو انہوں نے کمال مہربانی سے ڈیڈیکیشن منظور فرمالیا ۔ اسی طرح جب ۱۹۲۱ میں میری کتاب ''جہاں آرا بیگم'' شائع ہوئی تو انہوں نے مجھے ذیل کی رائے سے سرفراز فرمایا :۔

''لاهور۔ ۲ اپریل ۱۹۲۲ ۔

مکرمی بندہ ۔ السلام علیکم ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آپ نے جہاں آرا بیگم کی سوانح عمری بہت اچھی لکھی ہے ۔ اس کی زندگی واقعی ایک نیک مسلم عورت کا نمونہ ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ والسلام ۔

محمد اقبال''

ایک ملاقات میں میں نے ڈاکٹر صاحب سے پوچھا کہ آپ نے اپنی ایک نظم میں جو یہ شعر لکھا ہے :۔

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی

اس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ سر محمد شفیع جیسے استاد کی موجودگی میں آپ کو یہ شعر نہ لکھنا چاہئے تھا ۔ ہنس کر فرمایا کہ ''شعر اسی لئے کہا گیا ہے تاکہ لوگ وہی سوال کریں جو آپ نے کیا ہے ۔ اسی سوال میں پورا جواب مضمر ہے۔''

ڈاکٹر صاحب سے میری آخری ملاقات بمبئی میں ستمبر ۱۹۳۱ میں ہوئی جبکہ وہ دوسری گول میز کانفرنس سے واپس ہوئے تھے اور خلافت هاؤس میں مقیم تھے ۔ انہی دنوں ایک سہ پہر کو محترمہ عطیہ بیگم نے اپنے دولت کدہ ''ایوان رفعت'' میں انہیں چائے پر مدعو کیا ۔ اس موقع پر ہائی کورٹ کے جج مرزا علی اکبر خاں ، مولانا محمد عرفان ، ڈاکٹر غلام محی الدین صوفی اور بہت سے دوسرے اکابر و فضلا موجود تھے ۔ یہ ٹی پارٹی لان میں دی گئی تھی جس میں پھولوں کی پر بہار روشوں اور سمندری ماحول کی وجہ سے ایک خاص دلآویزی پیدا ہو گئی تھی ۔

میں وقت سے پہلے پہنچ گیا تھا تاکہ بیگم صاحب کا ھاتھ بٹاؤں۔ اتفاق یہ ھوا کہ ڈاکٹر صاحب کو پہنچنے میں دیر ھو گئی۔ بیگم صاحب بہت گھبرائی ھوئی تھیں اور اسی حالت میں مجھ سے فرمایا کہ ''موٹر لے کر جاؤ اور ڈاکٹر صاحب کو لاؤ۔'' ابھی چند ھی فرلانگ گیا ھونگا کہ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اور مولانا عرفان چلے آرھے ھیں۔ میں ان کی گاڑی میں بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ ''آپ کا وھاں بڑی شدت سے انتظار کیا جارھا ھے۔'' ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ''میں آج عطیہ بیگم کو ذرا ستانا چاھتا ھوں۔'' میں نے کہا کہ ''یہ کام تو آپ پھر بھی کرسکتے ھیں، لیکن آپ کے انتظار میں جو اکابر جمع ھیں انہیں آپ کس مد میں ستارھے ھیں؟'' بہر حال ڈاکٹر صاحب چلنے پر رضامند ھو گئے۔ تھوڑی دیر میں ھم ''ایوان رفعت'' پہنچ گئے جہاں دروازہ پر بیگم صاحبہ اور فیضی رحمن نے ان کا استقبال کیا۔ بیگم صاحب کے شکوہ و شکایت کے بعد ھم سب لان میں پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب کو جتنا مسرور میں نے اس سہ پہر کو دیکھا اتنا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ عطیہ بیگم سے ھنس ھنسکر مختلف موضوعات پر گفتگو کر رھے تھے اور ساتھ ھی ساتھ مذاقیہ جملے بھی کستے جاتے تھے۔ مجھے ایک جملہ یاد رہ گیا ھے۔ دوران گفتگو میں عطیہ بیگم نے کہا:۔ ''اقبال، یاد رکھو، بچہ کے لئے ماں کی گود سب سے بڑی تربیت گاہ ھے۔'' اس پر ڈاکٹر صاحب نے ھنس کر پوچھا:۔ ''اور بیوی کی گود کے بارے میں کیا ارشاد ھوتا ھے؟'' عطیہ بیگم نے جھڑک کر انہیں خاموش کردیا۔

چائے نوشی سے فارغ ھوتے ھی بیگم صاحب نے معزز مہمان کا تعارف کرایا اور ان سے درخواست کی کہ وہ کچھ پیغام دیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب کھڑے ھوئے اور مختصر سی تقریر کی اور ساتھ ھی اپنا ایک شعر سنایا اور فرمایا کہ ''یہی میرا پیغام ھے۔''

وہ شعر یہ ہے :-

چناں بزی کہ اگر مرگ تست مرگ دوام
خدا ز کردۂ خود شرمسار تر گردد

جو لوگ فارسی سمجھتے تھے وہ اس لافانی شعر سے اور پیغام کی عظمت سے گہرے طور پر متاثر ہوئے۔ لیکن جو لوگ فارسی سے نابلد تھے انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو گھیر لیا اور اصرار کیا کہ وہ اس شعر کا انگریزی میں ترجمہ لکھوادیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے وہیں کھڑے کھڑے اُس کا ترجمہ لکھوادیا۔ و ھو ھذا :-

"Live so beautifully that if death is the
end of all,
God himself may be put to shame for
having ended thy career."

لان سے سب حاضرین کو ہال میں لیجایا گیا جہاں رقص و سرود کا انتظام تھا۔ میں ڈاکٹر صاحب کے قریب ھی بیٹھا تھا۔ تھوڑی دیر تک موسیقی ھوتی رھی اور اس کے بعد رقص ھوا۔ ایک کالی کلوٹی عیسائی عورت نے اپنے ''کمالات'' دکھائے۔ رقص کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے ایک کاغذ طلب کیا اور ذیل کے اشعار لکھکر انہیں عطیہ بیگم کی خدمت میں پیش کیا :-

ترسم کہ تو می رانی زورق بہ سراب اندر
زادی بہ حجاب اندر میری بہ حجاب اندر
بر کشت و بیابان پیچ بر کوہ و بیابان پیچ
برقے کہ بہ خود پیچد میرد بہ سحاب اندر
ایں صوت دل آویزے از زخمۂ مطرب نیست
مہجور جناں حورے نالد بہ رباب اندر

تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر صاحب نے ذیل کا مزاحیہ شعر ایک کاغذ پر لکھکر عطیہ بیگم کو دیا :-

"پرائیویٹ

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ
کہئے کیا حکم ہے ؟ دیوانہ بنوں یا نہ بنوں ؟

محمد اقبال

بمبئی ۱۰ ستمبر ۱۳ء"

تقریب کے بعد ڈاکٹر صاحب نے معزز مہمانوں سے ہاتھ ملائے اور "ایوان رفعت" سے رخصت ہوگئے۔

میں نے نومبر ۱۹۳۷ میں ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں ایک خط بھیجا جس کا جواب ان کے رفیق چودھری محمد حسین نے دیا۔ اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان کی حالت اب ایسی ہوگئی ہے کہ وہ اب خطوں کا جواب بھی نہیں لکھ سکتے حالانکہ تندرستی کے زمانہ میں وہ سونے سے پہلے اس دن کے تمام خطوط کا جواب دیدیا کرتے تھے۔ لاہور کے انٹرمیڈی ایٹ کالجوں کے طلبا کی اپیل کے جواب میں ہم نے بھی بمبئی میں ۹ جنوری ۱۹۳۸ کو "یوم اقبال" منایا تھا۔ یہ دن سارے متحدہ ہندوستان میں منایا گیاتھا، اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب کے حضور میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا جائے اور ان کی صحت کے لئے دعائیں مانگی جائیں۔ اس جلسہ میں جو کاؤسجی جہانگیر ہال میں منعقد کیا گیا تھا، مسز نائیڈو نے بھی معرکۃ الآرا تقریر کی تھی۔ افسوس یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ کو ہم سب سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئے۔

اقبال کی وفات سے اسلام کا ایک فقید المثال مفکر، مجتہد، فلسفی اور شاعر دنیا سے اٹھ گیا۔

عمرہا در کعبہ و بت خانہ می نالد حیات
تا زبزم عشق یک "دانائے راز" آید بروں

***

ولایت علی بمبوق

ولایت علی علیگڈھ کے اولڈ بوآئے تھے اور اپنے وطن بارہ بنکی میں وکالت کرتے تھے۔ وہ مولانا محمد علی کے عاشق زار تھے اور ’’کامریڈ‘‘ میں ’’گپ‘‘ کے عنوان سے مزاحیہ مضامین لکھتے تھے۔ ان میں سے چند کے عنوانات یہ ہیں:— ’’قدرتی لیڈر۔ مقروض۔ اسیر۔ چوکیدار۔ آنریری مجسٹریٹ۔ سوشل ریفارم۔ انگلستان پلٹ۔ بور۔ پٹواری۔‘‘ یہ کالم بیحد پسند کئے جاتے تھے اور بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے تھے۔ بمبوق پہلے شخص ہیں جنہوں نے صحافت میں ’’غیر شخصی تفریح، تفنن، شوخی و بذلہ سنجی کو رائج کیا۔‘‘ ’’کامریڈ‘‘ کے بند ہوجانے پر اس کے اسسٹنٹ ایڈیٹر راجہ غلام حسین لکھنؤ چلے گئے جہاں سے انہوں نے ایک ہفتہ وار اخبار ’’نیو ایرا‘‘ نکالنا شروع کیا۔ بمبوق اس کے بھی قلمی معاون تھے۔ وہ اس اخبار کے لئے نہ صرف ’’گپ‘‘ لکھتے تھے بلکہ نوٹ بھی اور بعض اوقات اداریے بھی۔ راجہ کی بے وقت وفات پر انہوں نے کچھ دنوں کے لئے اس اخبار کی زمام ادارت بھی سنبھال لی تھی۔

۱۹۱۷ میں ’’نیو ایرا‘‘ میں میرا ایک مراسلہ شائع ہوا جس میں میں نے لکھا تھا کہ ’’میں مولانا محمد علی کی سیاسی زندگی سے خوب واقف ہوں اور اس لئے وثوق سے کہ سکتا ہوں کہ انہوں نے کبھی کوئی کام ایسا نہیں کیا جس کی پاداش میں انہیں نظر بند رکھا جائے۔‘‘ اس کے بعد میں نے مطالبہ کیا تھا کہ ’’اگر مولانا قصوروار ہیں تو ان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے اور انہیں صفائی کا پورا پورا موقع دیا جائے۔‘‘ میرے اس مراسلہ کو پڑھ کر مدراس کے ایک مشہور پبلشر

(گنیش اینڈ کو) نے مجھے لکھا کہ انگریزی میں مولانا محمد علی کی مختصر سی سوانح عمری تیار کردو۔ باوجود بے بضاعتی کے میں نے ھامی بھر لی۔ اس کے بعد میں نے مولانا کے متعدد دوستوں کی خدمت میں اس مضمون کے خطوط بھیجے کہ اس لائف کی تیاری میں وہ میرا ھاتھ بٹائیں۔ مگر سوائے ایک شخص کے کسی نے بھی مجھے جواب سے سرفراز نہیں فرمایا؛ اور وہ صاحب تھے ولایت علی بمبوق۔

انہوں نے اپنے گرامی نامہ میں نہ صرف اس امر پر اظہار مسرت کیا تھا کہ میں مولانا کی لائف لکھ رہا ھوں، بلکہ میری ھمت افزائی کے لئے یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ''میں خود بہت دنوں سے اس فکر میں تھا کہ مولانا محمد علی کی لائف لکھوں، لیکن چونکہ تم میدان میں آگئے ھو، اس لئے میں مناسب سمجھتا ھوں کہ تمہاری پوری پوری امداد کروں۔ تم اپنا مسودہ لے کر میرے پاس چلے آؤ۔ میں اس کا ایک ایک لفظ دیکھ لونگا۔'' چنانچہ جب میری کتاب تیار ھو گئی تو میں مسودہ لے کر بارہ بنکی پہنچا اور بمبوق کے یہاں تین دن تک قیام کیا۔ اس عرصہ میں انہوں نے میرے مسودہ کا ایک ایک لفظ پڑھا اور جہاں جہاں اضافہ کی ضرورت سمجھی وھاں اضافے کردئے اور جہاں جہاں کانٹ چھانٹ کی ضرورت دیکھی وھاں قطع و برید کردی۔ یہ کتاب بالآخر چھندواڑہ میں مولانا محمد علی کی نظرثانی کے بعد ۱۹۱۸ میں شائع ھو گئی۔ اس پر میرا نام درج نہیں ھے۔ اس لئے کہ کتاب کی اشاعت کے وقت میں مدخولۂ حکومت ھوچکا تھا۔ اس کتاب کا دیباچہ سر سی۔ پی۔ راما سوامی آئیر کا تحریر کردہ ھے جو پبلشر کی درخواست پر لکھا گیا تھا۔ یہ انگریزی میں مولانا کی پہلی مختصر لائف ھے۔

دوران قیام میں بمبوق نے جس اخلاق اور محبت کا ثبوت دیا وہ یقیناً ان کی زندگی کا امتیازی پہلو تھا۔ میں ان کے یہاں اس

طرح سے رہا گویا میں اپنے ہی گھر میں ہوں ۔

ستمبر ۱۹۱۷ کے آخر میں مسز اینی بیسنٹ نظر بندی سے رہا ہوئیں ۔ اپنی رہائی کے بعد انہوں نے علی برادران کی رہائی کے لئے کوشش شروع کردی ۔ وہ لارڈ چیمسفورڈ سے مل کر ناکام واپس آرہی تھیں کہ کانپور کے اسٹیشن پر انہوں نے مجھے علیحدگی میں بتایا کہ ”علی برادران کی رہائی میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا وہ (مفروضہ) خط ہے جو انہوں نے فارسی میں امیر امان اللہ کے نام بھیجا تھا اور جس میں امیر موصوف کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی گئی تھی ۔ تم اُردو اخبارات کے ذریعہ یہ بات مسلم پبلک تک پہنچادو اور انہیں یقین دلادو کہ میں علی برادران کی رہائی کے لئے آخر وقت تک جد وجہد کرتی رہونگی ۔“ چنانچہ میں نے انگریزی اور اردو اخبارات کے ذریعہ یہ بات مسلمانوں تک پہنچادی اور مسز موصوفہ کی اُن کوششوں کا بھی شکریہ ادا کیا جو وہ علی برادران کی رہائی کے سلسلہ میں اسوقت تک کرچکی تھیں ۔ اس اطلاع کا شائع ہونا تھا کہ مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی اور ایک ہنگامہ برپا ہو گیا ۔ بعض اخبارات نے لکھا کہ اگر فارسی والے خط کا معاملہ صحیح ہے تو پھر کھلی عدالت میں ان پر مقدمہ کیوں نہیں چلایا جاتا ؟ مگر ایک طبقہ ایسا بھی تھا جسے یہ بات ایک کل نہیں بھائی کہ مسز بیسنٹ اسلام کی لڑائیاں لڑیں ۔ چنانچہ اس طبقہ کی طرف سے مسز موصوفہ کی نیت پر حملے کئے گئے ۔ بمبوق بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے ۔ انہوں نے ”نیو ایرا“ میں اس سلسلہ میں ایک نوٹ بھی لکھا تھا جس کا جواب میں نے ”لیڈر“ میں دیا اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا کہ ”مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ مسز بیسنٹ کی کوششوں کو سراہیں نہ کہ اُلٹا انہیں مورد الزام قرار دیں اور ان کی نیت کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کریں ۔“ بمبوق نے بعد میں ایک ملاقات کے

دوران میں اپنی غلطی کو تسلیم کرلیا، مسز بیسنٹ پر حملے کرنے بند کردئے اور ان کی کوششوں کا شکریہ بھی ادا کیا۔ یہ واقعہ معمولی سا ہے لیکن اس سے بمبوق کی انصاف پسندی اور معقولیت شعاری کا پورا پورا اظہار ہوجاتا ہے۔

بمبوق پرانی وضع کے بزرگ تھے۔ ان کا لباس بیحد سادہ تھا۔ وہ عمر بھر موٹا جھوٹا کھدر پہنتے رہے۔ ان کے قلم میں بہت زور تھا اور ساتھ ھی روانی بھی۔ وہ انگریزی اور اردو دونوں کے زبردست انشا پرداز تھے اور یہی حالت ان کی تقریر کی تھی۔ وہ بے تکان انگریزی لکھتے تھے اور مناسب الفاظ ڈھونڈھنے کے لئے انہیں مطلق سوچنا نہیں پڑتا تھا۔ محمد علی کی انگریزی لائف میں جو چند پیرا گراف انہوں نے بڑھائے وہ قلم برداشتہ لکھے گئے تھے۔

ان کی پریکٹس بھی اچھی تھی اور وہ اپنے ھمعصروں میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان کے دوستوں میں ھندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ ان کی زندگی کی پاکیزگی ھر ملنے والے کو اپنا گرویدہ بنا لیتی تھی۔

وہ نماز روزہ کے اچھے خاصے پابند تھے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند تھی کہ عدالت کے اوقات میں بھی وہ احاطہ عدالت میں نماز پڑھنے کے عادی تھے۔

مولانا محمد علی کے یوں تو بہت سے دوست تھے مگر جو والہانہ محبت، عقیدت اور فدائیت بمبوق میں دیکھنے میں آئی وہ آپ اپنی نظیر تھی۔ بمبوق دوسروں کی عظمت پہچانتے تھے۔

ان کا انتقال بارہ بنکی میں جولائی ۱۹۱۸ میں ھوا۔ مرتے وقت ان کی عمر صرف ۳۲ سال تھی۔ انہیں ھیضہ ھو گیا تھا اور اگرچہ ڈاکٹر انصاری نے اپنے سارے جتن کر ڈالے مگر موت ٹالے نہ ٹل سکی۔ انتقال کے وقت مرحوم نے سب کی موجودگی میں کلمۂ شہادت پڑھا اور ''اپنے مولا کے حضور میں حاضر ھو گئے۔''

پروفیسر شیخ عبدالقادر

میرے دوست محمد حفیظ سید ۱۹۱۵ میں کانپور کے تھیوسوفیکل اسکول میں ٹیچر تھے ۔ چونکہ میں آن دنوں بیکار تھا ، اس لئے انہوں نے مجھے دھلی سے اپنے اسکول میں بلوا لیا ۔ میں نے یہاں کوئی تین سال کام کیا ھوگا کہ حفیظ انجمن اسلام ھائی اسکول بمبئی کے ھیڈ ماسٹر مقرر ھوکر چلے گئے ۔ وھاں پہنچتے ھی انہوں نے اصرار کرکے مجھے بھی بلوالیا ۔ یہ واقعہ فروری ۱۹۱۸ کا ھے ۔ انہی کے یہاں شیخ صاحب سے میری پہلی ملاقات ھوئی ۔ آن دنوں وہ انڈین ایجوکیشن سروس کے رکن تھے اور الفنسٹن کالج بمبئی میں فارسی کے پروفیسر ۔ جون میں میرا تعلق انجمن ھائی اسکول سے ٹوٹ گیا اور میں پھر بیکار ھوگیا ۔

شیخ صاحب نے از راہ کرم پوچھا کہ ”سیکرٹیریٹ میں آردو فارسی کے مترجم کی جگہ خالی ھے ۔ اگر سرکاری ملازمت کا ارادہ ھو تو میں کوشش کروں ؟ “ مجھے ملازمت کی ضرورت تو تھی ھی اور اگرچہ سرکاری ملازمت کے لئے میرے دل میں کبھی کوئی خاص کشش یا تڑپ پیدا نہیں ھوئی تاھم غیر سرکاری ملازمتوں * کے بارے میں اپنے سابقہ تجربہ کو ملحوظ رکھتے ھوئے میں نے فیصلہ کرلیا کہ میں اب سرکاری ملازمت قبول کرلونگا ۔ بظاھر اس راہ میں وہ تعلق حائل تھا جو مجھے ”ھمدرد“ سے رہ چکا تھا ۔ علاوہ ازیں دھلی کے چیف کمشنر نے خفیہ احکام جاری کردئے تھے کہ ”ھمدرد“ اور ”کامریڈ“ کے کسی شخص

---

* جولائی ۱۹۱۸ میں سرکاری ملازمت میں داخل ھونے سے پہلے میں نے تین جگہ ملازمت کی تھی ۔ صرف ایک جگہ سے میں خود مستعفی ھوا اور باقی دو جگہوں سے مجھے سبکدوش کردیا گیا تھا ۔

کو بھی کوئی سرکاری ملازمت نہ دی جائے۔ چنانچہ جب میں
شیخ صاحب کی معیت میں حکومت بمبئی کے اورینٹل ٹرانسلیٹر
سے ملا تو بہ نظر احتیاط میں نے ''ہمدرد'' سے اپنے تعلق اور
چیف کمشنر کے احکام کا بھی ذکر کر دیا۔ انہوں نے جواب
میں فرمایا کہ ''ہم دھلی کے چیف کمشنر کے ماتحت نہیں ھیں
اور اس لئے ہم اس کے کسی حکم کی پروا نہیں کرتے۔'' یہ کہا
اور مجھے اپنے یہاں جگہ دیدی۔ یہ نتیجہ تھا شیخ صاحب کی
عنایات کا جو صحیح معنوں میں میرے محسن تھے۔

ایک مرتبہ صوبۂ بمبئی کے محکمۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر
نے شیخ صاحب کو ایک پمفلٹ ترجمہ کے لئے دیا۔ شیخ صاحب
نے وہ پمفلٹ میرے حوالہ کر دیا۔ ان دنوں میں چھٹیوں میں
دھلی جارھا تھا، اور چونکہ مجھے فرصت تھی اس لئے میں نے
چند دن میں ترجمہ مکمل کر کے ان کی خدمت میں بھیجدیا۔
شیخ صاحب اسے کہیں رکھکر بھول گئے۔ ڈائرکٹر نے کچھ عرصہ
تک تو ترجمہ کا انتظار کیا اور پھر سرکاری طور پر اسے ھمارے
دفتر میں بھیجدیا۔ میں شیخ صاحب کی خدمت میں پہنچا اور اپنا
ترجمہ طلب کیا اور سارا حال کہ سنایا۔ شیخ صاحب نے
ترجمہ تو واپس کر دیا مگر ساتھ ھی اپنی جیب سے ایک سو
روپے بھی عنایت کئے یہ کہکر کہ یہ کام چھٹیوں میں کیا گیا
ھے۔ میرا کہنا یہ تھا کہ میں اب نئی محنت سے بچ جاؤنگا اور
پرانا ترجمہ کام آجائیگا۔ بہت دیر تک بحث ھوتی رھی،
ادھر سے اصرار اور ادھر سے انکار۔ لیکن میری ایک نہ سنی گئی
اور مجھے مجبور کردیا گیا کہ میں ان کی عطا کردہ رقم کو
قبول کرلوں۔ میرا کہنا یہ تھا کہ ''جو رقم آپ دے رہے ھیں
وہ ایک قسم کا جرمانہ ھے جس کا بار آپ کی ذات گرامی پر
پڑیگا۔'' مگر ان کا فرمانا یہ تھا کہ ''یہ سب کچھ میری بھول
کا نتیجہ ھے اور اس لئے مجھے ھی اس کا خمیازہ بھگتنا چاھئے۔''

اسی قبیل کا ایک اور واقعہ ۱۹۳۰ میں پیش آیا جب کہ اسمعیل کالج اندھیری کی رسم افتتاح حکومت بمبئی کے وزیر تعلیم مولوی رفیع الدین احمد کے ھاتھوں انجام پانے والی تھی۔ مولوی صاحب اور شیخ صاحب آپس میں گہرے دوست تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی انگریزی تقریر شیخ صاحب کے حوالہ کی اور فرمایا کہ اسے اور اس کے اردو ترجمہ کو چھپوادیجئے۔ چنانچہ یہ خدمت میرے سپرد کی گئی۔ شیخ صاحب ھی نے ترجمہ کا معاوضہ اور طباعت کا بل اپنی جیب سے ادا کیا۔ وہ اس قسم کے کام اپنے دوستوں کی خاطر انجام دیدیا کرتے تھے۔

کچھ عرصہ تک الفنسٹن کالج میں کام کرنے کے بعد شیخ صاحب کا تبادلہ پونا کے مشہور و معروف دکن کالج میں ھو گیا۔ وھاں سے وہ مختلف سرکاری کمیٹیوں اور یونیورسٹی کے کاموں کے سلسلہ میں وقتاً فوقتاً بمبئی آیا کرتے تھے۔ شیخ صاحب کا دستور تھا کہ وہ اپنے ساتھیوں کا کرایہ بھی اپنی ھی جیب سے ادا کرتے اور جب کبھی دوستوں کی جانب سے کرایہ کی پیش کش کی جاتی تو وہ یہ کہکر قبول کرنے سے انکار کردیتے کہ مشرقی اخلاق کا تقاضا ھے کہ گروپ میں جو سب سے معمر ھو اسی کو مصارف برداشت کرنے چاھئیں۔ یہ ان کی مخصوص ادا تھی۔

اسی طرح ان کی مہمان نوازی بھی مسلم تھی۔ مثالاً جب کبھی وہ اپنے احباب کے ساتھ کسی ریسٹوراں میں جاتے تو کبھی ایسا نہیں ھوا کہ انھوں نے بل ادا کرنے کی زحمت کسی اور کو دی ھو۔ گھر پر بھی جب کوئی شخص ان سے ملنے جاتا تو وہ اسے کچھ نہ کچھ کھلائے بغیر واپس جانے نہیں دیتے تھے۔ انہیں دوسروں کی خاطر داری کرنے میں لطف آتا تھا۔

شیخ صاحب فارسی علم ادب کے زبردست فاضل تھے۔ فارسی ادب کی کوئی کتاب ایسی نہ ھوگی جو ان کی نظر سے بچ گئی ھو۔ یورپ میں فارسی ادب پر جو کچھ شائع ھوتا رھتا تھا اس

سے بھی وہ واقف تھے۔ ان کے پاس مختلف زبانوں کی کتابوں کا معقول ذخیرہ تھا۔

شیخ صاحب ابتدائے ملازمت سے آخر تک بمبئی یونیورسٹی کے فیلو رہے۔ انہوں نے ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم (مسٹر جے۔ جے۔ کورنٹن) اور کمشنر وسطی ڈویژن (مسٹر سی۔ این۔ سیڈن) اور یونیورسٹی کی تحریک پر دورے کرکے فارسی، اردو اور عربی کی نایاب قلمی کتابیں جمع کیں۔ یہ کتابیں مختلف موضوعات پر ہیں، مثلاً تاریخ، سوانح، ریاضی، عروض، ہیئت، تیر اندازی، تصوف وغیرہ۔ اس کے بعد انہیں ان کتابوں کی فہرست تیار کرنے کی خدمت بھی سپرد کی گئی۔ یہ توضیحی فہرست بڑے سائز کے تقریباً چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ بظاہر یہ فہرست ہے، لیکن در حقیقت اس سے مولف کی وسیع معلومات اور حقیقی قابلیت کا پورا پورا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ اس میں انہوں نے بعض جگہ یورپین مستشرقین کی آرا سے اختلاف بھی کیا ہے اور دلائل و براہین کے ساتھ بتایا ہے کہ دیوان ابن یمین، مظہرالعجائب، یوسف زلیخا وغیرہ کس کس کی تصنیف ہیں۔ یونیورسٹی کے لئے جو کتابیں انہوں نے جمع کیں ان میں ایک کتاب ایسی بھی ان کے ہاتھ لگ گئی جو مولانا عبدالرحمن جامی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے اور جس پر ان کے دستخط بھی ثبت ہیں۔ ان دستخطوں کو انہوں نے ”معارف“ میں شائع کرایا تھا اور علم دوست حضرات کے لئے بھی اسے علیحدہ چھاپ کر تقسیم کردیا تھا۔ وہ تحریر حسب ذیل ہے:۔

ولادت فرزند ارجمند ضیاء الدین یوسف انبته اللہ تعالے نباتاً حسناً فی النصف الاخیر من لیلۃ الاربعاء التاسع من شہر شوال سنہ اثنین و ثمانین و ثمانمائۃ۔

والکاتب ابوہ الفقیر عبدالرحمن بن احمد الجامی عفی عنہ۔

حضرت مولانا سری در تاریخ ولادت وے فرمودہ اند:۔

بحمد اللہ سپہر فضل جامنی را دگرباره
ز برج سعد ناگہ کوکبی فرخنده شد لامع
همایوں طامعتی پاکیزہ اخلاقی که خواهد شد
باندک فرصتی هر علم راهمچوں پدر جامع
خرد می جست دی از هر کسی تاریخ میلادش
رواں گفتم ''سہیلی شد ز برج سعد او طالع''

۸۸۲

جو مخطوطات شیخ صاحب نے جمع کئے ان میں سے بعض غیر شائع شدہ هیں اور بعض ایسے هیں جو دنیا کے عظیم الشان کتب خانوں میں بھی نہیں ملتے۔ مثالاً ''چہار مقاله'' کے دنیا میں فقط تین قلمی نسخے پائے جاتے هیں، چوتھا شیخ صاحب نے دریافت کیا اور اب وہ بمبئی یونیورسٹی لائبریری کی زینت ہے۔

اس سلسلہ میں ایک اور مخطوطه کا ذکر کرنا چاهتا هوں۔ اس کا نام ''مخزن الشعرا'' ہے جو ''شعرائے ریختہ'' کا تذکرہ ہے اور فارسی زبان میں ہے۔ مولف کا نام قاضی نورالدین بن قاضی سید احمد رضوی فائق ہے اور اسے بھڑوچ میں ۱۲۷۰ ھجری (۱۸۵۳-۵۴) میں تحریر کیا گیا تھا۔ یہ نسخہ خود مصنف کے هاتھ کا لکھا هوا ہے اور اس پر ذیل کی عبارت درج ہے:—

تمت هذا تذکرہ تاریخ شانزدهم شوال المکرم روز جمعه سنه هزار و دو صد و هفتاد من هجرة المبارک در بندر بروچ با تمام رسید۔ کاتب و مولف و مالک هذا یکے است۔

مولف نے اپنا تذکرہ مرزا غالب کی خدمت میں دهلی بھیجا تھا اور مرزا نے اس پر اردو میں تقریظ بھی لکھی تھی۔ وہ تقریظ بھی اسی کتاب کے آخر میں درج ہے۔ و هو هذا:—

مخدوم و مکرم حضرت قاضی محمد نورالدین حسین خان بہادر کی خدمت میں عرض ہے کہ برخوردار مرزا

شہاب الدین خان بہادر نے یہ اجزا مجھ کو دئے ۔
نظم سے میں نے بالکل قطع نظر کی ، کامل صاحب کی
نثر جو آغاز میں ہے اس کو بھی نہیں دیکھا ۔ صرف
آپ کی نثر کو دیکھا اور اس کو موافق حکم آپ کے
بعض جا درست کر دیا ، بعض موقع پر منشاء اصلاح بھی
لکھدیا ہے ۔ مجھ کو یہ پایہ نہیں کہ آپ کی نثر میں
دخل کروں ، بفحوای الامر فوق الادب حکم بجا لایا
ہوں ۔ مرحبا آفریں بخدا خوب نثر لکھی ہے ، اللہ
سبحانہ آپ کو مدارج اعلیٰ کو پہنچاوے اور سلامت
رکھے ! مرقومہ دوشنبہ جولائی سنہ ۱۸۶۲ عیسوی ۔
خوشنودیٔ احباب کا طالب
غالب

اس تذکرہ میں ۱۰۷ شعرا کے حالات دئے گئے ہیں اور ساتھ ہی ان کا کلام بھی درج ہے ۔ ولی کے حال میں مصنف رقمطراز ہے :— ”وہ احمد آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں دفن ہوئے ۔ ان کی قبر موسیٰ سہاگ اور شاہی باغ کے درمیان واقع ہے ۔“ مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ ”میر تقی میر نے اپنے تذکرہ میں جو یہ تحریر کیا ہے کہ ولی اورنگ آباد کے رہنے والے تھے ، صداقت سے دور ہے ۔“ اس میں ایک خاتون کا کلام بھی درج ہے جس کا تخلص حجاب تھا ۔

شیخ صاحب مشکل سے مشکل اشعار کا مطلب اس خوبی سے طلبا کو سمجھاتے تھے کہ وہ دل میں اتر جاتا تھا ۔ راقم الحروف کو ان کی بی ، اے اور ایم ، اے کی جماعتوں میں کبھی کبھی شرکت کا اتفاق ہوا ہے اور وہ ان کے علمی تبحر کو دیکھکر ہمیشہ حیرت میں رہ جاتا تھا ۔

شیخ صاحب مراٹھی زبان کے بھی فاضل تھے ۔ بمبئی یونیورسٹی اور حکومت بمبئی کی بعض کمیٹیوں میں وہ فارسی اور

عربی کے ساتھ ساتھ مراٹھی کے ممتحن بھی مقرر کئے جاتے تھے۔ مراٹھی علم ادب کا انہوں نے غائر نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ مراٹھوں کی تاریخ سے بھی انہیں گہری دلچسپی تھی۔ وہ اس زبان کو ٹھیٹھ اہل زبان کی طرح بولتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان میں زبانیں سیکھنے کا قدرتی ملکہ تھا۔ شیخ صاحب نے اپنے ایک یہودی دوست ہزقیل* سے جو سینٹ زیویرز کالج، بمبئی، میں عبرانی کے پروفیسر تھے، عبرانی سیکھی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب عمر بھر طالب علم رہے۔ جہاں سے جو چیز ملی، حاصل کرلی۔ علامہ سید سلیمان ندوی سے انہوں نے عربی کی تحصیل کی تھی۔ وہ فرانسیسی زبان کے بھی فاضل تھے۔ سید صاحب نے ''ارض القرآن'' کے دیباچہ میں اس کا یوں اعتراف کیا ہے :—''میں اپنے صدیق صمیم پروفیسر شیخ عبدالقادر کا ممنون ہوں جنہوں نے میرے لئے از راہ عنایت فرنچ سے انگریزی میں ترجمہ کرنے کی تکلیف گوارا کی۔'' سید صاحب نے شیخ صاحب کی وفات پر جو مضمون لکھا ہے اس میں انہوں نے مزید وضاحت کرتے ہوئے تحریر فرمایا ہے کہ ''اگر شیخ صاحب کی رفاقت نہ ہوتی تو اس کتاب کو کبھی اس طرح نہ لکھ سکتا۔''† یہ حقیقت ہے کہ ساری کتاب کی تدوین میں شیخ صاحب کے مشورے شامل تھے۔

شیخ صاحب جدید فارسی کے علم ادب سے کماحقہ واقف تھے۔ ایرانیوں سے وہ ایرانی لہجہ میں گفتگو کرتے تھے۔ بمبئی کے تعلیم یافتہ ایرانی ان کی فارسی دانی کے بیحد معترف تھے۔ جدید فارسی لٹریچر پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ انہیں ایرانی

---

* یہ شیخ صاحب کے مخلص ترین دوستوں میں سے تھے۔ بمبئی میں یہودیوں کا جو قبرستان ہے اس کی متعدد قبروں کے کتبے انھی کے تحریر کردہ ہیں۔

† ''یاد رفتگاں'' : صفحہ ۵۰۱۔

فن موسیقی سے بھی دلچسپی تھی۔ وہ فارسی ریکارڈوں کو بہت شوق سے سنتے تھے اگرچہ اُن کی رائے تھی کہ فرانسیسی دھنیں ایرانی موسیقی پر پوری طرح چھا گئی ہیں۔

شیخ صاحب برسوں ٹیکسٹ بکس کمیٹی، بمبئی کے چیئرمین رہے۔ یونیورسٹی کے شعبۂ علوم مشرقیہ کے بھی انچارج وہی تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بی، اے یا ایم، اے کے نصاب فارسی میں نظم کے حصہ میں ایک شعر ایسا آ گیا جس میں لفظ ''آتش کدہ'' سے ذم کا پہلو نکلتا تھا۔ اس پر ایک دوسرے سرکاری کالج کے پارسی پروفیسر منوچہر هوسجی بگڑ گئے اور انہوں نے ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم اور سکریٹری محکمۂ تعلیم سے درخواست کی کہ اس سارے حصہ کو نصاب سے خارج کر دیا جائے اس لئے کہ اس شعر سے پارسیوں کے مذهبی جذبات کو ٹھیس لگتی ہے۔ یہ رپورٹ جب شیخ صاحب کے پاس آئی تو انہوں نے اس کا ایسا مسکت اور مدلل جواب دیا کہ حکومت مطمئن ہو گئی۔ شیخ صاحب نے انگریزی کلاسیکل مصنفوں کی کتابوں کے متعدد اقتباسات پیش کرکے بتایا تھا کہ ایسی مثالیں ہر زبان میں ملینگی اور اگر اس طرح سے مختلف حصوں کو خارج کیا جاتا رہا تو ادبیات پر بہت بڑا ظلم ہوگا۔

مذکورہ بالا فہرست شیخ صاحب کا یادگار کارنامہ ہے اور اسی کے اعتراف میں حکومت بمبئی کی سفارش پر انہیں ''خان بہادر'' کا خطاب عطا کیا گیا تھا۔ شیخ صاحب اس خطاب سے چنداں خوش نہ تھے، مگر سرکاری ملازم ہونے کی حیثیت سے وہ اسے واپس بھی نہیں کرسکتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ہر خطاب سے بالاتر تھے۔

جہاں تک تصانیف کا تعلق ہے شیخ صاحب نے صرف چند پمفلٹ اور مضامین اپنے پیچھے چھوڑے ہیں۔ اُن کے کچھ مضامین رائل ایشیاٹک سوسائٹی (بمبئی برانچ) کے جرنل میں بھی نکل

چکے ھیں۔ ان کا ایک مشہور مضمون ''یائے مجہول'' سے تعلق رکھتا ھے۔ یہ بتیس صفحے کا بڑے سائز کا پمفلٹ ھے۔ اس میں انہوں نے متعدد مثالیں دے کر بتایا ھے کہ یائے مجہول اپنی جداگانہ حیثیت رکھتی ھے اور زمانۂ حال کے ایرانیوں میں یائے مجہول کو یائے معروف کی طرح پڑھنے کا جو طریقہ رائج ہو گیا ھے وہ سراسر غلط ھے۔ یہ پمفلٹ دو حصوں پر مشتمل ھے۔ پہلے حصہ میں انہوں نے دلائل دیکر یہ ثابت کیا ھے کہ ھندوستان میں یائے مجہول اور یائے معروف کے تلفظ کو علیحدہ علیحدہ ادا کرنے کا جو طریقہ رائج تھا اور ھے وھی صحیح ھے، اور وہ وھی ھے جو رودکی، عنصری، منوچہری، خاقانی، سعدی اور حافظ کے زمانہ میں رائج تھا۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ھے کہ حافظ کے بعد جو شاعر آئے انہوں نے اس فرق کو معدوم کر دیا جو غلط ھے اور غیر ایرانی بھی۔ اپنے بیان کے ثبوت میں انہوں نے پرنس نجف علی مرزا کی کتاب ''درۂ نجفی'' سے جو فارسی صنائع بدائع اور عروض کی نہایت مستند کتاب سمجھی جاتی ھے، ذیل کا اقتباس پیش کیا ھے:-

''شیر خوردنی کہ یائے آن معروف است، با شیر درندہ
کہ یائے آن مجہول است، قافیہ نباید کرد۔''

دوسرے حصے میں شیخ صاحب نے سیکڑوں مثالیں دیکر یائے مجہول اور یائے معروف کے باھمی فرق کو عملی طور پر دکھایا ھے۔ یہ مضمون بہت جامع ھے۔

ایک اور انگریزی پمفلٹ میں انہوں نے ایرانی پروفیسر مرزا حیرت کے سوانح حیات، ان کے فضائل اور ان کی علمی کاوشوں پر روشنی ڈالی ھے۔ شیخ صاحب پروفیسر حیرت کے شاگرد تھے اور اس لئے وہ اپنے شفیق استاد کے علمی کمالات کے عینی شاھد تھے۔ اسی طرح انہوں نے اورنگ زیب کی مشہور توپ ''مرد میدان'' پر تاریخی نقطۂ نظر سے ایک مضمون سپرد قلم کیا تھا۔

ان کے کچھ مضامین ''معارف'' میں بھی شائع ہوچکے ہیں۔ شیخ صاحب کے تقریباً سارے رسالے مع ان کے دستخطوں کے راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں۔

شیخ صاحب کے دوسرے علمی کارناموں میں بڑا کام تصحیح کا ہے۔ انہوں نے قا آنی، خاقانی، انوری، ظہیر فاریانی اور عرفی کے ان حصوں کی تصحیح پر جو داخل نصاب ہوتے تھے، بڑی دیدہ ریزی سے محنت کی تھی اور انہیں عام فائدہ کے لئے چھپوا دیا تھا۔ انوری اور بعض دوسرے شعرا مثلاً نظامی، قوامی وغیرہ کے ادق اشعار کا حل بھی ان کی اهم ادبی خدمات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ پروفیسر ای۔ جی۔ براؤن بھی قوامی کے جن اشعار کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے ان کا حل بھی شیخ صاحب نے کر دیا تھا اور رائل ایشیاٹک سوسائیٹی بمبئی کے کے جرنل میں چھپوا دیا تھا۔ انہوں نے جامی کی ''سبحۃ الابرار'' کی بھی تصحیح کی تھی۔

شیخ صاحب اپنے علمی تبحر اور اعلیٰ اخلاق کی وجہ سے ہر جگہ عزت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ جن جن سرکاری کمیٹیوں کے ممبر رہے، ان کے صدر بالعموم یورپین آئی۔ سی۔ ایس ہوا کرتے تھے، جن میں سے بعض مشرقی زبانوں کے بھی ماہر تھے۔ وہ سب شیخ صاحب کا دلی احترام کرتے تھے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ شیخ صاحب پہنچے ہوں اور وہ استقبال کے لئے کھڑے نہ ہوگئے ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ شیخ صاحب اُن اشخاص میں سے تھے جن کی علمی فضیلت اور صیانت دیکھ کر انگریزی حکومت ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں کے قابل سمجھنے لگ گئی تھی۔

حکومت بمبئی وقتاً فوقتاً بعض علمی استفسارات شیخ صاحب کے پاس بغرض تشریح بھیجا کرتی تھی۔ کبھی کبھار شیخ صاحب خود بھی حکومت کی توجہ بعض امور کی جانب مبذول کرایا

کرتے تھے۔ ایک موقع پر شیخ صاحب نے حکومت کو لکھا کہ تعطیلات کی سرکاری فہرست میں ''بقر عید'' کو ہمیشہ ''بکری عید'' لکھا جاتا ہے جو صریحاً غلط ہے۔ لہذا حکومت کو چاھئے کہ اس کی تصحیح کردے۔ جب یہ خط ہمارے دفتر میں آیا تو میں نے شیخ صاحب کی تائید میں ایک نوٹ لکھا اور بتایا کہ یہ غلطی مدت مدید* سے چلی آرہی ہے اور وقت آگیا ہے کہ اس کی تصحیح کردی جائے۔ لیکن جب یہ خط جنرل ڈیپارٹمنٹ میں پہنچا تو محکمہ کے سکریٹری نے جو آئی۔سی۔ایس تھا، اپنے کسی مسلمان ماتحت سے ''بقر'' اور ''بکری'' کے معنی دریافت کئے اور پھر لکھا :— ''جب غلط نام (بکری عید) کے ہوتے ہوئے اس قدر ہندو مسلم فسادات ہوتے ہیں تو نام تبدیل ہو جانے پر اور زیادہ فسادات کے ہونے کا امکان ہے۔ لہذا نام وہی رہے جو عرصۂ دراز سے چلا آرہا ہے۔'' اس پر شیخ صاحب نے حکومت کو پھر لکھا کہ ''بقر عید'' کی بجائے عید اضحیٰ کا نام اختیار کرلیا جائے تا کہ کسی طرح غلط نام سے تو چھٹکارا حاصل ہو۔ حکومت نے یہ مشورہ مان لیا، مگر حکم دیا کہ اس نام کے نیچے خطوط وحدانی میں ''بکری عید'' ضرور لکھا جائے۔ چنانچہ آج تک حکومت بمبئی کی شائع کردہ فہرست تعطیلات میں یہ دونوں نام ساتھ ساتھ ملتے ہیں۔

جن دنوں شیخ صاحب آردو ٹیکسٹ بکس کمیٹی کے چیئرمین تھے اس زمانہ کا واقعہ ہے کہ لاہور کی ایک مشہور پبلشنگ فرم کپور چند کے ایک مسلمان نمایندہ نے شیخ صاحب سے ملاقات کی اور اپنی آردو کتابیں بغرض منظوری پیش کیں۔ اس کے بعد اس نے کسی سے شیخ صاحب کے گھر کا پتہ معلوم کرکے ان کے یہاں ایک بڑے ٹوکرے میں من ڈیڑھ من مٹھائی بھجوادی۔

---

* اس غلطی کی ابتدا صد سالہ کیلنڈر سے ہوئی جو سواسو سال پیشتر چھاپا گیا تھا۔

یہ پونا کا واقعہ ہے۔ شیخ صاحب ان باتوں سے کوسوں دور تھے۔ گھر پہنچ کر جب انہیں معلوم ہوا کہ ٹوکرا فلاں شخص کی طرف سے آیا ہے تو وہ بیحد بگڑے اور اسی وقت رشوت کی اس پوٹ کو بذریعۂ ریل لاھور کی پبلشنگ فرم کے نام روانہ کردیا اور محصول بھی اپنے پاس سے ادا کیا اس لئے کہ ریلوے کے قواعد کے ماتحت کھانے پینے کی چیزوں پر پیشگی محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ ان دنوں کمیٹی کا ہر ممبر شیخ صاحب کی طرح دیانت وصیانت کا پتلا تھا۔ اگر تقسیم کے بعد کا سا رنگ ہوتا تو کیا کچھ نہیں ہوسکتا تھا۔ مگر شیخ صاحب کا زمانہ خلفائے راشدین کا زمانہ تھا، ہر قسم کی بدعملی سے بالاتر، جہاں رشوت کو کسی شکل میں بھی بار نہیں مل سکتا تھا۔ شیخ صاحب کو میں نے کبھی غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا تھا مگر لاھوری فرم کے نمایندہ کی جسارت پر انہیں جو غصہ آیا وہ بیان سے باہر ہے۔

دسمبر ۱۹۱۸ میں سر ابراھیم رحمت اللہ جو حکومت بمبئی کی ایگزیکیوٹیو کونسل کے ممبر تھے، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ سورت کے لئے صدر منتخب کئے گئے۔ ایک دن انہوں نے مجھے بلابھیجا اور فرمایا کہ ''میں اپنا صدارتی ایڈریس لکھ رہا ہوں۔ تم اتنا کرو کہ مسلمانوں کے گزشتہ علمی کارناموں کے بارے میں کچھ اقتباسات دیدو تا کہ میں انہیں اپنے خطبہ میں شامل کرلوں۔'' چنانچہ اس مقصد کے لئے میں شیخ صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور انہوں نے اپنے ذاتی کتب خانہ سے چند کتابیں دیدیں اور متعلقہ اقتباسات پر نشانات بھی لگادئے۔ دو ایک اقتباسات میں نے بھی جمع کرلئے تھے۔ سر ابراھیم ان اقتباسات کو دیکھ کر بیحد خوش ہوئے اور فرمایا کہ ''مجھے انہی چیزوں کی ضرورت تھی۔'' یہ کام شیخ صاحب کی اعانت سے بہت سہل ہوگیا ورنہ تنہا میری بساط سے باہر تھا۔

ایک مرتبہ میرا تنازعہ اپنے دفتر کے افسر اعلیٰ سے ہو گیا ۔ اس کی نوعیت یہ تھی کہ بمبئی کے پولیس کمشنر کے پاس سے ایک اردو تقریر ترجمہ کے لئے میرے پاس آئی ۔ یہ تقریر پہلی مئی کو جو ''مزدوروں کا دن'' کہلاتا ہے کسی جلسہ میں کی گئی تھی ۔ لیکن پولیس نے اسے ۱۵ جون کو میرے پاس ترجمہ کے لئے بھیجا ۔ اس غیر معمولی تاخیر کے باوجود پولیس چاہتی تھی کہ ترجمہ تین دن کے اندر اندر مکمل ہو جائے ۔ میں نے پولیس سے کہدیا کہ ''ترجمہ میں کم از کم دس دن لگینگے ۔'' اس پر پولیس کمشنر نے براہ راست دفتر کے افسر اعلیٰ کو (جو اُن دنوں پونا میں تھے) ٹیلیفون کیا اور کہا کہ ''ترجمہ تین دن کے اندر تیار کرادیجئے ۔'' چنانچہ افسر نے مجھے ٹیلیفون پر حکم دیا کہ ''ترجمہ تین دن کے اندر اندر تیار ہو جائے ۔'' مگر میں نے ترجمہ دسویں دن ہی تیار کر کے حوالۂ پولیس کیا ۔ اس تاخیر پر افسر نے مجھ سے باز پرس کی ۔ میں نے جواب میں لکھا کہ (۱) میرے پاس بہت سے ارجنٹ اور اسی جی ایٹ (Immediate) کام تھے جو فوری توجہ کے محتاج تھے ۔ (۲) خود پولیس نے ڈیڑھ ماہ کی تاخیر کے بعد تقریر ترجمہ کے لئے بھیجی تھی ۔ (۳) اس تقریر کے ساتھ جو مراسلہ منسلک تھا اس پر بھی لفظ ارجنٹ مرقوم نہ تھا اور (۴) چونکہ عدالت میں جرح مجھ سے کیجائیگی ، اس لئے صحیح ترجمہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ اسے پورے اطمینان کے ساتھ کیا جائے ۔ ساتھ ہی میں نے سارا واقعہ شیخ صاحب کے گوش گزار کر دیا اور ان سے مداخلت کی درخواست کی ۔ چنانچہ انہوں نے افسر موصوف سے جو کچھ کہنا تھا کہا اور پھر مجھ سے فرمایا کہ ''تم اتنا لکھکر دیدو کہ یہ حکم عدولی آپ کی ذات خاص سے متعلق نہ تھی ۔'' بہر حال ان کی مداخلت سے یہ قضیۂ نامرضیہ ختم ہو گیا ۔ چونکہ ہمارے دفتر کی دو سرکاری کمیٹیوں سے شیخ صاحب کا تعلق

تھا اس لئے افسر اعلیٰ بھی ان کے سامنے نرم پڑ گئے ، ورنہ ان کی تو خواہش یہی تھی کہ وہ اس ''حکم عدولی'' کی بنا پر مجھے برخاست ھی کردیں ۔ بہرحال —

رسیدہ بود بلائے ولے بخیر گزشت

مہاراشٹر یونیورسٹی کے قیام سے بہت پہلے جیکر کمیٹی مقرر کی گئی تھی ۔ شیخ صاحب اس کمیٹی کے ممبر تھے اور انھوں نے مسلمانوں کی مادری زبان کے مسئلہ پر ایک اختلافی نوٹ بھی تحریر کیا تھا جو خاصا بڑا تھا ۔ اس میں شیخ صاحب نے بتایا تھا کہ دکن اور مہاراشٹر میں مسلمانوں کی تعلیم فارسی کے ذریعہ ہوتی رہی ھے اور پھر اردو میں ۔ اس کے بعد انھوں نے بہ دلائل ثابت کیا تھا کہ مسلمانان دکن کی مادری زبان اردو ھے ۔ اسی طرح مہاراشٹر یونیورسٹی کمیٹی کے سامنے انھوں نے شہادت دیتے ہوئے مطالبہ کیا تھا کہ مہاراشٹر یونیورسٹی میں مسلمانوں کی تعلیم اردو کے ذریعہ ہو ، اس لئے کہ مسلمانان مہاراشٹر مدت مدید سے اردو ھی بولتے چلے آئے ھیں ۔ شیخ صاحب ھر موقع پر اردو کی حمایت میں سینہ سپر ہوجاتے تھے ۔ قدیم دکنی اردو سے انھیں بیحد شغف تھا اور وہ اسے خوب سمجھتے تھے ۔

شیخ صاحب کا وطن مالوف ناسک تھا لیکن ان کی شادی پونا میں ہوئی تھی ۔ ان کے خسر کے آبا و اجداد مراٹھوں کے زمانۂ حکومت میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے ۔ پیشوا نے ان کے ایک بزرگ کو حکم دیا تھا کہ وہ تعزیہ نکالا کریں ، چنانچہ اُن کا تعزیہ دوسرے تعزیوں کی سربراھی کیا کرتا تھا ۔ پیشوا خود بھی ایک جگہ بیٹھ کر محرم کا جلوس دیکھا کرتا تھا ۔ مراٹھی حکومت نے کچھ رقم بھی اس سلسلہ میں منظور کی تھی جو آج تک اُن کے خاندان والوں کو ملتی ھے ۔ پونا کا محرم دیکھنے کے قابل ہوتا ھے ۔ ایک زمانہ میں لاکھوں ھندو

مسلمان عقیدتاً اس میں شریک ہوا کرتے تھے ۔ لیکن بال گنگا دھر تلک نے ہندوؤں کو محرم کے جلوسوں میں شریک ہونے سے روکا اور محرم کی بجائے انہیں گنپتی کا تہوار منانے میں لگا دیا ۔ اس کے باوجود آج بھی ہزارہا ہندو محرم میں شریک ہوتے ہیں اور نذر و نیاز میں عام مسلمانوں کی طرح حصہ لیتے ہیں ۔ مراٹھے اپنے دور حکومت میں محرم کے ذریعہ ہندو مسلمانوں کو متحد رکھنے کی سعی کیا کرتے تھے ۔

شیخ صاحب بڑے علم نواز تھے اور صاحب علم کی خوب پرکھ رکھتے تھے ۔ صحیح قسم کے آدمی کو صحیح جگہ پر فائز کرانے میں وہ اپنی پوری اخلاقی قوت صرف کردیتے تھے ۔ میرے سامنے متعدد مثالیں ہیں ایسے پروفیسروں کی جو محض ان کی سفارش پر مختلف کالجوں میں مقرر کئے گئے ۔ ان کی سفارش کے معنی یہ تھے کہ صحیح آدمی کا انتخاب کیا جارہا ہے ۔

شیخ صاحب کے والد بہ اعتبار پیشہ ڈاکٹر تھے اور ان کا شمار اپنے دور کے اچھے اور فرض شناس ڈاکٹروں میں تھا ۔ ان کی زندگی کا ایک واقعہ مجھے یاد رہ گیا ہے ۔ ۱۹۰۹ میں ناسک تھیٹر میں جب کلکٹر ضلع جیکسن* کی پیٹھ میں عین اس وقت جب کہ وہ معزز مہمان کی حیثیت سے تھیٹر میں داخل ہو رہا تھا ، پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق گولی ماردی گئی تو اس وقت سب سے پہلے جس شخص نے اسے طبی امداد بہم پہنچائی وہ شیخ عبدالقادر کے والد ماجد ڈاکٹر شیخ سرفراز ہی تھے ۔ اس خدمت کے صلہ میں حکومت نے انہیں کسی خطاب سے بھی نوازا تھا ۔ خدمت الناس کا جذبہ شیخ صاحب نے اپنے والد ماجد سے ورثہ میں پایا تھا ۔

---

* جیکسن عام طور پر "پنڈت جیکسن" کے نام سے مشہور تھا ۔ مراٹھے اس بنا پر اس کے مخالف ہو گئے تھے کہ اس نے مہاسبھائی لیڈر ونایک ساورکر کے بھائی کو دو سال کی سزائے قید دی تھی ۔

شیخ صاحب مشرقی تہذیب اور مشرقی تواضع اور اخلاق کا مکمل نمونہ تھے۔ وہ اپنے والد ماجد کے سامنے دو زانو ہو کر نہایت مودبانہ طریقے سے بیٹھتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی میں کسی اور شخص کو نہیں دیکھا جو شیخ صاحب کی طرح ادھیڑ عمر کو پہنچکر بھی اپنے باپ سے ایسے غیر معمولی احترام سے پیش آتا ہو۔ وہ اسلامی اور مشرقی تہذیب کا بہترین نمونہ تھے۔

نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں

ملازمت سے سبکدوش ہوجانے کے بعد شیخ صاحب نے اپنے تینوں بچوں کے ساتھ ۱۹۳۳ میں حج کیا۔ وہاں مکہ مکرمہ میں انہوں نے اور ان کے لائق صاحبزادے ڈاکٹر عبدالحق نے جو آج کل بمبئی کے ایک کالج میں فارسی کے پروفیسر ہیں، مولانا عبیداللہ سندھی سے ''حجۃ البالغہ'' لفظاً لفظاً پڑھی۔ واپسی پر وہ احادیث وفقہ کی بہت سی کتابیں اپنے ساتھ لائے۔ سلطان ابن سعود مرحوم نے بھی انہیں شرف باریابی بخشا تھا، اور از راہ خوشنودی بخاری مشکل کا ایک نسخہ شاہی کتب خانہ سے عنایت فرمایا تھا۔

پونا میں بہتر برس کی عمر میں ۱۰ دسمبر ۱۹۵۲ کو صبح کے ساڑھے ۹ بجے علم و فضل کا یہ آفتاب ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔ وہ پونا کے مشہور قبرستان ''یسین جھک'' میں اپنی بیوی کے پہلو میں دفن ہوئے۔ ایسے فاضل، شریف النفس، بے غرض خدمتگذار، مخلص اور مرنجاں مرنج اشخاص کبھی کبھار دنیا میں آتے ہیں اور اپنے ماحول کو منور کرکے رخصت ہوجاتے ہیں۔

قرنہا باید کہ تا یک کود کے از لطف طبع
عالم گویا شود یا فاضل شیریں سخن

***

سیّد عبدُاللہ بریلوی

سید صاحب کے بزرگ بخارا سے ہندوستان آئے تھے اور بریلی میں قیام پذیر ہو گئے تھے۔ کوئی تین چار نسلوں سے ان کا خاندان بمبئی میں مقیم ہے۔ اُن کے دادا سید امیر علی ''منشی'' تھے اور انگریزوں کو ''ہندوستانی'' پڑھایا کرتے تھے۔ اُن کے والد الحاج سید محمود علی میونسپل کارپوریشن میں ملازم تھے۔

اُنہوں نے انجمن اسلام ہائی اسکول بمبئی سے انٹرنس کا امتحان پاس کیا۔ پھر وہ الفنسٹن کالج میں داخل ہو گئے اور وہیں سے امتیاز کے ساتھ ایم۔ اے کیا۔ ان کے ہم جماعتوں میں ہمیں چند نام ایسے ملتے ہیں جو بعد کو بہت مشہور ہوئے۔ ان میں جمنا داس دوارکا داس، لفٹنٹ کرنیل جلال شاہ، مہادیو دیسائی اور ویکنٹھ مہتا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ویکنٹھ مہتا کے گھر والوں سے بریلوی کے تعلقات اتنے دوستانہ اور صمیمانہ تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اُنہی کے خاندان کے فرد ہیں۔

ایل ایل۔بی کے امتحان سے فراغت پاتے ہی سید عبداللہ ''بمبئی کرانیکل'' کے ادارتی عملہ میں شامل ہو گئے۔ اُس زمانہ میں زمام ادارت بی۔ جی۔ ہارنیمین کے ہاتھ میں تھی۔ سید حسین، پوتھین جوزیف، وغیرہ بھی بریلوی کی طرح سب ایڈیٹر تھے۔ یہ سب لوگ ہارنیمین کے شاگرد تھے اور یہ حقیقت ہے کہ وہ اپنے کپتان کی رہنمائی میں کرکٹ ٹیم کی طرح کام کرتے تھے۔ بریلوی اپنے استاد کا بیحد احترام کرتے تھے اور تقریروں میں اور نجی گفتگوؤں میں فخریہ کہا کرتے تھے کہ ''میں نے جو کچھ سیکھا ہے وہ سب کچھ انہی کا فیض ہے۔''

ابتدائے دسمبر ۱۹۱۸ میں ہارنیمین، عمر سوبانی اور دوسرے

کانگریسی رہنماؤں نے محمد علی جناح کی قیادت میں بمبئی میں لارڈ ولنگڈن کو الوداعی ایڈریس دئے جانے کی تحریک کی جس کامیابی سے مخالفت کی اسی کا نتیجہ تھا کہ لارڈ ولنگڈن کے جانشین لارڈ لائڈ نے چند مہینے کے بعد ھارنیمین کو جبراً جہاز میں بٹھا کر انگلستان چلتا کردیا۔ ھارنیمین کی غیرحاضری میں بریلوی ''بمبئی کرانیکل'' کے قائم مقام ایڈیٹر مقرر کئیے گئیے۔ مگر یہ انتظام محض عارضی تھا اس لئیے کہ منتظمین ''کرانیکل'' نے ھارنیمین کی وساطت سے انگلستان کے مشہور ادیب محمد مارما ڈیوک پکتھال کو انگلستان سے بلا کر ایڈیٹر مقرر کردیا تھا۔ پکتھال جب تک ایڈیٹر رہے، بریلوی کا نام بھی جائنٹ ایڈیٹر کی حیثیت سے اخبار کے صفحۂ اول پر شائع ھوتا رھا۔ جب پکتھال نے بعض اختلافات کی بنا پر ادارت سے استعفیٰ دے دیا تو بریلوی ''کرانیکل'' کے مستقل ایڈیٹر بنادئے گئیے۔ پکتھال نے اپنے خط مورخہ ۵ اگست ۱۹۲۴ میں مجھے اس واقعہ کی اطلاع یوں دی تھی:— ''آج صبح سے مسٹر بربلوی باقاعدہ طور پر ایڈیٹر مقرر ھوگئیے ھیں۔'' اس تاریخ سے لے کر اپنی زندگی کے آخری دن (۹ جنوری ۱۹۴۹) تک وہ اسی حیثیت سے کام کرتے رہے۔

بریلوی عام ایڈیٹروں کی طرح محض دفتر کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرنے کے عادی نہ تھے۔ وہ بیک وقت ایڈیٹر بھی تھے اور لیڈر بھی۔ ان کے ادارتی کمرہ میں مختلف‌الخیال لیڈر مشورہ کرنے کے لئیے آتے رھتے تھے۔ انھوں نے اعلیٰ صحافتی روایات کو جو انھیں ھارنیمین سے ورثہ میں ملی تھیں، نہ صرف برقرار رکھا بلکہ انہیں بلند سے بلندتر کردیا۔ اپنے عقائد کی بنا پر انہوں نے متعدد مرتبہ قید و بند کی مصیبتیں جھیلیں، لیکن اس کے باوجود وہ اپنی جگہ پر پہاڑ کی طرح اٹل رہے۔ صحافت میں ان کا منتہائے نظر صرف خدمت‌الناس تھا۔ اپنی

۳۵ سالہ صحافی زندگی میں انہوں نے اپنے قلم سے کبھی کوئی مضمون ایسا نہیں لکھا جس میں کسی کی دلآزاری کی گئی ہو یا جس میں سچائی سے ہٹ کر خیالات کی ترجمانی کی گئی ہو۔

میں پہلی مرتبہ بریلوی سے ۱۹۱۸ میں اپنی سرکاری ملازمت کے دوران میں ملا اور ہم دونوں میں بہت جلد دوستی ہو گئی جو آخر وقت تک قائم رہی۔ بریلوی نے آڑے وقتوں میں میری اخلاقی امداد بھی کی تھی اور میں ذاتی طور پر ہمیشہ ان کا مرہون منت رہا۔ بریلوی ھی کی فرمائش پر میں نے اردو کتابوں اور رسالوں پر ''کرانیکل'' کے لئے تبصرہ لکھنا شروع کیا جس کا سلسلہ برسوں چلتا رہا۔

بمبئی کے اخبار ''ٹائمز آف انڈیا'' میں ایک صاحب ''تھرو انڈین آئیز'' (Through Indian Eyes) کے عنوان سے ہر جمعرات کو مضمون لکھا کرتے تھے جن میں ملک کے لیڈروں پر گندگی اچھالی جاتی تھی اور ان کی اخلاقی کمزوریوں کو بے نقاب کیا جاتا تھا۔ یہ کالم ۵ سال تک نکلتے رہے۔ بریلوی کے مشورہ سے میں نے بھی ''کرانیکل'' میں اردو اخبارات کے اقتباسات دینے شروع کردئے جو ہفتہ میں ایک دن بعنوان ''خوشہ چینیاں'' نکلا کرتے تھے۔ ان اقتباسات میں ہندوستانی زندگی کا اچھا پہلو پیش کیا جاتا تھا۔

بریلوی کی وجہ سے ''بمبئی کرانیکل'' میں اردو کی بہت سی چیزیں شائع ہوتی تھیں۔ مثلاً اردو کے متعدد ادیبوں اور شاعروں کے بارے میں نہ صرف مضامین بلکہ ان کی نظموں کے تراجم بھی نکلتے تھے۔ وہ اردو کو ملک کی ''مشترکہ زبان'' کے نام سے پکارا کرتے تھے، اور اپنی زندگی کے آخری سانس تک اس زبان کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔ انہوں نے بمبئی کی ایک ادبی انجمن (بزم خیال) کے متعدد اجلاس کی صدارت کی اور وہاں قابل قدر تقریریں بھی کیں۔ اردو کے بڑے بڑے ادیبوں، ڈراما

نویسوں اور شاعروں کے حالات کے لئے انہوں نے ''بمبئی کرانیکل''
کے کالم کھول رکھے تھے۔ملک کے کسی دوسرے انگریزی اخبار
نے اردو کی اتنی خدمت انجام نہ دی ہوگی جتنی اکیلے ''کرانیکل''
نے انجام دی ۔ اردو کا کام زیادہ تر راقم الحروف کے ذمہ تھا ۔

''بمبئی کرانیکل'' کی کہانی دراصل (غیر منقسم) هندوستان
کی آزادی کی کہانی ہے اس لئے کہ اس نے جنگ آزادی میں
جتنا حصہ لیا اتنا شاید ہی کسی دوسرے اخبار نے لیا ہو۔ کوئی
ملکی تحریک ایسی نہ تھی جس میں وہ شریک نہ رہا ہو، کوئی
ظلم ایسا نہ تھا جسے اس نے نہ اپنا لیا ہو ، کوئی بے انصافی
ایسی نہ تھی جسے اس نے پبلک کے رو برو بغرض مداوا پیش
نہ کیا ہو اور جس کی حمایت میں وہ سینہ سپر نہ رہا ہو۔ اس
کی ایک مثال یہ ہے کہ امرت سر کے خونی واقعات سے بیرونی
دنیا کو سب سے پہلے اسی نے روشناس کرایا ۔ پنجاب کے
اخباروں میں سے کسی نے نہ تو ان خبروں کو شائع کیا اور
نہ ان پر تبصرہ ہی کیا اور وہ کرتے بھی کیسے ! سارا پنجاب
مارشل لا کی آہنی گرفت میں تھا۔ یہ اخبار اپنے زمانے کے قومی
اخباروں میں '' آزادی کی جنگ'' کا سب سے بڑا علم بردار تھا۔

بریلوی کے تعلقات آخر وقت تک محمد علی جناح سے دوستانہ
اور صمیمانہ رہے اگرچہ یہ دونوں الگ الگ مسلک پرگامزن تھے۔
دونوں ایک دوسرے کی عظمت سے واقف تھے۔ بریلوی قائد اعظم
کے کیر کٹر کی صیانت کے بے حد مداح تھے۔ پاکستان بن جانے
کے بعد بھی وہ ان کے اوصاف حمیدہ کے معترف رہے ۔ جناح کا
ذکر کرتے وقت ان کی باتوں میں تلخی نام کو نہ ہوتی تھی ۔
ایک دفعہ بریلوی نے مسز سروجنی نائیڈو کی دعوت کی ۔ میں
بھی اس موقع پر موجود تھا۔ اس وقت گفتگو زیادہ تر محمد علی جناح
کے متعلق رہی ۔ مسز نائیڈو کی طرح بریلوی بھی کہا کرتے
تھے کہ ''دنیا کی کوئی قوت نہ تو جناح کو خرید سکتی ہے

اور نہ رشوت کے ذریعہ اُن کی رائے کو متاثر ہی کرسکتی ہے۔"
یہ واقعہ قیام پاکستان سے چند مہینے پہلے کا ہے۔ پاکستان بن جانے کے بعد بھی وہ اُن کا ذکر احترام سے کیا کرتے تھے۔

حکومت بمبئی کی نظر میں بھی "کرانیکل" کو جو وقعت حاصل تھی اس کا اندازہ اس ایک امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جب گاندھی جی اپنڈی سائیٹس کے آپریشن کے بعد قبل از وقت رہا کئے گئے تو حکومت وقت نے اسسٹنٹ سکریٹری، ہوم ڈیپارٹمنٹ (جے۔سیکڈانل) کو آدھی رات کے وقت بریلوی کے پاس بھیجا تاکہ وہ بہ نفس نفیس رہائی کی خبر اُن تک پہنچائیں۔ بریلوی نے صبح کے اخبار میں وہ خبر نمایاں طور پر شائع کی اور لیڈنگ آرٹیکل کو بدل کراس کی جگہ نیا لیڈنگ آرٹیکل لکھا جو گاندھی جی کی رہائی سے متعلق تھا۔ اسی طرح جب لارڈ ولنگڈن وائسرائے کی حیثیت سے ہندوستان سے رخصت ہوئے تو وہ دستور کے مطابق تاریخ روانگی سے ایک دن پیشتر بمبئی پہنچ گئے اور گورنمنٹ ہاؤس میں مقیم ہوئے۔ یہ دن جمعہ کا تھا اور ہفتہ کے دن ایک بجے پی۔ اینڈ او (.P. & O) کے جہاز سے اُن کی روانگی عمل میں آنے والی تھی۔ ایسے موقعوں پر سی۔ آئی۔ ڈی کے آدمی گورنمنٹ ہاؤس پر "قبضہ" کرلیتے تھے۔ چنانچہ میرے ایک دوست حافظ عثمان خاں مالی کے لباس میں ڈیوٹی ادا کررہے تھے کہ لارڈ ولنگڈن نے علی الصبح انہیں بلا کر پوچھا:— "سی۔ آئی۔ ڈی؟ انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ پھر لارڈ موصوف نے کہا کہ آج کا "کرانیکل" مجھے لا کر دو۔ چنانچہ وہ پرچہ انہیں دیدیا گیا۔ بریلوی نے پورے صفحہ کا لیڈنگ آرٹیکل لکھا تھا جس میں بمبئی اور مدراس کے گورنر کی حیثیت سے اور پھر وایسرائے کی حیثیت سے لارڈ ولنگڈن کی استبدادی کارروائیوں اور کوتاہیوں پر نہایت سخت تنقید کی گئی تھی۔ انہوں نے اور کوئی اخبار طلب نہیں فرمایا اور میرا خیال ہے کہ وہ اس پرچہ

کو ''آخری تحفہ'' کے طور پر اپنے ساتھ ولایت لے گئے ہونگے۔

بریلوی اپنے سیاسی عقائد میں بہت سخت واقع ہوئے تھے۔ وہ جہاں ملک کی آزادی پر ایمان رکھتے تھے اور اس کے لئے ہر ممکن ذریعہ سے کوشاں رہتے تھے وہاں وہ ہمیشہ اس امر کے خواھشمند رہے کہ ملک کی دونوں سیاسی جماعتوں (کانگریس ولیگ) میں ایسا مضبوط رشتہ قائم ہو جائے جو کبھی ٹوٹنے میں نہ آئے۔ اسی غرض سے آنہوں نے ۱۹۴۲ والی تحریک ''کوئٹ انڈیا (Quit India) شروع ہونے سے کچھ عرصہ پہلے چار پانچ مضامین کا ایک سلسلہ لکھا جس میں کانگریس سے کہا گیا تھا کہ اگر وہ چاهتی هے کہ یہ تحریک همہ گیر ہو اور زیادہ سے زیادہ موثر، تو اسے چاهئے کہ وہ مسلم لیگ کا اشتراک عمل ہر قیمت پر حاصل کرے۔ یہ مضامین نہایت مدلل اور زور دار تھے، مگر افسوس هے کہ ان کا مطلب غلط سمجھا گیا اس لئے کہ پنڈت جواهر لال نہرو نے ۸ اگست کو آل انڈیا کانگریس کے بھرے اجلاس میں آنہیں یہ کہکر ''ڈانٹا'' کہ '' آخری بریلوی چاهتے کیا هیں؟ هم جہاں تک جاسکتے تھے، چلے گئے هیں۔ اس سے آگے بڑھنا همارے لئے ناممکن هے۔'' ساتھ هی آنہوں نے لیگ کی لیڈر شپ پر بھی تنقید کی۔ غالباً اسی ''ڈانٹ'' کا نتیجہ تھا کہ حکومت بمبئی نے اس تحریک کے سلسلہ میں دوسرے لیڈروں کی طرح بریلوی کو گرفتار نہیں کیا، حالانکہ اس سے پہلے وہ هر تحریک میں گرفتار کرلئے جاتے تھے خواہ وہ عملاً اس میں شریک رہے هوں یا نہ رہے هوں۔

بریلوی نڈر قسم کے آدمی تھے۔ ویسے تو وہ منحنی اور دبلے پتلے تھے مگر دل گردہ اس قدر قوی تھا کہ وہ بڑے سے بڑے خطرے کو بھی خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ شیکسپیئر نے سیزر کے منہ سے جو الفاظ کہلوائے هیں کہ '' خطرہ جانتا هے کہ میں خطرہ سے کہیں زیادہ خطرناک هوں'' وہ آن پر پوری طرح صادق آتے

تھے۔ اس سلسلہ میں ایک خاص واقعہ بیان کرونگا اور چونکہ میں خود اس کا عینی شاہد رہا ہوں اس لئے میرے دل پر ان کی جرائت رندانہ کا بے حد اثر پڑا ۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اگست ۱۹۳۱ کی ابتدا میں اعلان کیا گیا کہ گانگریس جناح ہال میں کانگرسی مسلمانوں کا ایک جلسہ بریلوی کی صدارت میں منعقد ہوگا لیکن جلسہ شروع ہونے سے بہت دیر قبل خلافتیوں نے ہال پر قبضہ جما لیا اور ''روز نامۂ خلافت'' کے ایڈیٹر قطب الدین صدیقی صدر بھی منتخب کرلئے گئے ۔ میں بھی دفتر کے بعد اتفاقیہ طور پر وہاں پہنچ گیا ۔ دیکھا کہ پشاور کے مشہور کانگریسی ورکر حکیم عبدالجلیل خون میں لتھڑے ہوئے سیڑھیوں پر سے اوپر والے کمرے میں لیجائے جارہے ہیں۔ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ہڑبونگ میں ان پر چاقو سے حملہ کیا گیا تھا جس سے وہ بری طرح زخمی ہوگئے تھے ۔ ہال میں پولیس بڑی تعداد میں موجود تھی لیکن جیسا کہ میرے دوست انسپکٹر حسن علی نے بتایا وہ وہاں صرف اس لئے آئی تھی کہ تماشا دیکھے اور دم نہ مارے۔ میں بریلوی کے پاس کھڑا تھا اور بریلوی ''صدر'' جلسہ میں کے پاس براجمان تھے اور اپنی جگہ سے ہٹنے کا نام نہ لیتے تھے۔ میں نے ایک دو دفعہ آن سے چپکے سے کہا بھی کہ ''صورت حالات خطرناک ہوتی جارہی ہے اور اس لئے یہاں سے آپ کا چلا جانا مناسب ہوگا ،'' مگر ہر مرتبہ انہوں نے یہی کہا کہ ''میں اس جلسہ کا صدر ہوں اور میں اپنے اس حق کا استعمال کرونگا خواہ اس کوشش میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔'' اتنے میں ایک موالی کو میں نے یہ کہتے سنا کہ ''سب کو مارنے کی بجائے بہتر یہ ہے کہ بریلوی کی انتڑیاں نکال دی جائیں۔'' میں نے مڑ کر حسن علی سے کہا کہ کم سے کم اس شخص کو تو گرفتار کرلو ۔ انہوں نے پھر پہلی بات دہرادی ۔ میں نے

ان سے کہا کہ ''اچھا تو اس کی احتیاط رکھنا کہ بریلوی پر کسی قسم کی آنچ نہ آنے پائے۔'' اس کا انہوں نے پکا وعدہ کرلیا۔ تناؤ کی یہ حالت تھوڑی دیر رہی ہوگی کہ سوالیوں نے جن سے سارا ہال بھرا ہوا تھا، اپنے آقاؤں کے اشارے پر توڑ پھوڑ کی مہم شروع کردی۔ کرسیاں توڑدی گئیں، جانے پہچانے اور نامچیں کانگریسی مسلمانوں کو تاک تاک کر بری طرح زد و کوب کیا گیا، کھڑکیوں کے شیشے توڑ دئے گئےاور ایک زبردست ہنگامہ کی سی کیفیت پیدا کردی گئی۔ جواہرلال نہرو بھی اس انتشاری کیفیت کے پیدا ہونے سے چند سیکنڈ پیشتر اوپر چلے گئے تھے۔ اس حالت میں انسپکٹر حسن علی کے آدمی بریلوی کو اپنی حفاظت میں اوپر لے گئے۔ جب خوب ٹوٹ پھوٹ ہوچکی تو پولیس نے ہال خالی کرا لیا، مگر کوئی سوالی گرفتار نہیں کیا گیا۔ بعد کو مجھے بتایا گیا کہ یہ سوالی بارہ آنے روز پر لائے گئے تھے۔ اس تمام ہنگامہ کی تہ میں جو جذبہ کار فرما تھا وہ یہ تھا کہ قوم پرست مسلمان اتنے مرعوب ہوجائیں کہ سارے شہر میں کہیں بھی اپنا کوئی جلسہ منعقد نہ کرسکیں۔ برطانوی حکومت بھی اپنے دور شباب میں کن کن ہتھکنڈوں سے کام لیتی تھی! اس ہڑبونگ کا میرے دل پر بہت برا اثر پڑا اور میں نے سوچا کہ اگر غنڈہ گردی کی قسم کی چیزیں ہماری سیاسی زندگی میں داخل ہوگئیں تو پھر ہماری آئینی ترقی کا خدا ہی حافظ ہے۔ میں نے اس ہنگامہ پر ایک شاہد کی حیثیت سے یکے بعد دیگرے تین گمنام مضمون ''کرانیکل'' میں شائع کرائے جن میں حکومت اور خلافتیوں کے طرز عمل پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی۔

غالباً ۱۹۴۲ کا واقعہ ہے کہ بمبئی کی گودی میں گولہ بارود (ٹی۔این۔ٹی) سے بھرے ہوئے ایک جہاز میں آگ لگ گئی۔ دوسرے جہاز کو اس کا کپتان ساحل سے دور لے گیا ورنہ

وہ بھی لپیٹ میں آجاتا۔ اتنا بڑا حادثہ بمبئی میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ اس جہاز کے پہلے دھما کے میں کافی جانی نقصان ہوا۔ سکیڑوں لاشیں سمندر میں تیر رہی تھیں، کسی کا دھڑ کہیں تھا اور کھوپری کہیں۔ قریب کی سڑکیں بھی لاشوں سے پٹ گئی تھیں۔ ریل کی پٹریاں آڑ آڑ کر دور دور جاپڑی تھیں۔ جہاز کا لنگر کوئی ایک میل پرے جا کر گرا تھا۔ پہلے دھما کے بعد میں تحقیقات کی غرض سے مختلف جہازی کمپنیوں سے ہوتا ہوا ''کرانیکل'' کے دفتر میں پہنچا۔ بریلوی اسی وقت آئے تھے۔ عین اس وقت ایک رپورٹر گھبرایا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ ''جاپانی ہوائی جہازوں نے حملہ کر دیا ہے۔ میں نے خود گولے گرتے ہوئے دیکھے ہیں'' حالانکہ وہ لوہے کے ٹکڑے تھے جو فضا میں آڑ آڑ کر گر رہے تھے۔ بہرحال بریلوی نے کمرے کی ساری کھڑکیاں کھلوادیں اور نہایت اطمینان سے کام کرنے بیٹھ گئے۔ میں وہیں تھا کہ دوسرا دھماکہ ہوا جو پہلے سے کہیں زیادہ خوفناک تھا۔ اگر کھڑکیاں بند ہوتیں تو یا تو ان کے قبضے کھل جاتے یا وہ ٹوٹ جاتیں۔ مگر تیز ہوا کا جھونکا کھلی کھڑکیوں میں سے صاف گزر گیا اور عمارت کو کوئی گزند نہیں پہنچا حالانکہ میلوں تک عمارتیں ان دھماکوں سے بری طرح متاثر ہوئی تھیں۔ مجھے آج بھی بریلوی کی کوہ وقاری یاد ہے کہ طرح طرح کی افواہوں اور دھماکوں کے باوجود بھی وہ اپنی کرسی پر ڈٹے رہے اور اپنا کام کرتے رہے۔

بریلوی سارے ملک کے جرائد کی انجمن کے صدر تھے اور اس حیثیت سے انہوں نے بہت مفید خدمات انجام دی تھیں۔ وہ حکومت بمبئی کی پریس ایڈوائیزری کمیٹی کے بھی صدر تھے اور انہوں نے اپنی صدارت کے زمانے میں اخبارات کی آزادی کو کسی قیمت پر قربان ہونے نہیں دیا۔ وہ ہر موقع پر اخباری آزادی کے حق میں لڑتے رہے۔ انہوں نے صحافتیوں کی تنخواہیں

بڑھوائیں اور ان کے لئے ہر قسم کی آسانیاں بہم پہنچائیں۔ انہوں نے نوآموز صحافیوں کو اپنے یہاں ٹریننگ دی تاکہ وہ آگے چل کر اخبار نویسوں کی حیثیت سے ملک و ملت کی خدمت کریں۔ محض بریلوی کی ترغیب و تحریص سے متعدد مسلمان اس "لائن" میں نظر آنے لگ گئے تھے، حالانکہ تیس پینتیس سال پیشتر ملک میں مسلمان اخبار نویسوں کا اس قدر قحط تھا کہ مولانا محمد علی کو راجہ غلام حسین کی وفات پر باوجود تلاش بسیار کے "کامریڈ" کے لئے کوئی اچھا اسسٹنٹ نہ مل سکا۔

۱۰ جنوری ۱۹۴۴ کو انہوں نے جرائد کی انجمن کے اجلاس منعقدہ مدراس کی صدارت کی۔ اپنے ایڈرس میں انہوں نے تمام اخبار نویسوں کو اپنے حقوق کے حصول کے لئے منظم ہو جانے پر زور دیا۔ آخر میں انہوں نے لکھا کہ "رواداری، انصاف اور سمجھوتہ کی فضا میں جسے صرف جمہوریت ہی فروغ دے سکتی ہے، آزاد پریس زندہ رہ سکتا ہے۔ آزاد پریس سچی جمہوریت کے لئے اتنی ہی لازمی چیز ہے جتنی سچی جمہوریت آزاد پریس کے لئے ضروری ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم پریس کو آمرانہ حکومت کے خطرے سے بچائیں۔"

بریلوی عقیدہ کے اعتبار سے کانگریسی تھے اور زندگی کے آخری لمحہ تک اسی مسلک پر گامزن رہے، لیکن اپنی شرافت نفس کی وجہ سے وہ تمام سیاسی جماعتوں کے محبوب تھے۔ مختلف سیاسی جماعتوں کے افراد اپنی مشکلات لے کر ان کے پاس آتے تھے۔ بریلوی آخر وقت تک کھدر پوش رہے۔ کھدر پوشی ان کے سیاسی عقیدہ میں شامل تھی۔

افسر کی حیثیت سے ان کا برتاؤ اپنے عملہ کے ساتھ نہایت ہی شریفانہ تھا۔ انہوں نے کبھی تحکم پسندی سے کام نہیں لیا۔ یہی وجہ ہے کہ عملہ کے تمام آدمی دل و جان سے ان کے ساتھ کام کرنے پر ہمہ وقت تیار رہتے تھے۔ یہ خدائے برتر کی

مہربانی تھی کہ بریلوی کو ایسے وفادار رفقائے کار ملے جن پر وہ ہمیشہ فخر کرتے رہے۔

کارڈینل نیومین نے شریف آدمی کی جو تعریف کی ہے وہ یہ ہے:- ''اور اسی لئے کہا جاتا ہے کہ شریف آدمی وہ ہے جو دوسروں کو دکھ نہیں پہنچاتا۔'' ہمارے رسول مقبول (ص) نے مومن کی جو تعریف فرمائی ہے وہ یہ ہے:- ''مومن وہ ہے جس کی زبان و قلم سے بنی آدم محفوظ رہیں۔'' .... ''ایک آدمی اس وقت تک سچا مومن نہیں ہوتا جب تک کہ اس کی زبان اور اس کا دل ایک نہ ہوں۔'' بریلوی پر یہ تینوں تعریفیں پوری طرح سے منطبق ہوتی تھیں۔ وہ ساری عمر ''خدمت الناس'' کو ''افضل الاشغال'' سمجھ کر اس میں مشغول رہے۔ ان کی زندگی کی پاکیزگی ان کے چہرے سے ہویدا تھی۔ ان میں ایک خاص کشش اور جاذبیت تھی جو بہت کم دیکھنے میں آتی ہے۔

وہ برطانوی حکومت کے سب سے بڑے نقاد تھے اور انہوں نے اسے کبھی نہیں بخشا۔ باوجود اس کے حکومت کے افراد ان کی دل سے عزت کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ لالچ یا کسی اور ترغیب سے انہیں جادۂ حق سے نہیں ہٹایا جاسکتا۔ یہی وہ سبق ہے جو انہوں نے برسوں جناح اور ہارنیمین کی صحبت میں رہ کر سیکھا تھا۔

ان کے دوستوں میں ہر قسم کے آدمی تھے، سیاسی بھی اور غیر سیاسی بھی، ہندو بھی اور مسلمان بھی، کانگریسی بھی اور لیگی بھی، پارسی بھی اور مہاسبھائی بھی، اور وہ ہر ایک سے خندہ پیشانی سے تبادلۂ خیال کرتے تھے۔ میں نے سخت بحثوں کے دوران میں بھی انہیں بگڑتے نہیں دیکھا۔ وہ نہایت نرمی سے دوسروں پر اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے تھے اور نہایت صبر و سکون سے دوسروں کی بات سنتے تھے۔

جہاں ایک طرف گاندھی جی سے ان کے صمیمانہ تعلقات

تھے وہاں دوسری طرف مولانا محمد علی سے بھی گہرے روابط تھے ۔ مولانا نے ایک مرتبہ انہیں ایک طویل خط لکھا اور بتایا کہ فلاں معاملہ میں ان کا موقف کیا ہے اور ان سے درخواست کی کہ وہ ان کے نقطۂ نظر کی وضاحت ''کرانیکل'' میں کردیں ، اس لئے کہ ایسوشی ایٹڈ پریس نے ان کی مرادآباد والی تقریر کا خلاصہ غلط دیا تھا ۔ یہ ۱۹۲۵ کا واقعہ ہے ۔ بریلوی اقبال کے بھی بڑے مداح تھے ۔ انہوں نے نہ صرف مختلف کالجوں اور دوسرے اداروں میں اقبال پر متعدد تقریریں کیں بلکہ اپنے ملنے والوں سے اقبال پر مضامین لکھوائے اور انہیں اپنے اخبار میں شائع کیا ۔ ''کرانیکل'' نے اقبال کا پیغام پھیلانے میں جو شاندار خدمات انجام دیں وہ ملک کے کسی دوسرے انگریزی اخبار سے بن نہ آئیں ۔

میں دسمبر ۱۹۴۸ میں پرمٹ پر بمبئی گیا تھا اور وہاں تقریباً روزانہ اُن سے ملنے کے لئے جایا کرتا تھا ۔ ہفتہ (۸ جنوری) کی رات کو انہوں نے میری اور ڈاکٹر رفیق ذکریا کی دعوت کی اور ہم رات کے گیارہ بجے تک ہندوستان اور پاکستان کی باتیں کرتے رہے ۔ دوسرے دن اتوار کی صبح کو اُن پر قلب کا دورہ پڑا ۔ ایسے دورے پہلے بھی پڑچکے تھے ۔ لیکن اس کے باوجود وہ برابر کام کرتے رہے ۔ اسی دن سہ پہر کو راج گوپال چاریا (گورنر جنرل) کو اخبارات کی کانفرنس کی طرف سے ایڈریس دیا جانے والا تھا ۔ چونکہ بریلوی صدر تھے اس لئے انہوں نے قلبی تکلیف کے باوجود ایڈریس تیار کرکے بھیجدیا تاکہ وہاں پڑھا جاسکے ۔ اس کے بعد اُن کے دل پر ایک اور زبردست دورہ پڑا جس کے جھٹکے بار بار محسوس ہوئے اور بالآخر رات کے نو بجے وہ اپنے رب سے جاملے ۔

پیر کی صبح کو میں بیٹھا چائے پی رہا تھا کہ ''ٹائمز'' کے پہلے صفحہ پر ان کے انتقال کی خبر پڑھی جس کا عنوان تھا : ''City Editor Dead'' ۔ میں فوراً ان کے در دولت پر پہنچا ۔

ان کی پیشانی کو بوسہ دیا اور تجہیز و تکفین میں مشغول ہو گیا۔ ان کے مکان پر راج گوپال چاریا سے لے کر حکومت کے ادنیٰ ملازم تک تعزیت پیش کرنے کے لئے موجود تھے۔ ان کا جنازہ نہایت شان و شکوہ سے اٹھا۔ اس کے ساتھ ہر قوم و مذہب اور عقیدہ کے لوگ ہزارہا کی تعداد میں موجود تھے۔ جنازہ قبرستان (سونا پور) لیجایا گیا جہاں ان کے بعض ہندو دوستوں نے پوچھا کہ کیا ہم بھی نماز جنازہ میں شریک ہوسکتے ہیں؟ اور جب انہیں اثبات میں جواب مل گیا تو وہ بھی مسلمانوں کے دوش بدوش ہاتھ باندھ کر صف آرا ہو گئے۔ میں نے اپنی زندگی میں ایسا عجیب و غریب سماں پہلی بار دیکھا تھا اور اس لئے قدرتی طور پر میں اس سے بےحد متاثر ہوا۔ نماز جنازہ میں جو غیر مسلم شریک ہوئے ان میں ان کے بچپن کے دوست اور ہم جماعت ویکنٹھ مہتا خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ اس وقت وہ حکومت بمبئی کے وزیر مالیات تھے۔ جنازہ کے ہمراہ ممتاز کانگریسی، لیگی، کمیونسٹ، سوشلسٹ، پارسی، سکھ، مہا سبھائی اور بدھ سبھی تھے۔

حافظا گر وصل خواہی صلح کن با خاص و عام
با مسلماں اللہ اللہ با برہمن رام رام

بریلوی کی زندگی بہت بھر پور تھی۔ صبح سے رات تک وہ قومی کاموں میں منہمک رہتے تھے اور بالکل بے غرض ہو کر۔ ان کے کسی کام میں ذاتی غرض یا نمود کو مطلق کوئی دخل نہ تھا اور نہ وہ کوئی کام حصول جاہ کی خاطر انجام دیتے تھے۔ وہ ہر کام کو فرض منصبی سمجھ کر کیا کرتے تھے اور جیسا کہ نیکی آپ اپنا معاوضہ ہے، وہ کام کرکے خوش ہوجایا کرتے تھے کہ کارے کردم۔ ہارنیمین کی طرح انہوں نے بھی گورنمنٹ ہاؤس کا کبھی طواف نہیں کیا، حالانکہ مجھے ذاتی طور پر علوم ہے (اس لئے کہ ہمارے دفتر کا ان باتوں سے براہ راست تعلق تھا) کہ انگریزی دور میں لوگ حکام سے ملنے اور سرکاری

تقاریب میں شامل ہونے کی خاطر کیا کیا جتن اور کوششیں کیا کرتے تھے ۔ وہ زندگی بھر انسانیت کے خادم رہے ۔

وہ کانگریسی تھے لیکن بالکل نڈر ہو کر کانگریس والوں کی کمزوریوں پر نکتہ چینی بھی کیا کرتے تھے ۔ نہ صرف یہ بلکہ ان کے اخبار میں گاندھی جی کی پالیسی پر سخت نکتہ چینی بھی ہوتی تھی ۔ ہمارے دفتر کے ایک افسر جے ۔ ای ۔ سنجانا کبھی کبھار ''ہندوستانی''، ''ہریجن'' اور ''مسلمان اور گائے'' کے مسائل کے بارے میں گاندھی جی پر کڑی تنقیدی مضامین لکھ کر بھیجتے تھے ۔ یہ سب ''کرانیکل'' میں باقاعدگی سے چھپتے تھے ۔ سنجانا صاحب کے یہ مضامین ایک کتابی صورت میں ''Caste & Outcaste'' کے نام سے چھپ چکے ہیں ۔ اس کتاب نے کانگریسی حلقوں میں تہلکہ مچا دیا تھا ۔ بریلوی نے اس پر جو مبسوط ریویو لکھا تھا وہ لیڈنگ آرٹیکل کی شکل میں تھا ۔ حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اخبار کو رائے عامہ کا اکھاڑا (Forum) بنا رکھا تھا تاکہ موافق اور مخالف نظریے پبلک کے سامنے آجائیں، اگرچہ وہ خود کانگریسی عقائد رکھتے تھے اور ان کا اخبار بھی کانگریسی خیالات کا علمبردار تھا ۔ وہ لیپا پوتی کی پالیسی کے قائل نہ تھے، بلکہ چاہتے تھے کہ جہاں حکومت ہر خرابی سے پاک ہو وہاں لیڈران قوم بھی اعلیٰ صفات سے متصف ہوں ۔ انہوں نے کبھی ریا کاری کے حضور میں خراجِ تحسین پیش نہیں کیا ۔

۱۹۲۸ میں مولانا راشد الخیری بمبئی تشریف لائے تاکہ اپنے اسکول ''مدرسۃ البنات'' کے لئے چندہ جمع کریں ۔ میں انہیں بریلوی سے ملانے کے لئے لے گیا ۔ اردو کے ایک زبردست ادیب سے مل کر وہ بے حد خوش ہوئے اور انہوں نے اپنے دوستوں کے نام خطوط لکھ کر دئے تاکہ مولانا کا کام آگے بڑھے ۔ انہوں نے خود بھی اپنی جیب سے معقول امداد دی ۔ تیس سالہ

دوستی کے دوران میں، میں مختلف کاموں کے لئے ان کی خدمت میں پہنچا کرتا تھا۔ خواہ معاملہ کسی طالب علم کے وظیفہ کا ہو، یا کسی مسجد یا مدرسہ کے چندہ کا، یا کسی جلسہ کے لئے مالی امداد کا، وہ کبھی خالی ہاتھ جانے نہ دیتے تھے۔ ''بزم خیال'' کے جلسوں کے لئے بھی میں نے ان سے کئی بار عطیے لئے حالانکہ وہ کوئی مالدار آدمی نہ تھے۔

ان کے انتقال سے جو جگہ خالی ہوئی ہے وہ برسوں تک پر نہ ہوسکیگی اس لئے کہ صحافت کی جو شاندار روایات ھارنیمین، سید حسین اور پکتھال نے قائم کیں وہ ان کی ذات گرامی پر ختم ہوگئیں۔ مسلمانوں میں بریلوی کی طرح کے لکھنے والے آج بھی شاذ ھی ہونگے۔ وہ اپنے پیچھے ایک بیوی، تین بچے اور ہزاروں دوست چھوڑ گئے ھیں جو انہیں یاد کر کے ہمیشہ اشک فشاں رھینگے۔ اقبال نے مرد مومن کی علامت یہ بتائی ہے :۔

نشان مرد مومن با تو گویم ۔ چو مرگ آید تبسم برلب اوست

جو تبسم زندگی بھر بریلوی کے چہرہ پر رقصاں رہا، وھی مرنے کے بعد بھی ان کے چہرہ سے عیاں تھا :۔

شدیم خاک و لیکن ببوئے تربت ما
تواں شناخت کزیں خاک مردمے خیزد !

***

لارڈ برے بورن

میرے سرکاری فرائض میں یہ بات بھی داخل تھی کہ جب کبھی کوئی ایسا شخص گورنر سے ملنے کے لئے آتا جو انگریزی سے نابلد ہوتا تو ترجمانی کے فرائض ادا کرنے کے لئے بالعموم مجھے گورنمنٹ ہاؤس جانا پڑتا۔ لارڈ ولنگڈن کے بعد سے جتنے گورنر آئے ہر ایک کی خدمت میں مجھے متعدد بار اس کام کے لئے جانا پڑا۔

لارڈ برے بورن گورنروں میں سب سے زیادہ با اخلاق تھے، اس لئے کہ ان سے پہلے جب کبھی میں ترجمانی کے سلسلہ میں گورنمنٹ ہاؤس جاتا تو مجھے کھڑا رہنا پڑتا تھا اور اسی غرض سے کمرے میں صرف دو کرسیاں رکھی جاتی تھیں، ایک گورنر کے لئے اور دوسری ملاقاتی کے لئے۔ لارڈ برے بورن پہلے گورنر ہیں جنھوں نے چوبدار سے "ہندوستانی" میں یہ کہکر کرسی منگوائی کہ "ایک اور کرسی لاؤ۔" وہ اتنے با اخلاق تھے کہ وہ اپنی کرسی پر اس وقت تک نہ بیٹھتے جب تک کہ ہم دونوں نہ بیٹھ جاتے۔ وہ بہت خاندانی آدمی تھے اور ان کی ہر بات سے لارڈپن برستا تھا۔

ایک مرتبہ کوئی سندھی زمیندار ملاقات کے لئے آئے۔ وہ پیر پگارو کی رہائی کے سلسلہ میں آئے تھے۔ گورنر نے جواباً کہا کہ "حکومت عدالتی فیصلوں میں مداخلت نہیں کیا کرتی، لیکن میں متعلقہ کاغذات منگواؤنگا اور اگر میں نے بچت کی کوئی صورت دیکھی تو میں بالضرور دخل دونگا۔" اس کے بعد ملاقاتی نے مجھ سے کہا کہ "گورنر صاحب کو میری وفاداری کا یقین دلادو۔" چنانچہ میں نے گورنر تک ان کا پیام وفاداری پہنچا دیا۔ گورنر نے شکریہ ادا کیا اور فرمایا کہ "مجھے اس اظہار وفاداری سے بیحد مسرت ہوئی ہے۔" اس کے بعد ملاقاتی نے

کہا کہ " گورنر صاحب سے کہدو کہ حکومت کے لئے میرا سر بھی حاضر ہے۔" گورنر اس پیشکش سے اور بھی محظوظ ہوئے اور انہوں نے قدر دانی کے مناسب الفاظ میں شکریہ ادا کیا اور میں نے ان کے جذبات ملاقاتی تک پہنچا دئے۔ اس پر ملاقاتی نے کہا :۔ "اگر گورنر صاحب واقعی اتنے خوش ہیں جتنا کہ وہ ظاہر کرتے ہیں تو ان سے کہو کہ مجھے سر بنادیں۔" یہ جملہ سنتے ہی میں بے اختیار کھل کھلا کر ہنس پڑا اس امر کا احساس کئے بغیر کہ میں کہاں ہوں اور میرا فرض منصبی کیا ہے۔ خود فراموشی کے یہ لمحات صرف چند سیکنڈ تک رہے۔ اتنے میں لارڈ برے بورن نے میری طرف دیکھا۔ اس وقت مجھے موقع کی نزاکت کا احساس ہوا۔ مگر تیر چھٹ چکا تھا، اور اس سے قبل کہ ان کے منہ سے کوئی لفظ نکلے میں نے کہنا شروع کر دیا :۔ " اس معزز ملاقاتی نے ایسا ذو معنی لفظ استعمال کیا ہے کہ جب یور ایکسیلنسی اس کی سماعت فرمائینگے تو میری طرح ہنسے بغیر نہ رہینگے۔ وہ ذو معنی لفظ سر ہے جس کے ایک معنی ہیں Head اور دوسرے معنی ہیں نائٹ ہڈ Knighthood۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر آپ میرے سر کی پیشکش سے خوش ہیں تو آپ کو چاہئے کہ مجھے نائٹ کے خطاب سے سرفراز فرمائیں۔" لارڈ برے بورن بہت محظوظ ہوئے اور غالباً میرا دل رکھنے کو پہلے تو خوب ہنسے اور پھر فرمایا :— "ایک سال سے زیادہ عرصہ ہوا ہے کہ آپ کو سی۔ آئی۔ ای کا خطاب دیا گیا ہے اور حکومت کی بالعموم یہ روایت (Convention) رہی ہے کہ وہ ایک بڑے خطاب کے بعد تین سال کے اندر دوسرا بڑا خطاب نہیں دیتی۔ لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اب کی مرتبہ جو اعزاز آپ کو ملیگا وہ نائٹ ہڈ ہوگا۔" ملاقات کے اختتام پر گورنر نے نہایت خندہ پیشانی اور گرم جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملائے اور شکریہ ادا کیا۔ ان دونوں باتوں سے میں

سمجھ گیا کہ سر سے بلا ٹل گئی ۔ اگر ان کی جگہ کوئی بد دماغ گورنر ہوتا تو خدا جانے وہ میری بدتمیزی کا کیا اثر لیتا ۔ بہر حال میں لارڈ موصوف کی وسیع القلبی کا ہمیشہ احسانمند رہا ۔

لارڈ برے بورن کی ایک اور بات لکھے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ برطانوی حکومت کے زمانہ میں قاعدہ تھا کہ جب کبھی گورنر بمبئی سے باہر جاتا یا باہر سے بمبئی آتا تو ہوم ممبر، ہوم سیکریٹری، پولیس کمشنر، میئر، بری اور بحری افسران اور شریف (Sheriff) وغیرہ اسے پہنچانے یا اس کی پذیرائی کرنے کے لئے اسٹیشن یا بندر پر موجود رہتے ۔ لارڈ برے بورن پہلے گورنر ہیں جنہوں نے اس رواج میں اصلاح کی اور احکام نافذ کر دئے کہ ایک دو افسروں کو چھوڑ کر باقیوں کی موجودگی کی مطلق ضرورت نہیں ۔

بمبئی کی گورنری کی میعاد کے اختتام پر لارڈ برے بورن ہندوستان کے وایسرائے اور گورنر جنرل بنا دئے گئے تھے ۔ ابھی چند ہی دن گزرے ہونگے کہ وہ بیمار پڑے اور مختصر سی علالت کے بعد کلکتہ کے ایک ہسپتال میں وفات پا گئے ۔

مسز نائیڈو مجھ سے فرماتی تھیں کہ ”لارڈ برے بورن حقیقی معنوں میں شریف آدمی تھے ۔ قوم پرستوں کے نقطۂ نظر سے بھی ہم کانگریسیوں کو ان کی سیاسی پالیسی سے کبھی کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی ۔“

***

مولوی نذیر احمد خجندی

مولوی نذیر احمد خجندی میرٹھ کے رہنے والے تھے اور چونکہ ان کا تعلق پرانی وضع کے علمی گھرانے سے تھا اس لئے انہوں نے پہلے تو درس نظامی کی تکمیل کی اور پھر طب کا مطالعہ کیا، اگرچہ طبیب کی حیثیت سے وہ بمبئی میں صرف تھوڑے سے عرصہ کے لئے جلوہ گر ہوئے۔ ان کے ایک بھائی (مولوی مختار احمد صدیقی) تبلیغ اسلام کے سلسلہ میں جنوبی افریقہ میں مقیم ہوگئے تھے۔ ان کے دوسرے بھائی (مولوی عبدالعلیم صدیقی) سنگاپور، ماریشس وغیرہ علاقوں میں مدتوں تبلیغ کا کام کرتے رہے جہاں آن کے قائم کردہ ادارے آج بھی مصروف تبلیغ ہیں۔

خجندی نظم و نثر دونوں پر یکساں قدرت رکھتے تھے۔ ان میں ایک وصف یہ تھا کہ وہ مقرر کی تقریر کو ساتھ کے ساتھ نظم کا جامہ پہناتے جاتے تھے۔

ان کی ایک دو خدمات تو ایسی ہیں جنہیں بمبئی والے کبھی فراموش نہیں کرسکتے۔ انہوں نے محمد ذکریا منہیار اور حکیم ابو یوسف اصفہانی کے ساتھ ملکر آزاد میدان میں عیدین کی نماز کا ڈول ڈالا اور سر غلام حسین سے جو آن دنوں محکمۂ رفاہ عامہ کے وزیر تھے، آزاد میدان کے ایک حصہ میں نماز باجماعت ادا کرنے کی اجازت حاصل کرلی۔ اس وقت سے وہاں عیدین کی نمازیں بڑی شان سے ادا ہوتی ہیں۔

ان کی دوسری خدمت یہ تھی کہ وہ شہر بمبئی کے تمام مسلم اداروں کی طرف سے عید میلاد کی تقریب نہایت شاندار طریقہ سے کاؤسجی جہانگیر ہال میں مناتے تھے۔ ان جلسوں میں سب مذاہب کے لیڈروں کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔

مسز نائیڈو ، سردار تیجا سنگھ اور پارسی موبد اس پلیٹ فارم سے ایک سے زائد مرتبہ تقریریں کرچکے ہیں۔ محمد علی جناح ، نواب بہادر یار جنگ ، مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلم اکابر بھی ان موقعوں پر پبلک سے خطاب کرچکے ہیں۔

پچیس تیس سال پہلے بمبئی کے چند دوستوں نے ''بزم خیال'' کی تشکیل کی تھی۔ راقم الحروف اس بزم کا صدر تھا اور خجندی نائب صدر۔ سوائے میرے باقی سب عہدیدار شاعر تھے۔ اس کی زیر سرپرستی ہم نے دو تین دفعہ آل انڈیا مشاعرے منعقد کئے جو بیحد مقبول ہوئے۔ اسی بزم کی بدولت اہل بمبئی جوش ملیح آبادی ، آزاد انصاری ، سیماب اکبر آبادی ، بسمل الہ آبادی ، ساغر میرٹھی ، احسن مارہروی جیسے شعرا سے متعارف ہوئے۔ مولوی خجندی ان مشاعروں کے انعقاد میں تن ، من ، دھن ایک کردیتے تھے۔

مولوی صاحب برسوں مسجد خیرالدین کے امام رہے۔ یہ وہ مسجد ہے جسے مولانا ابوالکلام آزاد کے والد ماجد نے تعمیر کرایا تھا ، اور آج بھی وہ انہی کے نام سے موسوم ہے۔ اس مسجد کی آمدنی اور مصارف کبھی متوازن نہیں ہوئے ، لیکن اس کے باوجود وہ اس سے لپٹے رہے حالانکہ انہیں ہر مہینہ مصارف پورا کرنے کی غرض سے اچھی خاصی تگ و دو کرنی پڑتی تھی۔

خجندی رشتہ میں مولانا محمد اسمعیل میرٹھی کے بھتیجے تھے اور اس اعتبار سے شاعری ان کی خاندانی چیز تھی۔ ان میں غضب کی آمد تھی۔ وہ ہر وقت شعر کہہ سکتے تھے۔

انہیں مشاعرے منعقد کرانے کا شوق جنون کی حد تک تھا۔ وہ عرسوں کے موقعوں پر بھی مشاعرے منعقد کراتے تھے۔ شیخ مصری کی درگاہ (بمبئی) میں انہوں نے متعدد مشاعرے منعقد کئے۔ ایک موقع پر طرح تھی :-

باتیں کریگی آج اجل مجھ سے پیار کی

کئی ایک شعرا نے اس پر گرہیں لگائیں، لیکن مولوی صاحب کو منشی اختر وارثی کی گرہ سب سے زیادہ پسند آئی اور وہ دیر تک داد دیتے رہے۔ وہ گرہ یہ ہے:-

بالیں سے ہٹئے آپ سے دیکھا نہ جائیگا
"باتیں کریگی آج اجل مجھ سے پیار کی"

ان کا داد دینے کا انداز بھی مخصوص تھا۔ کبھی کہتے "واہ، کیا شعر کہا ہے!" کبھی فرماتے، "دونوں مصرعے برابر کے ہیں" کبھی فرماتے، "خوب سوچ کے کہا ہے" وغیرہ وغیرہ۔ نا ممکن تھا کہ اچھا شعر پڑھا جائے اور وہ چپ رہیں۔ ایک دفعہ باندرہ میں "مولانا کی مسجد" کی ملحقہ درگاہ میں مشاعرہ ہوا۔ خجندی صدر تھے۔ اختر وارثی نے ذیل کا شعر پڑھا جس پر حاضرین نے انہیں خوب داد دی:-

زاہد کو بڑا ناز ہے مسجد پہ الہی
رندوں کی دعا ہے اسے میخانہ بنادے

مولوی صاحب نے داد میں مطلق حصہ نہیں لیا، مگر اتنا فرمایا:- "اختر صاحب، وارثی ہو کر ایسی باتیں!"

خجندی بڑی پاکیزہ سیرت کے مالک تھے۔ وہ بیحد متوکل اور صابر انسان تھے۔ کڑے وقتوں کو انہوں نے جس صبر و شکر سے جھیلا وہ انہی کا حصہ تھا۔

ایک رات وہ مسجد سے گھر جارہے تھے کہ موٹر کی جھپیٹ میں آگئے اور بری طرح زخمی ہوئے۔ سب کا خیال تھا کہ وہ جانبر نہ ہوسکینگے، لیکن خدا نے فضل کیا اور وہ بچ گئے۔ اس کے بعد یکایک ان کے دل میں حج بیت اللہ کا شوق پیدا ہوا اور وہ عازم حجاز ہو گئے۔ حج کے بعد وہ بیمار پڑے اور مدینہ منورہ میں انتقال کر گئے۔ زندگی میں وہ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ انہیں سر زمین حجاز میں موت نصیب ہو۔ بالآخر خدا نے ان کی دعا قبول فرمائی۔

شیخ حسن علی

شیخ صاحب پونا کے رہنے والے تھے۔ ان کے اکثر اعزا یا تو فوج میں ملازم تھے یا پولیس میں۔ ان کے کچھ قریبی عزیز حکومت پاکستان میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں جنہیں شریف خان (انسپکٹر جنرل آف پولیس، مغربی پاکستان) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ تقسیم سے قبل ان کے کچھ رشتہ دار ریاستوں میں محکمۂ پولیس میں اونچے عہدوں پر مامور تھے۔ انہی کی دیکھا دیکھی وہ بھی ۱۹۰۸ میں بمبئی کی پولیس میں بھرتی ہوگئے۔ وفات کے وقت وہ انسپکٹر، سی۔ آئی۔ ڈی، تھے۔

حسن علی اپنے کام میں بیحد مستعد تھے، نہ صرف یہ بلکہ انہیں فرض منصبی کا غیر معمولی احساس تھا۔ انہوں نے فرض کی ادائگی میں اپنے ذاتی جذبات کو کبھی حائل ہونے نہیں دیا۔

وہ بمبئی کے مشہور و معروف باؤلا یتیم خانہ* کے کئی سال تک سیکریٹری رہے۔ یہ لڑکیوں کا یتیم خانہ ہے اور ہمیشہ سے ایک نمایاں حیثیت کا مالک رہا ہے۔ اور اسکی وجہ یہ تھی کہ اس کا سرپرست اعلیٰ ہمیشہ پولیس کمشنر ہوتا تھا۔ اس یتیم خانہ کی لڑکیوں کی شادی میں حسن علی بہت احتیاط برتتے تھے اور ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ ان کے لئے اچھے بر ملیں۔

---

* یہ یتیم خانہ ۱۹۰۹ میں قائم ہوا تھا۔ اس کے قیام کا سہرا بمبئی کے پولیس کمشنر ایس۔ ایم۔ ایڈورڈز کے سر ہے۔ چونکہ عبداللہ حاجی داؤد باؤلا نے تین لاکھ روپے کی رقم دی تھی اس لئے یتیم خانہ کا نام ان کے نام پر رکھا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ جو مسلمان لڑکیاں مختلف وجوہ سے بے گھر ہوجاتی ہیں ان کے لئے گھر مہیا کیا جائے اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے۔

شادی رچانے کے بعد بھی وہ لڑکیوں کی خبر گیری کرتے تھے اور ان کے دکھ درد میں کام آتے تھے۔

ان کی مدت ملازمت میں ملک میں متعدد سیاسی تحریکیں چلیں۔ نجی گفتگوؤں میں وہ مجھ سے کہا کرتے تھے کہ ''یہ لوگ ہمارے خلاف تو ہیں نہیں، یہ تو برطانوی حکومت کے خلاف ہیں۔ در حقیقت انہی لوگوں کی کامیابی یا ناکامی پر خود ہماری کامیابی یا ناکامی کا دار و مدار ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی تحریکوں میں کامیاب ہوگئے تو انجام کار ملک کی حالت بہتر ہوجائیگی۔'' یہ اس زمانہ کی بات ہے جبکہ اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا کہ کوئی وقت ایسا آئیگا کہ انگریز بوریا بستر باندھ کر ہندوستان سے رخصت ہوجائینگے۔

ایک مرتبہ وہ میری ھی بلڈنگ میں ایک مسلم قوم پرست (غلام احمد خان آرزو، مدیر ''ہندوستان'') کو گرفتار کرنے آئے۔ آتے ھی وہ پہلے مجھ سے ملے۔ پھر میں انہیں اس کمرے میں لے گیا جہاں آرزو رہتے تھے۔ انہوں نے وارنٹ گرفتاری دکھایا اور کہا کہ ''آپ تیاری کے لئے جتنا وقت لینا چاہیں، لے سکتے ہیں۔'' میں نے انہیں اپنے کمرے میں ٹھہرالیا۔ کوئی دو گھنٹے بعد آرزو آگئے اور انہوں نے کہا کہ ''میں اب آپ کے ساتھ چلنے کو تیار ہوں۔'' سیاسی ملزمین کے ساتھ ان کا برتاؤ حد درجہ شریفانہ تھا۔

حسن علی ہر مہینہ اپنی تنخواہ کا ایک مقررہ حصہ اپنے غریب رشتہ داروں کو دیا کرتے تھے۔ نادار طلبا کو نہ صرف وہ اپنی جیب سے روپیہ دیتے تھے بلکہ اپنے مالدار دوستوں سے بھی دلواتے تھے۔ ان کی خدا ترسی کو دیکھ کر میں کہا کرتا تھا کہ ''آپ دوسرے پولیس افسروں سے کسی قدر مختلف ہیں!'' میری بات سنکر وہ مسکرادیا کرتے تھے۔

ایک دن میں نے ان سے پوچھا کہ ''نوکری کرتے ہوئے

آپ کو اتنا زمانہ گزر گیا ہے ، ٹھیک ٹھیک بتائیے کہ اس مدت میں آپ کو رشوت کی مد میں کتنی رقم ملی؟" کہنے لگے کہ "میں نے آج تک کبھی کسی سے خود رشوت طلب نہیں کی ۔ لوگ زبردستی میری جیبوں میں روپیہ ڈال جاتے تھے یا گھر آکر میری بچیوں کو دے جاتے تھے ۔ میں نے ایک ایک پائی کا حساب رکھا ہے ۔ مجھے کم و بیش رشوت میں — ہزار روپے ملے ہونگے اور میں نے یہ ساری رقم اپنی بیوی کے علاج پر صرف کردی ، اس پر بھی وہ غریب جانبر نہ ہوئی ۔"

آخری بیماری میں وہ پولیس ہسپتال میں داخل ہوگئے تھے ۔ جس دن ان کا انتقال ہونے والا تھا وہ بالکل تن تنہا بے یار و مددگار بستر پر پڑے تھے اس طرح سے کہ ان کی آنکھیں چھت سے لگی ہوئی تھیں ۔ اتنے میں پولیس کے ایک افسر حافظ محمد عثمان خاں جو آن سے بیحد مانوس تھے ، آگئے اور انہوں نے جب ان کی حالت غیر دیکھی تو از خود قرآن مجید کی تلاوت شروع کردی ۔ ابھی وہ سورۂ یسین پڑھ رہے تھے کہ شیخ صاحب کی جان جان آفریں کے سپرد ہوگئی ۔ تھوڑی دیر میں میں پہنچ گیا ۔ جب مجھے سارا واقعہ معلوم ہوا تو میں نے حافظ عثمان کا دلی شکریہ ادا کیا اور کہا کہ "اگر تم نہ آجاتے تو شیخ صاحب کی موت تو بالکل بیکسی کی حالت میں ہوتی ۔ تم تو ان کے لئے فرشتۂ رحمت بنکر آئے ہو ۔" ان کا انتقال ۷ اگست ۱۹۳۲ کو سہ پہر کے وقت ہوا ۔

حضرت اکبرالہ آبادی نے ہسپتال کی موت کی تصویر ایک لاثانی شعر میں کھینچی ہے اور مجھے اقرار ہے کہ اس دن سے پہلے مجھے خود بھی ایسی موت کی بیکسی کا پورا پورا احساس نہ تھا ۔ وہ شعر یہ ہے :—

(ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں) مرے ہسپتال جا کر

ان کے انتقال پر مختلف اخبارات نے جن میں مشہور کانگریسی اخبار ''کرانیکل'' بھی تھا، مقالے لکھے اور ان کی بیوقت موت پر اظہار افسوس کیا - بمبئی کے ہر دلعزیز پولیس کمشنر پی - اے- کیلی کے دستخطوں سے پولیس کے ''خبرنامہ'' میں جو اعلان نکلا اس میں یہ فقرہ بھی درج تھا :- ''ان کی بیوقت وفات سے بمبئی کی پولیس فورس ایک محنتی اور مستقل مزاج افسر کی خدمات سے محروم ہو گئی ہے -''

۳ اگست ۱۹۳۱ کو کانگریس جناح ہال میں قوم پرست مسلمانوں کا ایک جلسہ ہونے والا تھا - جلسہ کے متعلق پہلے سے اعلان ہوچکا تھا کہ اس کی صدارت سید عبداللہ بریلوی کرینگے - لیکن وقت مقرہ سے بہت پہلے خلافتیوں نے ہال پر قبضہ جمالیا اور دروازوں پر اپنے ''رضا کار'' بٹھادئے - اتفاقاً میں دفتر کے بعد سیدھا جلسہ گاہ چلا گیا - وہاں پنہچکر جو رنگ میں نے دیکھا یہ تھا کہ صدر کی جگہ پر قطب الدین صدیقی (ایڈیٹر ''خلافت'') براج رہے ہیں اور بریلوی ان کے پاس بیٹھے ہیں - ہال میں پولیس کے جتنے آدمی تھے وہ سب شیخ صاحب کی رہنمائی میں کام کر رہے تھے - مگر انہیں یہ ہدایت تھی کہ سب کچھ دیکھیں اور دم نہ ماریں - میں بریلوی کے پاس کھڑا چپکے چپکے انہیں خطرات سے آگاہ کر رہا تھا اور مشورہ دے رہا تھا کہ وہ اٹھکر اوپر چلے جائیں - مگر وہ بدستور اپنی کرسی پر ڈٹے رہے - ان کا اصرار تھا کہ ''میں کسی قیمت پر یہاں سے نہیں ہٹونگا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے -'' اتنے میں میں نے ایک موالی کو یہ کہتے سنا کہ ''سب کو کیوں مارتے ہو؟ صرف بریلوی کی انتڑیاں نکال دو -'' یہ سنتے ہی میں نے شیخ صاحب سے کہا کہ ''کم سے کم اس کو تو گرفتار کرلو -'' انہوں نے کہا کہ ''ہم امن قائم رکھنے کے لئے نہیں بھیجے گئے ہیں - ہمارا کام صرف یہ ہے کہ محض تماشا دیکھیں خواہ کتنا

ہی خون خرابہ کیوں نہ ہو جائے۔'' اس پر میں نے کہا کہ ''اچھا تو اتنا خیال رہے کہ بریلوی پر کوئی آنچ نہ آنے پائے۔'' انہوں نے ان کی حفاظت کی پوری ذمہ داری لیلی۔ اس کے بعد یکایک توڑ پھوڑ کی مہم شروع کردی گئی اور چن چن کر مسلم کانگریسیوں کو حملوں کا ہدف بنایا گیا۔ اور پھر جب یہ سب کچھ ہوچکا تو پولیس نے ہال خالی کرا لیا، مگر ایک حملہ آور بھی گرفتار نہیں کیا گیا۔ یہ تھے وہ طریقے جن پر غیر ملکی حکومت برسوں عمل پیرا رہی۔ ہنگامہ کے بعد شیخ صاحب نے مجھ سے کہا کہ ''میں نے طے کرلیا تھا کہ اگر کسی موالی نے بریلوی پر حملہ کیا تو میں ریوالور سے اسے وہیں ڈھیر کردونگا۔'' اس سارے قصہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ میں نے بریلوی کو آخر وقت تک نہیں بتایا کہ ان کی حفاظت کے لئے کیا کیا جتن کئے گئے تھے۔ مگر میں ہمیشہ شیخ صاحب کا شکر گزار رہا کہ انہوں نے میری درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔

***

عبدالرحیم ڈِمٹمکر

انجمن اسلام ھائی اسکول کی ملازمت کے سلسلہ میں میں فروری ۱۹۱۸ میں بمبئی پہنچا اور وھیں ڈمٹمکر صاحب سے پہلی مرتبہ نیاز حاصل ھوا۔ وہ اس اسکول کے اسسٹنٹ سیکریٹری تھے۔ کچھ عرصہ بعد ھمارے تعلقات بہت دوستانہ ھو گئے۔ بدقسمتی سے ھم دونوں کی زندگی میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ھے جب کہ باھمی تعلقات میں فرق آ گیا تھا، لیکن جنگ اور صلح دونوں حالتوں میں میں نے انھیں ایک شریف ترین انسان پایا۔ میری نظر میں ان کی سیرت کی یہ خصوصیت سب سے زیادہ واجب الاحترام تھی۔

ھمارا زمانۂ اختلاف طویل ثابت نہ ھوا اور تعلقات بہت جلد پہلے سے کہیں زیادہ آستوار ھو گئے۔ آج بھی جب ان تعلقات کی یاد آجاتی ھے تو میری زبان پر ان کے لئے دعائیہ جملے خود بخود جاری ھوجاتے ھیں۔ یہ نتیجہ ھے ان کی نیکی کے گہرے نقش کا جو بقیۂ العمر میرے قلب پر رھیگا۔

مولانائے روم اپنی مثنوی میں ایک جگہ لکھتے ھیں کہ انسان کو اور بالخصوص مسلمان کو اپنی زندگی کس طرح گزارنی چاھئے۔ زندگی کا جو مطمح نظر انھوں نے پیش کیا ھے وہ اپنی دل آویزی اور پاکیزگی کی وجہ سے اس قابل ھے کہ اسے ھمیشہ سامنے رکھا جائے۔ وہ فرماتے ھیں:-

یاد داری کہ وقت زادن تو
ھمہ خنداں بدند تو گریاں؟
آنچناں زی کہ بعد مردن تو
ھمہ گریاں بوند تو خنداں

اس بلند معیار پر اگر ڈمٹمکر صاحب کی زندگی کو پرکھا جائے تو وہ بالکل ٹھیک اترتی ہے ۔ انہوں نے اپنے پیچھے بہت سے رونے والے چھوڑے ہیں ۔

انہوں نے بلا مبالغہ سیکڑوں مسلمانوں کو ملازمتیں دلوائی ہونگی تاکہ وہ اپنے اور اپنے بال بچوں کے جسم و جان کے تعلق کو قایم و برقرار رکھ سکیں ۔ میں خود متعدد اشخاص سے واقف ہوں جن کے لئے ڈمٹمکر صاحب نے محض اسلامی رشتہٗ اخوت کی بنا پر انتھک کوششیں فرمائی تھیں ۔ بے غرض انسانی خدمت کا جو نادر نمونہ انہوں نے پیش کیا وہ انتہائی روح پرور ہے ۔

وہ میونسپل کارپوریشن کے ممبر تھے ، آنریری مجسٹریٹ تھے ، جے ۔ پی تھے اور بہت سی سرکاری اور نیم سرکاری کمیٹیوں سے وابستہ تھے ۔ ان کے تعلقات ہندوؤں کے ساتھ بھی بہت دوستانہ تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے جنازے میں مختلف‌الخیال اشخاص شریک تھے ۔ جمناداس مہتا جو اپنے دور کے کٹر مہاسبھائی لیڈر تھے ، ان کے دوستوں میں تھے ۔ انتقال والے دن وہ کئی گھنٹے تک ان کے مکان پر رہے اور جنازے کے ساتھ ساتھ قبرستان بھی گئے ۔

وہ غیر مسلموں کی خدمت بھی اسی خلوص سے کرتے تھے جس خلوص سے وہ مسلمانوں کے کام آتے تھے ۔ ایک مرتبہ ان کے پاس ان کا ایک ہندو دوست آیا اور ایک خاص نجی معاملہ میں ان سے امداد کا طالب ہوا ۔ وہ اسے لیکر ڈپٹی کمشنر پولیس (کاؤسجی جہانگیر پیٹی گارا) کے پاس پہنچے ۔ اس نے اسی وقت کا نجی ماسٹر کو بلوا بھیجا اور اس کا بیان لینے کے بعد اس پر مقدمہ چلانے کا حکم دیدیا ۔ بعد کو وہ سشن سپرد ہوا اور سشن جج نے جو ایک انگریز تھا ، اسے یہ کہکر صرف پانچ سال کی سزائے قید دی کہ ” ہم نہیں چاہتے کہ تم جیلخانہ میں مرو ، اگر ایسا ہوا تو یہ جیلخانہ کی توہین ہوگی ۔ تمہاری عمر کا

لحاظ رکھتے ہوئے تمہیں صرف پانچ سال کی سزائے قید دیجاتی ہے اگرچہ جرم کی نوعیت کو دیکھتے ہوئے تم اس سے کہیں زیادہ سنگین سزا کے مستحق تھے۔" ظاہر ہے کہ اگر ڈمٹمکر اپنے ہندو دوست کی دستگیری نہ کرتے تو ملزم کبھی بھی کیفر کردار کو نہ پہنچتا۔ کانجی ماسٹر کافی معمر تھا، اس کا پیشہ معلمی تھا جس سے وہ غلط فائدہ اٹھاتا تھا۔

ڈمٹمکر کوکنی قوم کے ممتاز فرد تھے۔ باوجود بمبئی کا باشندہ ہونے کے ان کی اردو بہت اچھی تھی۔ انہوں نے اس زبان کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور کبھی کبھی وہ اس میں مضامین بھی لکھتے تھے۔ ایک مرتبہ میں نے انہیں "بزم خیال" کے جلسہ کی صدارت کرنے کی زحمت دی۔ اس موقع پر انہوں نے "بمبئی اور اردو" کے عنوان سے نہایت معلومات افزا مقالہ پڑھا۔ ان کی انگریزی انشاپردازی بھی بہت اونچی تھی۔ اپنی مادری زبان کوکنی اور مراٹھی میں بھی انہیں اچھی دستگاہ تھی۔ وہ گجراتی بھی خوب سمجھتے اور بولتے تھے۔

جن دنوں ڈمٹمکر صاحب حج کمیٹی کے چیئرمین تھے، اس زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ پنجاب کے ایک صاحب نے جن کا پیشہ "خدمت حجاج" تھا، بمبئی سے یہ بیان جاری کیا کہ "حاجیوں پر لاٹھی چارج کیا گیا ہے،" حالانکہ اس قسم کا کوئی واقعہ پیش نہ آیا تھا۔ ڈمٹمکر نے انہیں خط لکھا کہ "آپ اپنا بیان واپس لے لیں۔" مگر حاجیوں کے اس "خادم" نے نہ صرف یہ کہ بیان واپس لینے سے انکار کر دیا بلکہ اسے مزید شد و مد کے ساتھ دہرایا۔ ڈمٹمکر صاحب نے پھر لکھا کہ "شاید آپ لاٹھی چارج کا مفہوم نہیں سمجھتے ورنہ ایسا غیر ذمہ دارانہ بیان شائع نہ کرتے۔ لہذا آپ کو پھر موقع دیا جاتا ہے کہ یا تو اپنا بیان واپس لے لیں یا پھر ثبوت پیش کریں۔" بہرحال اتمام حجت کے بعد حکومت بمبئی نے اس شخص پر مقدمہ چلانے

کا حکم دیدیا ۔ مجسٹریٹ نے یہ خیال کر کے کہ ملزم مسلمانوں کا مذہبی ''لیڈر'' ہے ، اسے برائے نام سزا دیدی ۔ ڈسٹمکر کہتے تھے کہ ''اگر یہ شخص اپنا بیان واپس لے لیتا تو پھر مقدمہ کی نوبت ہی نہ آتی ۔ اس لئے ضرورت تھی کہ سچائی کی خاطر اس پر مقدمہ دایر کیا جائے اور پبلک کو صحیح واقعات سے روشناس کرایا جائے ۔''

ڈسٹمکر بہت دوست پرور انسان تھے ۔ انہوں نے مجھ پر کئی ایک احسان کئے اور ایک نجی مقدمہ میں میری خاطر اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کیا ۔ ان سب باتوں کی یاد میری زندگی کا متاع عزیز ہے ۔ ڈسٹمکر ان اشخاص میں سے تھے جنہوں نے اپنے اخلاق سے غیر مسلموں کے دلوں میں مسلمانوں کی عزت اور وقار کا نقش بٹھا دیا تھا ۔

***

لارڈ لائڈ

بھارت و پاکستان کا کوئی تعلیم یافتہ شخص مشکل سے ایسا ہوگا جو لارڈ لائڈ کے نام نامی سے ناواقف ہو۔ سکھر کا عظیم‌الشان بند انہی کے زمانۂ حکومت کی یادگار ہے۔ وہ ۱۹۱۹ سے ۱۹۲۴ تک بمبئی کے گورنر رہے۔

پہلی جنگ عظمیٰ میں ہندوستان کے کونے کونے سے مزدور سمٹ سمٹا کر بمبئی آگئے تھے جس کے نتیجہ میں بمبئی میں مکانوں کی شدید قلت ہوگئی اور ''پگڑی'' کا رواج پڑ گیا۔ اس قلت کو دور کرنے کے لئے لارڈ لائڈ نے ایک پنج سالہ منصوبہ تیار کیا جس میں شہر کے مختلف حصوں میں کئی منزلہ مکانات تعمیر کئے گئے، سمندر کے وسیع حصے کو پاٹا گیا اور جو زمین نکلی اسے اچھے داموں فروخت کیا گیا۔ آج یہی حصہ اپنی خوبصورت عمارات اور دلکش مناظر کی وجہ سے بمبئی کی بہترین سیرگاہوں میں شمار ہوتا ہے۔ بمبئی کے اخبارات اس منصوبہ کے شدت سے مخالف تھے۔ وہ کہتے تھے کہ روپیہ خواہ مخواہ سمندر میں پھینکا جارہا ہے۔ مگر لارڈ موصوف اس مخالفت سے ذرا بھی متاثر نہ ہوئے۔

لارڈ لائڈ اسلام اور اس کی تعلیمات سے بخوبی واقف تھے۔ اس سلسلہ میں میں ایک واقعہ بیان کرونگا جس کا اثر آج تک میرے دل و دماغ پر ہے۔ حکومت بمبئی کے ایک مسلمان وزیر نے پونا میں اپنے دولت کدہ پر لارڈ لائڈ کی دعوت کی۔ اس دعوت میں راجہ مہاراجہ، نواب، سرداران دکن، سرکاری عمال اور دوسرے اکابر مدعو تھے۔ میزبان نے دنیا کی بہترین شرابوں کا انتظام کیا تھا اور پونا میں یہ خبر اڑ گئی تھی کہ آج رات

کو شراب کے دریا بہینگے۔ لارڈ لائڈ کی سیاست قابل داد ھے
کہ انہوں نے کھانے کی میز پر بیٹھتے ھی اعلان کردیا کہ
''میں مسلمان کے گھر میں شراب نہیں پیونگا۔'' پھر کس کی
ہمت تھی کہ وہ شراب کو ھاتھ لگاتا!

وہ نہایت زیرک آدمی تھے۔ جب کبھی انہیں حکومت
کی پالیسی کی تشریح کرنی ھوتی تو وہ لکھی ھوئی تقریر پڑھتے،
ورنہ وہ فی‌البدیہ تقریر کرنے کے عادی تھے۔ ان کی تقریر سے
اسی جوش، زور اور روانی کا اظہار ھوتا تھا جس کے لئے برطانوی
ممبران پارلیمنٹ مشہور ھیں۔

لارڈ لائڈ بلا کے محنتی تھے۔ وہ جب تک سارا فائل خود
نہ پڑھ لیتے اس وقت تک دستخط نہ کرتے۔ بمبئی میں گورنر
بالعموم سرخ روشنائی سے دستخط یا ریمارک کرتے تھے۔ ایک
دفعہ ایسا ھوا کہ کسی ریاست کے معاملہ میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ
کے سیکریٹری کنڈرزلے نے یک طرفہ بیان دے کر لارڈ موصوف
سے غلط احکام صادر کرائیے اور پھر فائل پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ
کے انچارج سر چمن لال سیتلوڈ کے پاس بغرض اطلاع بھجوا دیا۔
جب سر چمن لال نے وہ احکام پڑھے تو ان کے تن بدن میں آگ
ھی تو لگ گئی اور وہ فائل لیکر سیدھے گورنمنٹ ھاؤس پہنچے
اور لارڈ لائڈ کو تصویر کا دوسرا رخ دکھا کر کہا کہ فیصلہ
بالکل غلط صادر کیا گیا ھے۔ گورنر نے کنڈرزلے کو طلب کیا مگر
وہ کوئی خاص تشریح پیش نہ کرسکا۔ آخر لارڈ لائڈ نے اپنے احکام
بدلے اور سزا کے طور پر کنڈرزلے کا تبادلہ اضلاع میں کردیا۔

وہ بہت باھوش اور فہیم شخص تھے اور بڑی بڑی گتھیوں
کو منٹوں میں سلجھا دیتے تھے۔ ایک مرتبہ ھمارے دفتر
(اورینٹل ٹرانسلیٹرز آفس) نے محکمۂ رفاہ عامہ کو لکھا کہ
''چونکہ ھمارا عملہ بہت بڑھ گیا ھے لہذا دو کمرے کفایت
نہیں کرتے، ھمیں ایک کمرہ اور عنایت کیا جائے۔'' جنگ

کی وجہ سے سرکاری دفاتر اتنے بڑھ گئے تھے کہ جگہ کی قلت ہر جگہ محسوس کی جاتی تھی اور اس لئے سیکریٹری نے ہمیں مزید کمرہ دینے سے صاف انکار کردیا۔ بالآخر لارڈ لائڈ سے اپیل کی گئی اور انہوں نے اطلاع دی کہ وہ فلاں دن اور فلاں وقت دفتر دیکھنے آئینگے۔ چونکہ ہمارا دفتر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ کا تھا اور فرنیچر کا بیشتر حصہ پرانی وضع کا تھا اور اس کی میزیں آج کل کی معیاری میزوں سے تگنی بڑی تھیں، اس لئے معائنہ کے بعد لارڈ موصوف نے فیصلہ صادر کیا کہ موجودہ میزوں کی بجائے معیاری سائز کی میزیں خرید لی جائیں اور پھر دو کمرے ہمارے لئے کفایت کرجائینگے۔ جب نئی میزیں آ گئیں تو معلوم ہوا کہ لارڈ لائڈ کا فیصلہ کس قدر دانشمندانہ اور عملی تھا۔

بمبئی میں ویکسین بنانے کا ایک پرانا ادارہ (ھیف کین انسٹی ٹیوٹ) ہے جسے ۱۹ ویں صدی کے آخر میں ایک روسی یہودی سائنس دان نے قائم کیا تھا۔ اس ادارہ میں سانپ کے کاٹے کا تریاق سانپ کے زھر سے تیار کیا جاتا ہے۔ ھر نیا گورنر اس ادارہ کو دیکھنے جاتا ہے۔ چنانچہ لارڈ لائڈ بھی گئے۔ وہاں سانپ دکھانے پر سولہ سترہ برس کا لڑکا ملازم تھا۔ جب وہ افعی کو پکڑ کر گورنر کے سامنے لایا تو لارڈ موصوف نے اس سے پوچھا کہ "تمہیں کیا تنخواہ ملتی ہے؟" اس نے بتایا:۔ "پندرہ روپے۔" لارڈ لائڈ نے ڈائرکٹر سے کہا کہ "اس قدر جان جوکھم کا کام اور تنخواہ اس قدر قلیل!" اور اسی وقت حکم دے دیا کہ "آیندہ سے سانپ پکڑنے والے کو ساٹھ روپے ماھوار ملا کرینگے۔"

لارڈ لائڈ بڑی آن بان کے آدمی تھے، خوبصورت، وجیہ، ساڑھے چھ فٹ کے لمبے تڑنگے۔ چہرہ بیحد پر رعب تھا اور یہی وجہ ہے کہ عمال حکومت ان کے روبرو احساس کمتری

محسوس کرتے تھے۔

میعاد گورنری ختم ہونے سے پیشتر پونا کے لیڈر سر ابراهیم هارون جعفر نے مسلمانان شہر کی طرف سے انہیں ایک الوداعی پارٹی دی جس میں لارڈ موصوف نے ایک پر مغز تقریر کی اور اپنے پنج سالہ تجربہ کی بنا پر فرمایا :۔

''جو مسلمان سرکاری ملازمتوں میں داخل ہوتے ہیں ان کا معیار قابلیت زیادہ اونچا نہیں ہوتا ۔ مسلمانوں کو چاهئیے کہ وہ چھانٹ چھانٹ کر آدمی بھیجا کریں بعینہ جس طرح سے کرکٹ ٹیم کے لئے بہترین کھلاڑی چن کر بھیجے جاتے ہیں۔ بہترین آدمی بھیجنے سے آپ کا وقار بلند ہوگا۔ سرکاری ملازمتوں میں جانبداری، اقربا پروری اور عصبیت کو کچھ دخل نہ ہونا چاهئیے۔ صرف ایسے اشخاص کو مختلف جگہوں پر مقرر کرنا چاهئیے جو ان کے لئے موزوں ترین ہوں۔''

ان الفاظ کو سنے ہوئے تیس پینتیس سال گزر گئے ہیں۔ مگر وہ آج بھی میرے کانوں میں گونج رہے ہیں۔ چونکہ میں ان کے زمانۂ حکومت میں ترجمان کی حیثیت سے متعدد دفعہ گورنمنٹ هاؤس جاچکا تھا اور هز ایکسلینسی مجھ سے خوب واقف تھے، اس لئے جب وہ پارٹی میں لوگوں سے ملتے ملاتے مجھ تک پہنچے تو میں نے مسکرا کر کہا :۔ ''یور ایکسلینسی ذاتی طور پر اس امر سے مطمئن ہونگے کہ اگر میں بہترین ترجمان نہیں ہوں تو کم سے کم بہترین ترجمانوں میں سے بالضرور ایک ہوں۔'' اس پر هز ایکسلینسی هنس دئے۔ یہ میری ان سے آخری ملاقات تھی۔

***

پروفیسر عبدالصمد مولوی

پروفیسر مولوی ابتدا میں اورینٹل ٹرانسلیٹرز آفس، بمبئی، میں اسسٹنٹ آردو مترجم کی حیثیت سے ملازم ہوئے۔ بعد کو ان کی خدمات کرناٹک کالج دھارواڑ میں منتقل کردی گئیں۔

وہ شکارپور (سندھ) کے رہنے والے تھے، مگر ان کی تمام تر تعلیم بمبئی میں ہوئی اور اسی صوبہ میں ان کی سرکاری ملازمت کا بیشتر زمانہ بسر ہوا۔ کرناٹک کالج میں وہ کئی برس تک عربی، فارسی اور آردو کے پروفیسر رہے۔ جس زمانہ میں یہ کرناٹک کالج میں تھے، ان ہی دنوں کا قصہ ہے کہ گورنر بمبئی لارڈ لائڈ پہلی مرتبہ کالج دیکھنے کیلئے گئے۔ وہاں پرنسپل نے سب پروفیسروں سے ان کا تعارف کرایا۔ دوران ملاقات میں پروفیسر مولوی نے جرأت رندانہ سے کام لے کر پرنسپل، ڈائرکٹر محکمۂ تعلیم (لوری) اور دوسرے افسران کی موجودگی میں گورنر سے شکایت کی کہ سنسکرت کے پروفیسر کو عربی، فارسی اور آردو کے پروفیسروں کے مقابلہ میں کہیں زیادہ تنخواہ ملتی ہے اور اس کا درجہ بھی زیادہ بڑا ہے اور درخواست کی کہ اس امتیازی سلوک کو ختم کردیا جائے اور مشرقی زبانوں کے جملہ پروفیسروں کو ایک سطح پر لے آیا جائے۔ لوری اور دیگر افسران اس خلاف توقع شکایت سے بہت سٹ پٹائے، مگر وہ کر بھی کیا سکتے تھے! بہرحال ہزایکسیلینسی نے اس شکایت کی تحقیقات کی اور احکام جاری کردئے کہ آیندہ سے تمام سرکاری کالجوں میں السنۂ مشرقیہ کے اساتذہ کا مشاہرہ ایکساں ہوگا۔ کچھ عرصے بعد پروفیسر مولوی ایران گئے اور واپسی پر انہوں نے "ایران جدید" (Modern Iran) کے نام سے انگریزی میں ایک دلچسپ اور معلومات افزا کتاب لکھی۔

دوسری جنگ عظمیٰ میں حکومت ہند نے ان کی غیر معمولی قابلیت سے متاثر ہو کر انہیں پروپیگنڈا افسر مقرر کیا ۔ ان کی طبیعت میں بیحد ظرافت تھی ۔ تقریروں میں وہ ایسے ایسے لطیفے بیان کرجاتے تھے جن کی وجہ سے عوام ان کی تقریروں کے منتظر رہتے تھے ۔ ان کی شاندار جنگی خدمات کے اعتراف میں حکومت نے انہیں ''خان بہادر'' کے خطاب سے نوازا تھا ۔

وہ شاعر بھی تھے ۔ ان کی دو طویل نظموں کا مجھے علم ہے جو علی الترتیب سر ابراہیم رحمت اللہ کے حکومت بمبئی میں ایگزیکیوٹیو کونسلر بنائے جانے پر اور پونا میں لارڈ لائڈ کی آمد پر پڑھی گئی تھیں۔ اول الذکر فارسی میں تھی اور موخرالذکر عربی میں ۔

پروفیسر مولوی اپنے فرض منصبی کی ادائگی میں والہانہ انہماک سے کام لیتے تھے۔ وفات سے قبل وہ اسلامیہ کالج (کراچی) کے پرنسپل تھے ۔ ایک دن باتوں باتوں میں انہوں نے مجھ سے فرمایا :۔ ''یہ کالج مجھے بیحد عزیز ہے ۔ میں یہاں علی الصبح آجاتا ہوں اور رات کو دوسرے شفٹ کے بعد گھر جاتا ہوں ۔ یہی کالج اب میری تمام دلچسپیوں کا مرکز ہے ، حتیٰ کہ میں دعوتوں اور جلسوں میں بھی شریک نہیں ہوتا ۔'' وہ سولہ سولہ گھنٹے کام کرتے تھے اور باوجود اس کے کہ ان کی عمر ۷۵ کے لگ بھگ تھی ، وہ تھکنے کا نام نہ لیتے تھے۔

وہ جوانوں اور بوڑھوں میں یکساں مقبول تھے۔ وہ بچوں میں بچہ بنجاتے تھے اور انہیں طرح طرح کے لطیفے سنا کر خوب ہنساتے تھے۔ ان کے جنازے میں ہزارہا طالب علموں ، شہریوں اور یونیورسٹی پروفیسروں کی موجودگی اس امر کا ثبوت ہے کہ وہ کس قدر ہر دلعزیز تھے ۔ ان کا انتقال کراچی میں ۲۲ مئی ۱۹۵۷ کو ہوا۔

* * *

عمر سوبانی

عمر سوبانی بمبئی کے ایک مشہور اور متمول میمن خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ وہ ایک ایسے روشن خیال باپ (یوسف سوبانی) کے بیٹے تھے جنھوں نے اپنے زمانہ میں باوجود مخالفت کے بمبئی میں مسلمان لڑکیوں کی تعلیم کی گاڑی کو آگے بڑھایا اور انجمن اسلام ھائی اسکول بمبئی کے لئے اپنے خرچہ سے ایک اقامت گاہ تعمیر کرائی ۔ وہ خوبصورت عمارت آج بھی ٹائمز آف انڈیا بلڈنگ کے قریب فیاض معطی کی یاد دلانے کے لئے موجود ھے ۔ عمر کو خدا نے بہت دولت دے رکھی تھی لیکن ساتھ ھی فیاض دل بھی دیا تھا ۔ یہی وجہ ھے کہ وہ دل کھول کر قومی تحریکوں میں چندہ دیا کرتے تھے ۔ اگر ایک لاکھ تلک سوراج فنڈ میں دیا تو ایک لاکھ خلافت فنڈ میں دیا جب اتفاقات زمانہ سے ان کی مالی حالت خراب ھوگئی تو افسوس کے ساتھ کہا کرتے تھے کہ ”میں نے ان دونوں فنڈوں میں پانچ پانچ لاکھ روپے کیوں نہ دیدئے ؟ “

عمر روئی کے تاجر تھے ۔ انہوں نے ستمبر ۱۹۲۱ میں ایک سودے میں کوئی پونے دو کروڑ روپے کمائے مگر جنوری ۱۹۲۲ کے ایک ھی سودے میں تقریباً چار کروڑ روپے کی ادائگی کا بار ان کے کندھوں پر آن پڑا ۔ ان کے سامنے اس اھم ذمہ داری سے بچنے کے کئی ایک راستے تھے ۔ مثلاً وہ بڑی آسانی سے دیوالیہ بن سکتے تھے اور ایسی حالت میں ان کا کچھ بھی نہ بگڑتا ۔ مگر عمر کے والد ماجد نے اپنی سکنی جایداد ، کپڑے کی ملیں اور دوسرے کارخانے سب فروخت کر دئے تا کہ وہ اپنے بیٹے کے زبانی قرضوں کو چکا سکیں ۔ عزت ، ساکھ اور وعدہ ایفائی کے جس

بلند معیار کو انہوں نے اپنی جرأت رندانہ کے ذریعہ قائم کیا ، مادیت کے اس دور میں اس کی دوسری مثال مشکل سے ملیگی۔

کانگریسی تحریکوں اور مسز بیسنٹ کی هوم رول لیگ کی سرگرمیوں سے عمر سوبانی شروع سے وابستہ رہے ۔ وہ پس پردہ رہ کر کام کرتے تھے۔ بیسویں صدی کے ابتدائی پچیس سالوں کی کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس میں وہ عملاً شریک نہ رہے ہوں۔

جب تحریک عدم تعاون شروع هوئی تو انہوں نے مجھ سے فرمایا کہ ''ایک ایسا مضمون لکھدو جس میں ابتدائی مسلمانوں کی شاندار قربانیوں کا ذکر هو اور نیز اس کا کہ وہ بدی کے مقابلہ میں همیشہ نیکی کے ساتھ تعاون کرتے تھے ۔ چنانچہ میں نے ایک مضمون تیار کرکے دیدیا جس میں میں نے یہ لکھا تھا کہ اس دور کے مسلمان نیکی میں ایک دوسرے سے سبقت لیجانا پسند کرتے تھے ، مگر جھوٹ ، بدی اور کفر کے ساتھ تعاون کرنے کے مقابلہ میں موت کو ترجیح دیتے تھے۔ یہ طویل مضمون پمفلٹ کی شکل میں هزاروں کی تعداد میں چھاپا گیا تھا۔ عمر سوبانی اس پمفلٹ کو اور تحریک عدم تعاون کی دوسری مطبوعات کو جن میں مصطفی کامل ایڈیٹر ''اللوا'' کے حالات خصوصیت سے قابل ذکر هیں، بیچنے کی غرض سے خود بازاروں میں نکلتے اور اس طرح تحریک کو مسلمانوں میں مقبول بناتے۔ پبلک ایسے لٹریچر کو هاتھوں هاتھ خریدتی تھی۔

۱۹۱۵ میں بہار کے مشہور لیڈر مظہرالحق کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جو جلسہ منعقد هوا تھا اور جسے حکومت کے پٹھوؤں نے هڑبونگ مچا کر ناکام بنا دیا تھا تا کہ هندو مسلم اتحاد کی بنیاد نہ پڑنے پائے ، وہ بعد کو تاج محل هوٹل میں منعقد کیا گیا ۔ اس نازک موقع پر عمر سوبانی نے محمد علی جناح کو جو ناقابل فراموش امداد بہم پہنچائی ، اس کے لئے جناح همیشہ ان کے شکر گزار رہے ۔

عمر سوبانی جب تک جئے ، شیر کی طرح جئے ۔ وہ بڑی ہمت و جراًت کے انسان تھے ۔ حالات کے پلٹا کھانے کے بعد بھی ان کی بلند فطرت میں کوئی پستی پیدا نہ ہوئی ۔ یہی ان کی زندگی کا حسین ترین پہلو تھا ۔ وہ بڑی تمکنت کے انسان تھے ، اور یہ تمکنت ان میں آخر وقت تک قائم رہی ۔

انہیں مشہور عالم مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں کے جمع کرنے کا بیحد شوق تھا ۔ چنانچہ انہوں نے دور دور سے ان مصوروں کے شاہکار منہ مانگی قیمت دے کر منگوائے تھے ۔ ان کا مکان اچھا خاصا پکچر گیلری بنا رہتا تھا ۔ مگر روئی کے تلاطم میں وہ تمام تصاویر بہ گئیں ۔ انہیں دولت کے چلے جانے کا مطلق غم نہ تھا ، اگر کچھ صدمہ تھا تو ان نوادرات کا تھا ۔

ان کا انتقال ۶ جولائی ۱۹۲۶ کو ہوا ۔ جنازہ میں مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے ہزارہا اشخاص موجود تھے جن میں عبدالرحمن صدیقی ، راجہ پرتاب گیر جی ، ایل ۔ آر ۔ ٹیٹرسی ، ٹریکم داس دوارکا داس ، این ۔ ایچ ۔ بیلگام والا ، بی ۔ جی ۔ ہارنیمین ، سید عبداللہ بریلوی ، کے ۔ ایف ۔ نریمان خصوصیت سے قابل ذکر ہیں ۔ اب یہ کندھا دینے والے حضرات بھی سب کے سب اللہ کو پیارے ہوچکے ہیں ۔ رہے نام اللہ کا ۔ ان کی وفات کے بعد خلافت کمیٹی نے بطور یادگار اپنی عمارت کے دروازہ کا نام ''باب عمر'' رکھا ۔

ان کی وفات پر اخبارات نے اداریے لکھے اور مختلف انجمنوں نے قراردادیں منظور کیں ۔ مگر گاندھی جی نے ''ینگ انڈیا'' میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ، اس سے بہتر کسی نے کچھ نہیں لکھا ۔ وہ رقمطراز ہیں :۔ ان کی قبل از وقت اور غیر متوقع موت سے ہمارا ایک محب وطن دنیا سے اٹھ گیا ۔ کوئی تحریک ایسی نہ تھی جس میں انہوں نے (اپنی مالی تباہی سے قبل) دل کھول کر روپیہ نہ دیا ہو ۔ وہ کبھی پبلک کے سامنے

نہیں آئے ۔ لیکن وہ اسٹیج منیجر کی حیثیت رکھتے تھے ۔ وہ تاجروں میں بیحد مقبول تھے ۔ ... انہوں نے ایک ھی مہینہ میں اپنی دولت دگنی کرلی مگر دوسرے ھی مہینہ میں وہ بالکل کنگال ھوگئے ۔ انہوں نے اپنے نقصانات کو بہادری سے برداشت کیا ، اور ان کی مغرور طبیعت نے اجازت نہ دی کہ کروڑوں روپیہ کھو کر پھر پبلک کا کام کریں ۔ اگر عطیوں کی فہرست میں وہ اول نمبر پر نہیں آسکتے تو پھر پبلک کام سے ریٹائر ھوجانا ھی بہترین طریقۂ کار ھے ۔ ان کی زندگی نو عمر مالداروں کے لئے باعث تقلید ھے ۔ خدا ھم سب میں عمر سوبانی کی سی حب الوطنی پیدا کرے ! بہرحال جو ورثہ وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ھیں ھمیں اس کا اھل بننا چاھئے ۔''

مرحوم، تلک سوراج فنڈ کے بھی سیکریٹری تھے ۔ اس فنڈ میں گاندھی جی نے آل انڈیا نیشنل کانگریس کے لئے ایک قلیل مدت میں ایک کروڑ سے زائد رقم جمع کرلی تھی ۔ جہاں تک بمبئی کا تعلق ھے اکیلے عمر کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ ۳۷ لاکھ روپے جمع ھوسکے ۔ خود انہوں نے بھی اس میں ایک لاکھ روپے دئے تھے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ھے کہ جب گاندھی جی نے ان سے روپیہ طلب کیا تو انہوں نے چک بک ان کے سامنے رکھدی اور کہا کہ ''بھر لیجئیے ۔'' گاندھی جی نے اپنے ھاتھ سے ایک لاکھ روپے لکھے ۔ اس پر عمر قہقہہ مار کے ھنسے اور کہا کہ ''میں بہت سستا چھوٹا ۔'' مگر گاندھی جی نے جواب میں فرمایا، کہ ''نہیں یہ رقم کافی ھے ۔''

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا !

***

غلام حسین خیراز

غلام حسین خیراز خوجہ قوم کے ممتاز فرد تھے مگر بلحاظ عقیدہ سنی مسلمان تھے۔ وہ اس زمانہ میں مجسٹریٹ مقرر ہوئے تھے جبکہ چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ انگریز ہوا کرتا تھا۔ بمبئی پولیس کمشنر ایس۔ ایم۔ ایڈورڈز نے اپنی کتاب "بمبئی سٹی پولیس" میں ان کی قابلیت اور صیانت کی بہت تعریف کی ہے۔*

باوجود اس کے کہ وہ سب مجسٹریٹوں میں سینیر تھے، لیکن جب جب چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی جگہ خالی ہوتی انہیں نظرانداز کردیا جاتا اور کسی جونیر مجسٹریٹ کو چیف بنادیا جاتا۔ چونکہ یہ سب سے سینیر تھے اس لئے حکومت نے انہیں بمبئی ہائی کورٹ میں کسی بڑے عہدہ پر فائز کردیا، صرف اشک شوئی کے لئے اس لئے کہ تنخواہ کے اعتبار سے کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا تھا۔ خیراز مجھ سے کہتے تھے کہ "میری ترقی کو ترقی معکوس سمجھنا چاہئے۔" کچھ عرصے بعد وہ ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ انہوں نے مشکل سے چند برس پنشن لی ہوگی کہ اس دار فانی سے رحلت فرما گئے۔

ان کی عدالت میں مجھے متعدد دفعہ منجانب سرکار پیش ہونے کا موقع ملا۔ ان کا طرز عمل سب کے ساتھ اچھا اور شریفانہ تھا۔ ملزمین کے ساتھ تو وہ غیر معمولی ہمدردانہ برتاؤ کرتے

---

* "انہوں نے.... مجسٹریٹ کی حیثیت سے پولیس کو ہر ممکن مدد دی۔ انہوں نے کمشنر کو ذاتی طور پر اُن مقدمات کے بارے میں اطلاع دینے میں تامل نہیں کیا جن میں ان کی رائے میں پولیس نے غلط طرز عمل اختیار کیا تھا یا اپنے اختیارات سے تجاوز کیا تھا — یہ طرز عمل پولیس کے افسر اعلیٰ (کمشنر) کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتا تھا۔" (ص ۱۹۳)

تھے اور عدالت میں انہیں ہر قسم کی آسانی بہم پہنچاتے تھے۔ ایک مقدمہ کے دوران نے وکیل صفائی نے مجھ سے پوچھا کہ ”سرکار کا صیغہ کیا ہے؟“ میں نے جواب دیا ”مونث۔“ اس پر خیراز نے ہنس کر کہا:۔ ”جبھی ہماری حکومت میں اس قدر خرابیاں موجود ہیں۔“ وہ برملا پولیس انسپکٹروں سے پوچھا کرتے تھے کہ ”اس مقدمہ میں تمہیں کتنی رشوت ملی ہے؟“ ایک مرتبہ کسی ایرانی پر ”بمبئی پراسٹی ٹیوشن ایکٹ“ کے ماتحت مقدمہ چلایا گیا۔ خیراز نے بھری عدالت میں ایرانی سے کہا کہ ”تم نے شہر کے تمام چائے خانوں پر قبضہ کر رکھا ہے۔ اس کے باوجود آمدنی کے نئے نئے ذرائع تلاش کر رہے ہو۔“ بہر حال وہ اس قسم کے ریمارک دن بھر کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کی عدالت لالہ زار بنی رہتی تھی۔ پولیس کے خلاف ان کے ریمارک باقاعدگی کے ساتھ حکومت تک پہنچائے جاتے تھے۔ ان کے چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ نہ بنائے جانے کا راز یہی تھا کہ وہ پولیس اور حکومت کی کمزوریوں کو کھلم کھلا نہایت بیباکی سے بے نقاب کرتے تھے۔

ایک دن باتوں باتوں میں ان کے چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ نہ بنائے جانے کا ذکر آ گیا۔ میں نے عرض کیا کہ ”اپنی خفیہ معلومات کی بنا پر میں آپ کو اطلاع دینا چاہتا ہوں کہ حکومت آپ کو کبھی بھی چیف کا عہدہ نہ دیگی اور اس لئے آپ کو چاہئے کہ حکومت کو زیادہ سے زیادہ ستائیں، اور اس کی بہترین صورت یہ ہے کہ آپ گاندھی جی کی مختلف تحریکوں کے سلسلہ میں گرفتار ہونے والے ملزمین کو کم سے کم سزائیں دیں۔“ چنانچہ انہوں نے میرے مشورہ پر عمل کرنا شروع کردیا۔ ایک دن چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ (سر ہرسز دیار دستور) نے دوران ملاقات میں ان سے پوچھ ہی لیا کہ ”آپ سیاسی ملزمین کو بہت کم سزائیں دیتے ہیں۔ مجھے دیکھئے کہ میں انتہائی

سزائیں دیا کرتا ہوں ۔'' خیراز نے کہا کہ '' آپ مجھے تحریری حکم بھیجدیجئے ۔ پھر میں بھی آپ کی پیروی میں انتہائی سزائیں دینی شروع کردونگا ۔'' ظاہر ہے کہ دستور اس قسم کی ہدایت جاری نہیں کرسکتے تھے ۔ حکومت نے کچھ دن تک تو دیکھا اور پھر ان کی عدالت میں سیاسی مقدمات بھیجنے بند کردئے ۔

خیراز بیحد مذہبی آدمی تھے اور نماز روزہ کے سختی سے پابند ۔ روزانہ تلاوت قرآن مجید کرتے تھے ۔ وہ ساری عمر تہجد گزار رہے ۔ انہیں فقرا سے بڑی عقیدت تھی اور خود بھی کسی بزرگ کے مرید تھے ۔ ان کی زندگی کی پاکیزگی ان کے چہرے سے عیاں تھی ۔ انہوں نے کبھی رشوت نہیں لی حالانکہ اگر وہ چاہتے تو وہ لاکھوں روپے پیدا کرسکتے تھے ۔ ان سے مل کر روحانی مسرت حاصل ہوتی تھی ۔

ان کی موت * سے ایک نہایت قابل ، نیک منش ، دیانتدار اور خدا ترس افسر اٹھ گیا ۔

***

---

* '' بمبئی کرانیکل '' نے ان کی وفات پر جو نوٹ لکھا تھا ، اس میں ذیل کے فقرے قابل ذکر ہیں :-

" Because he was independent and never failed to pass strictures on the police whenever they went wrong he was not quite popular with some officials. The result was that his claim to be appointed Chief Presidency Magistrate was passed over."

مولوی عبداللہ چکڑالوی

۱۹۱۲ میں بی ۔ اے کا امتحان دینے کی غرض سے میں دھلی سے لاھور گیا ۔ ایک دن سہ پہر کو مسجد وزیر خاں میں پہنچا تا کہ مولوی عبداللہ چکڑالوی (بانیٔ مذھب اھل قرآن) کی زیارت سے مشرف ھوجاؤں ۔ دریافت کرتے کرتے میں آن تک پہنچ ھی گیا ۔ عصر کا وقت تھا اور وہ کھری چارپائی پر جس پر کوئی چیز بچھی ھوئی نہ تھی ، بغیر تکیہ کے اس طرح سے سو رھے تھے کہ ان کا سر پٹی پر تھا ۔ وہ نیلا تہبند باندھے ھوئے تھے اور باقی جسم برھنہ تھا ۔ ان کی چارپائی کے گردا گرد چار آدمی بیٹھے ھوئے تھے ، ھر پایہ کے پاس ایک ۔ میں سلام کر کے پاس جا کھڑا ھوا ۔ ان حواریوں نے پوچھا کہ کہاں سے آئے ھو؟ میں نے جواب دیا کہ ”دھلی سے آیا ھوں ۔ چونکہ اب مولوی صاحب کی زیارت نصیب ھوچکی ھے ، اس لئے رخصت چاھتا ھوں ۔“ ان میں سے ایک شخص نے پوچھا :- ”کوئی اعتراض ؟ کوئی سوال ؟ “ میں نے عرض کیا کہ ”صورت دیکھتے ھی سارے اعتراضات اور سوالات دل سے محو ھو گئے ھیں ۔ میں تو صرف اس لئے حاضر ھوا ھوں کہ اگر قیامت کے دن مجھ سے پوچھا گیا کہ مولوی صاحب کی زیارت کی تھی تو اس وقت میں باطمینان تمام کہہ سکوں کہ میں ان کی زیارت سے مشرف ھوچکا ھوں ۔“ کہنے لگے کہ ”اگر آپ کو ضروری کام ھو تو ھم جگادیں ۔“ میں نے منع کیا اور کہا کہ ”میں پھر حاضر ھوجاؤنگا ۔“

ابھی چند قدم گیا ھونگا کہ ایک مولوی صاحب میرے پاس آئے اور فرمایا :- ”میاں صاحبزادے ، تم ابھی نوجوان ھو ، ایسا نہ

ہو کہ اس شخص کے جال میں پھنس جاؤ۔ یہ تو مسلمان نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کا سخت ترین دشمن ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ چودھویں صدی میں ایک شخص ظاہر ہوگا، کھری چارپائی پر لیٹیگا، نیلا تہبند باندھیگا اور حدیث سے انکار کریگا۔ تم اس کی پیروی نہ کرنا۔ یہی وہ شخص ہے۔" میں نے پوچھا کہ "آخر میری کونسی بات سے آپ نے اندازہ لگایا کہ میں ان کا ہم خیال ہوں؟" فرمانے لگے: "یہ تو صرف انتباہ کے طور پر ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی مسلمان اس کے دام فریب میں آئے۔"

بہر حال مجھے خوشی ہے کہ میں نے کم سے کم ایک بانیٔ مذہب کی زیارت تو کرلی مگر افسوس رہا کہ میں علامہ کی خدمت میں دوبارہ حاضر نہ ہوسکا۔

***

علی محمدؔ مولوی

کوئی ۷۰-۶۰ برس پہلے کی بات ہے کہ علی محمد مولوی بمبئی میونسپل کارپوریشن میں کلرک کی حیثیت سے ۵۰ روپے پر ملازم ہوئے۔ پھر بڑھتے بڑھتے وہ میونسپل سیکریٹری بنے اور بعد کو ڈپٹی میونسپل کمشنر کے عہدہ پر فائز ہوئے۔ ان کی تنخواہ ڈیڑھ دو ہزار کے لگ بھگ ہوگی، مگر افسوس ہے کہ وہ اس عہدۂ جلیلہ پر صرف ۸۵ دن تک فائز رہے۔

وہ رہنے والے تو تھے یو۔ پی کے ایک گاؤں مصطفیٰ آباد کے، مگر نقل وطن کرکے بمبئی چلے گئے تھے۔ بمبئی میں سب سے پہلے ان کے والد علی بخش آئے تھے جو باعتبار پیشہ ''مولوی'' تھے۔ اگرچہ ان کی آمدنی محدود تھی مگر آغاخانیوں میں وہ بہت احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جو آغا خانی آج اثنا عشری کہلاتے ہیں، انہیں من حیث الجماعت سب سے پہلے مولوی علی بخش ہی نے منظم کیا تھا۔ انہوں نے ''آفتاب ہدایت'' کے نام سے اسلامی فقہ پر ایک کتاب بھی لکھی تھی جو آج کل ناپید ہے۔

علی محمد کی تعلیمی زندگی بہت شاندار رہی۔ میٹرک میں وہ بہت اچھے نمبروں سے پاس ہوئے اور انہیں آدم جی پیر بھائی کا تمغہ ملا۔ اس کے بعد وہ الفنسٹن کالج میں داخل ہوگئے جہاں سے ۱۹۰۰ میں انہوں نے بی۔ اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا۔ زمانۂ طالب علمی میں اور بعد کو بھی ان کی زندگی سادگی کا نمونہ رہی۔ وہ شروع ہی سے بہت محنتی تھے اور ان کی مابعد کی کامیابیوں کا راز اسی محنت میں مضمر تھا۔ طالب علمی کے زمانہ میں وہ ٹیوشن کرکے اپنا اور گھر کے دوسرے افراد کا

پیٹ پالتے تھے ۔

علی محمد مولوی کی زندگی کئی اعتبار سے سبق آموز ہے ۔ ان کی زبردست ترقی تمام تر ان کی محنت ، کار کردگی ، فرض شناسی اور دیانتداری کی رہین منت تھی ۔ انہی صفات کے باعث انہیں کارپوریشن کی مختلف پارٹیوں کا جن میں کانگریسی ، مہاسبھائی ، مسلم لیگی ، عیسائی اور پارسی سبھی شامل تھے ، مکمل اعتماد حاصل رہا ۔ اتنے بڑے عہدہ پر پہنچ جانے پر بھی وہ لوگوں سے پہلے کی طرح کھل کر ملتے تھے اور ہر ایک کی خدمت کرنا اپنا فرض اولین سمجھتے تھے ۔ انہیں انتہائی درجہ کی فروتنی تھی ۔ اسی کا اثر تھا کہ انہوں نے ان لوگوں کے ساتھ بھی دوستانہ تعلقات کو نبھایا جو اُن کے اس وقت کے دوست تھے جب وہ کچھ بھی نہ تھے ۔

وہ ہر مہینہ اپنی تنخواہ کا ایک معقول حصہ نادار طالب علموں اور غریب رشتہ داروں کے لئے الگ کرلیا کرتے تھے ۔ وہ اس طرح سے خیرات کرتے تھے کہ بائیں ہاتھ کو معلوم نہ ہوتا تھا کہ دائیں ہاتھ نے کیا دیا ۔

علی محمد مولوی کو مذہب سے بہت شغف تھا ۔ انہوں نے دنیا کے تمام بڑے بڑے مذاہب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا تھا اور اگرچہ وہ باعتبار عقیدہ شیعہ تھے ، لیکن ان کے برتاؤ ، سلوک اور گفتگو سے کوئی شخص یہ نہیں کہ سکتا تھا کہ وہ اسلام کے کس فرقہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ان کی مذہبی بے تعصبی اور رواداری کا اس سے بڑھ کر ثبوت اور کیا ہوگا کہ شیعہ اور سنی حضرات نے باری باری سے ان کی نماز جنازہ پڑھی ۔

دوران ملازمت مین انہوں نے پورے تن ، من ، دھن سے شہر بمبئی کی خدمت کی اور اس کے مفاد کو آگے بڑھایا ۔ وہ میونسپل قانون سے اتنے واقف تھے کہ کمشنر وقت کیپٹن* (آئی ۔ سی ۔ ایس)

---

* یہ وہی صاحب ہیں جن کے نام پر کراچی کی ایک خوبصورت سڑک کا نام ہے ۔

بھی واقف نہ ہوگا۔ ایک تقریر کے دوران میں کاپیٹن نے ان کی ہمہ دانی کی تعریف کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ ”جب کبھی میں شش و پنج میں پڑ جاتا ہوں میں انہی سے رجوع کرتا ہوں۔ ان کی تشریح حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہے۔“

وہ ہمیشہ کرایہ کے مکان میں رہے۔ ایک دن میں نے پوچھا کہ ”ایک اعتبار سے تمام میونسپل اراضیات آپ کے کنٹرول میں ہیں۔ پھر آپ اپنا مکان کیوں نہیں بنوالیتے؟“ جواب میں فرمایا :۔ ”جب میرے والد پہلے پہل بمبئی آئے تھے اس وقت بھنڈی بازار میں جیل کے قریب ایک پیسہ کی تین گز زمین ملتی تھی۔ لیکن اس وقت ہمارے پاس کچھ تھا ہی نہیں جو زمین خریدتے۔ اب جب کہ اللہ نے سب کچھ دے رکھا ہے، زمین کی قیمت اس قدر زیادہ ہے کہ خدا کی پناہ* اس لئے ہمت نہیں پڑتی، مکان کیسے بنواؤں؟“ انہیں رشوت لینے کے بیشمار مواقع حاصل تھے، لیکن انہوں نے اپنی پاکیزہ زندگی کو ناجائز آمدنی سے ملوث کرنا مطلق پسند نہیں کیا۔

ان کی وفات اپریل ۱۹۲۵ میں ہوئی۔

***

---

* بمبئی میں پہلی جنگ عظمیٰ کے بعد اراضی کی قیمت میں جو حیرت انگیز اضافہ ہوا اس کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ جس قطعۂ زمین پر ”سنٹرل بنک آف انڈیا“ واقع ہے وہ تقریباً ۱۸سو روپے فی مربع گز کے حساب سے خرید کی گئی تھی۔

سر جے - ای - بی - ہاٹسن

سر ارنسٹ ہاٹسن حکومت بمبئی میں ایگزیکیوٹیو کونسلر تھے اور ہوم ڈیپارٹمنٹ کے انچارج - ہمارا دفتر ہوم ڈیپارٹمنٹ سے منسلک تھا اور اس لحاظ سے وہ ہمارے افسر اعلیٰ تھے - انڈین سول سروس کے ممتاز ممبروں میں ان کا شمار ہوتا تھا - ملازمت سے سبکدوش ہونے سے کچھ عرصہ پیشتر وہ قائم مقام گورنر بھی بنادئے گئے تھے -

ان کی گورنری کا مشہور ترین واقعہ یہ ہے کہ جب وہ پرنسپل کی دعوت پر فرگوسن کالج دیکھنے کے لئے پونا گئے تو وہاں کے ایک طالب علم (وی - بی - گوگٹے) نے ان پر اچانک پستول سے حملہ کردیا - گولی ٹھیک ان کے قلب پر لگتی لیکن چونکہ ان کی جیب میں پرانی وضع کی ڈائری تھی جس میں پیتل کا موٹا سا کلپ لگا رہتا ہے اس لئے نشانہ کلپ پر لگا اور وہ بال بال بچ گئے - ان کی ذاتی بہادری کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے جھپٹ کر وہیں گوگٹے کو پکڑلیا اور حوالہٴ پولیس کردیا - اس بہادرانہ فعل کی بجا طور پر تمام اخبارات نے تعریف کی تھی اور حملہ کی شدید ترین مذمت - بعد کو گوگٹے پر مقدمہ چلایا گیا اور اقدام قتل کی علت میں اسے پانچ سال کی قید با مشقت کی سزا دیدی گئی - کچھ عرصہ بعد ہاٹسن ریٹایر ہوکر عازم ولایت ہوگئے - بمبئی میں جب ۱۹۳۸ میں پہلی مرتبہ کانگریسی حکومت قائم ہوئی اور کنہیا لال منشی ہوم منسٹر بنے تو انہوں نے وزارت سنبھالتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ گوگٹے کی رہائی کا حکم دیدیا - رہا کرنے سے پیشتر انہوں نے اخلاقاً اتنا کیا کہ ہاٹسن صاحب کو خط لکھا کہ

"میں گوگٹے کو اپنے گھر پر عدم تشدد کے سبق دینا چاہتا ہوں - اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میری خواہش ہے کہ اس کی قید کی باقی ماندہ مدت منسوخ کردیجائے -" ہاٹسن نے جواب میں لکھا :- "مجھے اب گوگٹے سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی - اگر آپ اسے رہا کردینا چاہتے ہیں تو آپ ایسا کرسکتے ہیں - میں نے اسے معاف کیا -" اس جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے میں نے ۱۷ ستمبر کو "بمبئی کرانیکل" میں ایک گمنام مراسلہ شائع کرایا جس میں ہاٹسن کے اس فعل کی ذیل کے الفاظ میں تعریف کی گئی تھی :-

سر ارنسٹ ہاٹسن کی فیاضی

آج کے اخبارات میں مجھے یہ دیکھ کر بیحد مسرت ہوئی ہے کہ سابق ہوم ممبر و قائم مقام گورنر بمبئی سر ارنسٹ ہاٹسن نے اپنے حملہ آور وی - بی - گوگٹے کو معاف کردیا ہے جس کے نتیجہ میں اب اس کی قید کی باقی ماندہ مدت بلا کسی شرط کے منسوخ کردی جائیگی - جب یہ حملہ کیا گیا تھا اس وقت سر ارنسٹ ہاٹسن نے نہ صرف غیر معمولی طور پر اپنے اوسان بجا رکھے تھے بلکہ اپنے حملہ آور کو پکڑ کر حیرت انگیز جرأت کا اظہار بھی کیا تھا - اور اب اتنے سال گزر جانے پر انہوں نے بھر اپنی سیرت کی اعلیٰ بلندی کا مظاہرہ کیا ہے اور اپنے حملہ آور کو معاف کرنے پر رضامندی کا اظہار کردینے سے اپنی فطری فیاضی ، شرافت اور کشادہ دلی کا مزید ثبوت پیش کیا ہے - یقیناً یہی وہ شریفانہ افعال ہیں جو دنیا کو خوبصورت اور رہنے کے قابل بنا دیتے ہیں -

بمبئی - ۱۶ ستمبر ۱۹۳۸ "اعتراف حقیقت"

اپنی گورنری کے زمانہ میں انہوں نے حکم دیا کہ سول

لسٹ کے تمام ہندوستانی ناموں کے ہجوں کو ہنٹرز میتھڈ (Hunter's method) کے مطابق معیاری بنادیا جائے۔ مسلمانوں کے ناموں کو معیاری بنانے کا کام میرے سپرد تھا۔ جب نئی تبدیل شدہ سول لسٹ شائع ہوئی تو سوائے سر ابراہیم رحمت‌الله کے باقی کسی کے پاس سے کوئی اعتراض موصول نہیں ہوا۔ سر ابراہیم چاہتے تھے کہ رحمت‌الله کے ہجے یوں لکھے جائیں: Rahimtoola نہ کہ Rahmatullah جیسا کہ میں نے اس کی تصحیح کی تھی۔ بہر حال حکومت نے ہمارے دفتر کی محنت کا خاص طور پر شکریہ ادا کیا اور خود ھاٹسن بھی خوش تھے کہ کارے کردم۔

ھاٹسن کی عقابی نظر ذرا ذرا سی چیز پر پڑتی تھی۔ ایک دن ہمارے دفتر کے کسی چپڑاسی نے کانفیڈنشل لفافہ پر جو سر ھاٹسن کے نام تھا، بہت سا لاکھ تھوپ دیا اور پھر اسپر مہر لگائی۔ جب یہ لفافہ ان کے ہاتھ میں پہنچا تو انہوں نے اپنے ریمارک کے ساتھ سیکریٹریٹ کے سارے دفاتر میں گھمایا اور ہدایت کی کہ آیندہ ایسا اسراف نہ کیا جائے، اور جس چپڑاسی کا یہ کارنامہ تھا اسپر آٹھ آنے جرمانہ کردیا۔

ھاٹسن میں ایک قابل تعریف بات یہ تھی کہ وہ اپنے ماتحتوں کا بہت خیال رکھتے تھے اور اخبارات کے موقع بے موقع حملوں سے انہیں بچاتے تھے۔ مثلاً جب "تھرو انڈین آیز" (Through Indian Eyes) کے لکھنے والے کے متعلق بی۔جی۔ ھارنیمین کی دریافت کے سلسلہ میں بمبئی اسمبلی میں طرح طرح کے سوالات پوچھے گئے تو انہوں نے جواب میں کہا کہ (۱) ان مضامین سے "گورنمنٹ سرونٹس کانڈکٹ رولز" کے کسی قاعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوتی۔ (۲) یہ کہنا بے بنیاد ھے کہ یہ مضامین حکومت کے اشارے سے لکھے جاتے ھیں یا یہ کہ حکومت ان کی پشت پناھی کرتی ھے۔ (۳) حکومت کی رائے میں

یہ مضامین قابل اعتراض نہیں ہیں اور (۴) اس لئے وہ ان کے لکھنے والے کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی -

ہاٹسن میں وہ تمام صفات بدرجہ اتم موجود تھیں جو قبل از تقسیم کی انڈین سول سروس کے ممبروں کا طرۂ امتیاز تھیں۔ وہ بہت بااخلاق اور بلا کے محنتی تھے۔ ان کی شخصیت بہت بارعب تھی - مجھے فخر ہے کہ میں ان کے دور میں مدخولۂ حکومت تھا۔

***

شیخ فیض اللہ بھائی

جب جسٹس بدرالدین طیب جی نے ۱۸۸۱ یا ۱۸۸۲ میں انجمن اسلام ھائی اسکول (بمبئی) کی بنیاد ڈالی تو اس وقت ھیڈ ماسٹری کے لئے ان کی نگہ' انتخاب شیخ فیض اللہ بھائی پر پڑی۔ شیخ صاحب بمبئی یونیورسٹی کے نہایت ذھین اور ھونہار طالب علم تھے۔ بال گنگا دھر تلک اور سر نراین چنداورکر جیسے فاضل اشخاص ان کے ھم جماعت تھے۔ اگر فیض اللہ بھائی چاھتے تو وہ بڑی آسانی سے اچھے سے اچھے سرکاری عہدہ پر فائز ھوسکتے تھے اس لئے کہ وہ صوبہ' بمبئی کے پہلے مسلم گریجوایٹ تھے۔مگر ان کے دل میں قومی و ملی خدمت کی لگن اس قدر زوروں پر تھی کہ انہوں' نے سرکاری ملازمت کی طرف رخ تک نہیں کیا اور جسٹس بدرالدین کے کہنے سے محض سو سوا سو روپے پر انجمن اسلام ھائی اسکول کی ھیڈ ماسٹری قبول کرلی۔ جسٹس موصوف نے ان کے ایثار سے متاثر ھوکر وعدہ کرلیا تھا کہ ملازمت سے سبکدوش ھونے پر ان کے تمام نقصانات کی تلافی کردیجائیگی۔ مگر لندن میں ان کے بیوقت انتقال سے وہ وعدہ تشنہ رہ گیا۔

شیخ فیض اللہ بھائی نے تقریباً ۳۵ سال تک نہایت انہماک اور خلوص سے اسکول کی خدمت کی۔ اس تمام مدت میں انہوں نے صرف ۱۴ دن کی رخصت لی اور وہ بھی اس وقت جب کہ وہ بخار میں مبتلا ھوگئے تھے۔ سر آدمجی پیر بھائی کے بوھرہ اسکول میں بھی انہوں نے تقریباً ۱۲ سال تک عربی پڑھائی اور حق الخدمت کے طور پر ایک حبہ بھی نہ لیا۔

دوران ملازمت میں شیخ صاحب نے بڑھتے ھوئے مصارف زندگی کے پیش نظر اضافہ' تنخواہ کی درخواست دیدی۔ اس وقت

اسکول کے ٹرسٹیوں میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو لکھ پتی ہونے کے باوجود تعلیم کی افادیت کے چنداں قائل نہ تھے، اور یہی وجہ ہے کہ انہیں چند روپوں کا اضافہ بھی گراں گزرا۔ لیکن خدا بھلا کرے مرزا علی محمد خاں کا کہ ان کی پر زور وکالت کے نتیجہ میں بصد دقت ان کی تنخواہ میں صرف ۲۵ روپے کا اضافہ کیا جاسکا۔ مرزا صاحب مجھ سے کہتے تھے کہ ''جاہل مالداروں کے ہاتھ میں کسی تعلیمی ادارہ کی باگ ڈور سونپ دینا انتہائی ظلم ہے۔'' اس واقعہ کے کچھ عرصہ بعد مزید ۲۵ روپے کا اضافہ کیا گیا۔ جب وہ ۱۹۱۷ یا ۱۹۱۸ میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے ہیں تو اس وقت انہیں صرف ۱۷۵ روپے مل رہے تھے۔ ان کے بعد جو صاحب آئے انہیں ۳۰۰ روپے ماہوار پر ملازم رکھا گیا۔ اس سے زیادہ قدرت کی ستم ظریفی اور کیا ہوگی!

ملازمت سے علیحدگی پر شیخ صاحب نے ٹرسٹیوں کو جسٹس بدرالدین کا وعدہ یاد دلایا اور پنشن یا گریچوایٹی (gratuity) کا مطالبہ کیا۔ اس پر ٹرسٹیوں کا پھر جلسہ ہوا اور بڑے ہنگاموں کے بعد ان کے لئے ۲ ہزار روپے کی ''گرانقدر'' رقم منظور کی گئی۔ یہ بھی مرزا صاحب کی پرجوش وکالت کی وجہ سے ہوا ورنہ جاہل ٹرسٹی تو انہیں کچھ بھی دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور کوئی ادارہ ہوتا تو شیخ صاحب جیسے ایثار پیشہ بزرگ کی بڑی قدر کرتا اور ریٹایر ہوتے وقت انہیں اتنی رقم دے دیتا کہ وہ فراغت سے اپنی باقی ماندہ زندگی علمی کاموں کی نذر کردیتے۔

جب مجھے اس بدسلوکی کا حال معلوم ہوا تو میں نے ''بمبئی کرانیکل'' میں ایک مراسلہ شائع کرایا جس میں سلطان محمود اور فردوسی کے قصہ کی طرح اشارہ کرکے پوچھا گیا تھا کہ کیا اسکول کے ٹرسٹی پچھلی تاریخ دہرانا چاہتے ہیں؟

شیخ صاحب سے میری ملاقات ۱۹۱۸ میں ہوئی جب کہ

وہ ریٹایر ہوچکے تھے۔ مگر میں نے از راہ ہمدردی ''کرانیکل'' میں ان کی تائید میں کئی ایک مراسلے شائع کرائے ، لیکن بے حس ٹرسٹیوں پر اس ''کلام نرم و نازک'' کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔

شیخ صاحب کی طالب علمی کا زمانہ بہت شاندار تھا۔ انہوں نے عربی زبان کا مطالعہ ۷ برس کی عمر میں شروع کیا اور دس سال کے عرصہ میں اس میں اعلیٰ قابلیت حاصل کرلی ، انہوں نے میٹرک کا امتحان سورت ہائی اسکول سے پاس کیا اور بائی مانک بائی بھراسجی جیجی بھائی کا انعام حاصل کیا۔ انٹرنس کے امتحان سے ابھی وہ فارغ ھی ھوئے تھے کہ ان کے والد ماجد کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ لیکن انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور ٹیوشن کرکے کالج کی تعلیم کو جاری رکھا۔ ان کے ذوق و شوق کی یہ حالت تھی کہ جب کبھی گھر میں مٹی کا تیل نہ ہوتا تو وہ باھر سڑک پر جاکر میونسپلٹی کے کھمبوں کی روشنی میں مطالعہ کرتے۔ کالج میں انہوں نے متعدد انعامات پائے اور بی۔ اے کا امتحان ۱۸۷۶ میں اول درجہ میں پاس کیا۔ انہیں عربی اور ریاضی سے زندگی بھر گہرا شغف رہا۔

وہ عربی کے منتہی تھے۔ انہوں نے ۱۸۹۳ میں قصیدہ بردہ کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا جس کا تعارف الفنسٹن کالج کے مشہور و معروف ایرانی بزرگ پروفیسر مرزا حیرت کا تحریر کردہ ھے۔ ۱۸۹۸ میں انہوں نے سبعۂ معلقات کے ترجمہ پر نظر ثانی کی اور دیباچہ میں انہوں نے زمانۂ جاھلیت کی شاعری پر مبسوط تبصرہ کیا۔ انہوں نے ریاضی کی شاخ علم مثلث (ٹرگنومیٹری) پر تقریباً ۱۰۰۰ صفحات کی کتاب بھی لکھی تھی۔ اگر انہیں فراغت نصیب ہوتی تو یقیناً وہ اور ٹھوس علمی خدمات انجام دیتے اور دنیائے علم و ادب میں مسلمانوں کا نام روشن کرتے اس لئے کہ وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔

میں ان کی غیر معمولی قابلیت ، ان کی فروتنی اور انکساری ،

ان کی بے داغ زندگی اور ان کے اعلیٰ اخلاق کا ہمیشہ گرویدہ رہا ۔ ان جیسی ٹھوس قابلیت کے مسلمان بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مجھے ہمیشہ اس بات کا رنج رہا کہ بمبئی کے لکھ پتی مسلمان ان کے ایثار کی ، ان کی کارکردگی کی اور ان کے علم و فن کی کچھ بھی قدر نہ کرسکے ۔ افسوس !

تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو !

***

سید سلیمان ندوی

سید سلیمان کے ایک بہت ہی قریبی عزیز سید سعید رضا سینٹ زیویرز کالج بمبئی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔ برسوں تک ہم دونوں ایک ساتھ رہے۔ ان سے سید صاحب کے بارے میں ذکر اذکار رہا کرتے تھے۔ ان کے علاوہ پروفیسر شیخ عبدالقادر سرفراز جو دکن کالج پونا میں فارسی کے پروفیسر تھے، متعدد دفعہ ان کا ذکر خیر کرچکے تھے۔ ان دونوں حضرات کی باتوں نے میرے دل میں یہ شوق پیدا کیا کہ کوئی موقع ہو تو سید صاحب سے ملاقات کی جائے۔ میری یہ آرزو اس وقت پوری ہوئی جب سید صاحب حکومت بمبئی کی دعوت پر بمبئی تشریف لائے اور مارچ ۱۹۲۱ میں "عربوں کی جہازرانی" پر انجمن اسلام ہائی اسکول کے ہال میں چار لیکچر دئے۔ اس وقت سے لیکر ان کی وفات تک میں ان کی شفقت سے بہرہ اندوز ہوتا رہا۔

ضلع پٹنہ میں دیسنہ نام کا ایک موضع ہے۔ یہ بڑا مردم خیز خطہ ہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں نے جتنے گریجوایٹ پیدا کئے ہیں آتنے ہند و پاکستان کے کسی اور گاؤں نے نہ پیدا کئے ہونگے۔ اس طرح اس نے عربی کے بھی متعدد منتہی پیدا کئے۔ انہی میں سید سلیمان کا شمار ہے۔

دارالعلوم ندوہ کے کسی سالانہ اجلاس میں سید صاحب نے پہلی دفعہ عربی میں برجستہ تقریر کی جسے سنکر علامہ شبلی اس قدر خوش ہوئے کہ انہوں نے جلسہ میں اپنا عمامہ آتار کر ان کے سر پر رکھدیا۔ اسی طرح جب سید رشید رضا (ایڈیٹر المنار) دارالعلوم ندوہ دیکھنے کے لئے لکھنؤ آئے تو اس موقع پر سید سلیمان نے عربی میں ان کا خیر مقدم کیا جس سے رشید رضا اس

قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے انہیں گلے لگالیا۔

بالائے سرش ز ہوشمندی
می تافت ستارۂ بلندی

سید صاحب نے کچھ دن تک دارالعلوم کی مسند تدریس کو زینت بخشی۔ کچھ عرصہ تک ''الہلال'' میں مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کام کیا۔ اس کے بعد دکن کالج پونا میں دو سال تک فارسی کے اسسٹنٹ پروفیسر رہے۔ پھر علامہ شبلی نے انہیں سرکاری ملازمت سے استعفا دیدینے اور دارالمصنفین میں آکر کام کام کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ اپنے استاد کی خواہش پر دارالمصنفین چلے گئے۔ پونا کے دوران قیام میں انہوں نے ''ارض القران'' لکھی جسے مشرق و مغرب کے مستشرقین نے بہت سراہا۔ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب ہے، اور تحقیق و علمیت کا نادر نمونہ ہے۔

وفات سے قبل علامہ شبلی نے سید صاحب سے بتاکید فرمایا کہ ''سیرت نبوی کے کام کو سب کاموں پر اولیت دیجائے۔'' یہ حقیقت ہے کہ جس خوش اسلوبی سے انہوں نے اپنے اُستاد کی نامکمل کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا اس کی وجہ سے علمی دنیا میں ان کا نام دور دور مشہور ہوگیا۔ سیرت کی چھ جلدوں میں ابتدائی پونے دو اُستاد کی ہیں۔

سید صاحب ساری عمر طالب علم رہے۔ ایک زمانہ میں وہ سیاسیات میں بھی حصہ لیتے تھے لیکن انہوں نے اس خارزار سے بہت جلد اپنا دامن چھڑالیا اور خاموش علمی خدمت میں اپنی بقیہ عمر گزاردی۔ ان کی کتابیں ''عمر خیام''، ''عرب و ہند کے تعلقات'' وغیرہ تحقیق کے اعتبار سے حرف آخر کی حیثیت رکھتی ہیں۔

۱۹۲۰ میں جب وفد خلافت انگلستان بھیجنے کی تجویز ہوئی تو اپنی غیر معمولی علمی فضیلت کی وجہ سے انہیں علمائے

ہند کی جانب سے وفد میں شامل کیا گیا - وہاں انہوں نے ممتاز مستشرقین سے ملاقاتیں کیں اور انہیں اپنا ہم خیال بنایا - جولائی کے ''فارین افیئرز'' میں ان کا ایک مضمون شائع ہوا تھا جس میں خلافت کے مذہبی پہلو کو نہایت قابلیت سے اجاگر کیا گیا تھا -

سید صاحب کا ایک اور کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے استاد کے سوانح حیات ایک مبسوط کتاب کی صورت میں لکھے - جب وہ شائع ہوئی تو میں نے اسے نہایت شوق سے پڑھا - اس کے بعد میں نے مولانا کو ایسی اچھی کتاب لکھنے پر مبارکباد بھیجی - جواب میں سید صاحب نے تحریر فرمایا :-

> ''خوشی ہوئی کہ آپ نے 'حیات شبلی' کو پسند کیا اور اس کو غور و تحمل سے پڑھا - آپ نے جن اغلاط کی طرف متنبہ کیا ہے انشاء اللہ ان کی تصحیح کر دیجائیگی اس قسم کے اغلاط کی نشاندہی مصنف کی سب سے بڑی مدد ہے - ہمارے یہاں جب تک لائق مصححین پیدا نہ ہونگے ، یہ فروگزاشتیں دور نہیں ہوسکتیں - آپ اگر مزید اغلاط سے اطلاع دیں تو اور بھی خوشی ہوگی - ''

سید صاحب ۱۹۵۰ میں کراچی تشریف لائے - ایک دن انجمن ترقی اردو کے میدان میں ان کی تقریر ہوئی - تقریر کا موضوع تھا : '' ہندی الاصل اور ہندی النسل مسلمان سلاطین ہند -'' صدر ڈاکٹر محمود حسین تھے اور انہوں نے اثنائے تقریر میں فرمایا کہ '' آپ حضرات یہ سنکر خوش ہونگے کہ سید صاحب مستقلاً نقل وطن کرکے پاکستان تشریف لے آئے ہیں - '' جلسہ کے اختتام پر میں نے سید صاحب سے شکایتاً کہا کہ '' یہ کیا غضب ہے کہ یہ اطلاع آپ نے خود مجھے نہیں دی -'' وہ مسکرا کر خاموش ہوگئے اور قدرے سکوت کے بعد فرمایا : ''اب

تو آپ کو معلوم ہو گیا ۔"

میری آخری ملاقات انتقال سے ایک دن قبل ۲۱ نومبر ۱۹۵۳ کو ہوئی ۔ وہ کچھ عرصہ سے ناسازیٔ مزاج کی وجہ سے صاحب فراش تھے اور ملنا جلنا کم کردیا تھا ۔ میں مغرب کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا ۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بالکل صحت یاب ہو گئے ہیں اگرچہ وہ نقاہت کی وجہ سے آہستہ آہستہ باتیں کررہے تھے۔ مجھے ان کا چہرہ جتنا نورانی اس شام کو نظر آیا اتنا کبھی نظر نہیں آیا تھا ۔ میں برابر ان کے چہرے کو ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا ۔ ان کے چہرے کی جاذبیت اور روشنی ناقابل فراموش ہے ۔ دوسرے دن شام کو جب مجھے ان کی وفات کی خبر ملی اس وقت میں سمجھ سکا کہ کیوں خدا نے ان کے چہرے کو اس قدر نورانی بنا دیا تھا ۔ وہ اب اس دنیائے اسفل کے قابل نہ رہے تھے ۔

نماز جنازہ نیوٹاؤن مسجد میں ہزارہا اشخاص کی موجودگی میں ادا کی گئی ۔ مملکت شام کے ثقافتی اتاشے شیخ ابوالخیر نے تدفین کے بعد تقریر کرتے ہوئے فرمایا :۔ "مجھے غم اس بات کا نہیں ہے کہ سید سلیمان ہم میں سے اٹھ گئے ۔ مجھے اگر غم ہے تو اس بات کا کہ علم بھی ان کے ساتھ دفن ہو گیا ۔"

سید صاحب فطرۃً نہایت خاموش اور قناعت پسند انسان تھے ۔ ان کی زندگی میں ہمیں دین و دنیا دونوں متوازن طریقے سے سموئے ہوئے ملتے ہیں ۔ ان کی زندگی کی پاکیزگی ان کے چہرے سے ہویدا تھی ۔

جن دنوں وہ دکن کالج پونا سے وابستہ تھے ، اس زمانہ کا ایک واقعہ مجھے یاد رہ گیا ہے جسے خود سید صاحب نے سنایا تھا ۔ فرماتے تھے :۔ "ہمارے کالج کا ایک پروفیسر مراٹھی میں کسی کو ڈانٹ رہا تھا ، لیکن گالیاں اردو میں دے رہا تھا ۔ اس پر میں نے پوچھا کہ کیا مراٹھی میں ان گالیوں کے مترادفات

موجود نہیں ہیں؟ کہا ، ہیں تو ، مگر آردو کا سا زور ان میں کہاں ؟'' بہر حال سید صاحب یہ دیکھکر خوش تھے کہ خواہ کسی حیثیت سے سہی آردو کا سکہ دور دور جاری و ساری تو ہے۔''

ان کی تنہا ذات ایک انجمن کی حیثیت رکھتی تھی ۔ عام مولویوں کی طرح وہ زاہد خشک نہ تھے ۔ وہ بلبل ہزار داستان تھے اور یورپ اور حجاز کے سفروں کے واقعات مزے لے لیکر بیان کرتے تھے ۔ ان کی طبیعت میں مزاح تھا لیکن وہ شایستگی کے حدود سے کبھی آگے نہیں بڑھا ۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ قابل ذکر ہے ۔ ایک دفعہ مولانا ..... دارالمصنفین تشریف لائے ۔ عین اس وقت کہیں سے کوئی گدھا بھی اندر آ گیا ۔ مولانا نے حیرت سے سید صاحب سے پوچھا کہ '' یہاں گدھے بھی آجاتے ہیں ؟'' فرمایا ، ''ھاں، کبھی کبھی باھر سے آجاتے ہیں ۔'' یہ جواب سن کر مولانا چپ سادھ گئے ۔

انہیں جو محبت اپنے آستاد (علامہ شبلی) سے تھی اسے دیکھکر پرانے زمانے کے گرو اور چیلے کے تعلقات کی یاد تازہ ہوجاتی تھی ۔ موجودہ دور کے شاگردوں میں ان کا سا شغف کبھی دیکھنے میں نہیں آسکتا ۔

جس زمانہ میں میں مدخولہ حکومت بمبئی تھا ، دوسرے فرائض کے علاوہ مولانا محمد علی کے خطوط کو سنسر کرنے کی خدمت بھی میرے سپرد تھی ۔ بیجا پور کی قید کے زمانہ میں مولانا ۸۰—۸۰ صفحات کے خط لکھا کرتے تھے ، اور ان میں جہاں دنیا بھر کی باتیں ہرتی تھیں وھاں ان کا تازہ کلام بھی ہوتا تھا ۔ بیجاپور سے اپنی رھائی سے قبل جو آخری خط مولانا نے لکھا اس میں ان کی ۲۲ اشعار کی ایک غزل بھی تھی جس کا مطلع تھا :

ہے یہاں نام عشق کا لینا اپنے پیچھے بلا لگا لینا

میں نے یہ غزل نقل کرکے ''معارف'' میں چھپنے کے لئے بھیجدی

اور پروفیسر سید سعید رضا کے ذریعہ یہ ہدایت بھجوادی کہ یہ ظاہر نہ ہونے پائے کہ غزل ان تک کیسے پہنچی۔ مگر سید صاحب کے شوخ قلم نے تمہید کے طور پر یہ الفاظ بڑھا ہی دئے: ''جناب جوہر کا یہ کلام ان کی آزادی سے پہلے آزاد ہو کر ہمارے پاس پہنچا تھا۔''

سید صاحب کی موت سے پاکستان اور بھارت دونوں ایک شریف ترین شخصیت، ایک بے بدل فاضل، ایک زبردست مصنف، ایک غیر جانبدار مورخ اور ایک عالم با عمل کی خدمات سے محروم ہو گئے۔ ایسے اشخاص کہیں صدیوں میں جا کر پیدا ہوتے ہیں اور جب تک زندہ رہتے ہیں اپنی زندگی کی درخشانی سے دنیا کو منور کر جاتے ہیں اور مرنے کے بعد بھی فیض پہنچاتے رہتے ہیں:

لوح امکان سے آج مٹتی ہے
علم و فضل و کمال کی صورت

***

مولوی وحید احمد مدنی

مولوی وحید احمد نام ہے مولانا حسین احمد مدنی کے بھتیجے کا۔ یہ پہلی جنگ عظمیٰ میں اپنے چچا کے ساتھ حج کرنے گئے اور سر زمین حجاز سے انہیں بھی مولانا حسین احمد اور مولانا محمود حسین کے ساتھ گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیا گیا۔ مالٹا میں انہیں متعدد قوم پرست ترکوں اور عربوں کی صحبت میسر آئی جنہیں برطانوی حکومت نے خطرناک سمجھکر نظر بند کر رکھا تھا۔ عربی انہوں نے دیوبند میں سیکھ لی تھی اور اب جو تعلیم یافتہ عربوں سے میل جول بڑھا تو ان کی عربی پر جلا ہوگئی۔ ترکی انہوں نے وہیں مالٹا میں ترک قیدیوں سے سیکھی۔ ان کے ذہن کی تعریف نہیں کی جاسکتی اس لئے کہ انہوں نے محض تھوڑی سی مدت میں ترکی پر عبور حاصل کرلیا تھا۔ وہ ترکی ایسی روانی سے بولتے تھے گویا کہ وہ ان کی مادری زبان ہے۔ جنگ عظیم کے اختتام پر وہ بمبئی آئے اور ''روز نامہ خلافت'' سے وابستہ ہوگئے۔

وہ مختلف ممالک کی سیاحت کرچکے تھے، لیکن اس کے باوجود انہوں نے اپنی وضع قطع نہیں بدلی۔ وہ ہمیشہ ڈھیلے ڈھالے لمبے کرتے اور پاجامہ میں ملبوس رہے۔ انہوں نے کھدر پہننے کا جو عہد کیا تھا اس پر مرتے دم تک قائم رہے۔

وحید احمد کہتے تھے کہ انگریزوں نے پہلی جنگ عظیم میں طرح طرح کے سبز باغ دکھا کر پہلے تو شریف مکہ کو ترکوں سے توڑا اور پھر اس سے بغاوت کرائی۔ وہ ان مظالم کے بھی عینی شاہد تھے جو ان ترک مردوں اور عورتوں پر روا رکھے گئے تھے جو مجبوراً حجاز میں رہ گئے تھے۔

میں ایک واقعہ بالضرور قلمبند کردینا چاھتا ھوں جس سے ترکوں کے شریفانہ کردار پر بھی روشنی پڑتی ھے۔ وحید احمد اس واقعہ کے راوی ھیں۔ انھوں نے بیان کیا کہ شریف حسین کا بڑا لڑکا بغاوت * سے پہلے شام میں مقیم تھا۔ وھاں جمال پاشا نے اسے بلا کر کہا :۔ ''ھمیں معلوم ھوا ھے کہ تم انگریزوں سے ساز باز کر رھے ھو۔'' اس نے کہا کہ ''یہ بالکل غلط ھے اور اگر میرے والد نے کسی انگریز سے اس قسم کے خیالات کا اظہار کیا بھی ھوگا۔ تو میں انہیں جادۂ وفاداری سے ھٹنے نہ دونگا۔'' یہ کہکر اس نے مزید اطمینان دلانے کے لئے قرآن مجید پر حلف اُٹھایا اورعہد کیا کہ ''میں ھمیشہ ھمیشہ خلیفۃ المسلمین کا وفادار رھونگا۔'' اس اظہار وفاداری کے بعد جمال پاشا نے اسے ۲۵ ھزار اشرفیاں دیں اور گیہوں اور دوسرے اجناس کے ذخائر بھی دئے۔ فیصل بغاوت کے ثمرات سے صرف تھوڑی مدت تک متمتع ھوسکا۔ خود اس کا باپ بھی زیادہ عرصہ تک والیٔ حجاز نہ رہ سکا اس لئے کہ سلطان ابن سعود نے اس کے خلاف خروج کیا جس کے نتیجہ میں اس نے انگریزی جہاز میں بھاگ کر جزیرہ قبرص میں پناہ لیلی۔

وحید احمد بڑی محبت اور خلوص کے آدمی تھے۔ ان سے مل کر دل خوش ھوتا تھا۔ جب وہ بمبئی سے چلے گئے تو مجھے اپنی زندگی میں نہ پر ھونے والا خلا محسوس ھوا۔

انھیں ترکی اور عربی کے ھزارھا اشعار یاد تھے جنھیں وہ دوستوں میں بیٹھکر سنایا کرتے تھے۔ دور جاھلیت کے شعرا کا بہت سا کلام انھیں از بر تھا۔ یہ اشعار وہ ترنم کے ساتھ بڑے جوش و خروش سے پڑھتے تھے اور محفل میں سماں باندھ دیتے تھے۔ وفات کے وقت ان کی عمر ۸۰ سال تھی۔

خوش درخشید ولے شعلۂ مستعجل بود

---

* ''شریف حسین کے بڑے صاحبزادے ... عربوں کی بغاوت کے اصل بانی تھے۔'' (''برید فرنگ'' از سید سلیمان ندوی۔)

جگن ناتھ کھنہ

جگن ناتھ الہ آباد کے رہنے والے تھے ۔ انٹرنس کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ ملک کے مشہور انقلابی لیڈر راجہ مہندر پرتاب کے یہاں ملازم ہو گئے جو ہندو مسلم اتحاد کے زبردست داعی تھے اور جو آج بھی بڑھاپے کے باوجود اسی تخیل کو عملی جامہ پہنانے میں مصروف ہیں ۔ راجہ صاحب کو برطانوی حکومت نے ناپسندیدہ شخص سمجھ کر جلاوطن کردیا تھا اور ان کی جایداد ضبط کرلی تھی ۔ مجھے بمبئی میں ان سے ملاقات کی عزت نصیب ہوچکی ہے ۔ راجہ صاحب کی معیت میں رہتے رہتے کھنہ صاحب میں رواداری اور وسیع المشربی کا بے پناہ جذبہ پیدا ہوگیا تھا ۔ بعد کو قرض وام کرکے کھنہ صاحب امریکہ پہنچے جہاں انہوں نے الیکٹریکل انجینیرنگ میں سب سے اونچی ڈگری حاصل کی اور عازم ہندوستان ہو گئے ۔ راستہ میں انگلستان ٹھہر گئے اور وقت کاٹنے کی غرض سے وہاں اسلحہ سازی کے کسی کارخانہ میں ملازمت کرلی ۔ بعد کو وزیر ہند کی سفارش پر لارڈ چیمسفورڈ نے انہیں بی ۔ بی ۔ اینڈ سی ۔ آئی ریلوے میں متبادل ملازمت دلوادی ۔ فروری ۱۹۱۸ میں میری ان سے پہلی ملاقات بمبئی میں ہوئی ۔ ملاقات کرانے والے میرے دوست ڈاکٹر محمد حفیظ سید تھے جو ان کے ہم جماعت ہیں ۔

کھنہ صاحب ''سیلف میڈ'' آدمی تھے ۔ وہ ایسے زمانہ میں امریکہ گئے تھے جبکہ بہت کم ہندوستانی وہاں جانے کی ہمت کرتے تھے ۔ انہوں نے وہاں ادنیٰ سے ادنیٰ ملازمتیں کیں، سڑکوں پر جھاڑو دی ، جوتوں پر پالش کی ، باغوں کے میوے توڑے ، وغیرہ وغیرہ ۔ کھنہ کہا کرتے تھے کہ ''چند مہینے کی

محنت مزدوری سے میں اپنا سال بھر کا خرچ نکال لیا کرتا تھا۔‘‘

جون ۱۹۱۸ میں جب انجمن اسلام ھائی اسکول سے میری علیحدگی عمل میں آگئی ، تو میں کھنہ صاحب کے یہاں چلا گیا اور تقریباً ایک مہینہ تک ان کے گھر میں مہمان کی حیثیت سے مقیم رہا ۔ میاں بیوی نے جس خلوص سے میری پذیرائی کی اس کی خوشگوار یاد میرے دل سے تا زندگی محو نہوگی۔ جولائی میں جب مجھے سرکاری ملازمت مل گئی تو میں ان کے یہاں سے اٹھ آیا ۔

کھنہ صاحب کی بیوی ودیا دیوی پنجاب کی رہنے والی تھیں ۔ یہ بڑی لکھی پڑھی اور روشن خیال خاتون تھیں۔ برسوں کے تجربہ کی بنا پر کہ سکتا ھوں کہ ان کے گھر کے درو دیوار تک محبت اور سکون کی فضا سے معمور رہتے تھے ۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان میں کبھی اختلاف ھی نہ ھوتا تھا ، جھگڑے ھوتے تھے اور کئی ایک جھگڑوں میں ثالثی کے فرائض میں ادا کرچکا ھوں ، لیکن محبت کی عام فضا میں وہ اختلافات اس طرح سے تحلیل ھوجاتے تھے کہ گھریلو زندگی کے سکون میں کبھی فرق نہ آنے پاتا تھا ۔ مسز کھنہ بیحد مزاج شناس ، وسیع الخیال اور خوش مزاج خاتون تھیں اور اختلافی باتوں سے دور رہتی تھیں۔

کھنہ صاحب کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور آئے دن ان کے یہاں مہمان اور دوست آتے رہتے تھے ۔ انہوں نے مجھے باندرہ میں اپنی بنگلیا کا ایک حصہ دے رکھا تھا ۔ اتفاق سے ایک دن ڈنر پر ان کے یہاں ایک صاحب مع اپنی اھلیہ کے آگئے ۔ ھم سب نے مل کر کھانا کھایا ۔ یہ بیوی بڑی کٹر ھندو تھی اور اس نے کسی غیر ھندو کے ساتھ زندگی بھر کھانا نہیں کھایا تھا ۔ ڈنر کے بعد اس نے اتفاق سے مجھے کونے میں نماز پڑھتے دیکھ لیا ۔ اس پر اس نے مسز کھنہ سے کہا کہ ’’آپ کے یہاں جو شخص ٹھہرا ھوا ھے ، وہ تو مسلمان معلوم ھوتا ھے ؟ ‘‘ انہوں نے اثبات میں جواب دیا اور کہا کہ

''مسلمانوں میں وہ برھمن کی حیثیت رکھتا ھے۔'' اسپر اس نے کہا کہ ''اسے علیحدہ کھانا کھلایا کرو ورنہ ھم یہاں سے چلے جائینگے۔'' مسٹر کھنا اور مسز کھنا نے لاکھ سمجھایا مگر وہ نہ مانی اور غصہ میں اپنے خاوند کو لے کر چلی گئی۔ میرے میزبانوں نے اپنے برسوں کے دوستوں سے بگاڑ کرلیا مگر اپنی وضعداری میں سر مو فرق نہ آنے دیا۔

ان کے دوستوں میں بہت سے مسلمان بھی تھے۔ علاوہ ازیں ان کے ماتحت ھزارھا آدمی تھے جن میں سب فرقوں کے لوگ شامل تھے۔ وہ ھمیشہ فرقہ وارانہ تعصب سے بالاتر رھے۔ بہ حیثیت افسر کے اُن کا برتاؤ اپنے ماتحتوں سے بہت شریفانہ تھا۔ ۱۹۳۸ میں ۱۸۰۰ روپے پانے کے باوجود ان میں کبھی اکڑ پیدا نہ ھوئی۔ وہ پہلے کی طرح سیدھے سادھے انسان رھے۔

وہ ھر لحاظ سے بہت اونچے انسان تھے نہ صرف دنیوی وجاھت کے نقطۂ نظر سے بلکہ خیالات اور اخلاق کے اعتبار سے بھی۔ جو باتیں انسانیت کو زنگ آلود کردیتی ھیں، ان میں سے ایک بھی ان میں موجود نہ تھی۔ اگر سارے تعلیم یافتہ ھندو ان دونوں کی طرح روادار، ھمدرد، وسیع القلب اور روشن خیال ھوتے تو کاھے کو تقسیم کا سوال اٹھتا!

ریٹایر ھونے سے کچھ عرصہ پہلے ان کی آنکھوں کی رگیں پھٹ گئی تھیں اور خون نہ پہنچنے کی وجہ سے ان میں اندھاپن پیدا ھو گیا تھا۔ بہت علاج کرائے، افعی کے زھر کے انجکشن پر انجکشن لئے، مگر سب بے سود۔ ان کی بینائی نہ آنی تھی نہ آئی۔ اسی بیماری میں آخر وہ گھلتے گھلتے سرگباش ھو گئے۔* اُن کی

---

* ان کی بڑی صاحبزادی سنتوش دیوی نے بمبئی میں مجھے انتقال کی خبر یوں دی تھی:۔

"Regret to write dear Daddy has left us for ever—Santosh."

بیوی اس صدمہ کو زیادہ عرصہ تک برداشت نہ کرسکیں اور وہ بھی کچھ دنوں بعد اپنے خاوند سے جاملیں۔ اپنے محبوب خاوند کی وفات کے بعد انہیں چپ لگ گئی تھی اور پہلے کا سا ہنسنا بولنا بند ہو گیا تھا۔

ان کی موت سے جو خلا میری زندگی میں پیدا ہوا وہ آج تک پر نہیں ہوسکا۔

***

بی۔جی۔کھیر

کھیر صاحب باعتبار پیشہ سالسٹر تھے اور رتنا گری کے رہنے والے تھے ۔ وزارت عظمیٰ پر فائز ہونے سے پیشتر وہ زیادہ تر سوشل کام کیا کرتے تھے۔ جب بمبئی میں پہلی مرتبہ کانگریسی حکومت قائم ہوئی تو اتفاق رائے سے انہیں وزیراعظم چنا گیا۔ ان سے میرے تعلقات زیادہ تر آفیشل تھے، مگر میں نے انہیں ہمیشہ ایک بہترین انسان پایا۔

اسمبلی میں وہ جب کبھی تقریر کرتے تو ایسے الفاظ استعمال کرتے جن سے کسی کی دلآزاری نہ ہو۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ انہوں نے حکومت کی طرف سے ایک قرارداد پیش کی جس میں حکومت برطانیہ سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ آیندہ سے ہندوستانیوں کو خطابات سے نہ نوازا کرے۔ اس موقع پر انہوں نے چند انگریز مفکرین کی رائیں پیش کرکے بتایا تھا کہ خطابات انسانی سیرت پر بہت برا اثر ڈالتے ہیں۔ ان کی تقریر نہایت مدلل تھی اور انداز بیان میں بیحد خلوص تھا۔

کھیر صاحب جب تک وزیر اعظم رہے ان کی کوشش یہی رہی کہ اقلیتوں کے ساتھ پورا پورا انصاف ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کے دور حکومت میں صوبۂ بمبئی میں وہ زیادتیاں نہ ہونے پائیں جن کا ذکر راجہ صاحب پیر پور کی رپورٹ میں کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ میں بمبئی کے بارے میں محض معمولی شکایات درج ہیں اور وہ بھی ایسی ہیں جن کے متعلق دو رائیں ہوسکتی ہیں۔ میں نے راجہ صاحب سے بمبئی میں ایک موقع پر عرض کیا تھا کہ معمولی باتوں کو وہ اپنی رپورٹ میں درج نہ کریں مگر انہوں نے میرے مشورے کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

کھیر صاحب کی مادری زبان مراٹھی تھی مگر وہ گجراتی اور کنڑی سے بھی خوب واقف تھے اور اردو تو بہت ہی اچھی بولتے تھے۔ وہ مسلمانوں سے عموماً اردو ہی میں گفتگو کرتے تھے۔ وہ ''آپ جناب'' کہکر باتیں کیا کرتے تھے۔ اردو کو وہ ہندوستان کی Lingua Franca قرار دیتے تھے۔ ان میں عصبیت نام کو نہ تھی۔

وزارت کے دور میں بھی ان میں نام کو اکڑ نہ تھی اور نہ وہ حفاظت کی غرض سے کسی ہتھیار بند شخص کو اپنے ہمراہ رکھتے تھے۔ وزارت سے پہلے وہ جیسے سیدھے سادے انسان تھے ویسے ہی وہ آخر وقت تک رہے۔ وزیر اعظم بن جانے کے بعد بھی وہ کچھ عرصہ تک بدستور سابق لوکل ٹرین یا بس سے آتے جاتے رہے۔ وہ بلا خوف و خطر لوگوں سے گھل مل کر بات چیت کرتے تھے۔ انہیں دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ عوامی وزیر کیسا ہونا چاہئے۔ وہ پبلک پر اعتبار کرتے تھے اور پبلک آن پر۔

کراچی آجانے کے بعد میری ان سے دو تین مرتبہ خط و کتابت ہوئی۔ خطوں میں وہی پہلا سا خلوص جھلکتا تھا۔ اگرچہ میں ان کے ماتحت رہ چکا تھا لیکن اس کے باوجود وہ ہمیشہ ''ڈیر جناب برنی'' لکھا کرتے تھے۔ یہ ان کی محض ذرہ نوازی تھی۔ مجھے فخر ہے کہ ان کی وزارت عظمیٰ کے دور میں میں مدخولۂ حکومت تھا۔

وہ جب تک زندہ رہے انہوں نے اپنی غیر معمولی شخصیت، بلند خیالات، وسیع المشربی اور بنی نوع انسان کی سچی محبت سے اپنے ماحول کو منور رکھا۔ وزارت عظمیٰ کے زمانہ میں انہوں نے محمد یاسین نوری کے ذریعہ جو محکمۂ رفاہ عامہ کے وزیر تھے، احمد نگر کی قدیم مساجد کو جو انگریزوں کے دور حکومت میں سرکاری دفاتر میں تبدیل کردی گئی تھیں، مسلمانوں کے حق میں واگزار کرادیا۔

سر غلام حسین ہدایت اللہ

پہلی جنگ عظمیٰ کے بعد جب ہندوستان میں پہلی مرتبہ ذمہ دار وزارتیں قائم ہوئیں تو اس وقت غلام حسین حکومت بمبئی میں وزیر کی حیثیت سے مقرر ہوئے اور رفاہ عامہ کا محکمہ ان کے سپرد کیا گیا۔ ان دنوں سندھ صوبہ بمبئی کا جزو تھا۔ ۱۹۳۶ میں جب سندھ الگ صوبہ کی حیثیت سے ہندوستان کے نقشہ پر نمودار ہوا تو غلام حسین یہاں چلے آئے اور مختلف حیثیتوں سے کام کرتے رہے۔ پاکستان بنجانے کے بعد وہ اس کے گورنر بنادئے گئے اور اسی عہدہ پر فائز تھے کہ وہ دنیائے فانی سے گزر گئے۔

غلام حسین کا اتنا زمانہ بمبئی میں گزرا ہے کہ وہ بجا طور پر اپنے آپ کو اس کا شہری کہ سکتے تھے۔ بمبئی میں رہتے ہوئے بھی انہوں نے سندھ کے مفاد کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ایک زمانہ میں یہ صوبہ خود کفیل نہ تھا اور مرکز سے ہمیشہ اس کی دستگیری کی جاتی تھی۔ آج سندھ سکھربیرج کی بدولت خود کفالت کے معاملہ میں جس مقام پر ہے اس میں غلام حسین کی کوششوں کو بھی کافی دخل ہے۔

جس دور میں وہ حکومت بمبئی میں وزارت کے عہدہ پر فائز تھے وہ برطانیہ و ہند کے تعلقات کی تاریخ میں بڑا نازک تھا۔ اس وقت بہت سے انگریز ایسے تھے جنہوں نے ہندوستانی وزرا کی ماتحتی میں کام کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور وزیر ہند کو درخواست دیدی تھی کہ متناسب پنشن پر انہیں سبکدوش کردیا جائے۔ چنانچہ صوبہ بمبئی سے بھی متعدد انگریز پنشن پر چلے گئے۔ ایک دن انگریزوں کے چلے جانے پر گفتگو ہو

رہی تھی ، میں نے پوچھا کہ ”کیا ان کے چلے جانے سے نظم ونسق میں دشواری تو پیدا نہ ہو جائیگی؟“ فرمایا :- ”یہ مردود جتنے جلدی چلے جائیں اتنا ہی اچھا ہے - باقی رہا نظم ونسق تو ہم اسے بہتر طریقہ سے چلالینگے - “

اس زمانہ میں بعض انگریز عہدیدار ایسے بھی تھے جو وزرا تک کی شان میں گستاخی کرنے سے نہ چوکتے تھے - اس سلسلہ میں ایک واقعہ سپرد قلم کرتا ہوں جس کا تعلق براہ راست غلام حسین کی ذات گرامی سے ہے :- صوبۂ بمبئی میں ایک پہاڑی مقام ہے مہابلیشور نام کا جہاں حکومت بمبئی کے ارکان گرمیوں کے دن گزارتے تھے - یہ جگہ پونا سے ۷۵ میل کے فاصلہ پر ہے اور وہاں سے پرتاب گڑھ صرف تھوڑی دور رہ جاتا ہے جہاں بیجاپور کے مشہور جرنیل افضل خاں کی آخری آرام گاہ ہے - ایک دن (۲۲ مئی ۱۹۲۲) غلام حسین اپنے بال بچوں سمیت پرتاب گڑھ پہنچے - وہاں ایک ڈاک بنگلہ ہے جہاں وہ زائرین وقتی طور پر قیام کرتے ہیں جو پرتاب گڑھ کے تاریخی آثار دیکھنے کے لئے جاتے ہیں - جب غلام حسین ڈاک بنگلہ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کیمرون نامی کسی انگریز نے خلاف قانون سارے بنگلہ پر قبضہ جما رکھا ہے - انہوں نے اس سے کہا کہ بنگلہ کا نصف حصہ کچھ دیر کے لئے خالی کردو ، مگر اس بددماغ انگریز نے ڈاک بنگلہ کا تھوڑا سا حصہ بھی خالی کرنے سے انکار کردیا - پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ محکمۂ رفاہ عامہ میں کہیں انجینیر ہے ، اور اس لئے غلام حسین نے تحکمانہ انداز سے آدھا بنگلہ خالی کر دینے کو کہا مگر اب کی مرتبہ بھی اس نے صاف انکار کردیا - غلام حسین بہت جزبز ہوئے ، لیکن قانون کو ہاتھ میں لینے کی بجائے انہوں نے واپس چلا جانا ہی مناسب سمجھا - مہابلیشور پہنچ کر انہوں نے سارا واقعہ لارڈ لائڈ کے گوش گزار کردیا اور مطالبہ کیا کہ اس کے خلاف تادیبی کارروائی

کی جائے۔ چنانچہ لارڈ لائڈ نے اس سے معافی بھی منگوائی اور اسے برطرف بھی کر دیا ۔ اس کا عذر یہ تھا کہ وہ شراب کے نشہ میں دھت تھا اور اسی لئے اس سے ایسی نا شایستہ حرکت سرزد ہوئی ۔ میں بھی ان دنوں مہابلیشور میں تھا اور میں نے غلام حسین کے ضبط و تحمل کو بہت سراہا تھا ۔ اگر اور کوئی جذباتی آدمی ہوتا اور معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا تو انگریز اور ہندوستانی کا سوال اپنی پوری بھیانک شکل میں ملک کے سامنے آجاتا ۔ مگر غلام حسین کی دانشمندی نے یہ صورت حالات پیدا نہ ہونے دی اور ایک بدتمیز انگریز کو دوسرے مدمغ انگریز کے ہاتھوں سزا دلوادی ۔ اس زمانہ میں یہ بہت سخت سزا سمجھی جاتی تھی کہ کوئی انگریز کسی ہندوستانی سے معافی مانگے ۔

اپنی وزارت کے زمانہ میں غلام حسین صوبہ کے مسلمانوں کے تعلیمی امور سے بھی کافی دلچسپی لیتے تھے ۔ ایک دفعہ حسین بھائی عبداللہ بھائی لالجی کی دعوت پر پنچ گنی* مسلم ہائی اسکول کے طلبا اور اساتذہ مہابلیشور آئے اور وہاں غلام حسین نے ان کے روبرو تقریر کی جس میں انہوں نے کہا کہ ”اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے حصول علم پر سب سے زیادہ زور دیا ہے اور اس لئے آپ کو چاہئے کہ حصول علم میں پیش پیش رہیں ۔“ آخر میں انہوں نے فرمایا کہ ”آج کے بچے کل کے باپ ہونگے اور آپ ہی میں سے ڈاکٹر، انجینیر، کونسلر، سیاست دان اور وزیر پیدا ہونگے ۔“ حاضرین ان کی اس تقریر سے بیحد محظوظ ہوئے مگر ذاتی طور پر مجھے اس کے آخری ٹکڑے سے قدرے کوفت ہوئی ۔ وہ کیوں وزارت سے آگے نہیں بڑھے، اور انہوں نے یہ کیوں نہیں فرمایا کہ آپ ہی میں سے کپتان، میجر، امیرالبحر، گورنر اور گورنر جنرل پیدا ہونگے ؟ دوسرے دن میں نے ”بمبئی

---

* یہ صحت بخش مقام پونا سے ٦۵ میل کے فاصلہ پر واقع ہے ۔ یہاں دنیا کی سب سے بڑی سطح مرتفع ہے ۔

کرانیکل '' میں ایک مراسلہ بھیجا جو ۱۵ جون ۱۹۲۲ کو شائع ہوا اور جس میں میں نے تقریر پر تبصرہ کرتے ہوئے انہی جذبات کا اظہار کیا تھا ۔ مراسلہ میرے نام سے چھپا تھا ۔ جب میرے ایک دوست نے انہیں یہ چٹھی دکھائی تو فرمایا کہ '' ہم ان عہدوں پر بتدریج قبضہ کرینگے ، مگر اتنی جلدی نہیں ۔''

تیس پینتیس سال پیشتر بمبئی میں صرف اہم سرکاری اعلانات کا آردو میں ترجمہ شائع ہوتا تھا ۔ مارچ ۱۹۲۴ میں مولوی رفیع الدین احمد نے کونسل میں تحریک پیش کی کہ جس طرح مراٹھی ، گجراتی اور کنڑی میں سرکاری قوانین کا ترجمہ شائع کیا جاتا ہے اسی طرح آردو میں بھی کیا جائے ۔ ان دنوں غلام حسین جنرل ممبر تھے اور انہوں نے بلا تامل پیش کردہ تحریک کو منظور کرلیا ۔ وضاحت کی غرض سے میں مولوی رفیع الدین کی بحث کا متعلقہ حصہ پیش کرتا ہوں ۔ انہوں نے فرمایا :
'' حکومت کے بنچوں کو جاننا چاہئے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت سے پہلے ملک میں حکومت کی زبان آردو ہی تھی حتی' کہ دکن میں بھی ۔ آخری پیشوا (باجی راؤ ثانی) نے برطانوی ریزیڈنٹ سے آردو زبان میں گفتگو کی تھی ۔

آنریبل مسٹر کیڈل : فارسی میں ۔

مولوی رفیع الدین احمد : نہیں نہیں ، آردو میں ۔ ایجنٹ اور پیشوا کے درمیان جو مراسلت ہوتی تھی وہ فارسی میں ہوتی تھی لیکن گفتگو ہمیشہ آردو میں ہوتی تھی ۔ میں آنریبل ممبر سے درخواست کرونگا کہ وہ لارڈ ویلزلی کی لائف پڑھیں ۔''

اس تحریک کی منظوری کے بعد جولائی ۱۹۲۴ سے آردو کو صوبہ' بمبئی میں وہی حیثیت حاصل ہو گئی جو سرکاری طور پر دوسری مقامی زبانوں کو پہلے سے حاصل تھی ۔ اس کا سہرا سر غلام حسین کے سر ہے ۔

اسی طرح بمبئی میں کوئی عیدگاہ نہ تھی اور اس لئے مسلمان

مختلف مساجد میں یا باغات میں عید کی نماز پڑھ لیتے تھے۔ سر غلام حسین کے زمانہ میں چند مقامی لیڈروں نے جنمیں حکیم ابو یوسف اصفہانی، مولوی نذیر احمد خجندی اور ذکریا منہیار خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، ایسپلینیڈ میدان میں جو بوری بندر کے سامنے واقع ہے اور جو غدر کے وقت سے غیر معمولی سیاسی اہمیت اختیار کرچکا ہے اور اسی مناسبت سے آزاد میدان کہلاتا ہے، حکومت سے عیدین کی نماز پڑھنے کی اجازت طلب کی۔ یہ میدان پی۔ڈبلیو۔ڈی۔ کے ماتحت تھا جس کے انچارج غلام حسین تھے، اور اس لئے اجازت حاصل کرنے میں مسلمانوں کو کوئی دقت نہیں ہوئی۔ وہ خود بھی اسی میدان میں نماز پڑھنے آتے تھے۔ نماز کے بعد شامیانے میں عام اجتماع ہوتا تھا جہاں ہر شخص غلام حسین اور دوسرے اکابر سے جا کر مل سکتا تھا۔ اگر وہ اس محکمہ کے انچارج نہ ہوتے تو ناممکن تھا کہ اس جرنیلی میدان میں مسلمانوں کو نماز پڑھنے کی اجازت ملتی۔

سندھ میں ان کی وزارت عظمیٰ کا ایک کارنامہ ایسا ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ انہوں نے آریا سماجوں کی کتاب "ستیارتھ پرکاش" پرجسے آریا سماجی مقدس کتاب کا درجہ دیتے ہیں اور جس کے آخری دو بابوں میں اسلام اور عیسائیت پر نہایت رکیک حملے درج ہیں، ایسی قدغن لگادی کہ وہ اب ہمیشہ کے لئے صوبۂ سندھ میں نہیں چھپ سکتی۔

میں حکومت بمبئی کے دوسرے محکمہ میں تھا لیکن ان کا برتاؤ مجھ سے ہمیشہ مشفقانہ رہا۔ جلسوں، دعوتوں یا ان کے در دولت پر جب کبھی ان سے ملاقات ہوتی وہ بے تکلفی اور خندہ پیشانی سے ملتے۔ ان کے سگار اور ان کی مسکراہٹ کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

ان کا انتقال ۵ اکتوبر ۱۹۴۸ کو ہوا اور ان کی نعش عیدگاہ والے باغ میں سپرد بخاک کی گئی۔

دادا بھائی واچ میکر

واچ میکر بمبئی کے اورینٹل ٹرانسلیٹر * کے دفتر میں سیکنڈ اسسٹنٹ تھے اور میں اسے اپنی انتہائی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے ان کے ماتحت تقریباً ۱۷ سال تک کام کرنے کا موقع ملا۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ وہ کس قدر قابل، کس قدر مہذب اور کس قدر شریف انسان تھے!

ان کی اعلیٰ تعلیم دکن کالج پونا میں ہوئی۔ ان کی ساری تعلیمی زندگی نہایت شاندار گزری ہے۔ میٹرک کے امتحان میں وہ صوبہ بھر میں دوسرے نمبر پر آئے اور کاما اسکالر شپ کے مستحق قرار پائے۔ کالج میں انہیں دو مرتبہ انگریزی میں اور ایک مرتبہ عام قابلیت میں انعامات ملے۔ کالج کے جس دور میں واچ میکر پڑھتے تھے اس میں ڈاکٹر ایف۔جی۔سیلبی اور جے۔این۔فریزر بھی پروفیسر تھے۔ واچ میکر ان دونوں کے چہیتے شاگرد تھے۔

چونکہ کالج میں انہوں نے اختیاری مضمون کے طور پر لاطینی لے رکھی تھی اس لئے ان کی انگریزی خصوصیت کے ساتھ اچھی تھی۔ سکریٹریٹ کے لوگ انگریزی الفاظ اور محاورات کے بارے میں ان سے مشورہ لینے کے لئے آیا کرتے تھے۔

وہ انگریزی بے تکان لکھتے تھے اور اسی لئے دفتر کے اہم ڈرافٹوں کی تیاری کا کام انہی کے سپرد رہتا تھا۔ مگر وہ ذرا بد خط واقع ہوئے تھے۔ جو لوگ ان کا خط پڑھنے کے عادی تھے، انہیں کوئی دقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ ایک دن دفتر کے

---

* یہ دفتر ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں قائم ہوا تھا۔ اس کی کہانی ''تعلیمی مرکز'' (کراچی-۱) نے انگریزی میں شائع کردی ہے۔

افسر اعلیٰ نے انہیں بلا کر کہا کہ فلاں معاملہ کے متعلق ایک ڈرافٹ تیار کر کے میرے پاس بھیجدو۔ یہ افسر خود بہت نکما اور کام چور واقع ہوا تھا اور اس لئے جب مطلوبہ ڈرافٹ تیار ہو کر اس کے پاس پہنچا تو اس نے پڑھنے کی زحمت گوارا کئے بغیر اس پر یہ ریمارک لکھدیا :۔ ''یہ بچوں کا سا ڈرافٹ ہے۔ مسٹر برنی کو اسے دوبارہ تیار کرنا چاہئے۔'' چنانچہ واچ میکر نے مجھے بلا کر پہلے تو افسر اعلیٰ کے ریمارک دکھائے اور پھر کہا :۔ ''اب تمہیں حکم دیا گیا ہے کہ از سر نو ڈرافٹ لکھو۔'' میں نے ابتدائی ڈرافٹ پڑھا۔ وہ اس قدر جامع تھا کہ اس میں ایک لفظ کے گھٹانے یا بڑھانے کی بھی گنجائش نہ تھی۔ میں چونکہ افسر اعلیٰ کی فطرت سے واقف تھا اس لئے میں نے واچ میکر کے ڈرافٹ کو جوں کا توں ٹائپ کرالیا اور اس پر لکھدیا :۔ ''از سر نو ڈرافٹ کیا گیا ہے'' اور پھر اسے بغرض منظوری چپڑاسی کے ذریعہ اس کے پاس بھیج دیا۔ ایک منٹ میں چپڑاسی افسر اعلیٰ کے دستخط کراکے واپس آ گیا۔ اس کے بعد میں واچ میکر کی خدمت میں پہنچا اور کہا :۔ ''آپ کے پندار کو جو صدمہ پہنچا ہے وہ در اصل خراج ہے جو ہمیں روزانہ اس لئے ادا کرنا پڑتا ہے کہ ہم ایک نالائق آدمی کے ماتحت کام کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتے ہیں۔ مگر آپ کو رنجیدہ ہونے کی مطلق ضرورت نہیں ہے اس لئے کہ یہ آپ ہی کا ڈرافٹ ہے جسے میں نے ٹائپ کرا کر اپنے نام سے بھیجدیا تھا۔'' وہ میری اس ترکیب سے بہت خوش ہوئے۔

واچ میکر دفتر میں روزانہ پانچ چھ سو روپے لے کر آتے تھے تا کہ اگر کسی کو امداد کی ضرورت ہو تو وہ اسے قرض حسنہ دیدیں۔ چھٹی پر جانے والے اشخاص تنخواہ کا پیشگی روپیہ انہی سے لے لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک مسلمان مترجم نے ان سے کچھ روپے قرض لئے۔ لیکن جب انہوں نے روپیہ واپس مانگا تو

اس نے کہدیا کہ ”میں روپیہ ادا کرچکا ہوں۔“ اس کے بعد سے انہوں نے طے کرلیا کہ آیندہ کسی مسلمان کو قرض نہ دینگے۔ اتفاقاً کچھ عرصہ بعد مجھے روپے کی ضرورت پڑ گئی اور میں ان کے پاس گیا۔ انہوں نے وہی واقعہ بیان کیا اور کہا کہ ”اب میں کسی مسلمان کو قرض نہ دونگا۔“ میں نے کہا کہ :۔ ”کیا سب مسلمان یکساں ہوتے ہیں؟ کیا ایک مسلمان کے خراب طرز عمل کی وجہ سے آپ ساری قوم کو بدنام کرنا چاہتے ہیں؟ اگر آپ نے ایسا کیا تو انتہائی ظلم ہوگا۔“ میرے دلائل سے متاثر ہوکر انہوں نے کہا کہ ”اچھا تم اس کلیہ کی استثنا ہو۔“ یہ کہا اور مطلوبہ رقم دیدی۔

ایک مرتبہ انہوں نے مجھ سے کہا کہ ”اسلام نے بہت ہی اچھا کیا کہ شراب حرام کردی اور ہم پارسی اس کے لئے اسلام کے بیحد شکر گزار ہیں۔“ میں نے متعجب ہوکر کہا کہ ”اگر اسلام نے شراب حرام کردی ہے تو آپ کو کیا؟ آپ کے یہاں تو شراب جائز ہی ہے۔“ کہنے لگے کہ ”تم میرا مفہوم نہیں سمجھے، حرام ہونے پر تو مسلمان اس کثرت سے پیتے ہیں، اگر حلال ہوتی تو پھر پینے کے لئے ہم پارسیوں کو ایک قطرہ بھی نہ ملتا۔“

واچ میکر کو غریبوں سے بڑی ہمدردی تھی۔ ان کی ہمدردی کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ریٹایر ہوتے وقت انہوں نے ۵۰ روپے کی رقم دفتر میں اس غرض سے رکھوا دی کہ اس سے چپڑاسیوں کو قرض حسنہ دیا جایا کرے۔

واچ میکر جب تک ملازمت میں رہے انہوں نے شادی نہیں کی۔ لیکن ریٹائر ہوتے ہی انہوں نے شادی کرلی۔ ایک دن میرے استفسار پر انہوں نے کہا کہ ”دفتر میں مجھے اس قدر کام رہتا ہے کہ جب تک میں اسے گھر نہ لے جاؤں وہ ختم نہیں ہوسکتا۔ ایسی حالت میں میں بیوی کے لئے کیسے وقت نکال سکتا

ہوں ؟ پنشن پانے کے بعد میں شادی کرونگا تا کہ سارا وقت آسے دے سکوں ۔'' لیکن افسوس اس کا ہے کہ وہ ازدواجی زندگی کی مسرتوں سے صرف تھوڑے عرصہ تک لطف اندوز ہوسکے ، اس لئے کہ اس کے بعد وہ یکایک بیمار پڑے اور انتقال کر گئے ۔

چونکہ وہ لاطینی زبان کے طالب علم تھے اس لئے جب کبھی اسلام کے بارے میں لاطینی کتابوں کا کوئی حوالہ انہیں مل جاتا تو وہ مجھ سے تصویر کا دوسرا رخ ضرور دریافت فرماتے ۔ ان کے استفسارات سے میں اندازہ لگا سکا کہ راہبانہ لاطینی کی کتابوں میں اسلام اور رسول اکرم (ص) کے متعلق کس قدر زہر موجود ہے ۔ بعض باتیں تو اس قدر فحش ہیں کہ انہیں صفحۂ قرطاس پر منتقل نہیں کیا جاسکتا ۔ اسلام کے خلاف اس قسم کی گندی کتابیں لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ عیسائی ہمیشہ کے لئے اس سے بدظن ہوجائیں ۔

دفتر میں ایک دن ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا ۔ ایک ہندو مترجم نے واچ میکر سے میری شکایت کردی اور کہا کہ گجراتی اخبار ''انصاف'' کے ایڈیٹر منشی فتح خاں راقم الحروف سے ملنے کے لئے آئے ہیں ۔ چنانچہ واچ میکر نے مجھے بلا کر پوچھا ۔ میں نے اُن سے کہا کہ ''انصاف * ایک گجراتی اخبار ہے ۔ جس سے سرکاری طور پر میرا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ یہ سچ ہے کہ حکومت اس اخبار سے ضمانت طلب کررہی ہے ، اور ضمانت کے احکام ابھی باہر نہیں گئے ہیں ۔ لیکن میرے دوستانہ تعلقات سے آپ ہرگز یہ نہ سمجھئیگا کہ میں حکومت کے احکام سے انہیں قبل از وقت مطلع کردونگا ۔ سرکاری ملازمت اور دوستی دو جداگانہ چیزیں ہیں ۔'' وہ مطمئن ہوگئے ، لیکن اس دن مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا کہ دفتر کے بعض افراد ایسے بھی ہیں جن کا کام جاسوسی ہے ۔

واچ میکر بڑے نیک دل اور مرنجاں مرنج انسان تھے ۔

---

* یہ لیگی اخبار تھا اور ہندوؤں پر نہایت کڑی تنقید کرتا تھا ۔

ان کا خالی وقت کتابوں کے مطالعہ میں صرف ہوتا تھا ۔ انہوں نے کم و بیش ے ہزار کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہوگا۔ ان کا حافظہ بہت قوی تھا اور وہ متعدد زبانوں کے ماہر تھے ۔ ان کی صورت پرانے زمانے کے رشیوں اور صوفیوں سے ملتی جلتی تھی ۔ اپنی لمبی سفید ڈاڑھی میں رابندرا ناتھ ٹیگور کی طرح بیحد پرشکوہ معلوم ہوتے تھے۔ ان کا چہرہ نورانی تھا ۔

انہیں میں نے کبھی غصہ کی حالت میں نہیں دیکھا ۔ اگر کبھی کسی سے وہ دفتری کام کے سلسلہ میں ناراض ہوجاتے تو آن کی یہ ناراضگی بالکل بچوں کی طرح ہوتی تھی ، محض عارضی ، گھڑی دو گھڑی کے بعد وہ پھر اسی طرح سے باتیں کرنے لگتے گویا کہ کچھ ہوا ہی نہیں۔

ان کے تعلقات ماتحتوں کے ساتھ مشفقانہ تھے ۔ ان کا طرز عمل اس قدر اچھا تھا کہ میں بجائے خود اسے نیکی سے تعبیر کرتا ہوں ۔ سترہ سال کے عرصہ میں کبھی کوئی ناملائم لفظ آن کی زبان سے نہیں نکلا ۔ یہ نتیجہ تھا آن کے کیرکٹر کی صیانت کا اور ان کی کلچر کی پاکیزگی کا ۔ دفتر کے ایک بدتمیز عیسائی افسر (جے۔ بی ۔ فرنینڈیز) * نے ایک موقع پر آن سے کہا :- ”یو ۔ آر۔ اے۔ فول ۔“ اس ریمارک سے وہ بیحد کبیدہ خاطر ہوئے اور آسی وقت درخواست دیدی کہ ”مجھے ریٹایر کردیا جائے ۔“ یہ خاموش احتجاج بہت موثر ثابت ہوا ۔ دفتر والوں کے دل میں اس عیسائی افسر کی طرف سے اس قدر نفرت پیدا ہوگئی کہ انہوں نے اس کے تبادلہ پر کوئی الوداعی تقریب بھی منعقد نہیں کی ۔

ہمارا بھی تو آخر زور چلتا ہے گریباں پر !

***

---

* آن دنوں اورینٹل ٹرانسلیٹر پانچ سال کے لئے مقرر کیا جاتا تھا ۔

مولانا محمد عرفان

مولانا سے میری پہلی ملاقات ۱۹۲۴ میں دھلی میں ہوئی تھی جہاں وہ عرصۂ دراز سے مقیم تھے۔ وہ رہنے والے تو تھے سرحد کے مگر برطانوی حکومت کی طرف سے انہیں دیس نکالا ملا ہوا تھا۔ اُن دنوں وہ اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ حکومت اپنا حکم واپس لیلے ۔ چنانچہ کچھ عرصہ کی جدوجہد کے بعد اخراج کا حکم واپس لے لیا گیا، مگر انہوں نے سرحد میں قیام کرنے کی بجائے مستقل طور پر بمبئی میں سکونت اختیار کرلی اور خلافت کمیٹی سے وابستہ ہو گئے ۔ وہ اس کے مالی سیکریٹری تھے ۔ جب دیکھتے کہ کمیٹی کی مالی حالت خراب ہو رہی ہے تو وہ کسی سے کچھ کہے بغیر خلافت کی موٹر میں بیٹھکر اپنے مخصوص دوستوں کے پاس جاتے اور اچھی خاصی رقم جمع کرکے لے آتے ۔ وہ جب تک زندہ رہے ، اسی طریقہ پر عمل پیرا رہے ۔

هزارہ ان کا وطن تھا لیکن وہ اردو ایسی اچھی بولتے تھے کہ گمان بھی نہ ہوتا تھا کہ وہ سرحد جیسے پشتو زدہ علاقہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ پشتو تو خیر اُن کی مادری زبان ہی تھی ، عربی میں بھی وہ منتہی تھے اور بے تکان بولتے تھے۔ فارسی پر بھی انہیں کافی عبور تھا ۔ وہ دنیائے اسلام کی تاریخ سے بھی خوب واقف تھے اور دل میں اسلام کا سچا درد رکھتے تھے ۔ ان کی تقریر بہت موثر ہوتی تھی ۔ ان کی صلاحیتوں کو دیکھکر ایک دن میں نے کہا :۔

”مولانا ، آپ میں قیادت کی ساری صلاحیتیں موجود ہیں۔ آپ دنیائے اسلام کا دورہ کیوں نہیں کرتے اور جو جگہ سید جمال الدین افغانی کی وفات سے خالی ہو گئی ہے ، اسے کیوں پر نہیں کرتے ؟ آپ تو خلافت کمیٹی کے مالی معتمد ہو کر رہ گئے ہیں۔“

میری باتوں کے جواب میں انہوں نے فرمایا :— ”میں خود بھی انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں رہتا ہوں ۔ انشاءاللہ وہ وقت دور نہیں جب میں دنیائے اسلام کی خدمت کے لئے آٹھونگا ۔“ مگر وہ وقت کبھی نہ آیا ۔

ایک دن مذاق مذاق میں ہم دونوں میں لڑائی ہو گئی اور لڑائی بھی ایسی سخت کہ میں نے انہیں برا بھلا کہا اور انہوں نے مجھے ۔ پھر وہ آوپر گئے اور مولانا شوکت علی سے شکایت کی اور کہا :۔ ”آپ ناحق اس شخص سے دوستانہ مراسم رکھتے ھیں ۔ ایک طرف یہ آپ کے اخبار سے ضمانتیں لیتا ھے اور دوسری طرف وہ آپ سے دوستی کا دم بھرتا ھے ۔“ مولانا شوکت علی نے ان کے غصہ کو ٹھنڈا کرتے ہوئے فرمایا :۔ ”یہ تو محض سرکاری ملازم ھے ۔ اس کی بجائے اگر کوئی اور شخص ھوتا تو ممکن ھے کہ وہ اس سے بھی بدتر ھوتا ۔ مگر یہ دوست ھے ، یہ ھمارا دوست ھے ۔“ یہ جواب سنکر عرفان نیچے آگئے ، اور کئی دن تک ھماری بول چال بند رھی ۔ اسی اثنا میں میرے برادرنسبتی اکبر یار خاں سے مولانا کی ملاقات ھو گئی ۔ انہیں جب اس جھگڑے کا علم ھوا تو انہوں نے کہا :۔ ”مولانا ، آپ کو کم سے کم ھمارے تعلقات کا تو لحاظ کرنا چاھئے تھا ، اب آپ کو فوراً صلح کرلینی چاھئے ۔“ چنانچہ ایک دن مقررہ پروگرام کے مطابق میں ان کی معیت میں خلافت ھاؤس پہنچا جہاں انہوں نے گلے ملوا دیا اور صلح صفائی ھو گئی ۔ مولانا عرفان اور میں پہلے کی طرح ھنس ھنس کے باتیں کر رھے تھے کہ اتنے میں مولانا نے فرمایا :۔ ”میاں برنی ، تم سے ایک شکایت ابھی باقی ھے ۔ اور اس کی صفائی بھی فوراً ھو جانی چاھئے ۔ اس دن تم نے بہت زیادہ گالیاں دی تھیں ۔“ میں نے جواب دیا :۔ ”اگر آپ یہ سمجھتے ھیں کہ زیادتی میری ھے تو میں حاضر ھوں ، آپ جتنا برا بھلا کہنا چاھیں ، کہ لیں تا کہ حساب پورا ھو جائے ۔ میں

بالکل خاموش رھونگا۔" یہ سنتے ھی وہ کھڑے ھو گئے اور مجھے لپٹا کر کہا:۔" بس طبیعت تمھاری طرف سے بالکل صاف ھو گئی ھے۔ اب مجھے کوئی شکایت نہیں رھی۔" اس کے بعد پھر ھم دونوں میں کبھی کوئی اختلاف نہیں ھوا۔

بڑا مزا اس ملاپ میں ھے جو صلح ھو جائے جنگ ھو کر

مولانا بہت قناعت پسند آدمی تھے۔ میں نے انہیں دال روٹی کھاتے دیکھا ھے، میں نے انہیں چٹنی روٹی کھاتے دیکھا ھے، میں نے انہیں اعلیٰ درجہ کے مرغن کھانے کھاتے دیکھا ھے، مگر ان سب موقعوں پر وہ بھوک سے ایک لقمہ زیادہ نہ کھاتے تھے۔ البتہ کھانا جلدی جلدی کھاتے تھے اور دانتوں کا کام معدے سے لیتے تھے۔

انہیں دوسروں کی خدمت کرنے میں بڑا مزا آتا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ جب کوئی ضرورتمند آتا کہ مولانا، فلاں کام کر دیجئے، تو وہ اس سے پہلے خلافت کی موٹر میں پٹرول ڈلواتے اور پھر اسے اس وقت تک لئے لئے گھومتے جب تک اس کا کام نہ ھو جاتا۔ انہوں نے اس قسم کی ذمہ داری سے بچنے کی کبھی کوشش نہیں کی بلکہ ھمہ وقت ھر شخص کی خدمت کے لئے تیار رھتے تھے۔

بمبئی میں ھمارے ایک مشترکہ دوست تھے جنھوں نے ایک صاحب کے ساتھ بیحد سلوک کئے تھے اور انہیں اس قابل کر دیا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ھو جائیں۔ یہ صاحب بال بچوں دار تھے، مگر تھے اتنے حق ناشناس کہ انہوں نے اپنے محسن کی ایک صاحبزادی پر ڈورے ڈالنے شروع کر دئے۔ اس سلسلہ میں ان دونوں کے درمیان کچھ خط و کتابت بھی ھوئی تھی جسے وہ مختلف لوگوں کو دکھاتے پھرتے تھے تاکہ ان کی ھمدردیاں حاصل کریں۔ ایک دن میرے پاس بھی آنکلے اور مجھ سے امداد کے خواھاں ھوئے۔ میں نے اظہار ھمدردی

کرتے ہوئے کہا کہ ”مولانا عرفان اس معاملہ میں مجھ سے بہتر طریقہ سے آپ کی امداد کرسکینگے ۔ آپ سارے خطوط اپنے ساتھ لے چلیں ۔“ چنانچہ دوسرے دن ہم دونوں خلافت ھاؤس پہنچے اور میں انہیں (پہلے سے طے کئے ہوئے پروگرام کے مطابق) سیدھا مولانا کے کمرے میں لے گیا ۔ مولانا نے بہ لطائف الحیل پہلے تو خطوط پر قبضہ کیا اور پھر بغیر پڑھے انہیں وھیں نذر آتش کردیا ۔ اس کے بعد انہوں نے دھمکی دی کہ ”اگر آپ نے شخص متعلقہ کو بدنام کرنے کی ذرا سی بھی کوشش کی تو میں آپ کو تڑی پار (خارج البلد) کرا دونگا ۔“ وہ صاحب اپنا سا منہ لیکر چلے گئے گویا کہ کچھ ھوا ھی نہیں ۔ مولانا اپنے دوستوں کی ھوا خواھی میں بہت کچھ کر گزرتے تھے ۔ اسی طرح انہوں نے حیدرآباد کے ایک رئیس کے نجی خطوط بمبئی کی ایک صاحبہ سے حاصل کرلئے اور معاوضہ کے طور پر اسے معقول رقم دلوادی ۔ اس قسم کے کاموں میں انہیں لطف آتا تھا ۔ یہ ان کی مخصوص ”ھابی“ تھی ۔

ایک دن کا ذکر ھے کہ کوئی شخص جو بہت ھی فاخرہ لباس پہنے ہوئے تھا ، ان کے پاس آیا اور اپنی داستان غم کچھ اس انداز سے سنائی کہ میں آنکھیں بند کر کے اس سوچ میں پڑ گیا کہ اسے کیا دوں اور کس کس کے پاس لیجاؤں کہ اتنے میں مولانا پوچھ بیٹھے کہ ”بصرہ سے کب آئے تھے؟“ اس نے جواب دیا کہ ”پندرہ دن ھوگئے ھیں ۔“ اس پر مولانا نے بگڑ کر کہا کہ ”اے نالائق شخص ، تین مہینے پیشتر تو میرے پاس آیا تھا اور تو نے اپنی کشتی کے آلٹ جانے کا واقعہ کچھ ایسے درد انگیز لہجہ میں سنایا تھا کہ میں تجھے موٹر میں بٹھا کر اپنے ایک دوست کے پاس لے گیا تھا اور تجھے معقول رقم دلوائی تھی ۔ آج تو کہتا ھے کہ آئے ہوئے صرف پندرہ دن ہوئے ھیں ۔ نکل جا یہاں سے مردود ۔“ وہ شخص کمرہ چھوڑ کر بھاگ گیا ۔

جب وہ چلا گیا تو مولانا نے فرمایا :۔ ''میں اس شخص کی دردانگیز کہانی سے متاثر ہو کر اسے فوراً عثمان سوبانی کے پاس لے گیا اور ان سے تین سو روپے دلوادئے ۔ اب یہ پھر دھوکا دیکر کچھ رقم حاصل کرنا چاھتا ھے۔'' لیکن وہ دیر تک اس کی لسانی کی تعریف کرتے رہے ۔

مولانا مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے ایک جلسہ میں شریک تھے کہ یکایک ان کی طبیعت بگڑنی شروع ھوئی ۔ وھاں انہوں نے جنجر کی بوتل منگوا کر پی ۔ پیتے ھی انہیں قے ھوئی مگر اس کے باوجود وہ جلسہ میں بیٹھے رہے ۔ ان کی حالت ھر لحظہ غیر ھو رھی تھی ۔ یہ دیکھ کر عثمان سوبانی انہیں حکیم مرزا حیدر بیگ کے پاس لے گئے جن کا مطب لیگ کے دفتر کے عین سامنے محمد علی روڈ پر واقع ھے ۔ حکیم صاحب نے تسکین قلب کے لئے پینے کو مفرح شربت کا گلاس دیا اور ساتھ ھی سوبانی صاحب کو تاکید کردی کہ انہیں جلد سے جلد خلافت ھاؤس پہنچا دیا جائے۔ وھاں پہنچتے ھی انہیں پھر قے ھوئی اور وہ دو تین منٹ میں اپنے رب سے جاملے ۔ انتقال کی خبر آناً فاناً سارے شہر میں پھیل گئی ۔ میں بھی فوراً خلافت ھاؤس پہنچا ، دیکھا کہ مولانا چارپائی پر دراز ھیں اور ایسا معلوم ھوتا ھے کہ وہ سو رہے ھیں ۔ ان پر مردنی کے آثار بالکل نمایاں نہ تھے ۔ میں نے جاتے ھی پیشانی کو بوسہ دیا اور پھر تجہیز و تکفین میں لگ گیا ۔

جس شان سے ان کا جنازہ اٹھا ، اس کی یاد ھمیشہ رھیگی ۔ اس کے ھمراہ ھر فرقہ اور ملت کے لوگ ھزاروں کی تعداد میں موجود تھے ۔ جلوس کوئی میل بھر لمبا ھوگا ۔ جنازہ کی چارپائی میں لمبے بانس باندھ دئے گئے تھے ۔ تاکہ سیکڑوں آدمی بیک وقت انہیں کندھا دے سکیں ۔ ایسا لمبا ماتمی جلوس میں نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھا ۔ تاریخ انتقال ۱۳ اپریل ۱۹۳۹ ھے ۔

قاضی کبیرالدین

پچاس سال قبل کے اخبارات میں قاضی صاحب کا نام کثرت سے آتا تھا اور وہ ہندوستان بھر میں جانے پہچانے آدمی تھے۔ وہ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسوں میں باقاعدگی سے شریک ہوتے تھے اور اس کے مباحث میں حصہ لیتے تھے۔ کانفرنس کے پرانے ریکارڈوں پر نظر ڈالئے تو آپ کو کوئی جلسہ ایسا نظر نہ آئیگا جس میں انہوں نے عملی حصہ نہ لیا ہو۔ قاضی صاحب بمبئی کے ایک ممتاز کوکنی خاندان کے فرد تھے۔

۱۹۱۸ میں راقم الحروف نے انجمن اسلام ہائی اسکول کی ترقی کے لئے ایک اسکیم "بمبئی کرانیکل" کی وساطت سے اسکول کے ارباب بست و کشاد کے سامنے پیش کی جسکے نتیجہ میں ایک تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی گئی۔ اس کے صدر قاضی صاحب تھے۔ مجھے بھی کمیٹی کے روبرو شہادت دینے کے طلب کیا گیا۔ قاضی صاحب اس کمیٹی کے روح رواں تھے اور وہی سوال کرتے تھے۔ جو جو سوالات انہوں نے مجھ سے پوچھے، ان سے مجھے اندازہ ہوسکا کہ وہ مسلمانوں کی تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر کس قدر گہری نظر رکھتے ہیں۔ ان کے سوالات پوچھنے کا انداز بھی پسندیدہ تھا حالانکہ ان دنوں میرا شمار انجمن کے مخالفین میں کیا جاتا تھا۔

قاضی صاحب "فاطمہ بائی روگھے ٹرسٹ" سے وابستہ تھے۔ ایک مرتبہ راقم الحروف کے ایک دوست کی بیگم نے غیر ملکی وظیفہ کے لئے اس ٹرسٹ میں درخواست دی۔ اس کی تعلیمی اسکیم ہائی کورٹ کی منظور شدہ تھی اور انگریزی میں تھی اور اس میں لفظ "اسکالر" استعمال کیا گیا تھا۔ بدقسمتی سے ٹرسٹیوں میں

اختلاف رائے پیدا ہو گیا۔ بعض کی رائے تھی کہ اس سے مراد فقط افراد ذکور ہیں، قاضی صاحب کی رائے تھی کہ اس میں لڑکا لڑکی دونوں شامل ہیں۔ بہرحال اس اشتباہ کو دور کرنے کی غرض سے معاملہ ہائی کورٹ سے رجوع کیا گیا۔ خوش قسمتی سے یہ مسئلہ جسٹس مرزا علی اکبر خان کی عدالت میں پیش ہوا جو اپنی روشن خیالی کے لئے بہت مشہور تھے۔ انہوں نے فیصلہ صادر کیا کہ لفظ ''اسکالر'' میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں داخل ہیں اور یہ کہ ٹرسٹ بغیر کسی پس و پیش کے طبقۂ اناث کے افراد کو بھی وظیفے دے سکتا ہے۔

ان کی وسیع النظری کا ایک اور ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ایک صاحبزادی کی شادی اپنے رشتہداروں کی خواہشات کے خلاف ''برادری'' سے باہر سلیمانی فرقہ کے ایک نہایت قابل اور روشن خیال فاضل* سے کردی تھی۔ کوکنیوں نے بہت شور مچایا لیکن انہوں نے اس کا ذرا سا بھی اثر قبول نہیں کیا۔ اس سے قبل بھی کوکنیوں کے ایک ممتاز فرد محمد علی روگھے اپنی قوم کے غصہ کا شکار ہوچکے تھے اس بنا پر کہ انہوں نے ایک ''غیر کوکنی'' † سے اپنی صاحبزادی کی شادی کردی تھی۔ قاضی صاحب درحقیقت اسلام کی تعلیمات پر عامل تھے اور تمام فرقوں کے مسلمانوں کو اپنا بھائی سمجھتے تھے۔ بمبئی کے کوکنی آج بھی ''کفو'' کے اس درجہ قائل ہیں کہ وہ اپنی رشتہداریاں صرف کوکنیوں تک محدود رکھتے ہیں۔ ایسی حالت میں قاضی صاحب کا جرائت مندانہ اقدام ہر لحاظ سے قابل تعریف ہے۔

قاضی صاحب آردو کے زبردست حامی تھے۔ خود اتنی اچھی آردو بولتے تھے کہ یہ محسوس نہ ہوتا تھا کہ وہ صوبۂ بمبئی

---

* اے۔ اے۔ اے۔ فیضی۔ یہ کرکٹ کے مشہور کھلاڑی رہ چکے ہیں، عربی کے فاضل ہیں اور متعدد کتابوں کے مصنف اور مولف۔

† محمد ابراہیم۔ یہ ریاست سچین کے نواب تھے۔

سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں اُردو سے ایک گونہ عشق تھا اور اسی لئے انہوں نے خود اپنے گھر میں نیز اپنے اعزا کے گھروں میں اُردو کو ہر دلعزیز بنانے کے سلسلہ میں بہت کچھ کام کیا تھا۔

باعتبار پیشہ قاضی صاحب بیرسٹر تھے۔ فرقہ وارانہ فسادات کے متعدد مقدمات میں انہوں نے مسلمان ملزمین کی مفت پیروی کی۔ ان کی نجی زندگی بہت پاکیزہ تھی۔ جولائی ۱۹۴۰ میں انہوں نے وفات پائی۔

* * *

سر آغا خاں

•

میں نے ہزہائینس سر آغا خاں کو پہلے پہل محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں دیکھا تھا جو دھلی میں ۱۹۱۱ میں منعقد ہوا تھا۔ یہ وہی تاریخی اجلاس ہے جس میں قوم کی طرف سے ڈاکٹر شیخ محمد اقبال کی خدمت میں ''ترجمان حقیقت'' کا خطاب پیش کیا گیا تھا۔ اس کے بعد میں نے انہیں متعدد دفعہ بمبئی میں دیکھا۔ لیکن ملاقات ۱۹۲۳ میں ہوئی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ میں رائل ایشیاٹک سوسائیٹی لائبریری (بمبئی) کے پاس سے گزر رہا تھا کہ میں نے اس کے دروازے کے قریب برساتی کے نیچے ایک نہایت خوبصورت کار کھڑی دیکھی۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ ہزہائینس کی کار ہے اور یہ کہ وہ اس وقت بہ نفس نفیس لائبریری میں موجود ہیں۔ چونکہ اس زمانے میں میں خود لائبریری کا ممبر تھا اس لئے خیال آیا کہ چل کر ہزہائینس سے ملاقات کی جائے۔ آغا خان ایک علیحدہ کمرے میں کوچ پر لیٹے ہوئے مطالعۂ کتب میں مصروف تھے۔ تھوڑی دیر تک میں خاموش کھڑا رہا اور جب ان کی نظر مجھ پر پڑی تو میں نے ادب سے سلام کیا جس کا جواب انہوں نے خندہ پیشانی سے دیا۔ پھر میں نے کہا: ''میں اپنے تئیں خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ آج آپ سے ہم کلامی کا شرف حاصل ہوگیا۔'' اس کے بعد میں نے اپنا تعارف کرایا اور بتایا کہ ''میں بھی اس لائبریری کا ممبر ہوں۔'' یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا:۔'' نوجوان آدمی، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ہمیشہ طالب علمانہ زندگی بسر کرنا اور کتابوں کو اپنا رفیق زندگی بنائے رکھنا۔''

چونکہ ہزہائینس مصروف مطالعہ تھے اس لئے میں سلام کر کے رخصت ہو گیا۔ ان کا انداز تکلم انتہائی شیریں تھا۔ باہر آ کر میں نے لائبریرین سے پوچھا کہ ”کیا ہزہائینس یہاں روزانہ آیا کرتے ہیں؟“ اس نے جواب دیا کہ ”جب کبھی وہ بمبئی آتے ہیں کچھ نہ کچھ وقت اس وقت لائبریری میں ضرور گزارتے ہیں۔ وہ اس کے بہت پرانے ممبر ہیں۔“

پہلی دفعہ جب میں نے انہیں دہلی میں دیکھا تھا تو اس وقت ان کی ناصرالدین شاہ قاچار کی سی لمبی اور گھنی مونچھیں تھیں جو بہت بھلی اور بارعب معلوم ہوتی تھیں۔ آخری بار جب کراچی میں دیکھا تو سر پر عمامہ تھا اور ڈاڑھی مونچھیں بالکل صاف تھیں۔

میں اِسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ میں ان کی تینوں جوبلیوں میں شریک ہوسکا۔ اول الذکر دو تقریبیں بمبئی میں منعقد ہوئی تھیں اور آخرالذکر کراچی میں۔ طلائی جوبلی کے موقع پر انہیں سونے کی اینٹوں سے تولا گیا تھا اور باقی دو میں ایسے ترازو استعمال کئے گئے تھے جن سے ہیروں اور پلاٹینم کی تھوڑی سی مقدار سے ان کے پورے وزن کا اندازہ ہوجائے۔ یہ تینوں مناظر انتہائی پرشکوہ تھے۔ گولڈن جوبلی کے موقع پر مجھے اتفاق سے ایسی جگہ ملی جہاں سے ہزہائینس صرف چند ہی فٹ کے فاصلہ پر تھے۔ وہ اس وقت بیحد مسرور نظر آرہے تھے۔ ان کی والدۂ ماجدہ بھی میری نشست کے قریب ہی براجمان تھیں۔ ان کی صورت سے مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ واقعی صاحب باطن خاتون ہیں۔

آغا خان دنیا بھر میں اپنے ریس کے گھوڑوں کے لئے مشہور تھے۔ متعدد دفعہ انہیں ڈربی کی ریسوں میں کامیابی ہوئی اور انہیں لاکھوں پونڈ انعام کی صورت میں ملے۔ مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ وہ ریس میں کبھی شرط نہیں لگاتے تھے۔ یہ ان کی مخصوص ادا تھی۔

وہ بنیادی طور پر مذہبی آدمی تھے۔ اپنی ''آپ بیتی'' (The Memoirs of Aga Khan) میں وہ رقمطراز ہیں:۔
''لوگوں کا خیال ہے کہ میں بالکل مغربی قسم کا انسان ہوں، ایک ایسا انسان جو کھیل تماشوں، اعلیٰ ہوٹلوں اور ریس کے کے میدانوں میں زندگی بسر کرتا ہو، .... لیکن یہ بھی غلطی ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جو مجھے مدبر اور ماہر سیاست سمجھتے ہیں، .... لیکن یہ بھی غلطی پر ہیں۔ میرے لمحات مسرت کا تعلق نہ گھوڑ دوڑ سے ہے اور نہ سیاست سے۔ میری زندگی کا مسرور ترین لمحہ ہر جمعہ کو زوال کے بعد جلوہ گر ہوتا ہے جب کہ میں دنیا کے دیندار مسلمانوں کی طرح بارگاہ خداوندی میں جھک کر گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ عبادت کرتا ہوں۔''
ان کی مذہبیت تمام و کمال ان کی والدہ کی رہین منت تھی۔

برطانوی حکومت نے انہیں ایسے اعزازات دے رکھے تھے جو بالعموم شاہی خاندان کے افراد کے لئے مخصوص ہوتے ہیں۔ ان کے اعزازات کی فہرست خاصی طویل ہے۔ ان کی جنگی خدمات کے پیش نظر حکومت ہند انہیں کچھ علاقہ دیکر والیٔ ریاست بنا دینا چاہتی تھی، مگر آغا خان نے دور اندیشی سے کام لیکر یہ آفر مسترد کردی۔

وہ ایک نہایت خوش قسمت انسان تھے۔ مختلف ملکوں کے چوٹی کے مصنف، شاعر، سائنس دان، ایڈیٹر اور فلسفی ان کے ذاتی دوستوں میں شامل تھے۔ ایک اعتبار سے وہ ایرانی تھے لیکن در حقیقت وہ ساری دنیا کے شہری تھے۔ انگلستان کے شاہی خاندان کے افراد کے ساتھ تو ان کے تعلقات عزیزوں کے سے تھے۔

جہاں تک ہندوستانی مسلمانوں کا تعلق ہے آغا خان نے مختلف مواقع پر ان کی رہنمائی کی۔ مسلم یونیورسٹی کی تحریک میں وہی آگے آگے تھے۔ ۱۹۰۶ میں شملہ ڈیپیوٹیشن کی سر براہی بھی انہوں نے کی تھی جس میں پہلی مرتبہ مسلمانوں کے لئے

جداگانہ حق نیابت منظور کیا گیا تھا ۔ ایک اعتبار سے آغاخان بھی پاکستان کے بانیوں میں شمار کئے جاسکتے ہیں اس لئے کہ جداگانہ حق انتخاب ہی پاکستان کا پیش خیمہ تھا ۔

جنگ بلقان کے دوران میں لندن کے کسی اخبار میں یہ تجویز شائع ہوئی کہ ''چونکہ ترک ایشیائی قوم ہیں اس لئے انہیں واپس ایشیا میں چلے جانا چاہئیے ۔ اس سے آئے دن کی لڑائیاں خود بخود ختم ہوجائینگی۔'' بدقسمتی سے آغا خان نے بھی اس مہمل تجویز کی تائید کردی ۔ مولانا محمد علی اپنے دوست کے اس مشورہ پر بیحد بگڑے اور انہوں نے ''کامریڈ'' میں اس کا یوں دنداں شکن جواب دیا :۔ ''ترک مرد ہیں۔ وہ گھوڑے پر مردوں کی طرح بیٹھتے ہیں ۔ ترک عورت نہیں ہیں جو گھوڑے پر ایک طرف کو ٹانگیں لٹکا کر بیٹھتی ہیں۔ اس لئے اگر ترکوں کا ایک پاؤں یورپ میں ہوگا تو دوسرا ایشیا میں۔'' یہ جواب بیحد مسکت تھا ۔ اس کے بعد بحث آگے نہیں بڑھی ۔

آغاخان کے دادا ایران سے نقل وطن کر کے پونا میں آباد ہو گئے تھے ۔ ان کے پیشروؤں میں سے کسی کو آن کی سی بین الاقوامی پوزیشن حاصل نہیں ہوئی ۔ یہ اللہ کی دین ہے ، جسے چاہے دے ۔

***

ایم۔این۔رائے

رائے مشہور روسی لیڈر لینن کے ساتھ کام کرنے کی سعادت حاصل کرچکے ھیں۔ ان کی مختلف تحریریں ، بیانات ، پمفلٹ اور مینی فیسٹو ھندوستان پہنچتے ھی ضبط ھوجاتے تھے ۔ انہیں '' ھندوستان کا کارل مارکس '' کہا جاتا تھا ۔ وہ گاندھی جی کے فلسفۂ عدم تشدد کے سخت مخالف تھے۔

رائے زیادہ تر ھندوستان سے باھر رھے اور پہلی دفعہ ۱۹۳۰ میں کانگریس کے اجلاس منعقدہ بمبئی میں اپنا نام تبدیل کرکے شریک ھوئے ۔ شدہ شدہ پولیس کو خبر ھوگئی کہ رائے بمبئی میں براج رھے ھیں۔ چنانچہ انہیں گرفتار کرلیا گیا اور عدالتی حوالات میں رکھا گیا ۔ شام کے اخبارات میں ان کی گرفتاری کی خبر پڑھتے ھی میں سیدھا چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ کی عدالت میں پہنچا اور افسران عدالت کی اجازت سے رائے سے عدالتی حوالات میں جا کر ملا ۔ اپنا تعارف کرانے کے بعد میں نے ان سے کہا کہ '' میں مدت سے آپ کا نام نامی سنتا چلا آیا ھوں اور آج جب میں نے آپ کی گرفتاری کی خبر پڑھی تو جی چاھا کہ آپ سے ملاقات کروں ۔ آپ حقیقی معنوں میں بڑے آدمی ھیں ۔ آپ کو جس عظیم الشان لیڈر کے ساتھ دوش بدوش کام کرنے کی عزت نصیب ھوچکی ھے اس کی عظمت سے ایک دنیا واقف ھے ۔ میں خوش ھوں کہ آپ جیسے بین الاقوامی شہرت رکھنے والے لیڈر سے آج ملاقات ھوگئی۔'' اس پر وہ مسکرائے اور پوچھنے لگے کہ '' کیا آپ نے مجھ سے ملنے کے لئے پولیس سے اجازت حاصل کرلی ھے ؟ '' میں نے نفی میں جواب دیا اور کہا '' مجھے پولیس سے اجازت لینے کی مطلق ضرورت نہیں ھے۔''

میرے اس سوال کے جواب میں کہ آپ کی گرفتاری کیسے عمل میں آئی ، انہوں نے فرمایا :- ''کانگریسی حلقوں میں میری آمد کی اس قدر شہرت ہو گئی تھی کہ روزانہ بیسیوں آدمی مجھ سے ملنے کے لئے آتے تھے ، اور اگرچہ میں نے اپنا نام تبدیل کر رکھا تھا لیکن کانگریسی ورکر ایک دوسرے سے یہی کہتے رہے کہ رائے آگیا ہے اور اس کا اس قدر چرچا ہوا کہ سب کو معلوم ہو گیا کہ میں کانگریس کے اجلاس میں موجود ہوں۔ اگر اس طرح سے شہرت نہ ہو جاتی تو پولیس ہرگز ہرگز مجھے گرفتار نہیں کرسکتی تھی۔''

کچھ عرصہ بعد ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں ۶ سال کی سزا دی گئی۔ مگر وہ مقررہ میعاد سے بہت پہلے رہا کردئے گئے۔ رہائی کے بعد انہوں نے دھلی سے انگریزی میں ہفتہ وار اخبار نکالا جس کا نام (Independent India) تھا اور اپنی وفات تک اسی کے ذریعہ ملک کی خدمت کرتے رہے۔ ۱۹۴۷ کے زہرہ گداز ایام میں اس اخبار نے عصبیت سے بالاتر ہو کر انسانیت کی زبردست خدمات انجام دیں۔ اکیلا یہی اخبار تھا جس نے مسلمانان دھلی کے جانی و مالی نقصانات کا عندالحالات قریب قریب صحیح اندازہ شائع کیا تھا۔

رائے اوسط قد سے ذرا نکلے ہوئے تھے۔ ان کے قویٰ بہت مضبوط تھے۔ ان کا رنگ گہرا سانولا تھا۔ چہرے کی تراش بہت اچھی تھی۔ انداز گفتگو بے حد شایستہ تھا۔ ان کی ہنس مکھ صورت مجھے آج بھی یاد ہے۔ ان کی یہ مسکراہٹ مصنوعی نہ تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ ان اشخاص میں سے ہیں جو مشکلات کو ہنس کر ٹال دینے کے عادی ہیں۔ ان کی چال ڈھال نہایت سنجیدہ اور پر وقار تھی۔ عدالتی حوالات میں وہ اس طرح پھر رہے تھے گویا کوئی شیر ہے جو کچھار میں چکر لگا رہا ہو۔ وہ نہایت مسرور تھے۔ ان سے میری یہ پہلی اور آخری ملاقات تھی۔

مرزا علی محمد خاں

مرزا صاحب ایرانی تھے ۔ ابتدا میں کچھ عرصہ تک بمبئی میں ایرانی قونصل کے فرائض ادا کرتے رہے ۔ باعتبار پیشہ وہ سالسٹر تھے ۔ لیکن چونکہ ان کے دل میں خدمت الناس کی تڑپ تھی اس لئے وہ زندگی بھر بمبئی کے مختلف تعلیمی اداروں کے ذریعہ مسلمانوں کی خدمت کرتے رہے ۔ وہ انجمن اسلام ہائی اسکول کی کمیٹی کے رکن تھے ، یونیورسٹی سینیٹ کے ممبر تھے اور چند سال تک بمبئی یونیورسٹی کے وایس چانسلر بھی رہے تھے ۔ یہ پہلے مسلمان تھے جو اس عہدۂ جلیلہ پر فائز ہوئے ۔

فارسی ان کی مادری زبان تھی ۔ فارسی کا کوئی مشہور شاعر ایسا نہ ہوگا جس کے سیکڑوں اشعار انہیں زبانی یاد نہ ہوں اور کوئی نامچیں مصنف ایسا نہ ہوگا جس کی تصانیف ان کی نظر سے نہ گزر چکی ہوں ۔ حافظ ، سعدی، سنائی ، خیام ، جامی اور فردوسی کا انہوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا ۔ بلا مبالغہ انہیں لاکھ ڈیڑھ لاکھ اشعار یاد ہونگے ۔ ان کی اردو بھی بہت اچھی تھی ۔

ایرانی نژاد ہونے کی وجہ سے ان کا انداز تکلم نہایت شیریں تھا ۔ جو لوگ تعلیم یافتہ ایرانیوں سے ملے ہیں وہ جانتے ہیں کہ ساری دنیا میں ان جیسا فن گفتگو کا ماہر اور کوئی نہیں ۔ گفتگو کرتے وقت ان کے منہ سے پھول جھڑتے تھے ۔

وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

باوجود شیعیت کے وہ تحریک خلافت میں پیش پیش رہے ۔ وہ اس تحریک سے اس وقت الگ ہوئے جب عدم تعاون کا پروگرام اختیار کرلیا گیا ۔ اس وقت عام لوگ ان سے برہم ہو گئے تھے ، لیکن یہ بات کسی کے ذہن میں نہ آئی تھی کہ وہ غیر ملکی ہیں

اور صرف آئینی حدود میں رہ کر کام کرسکتے ھیں۔ لیکن علیحدگی کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ مسلمانوں کی خدمت سے ھٹ گئے ھیں، نہیں، وہ بدستور سابق اس میں مشغول رہے۔

وہ مسلمانوں میں ناخواندگی اور جہالت دیکھکر بہت پریشان ہوتے تھے۔ ان کی خواھش تھی کہ مسلمانوں میں سے یہ لعنتیں ھمیشہ کے لئے ختم ھو جائیں۔ وہ علما کو مسلمانوں کی موجودہ پستی کا ذمہ دار ٹھہراتے تھے اور چاھتے تھے کہ وہ حقیقی معنوں میں روشن خیال بنیں اور زمانہ کے تقاضوں کو سمجھیں۔

جب تک مرزا صاحب یونیورسٹی سے وابستہ رہے آنہوں نے ھمیشہ کوشش کی کہ مشرقی علوم کو ترقی ھو۔ جس زمانہ میں سر چمن لال سیتلوڈ وایس چانسلر تھے اس وقت بھی انھوں نے آردو، فارسی اور عربی کو ان کا جائز مقام دلوانے میں زبردست جد وجہد کی تھی۔ مخالف حالات میں بھی انھوں نے کبھی اپنے موقف کو نہیں چھوڑا۔

۱۹۲۹ میں بمبئی میں غلط افواھوں کی بنا پر ایسا زبردست ھندو مسلم فساد ھوا جس کی یاد آج تک باقی ہے۔ حکومت کے سخت ترین انتظامات کے باوجود یہ فسادات سہینوں چلتے رہے۔ اس میں ایک ھزار کے قریب اشخاص مارے گئے اور تقریباً دو ھزار زخمی ھوئے۔ فسادات اس وقت ختم ھوئے جب شہر کا پورا نظم و نسق فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ فساد ختم ھوتے ھی پبلک نے مطالبہ کیا کہ اس کی سرکاری طور پر تحقیقات کی جائے۔ چنانچہ حکومت نے اس مطالبہ کو منظور کرلیا اور تین آدمیوں کا تحقیقاتی ٹریبونل مقرر کر دیا گیا جس کے ایک ممبر مرزا علی محمد خاں تھے۔ دوران تحقیقات میں مرزا صاحب نے بیحد جانفشانی، تن دھی، انصاف پروری اور غیر جانبداری سے کام کیا۔ آنھوں نے اپنے غیر معمولی تحمل اور اخلاق سے دونوں فرقوں کے افراد کو گرویدہ بنالیا تھا۔

مرزا انجمن اسلام ھائی اسکول بمبئی کی مجلس انتظامیہ کے بھی رکن تھے - انہوں نے اپنی سی انتہائی کوشش کی کہ اسکول کے سب سے پہلے ھیڈ ماسٹر شیخ فیض اللہ بھائی کو ان کی ۳۵ سالہ خدمات کے اعتراف میں معقول رقم دلوائیں مگر فیصلہ کرنے والے وہ لوگ تھے جن کی نظر صرف سود و زیاں تک محدود رھتی تھی - اور یہی وجہ ھے کہ ان کے سخت دلوں پر مرزا صاحب کے ''کلام نرم و نازک'' کا زیادہ اثر نہ ھوا -

وفات سے چند مہینے پیشتر وہ آل انڈیا شیعہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کے صدر منتخب ھوئے - اس سلسلہ میں ایک سہ پہر کو انہوں نے مجھے بلوا بھیجا اور اپنے انگریزی ایڈریس کے اردو ترجمہ کی خدمت میرے سپرد کی - اس وقت ان کے پاس ایک ایرانی مجتہد بیٹھے ھوئے تھے ، اس لئے وہ مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے اور کہا :- ''یہ شخص صبح دس بجے سے بیٹھا ھوا ھے اور جب میں اس سے کہتا ھوں کہ زیادہ بیٹھنے میں آپ کا ھرج ھوگا تو وہ فوراً کہدیتا ھے - میرا کوئی ھرج نہیں ھوتا ، آپ اپنا کام کرتے رھیں - چنانچہ چار بج چکے ھیں اور یہ جانے کا نام نہیں لیتا - میرے موکل میرے پاس آتے ھیں اور مجھ سے تنہائی میں گفتگو کرنا چاھتے ھیں ، لیکن اس شخص کی موجودگی میں وہ نجی باتیں نہیں کرسکتے - مجبوراً انہیں دوسرے کمرے میں لیجاتا ھوں - '' اتنا فرمانے کے بعد افسوس کے ساتھ کہا :- ''ھمارے علما اتنا وقت کیسے ضائع کردیتے ھیں ! ''

وہ الہ آباد کی سردی کو برداشت نہ کرسکے اس لئے کہ اس سفر سے لوٹتے وقت انہیں نزلہ و زکام ھو گیا جس نے بالآخر نمونیہ کی شکل اختیار کرلی اور وہ جانبر نہ ھوسکے - بیماری کا زمانہ انہوں نے جس صبر سے کاٹا اس سے ان کی اسلامیت ٹپکتی تھی - ان کی وفات فروری ۱۹۳۰ء میں ھوئی -

* * *

محمد مارماڈیوک پکتھال

۱۹۱۹ کی ابتدا تھی کہ لارڈ لائڈ (گورنر بمبئی) نے حکومت ہند کے ایما سے "بمبئی کرانیکل" کے ایڈیٹر بی - جی - ہارنیمین کو زبردستی جہاز میں بٹھا کر انگلستان چلتا کردیا - یہ گویا سزا تھی جو انہیں دسمبر ۱۹۱۸ میں لارڈ ولنگڈن کے خلاف ایجی‌ٹیشن میں حصہ لینے کی پاداش میں دی گئی تھی - وہاں ہارنیمین نے "کرانیکل" کی ایڈیٹری کے لئے مشہور ادیب پکتھال کا انتخاب کیا - چنانچہ وہ ستمبر ۱۹۲۰ میں بمبئی آ گئے اور اس قومی اخبار کی باگ دوڑ سنبھال لی - پکتھال سے میری ملاقات ابتدا ہی میں ہوگئی تھی اور چونکہ میں اس اخبار کے لئے تبصرے ، مضامین وغیرہ لکھتا تھا اس لئے اجنبیت بہت جلد دوستی میں تبدیل ہو گئی -

لارڈ ریڈنگ کے عہد حکومت میں واپسی برار کی تحریک شروع ہوئی - اس وقت میں نے ایک طویل مضمون لکھا جس کا عنوان تھا "Rendition of the Berars" - پکھتال نے نہ صرف اسے ایڈیٹوریل صفحہ پر جگہ دی بلکہ کچھ دنوں بعد واپسی برار کی حمایت میں خود بھی ایک پرزور اداریہ لکھا - اعلیٰ حضرت نظام دکن اس اداریہ سے اس قدر خوش تھے کہ انہوں نے پکتھال کو مبارکباد کا تار بھی بھیجا تھا -

"کرانیکل" کی ادارت سنبھالتے ہی پکتھال نے ٹرکی اور دنیائے اسلام پر اس کثرت سے مضامین لکھے کہ مسز بیسنٹ تک نے اپنے اخبار "نیو انڈیا" میں اُن کی اس روش کی شکایت کی - پکتھال ان نکتہ چینیوں سے بالکل ہراساں نہوئے بلکہ برابر اپنے مشن میں مصروف رہے - یہ مخالفت اس وقت اور زور پکڑ گئی جب

لوزان کانفرنس کی کارروائیوں کے بارے میں روزانہ تار پر تار آنے لگ گئے۔ نکتہ چین اس فضول خرچی کو دیکھ کر جامہ سے باہر ہو گئے۔ پکتھال نہ صرف معترضین کے خطوط چھاپتے تھے بلکہ ان کے جوابات بھی دیتے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ چونکہ خلافت اور ہندو مسلم اتحاد قومی پروگرام کا جزو اعظم ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ مشترکہ مسائل پر بہت کچھ لکھا جائے۔ لوزان کانفرنس کی رپورٹ کے متعلق ان کا استدلال یہ تھا کہ اگر ہندوستان دنیا کے شایستہ ممالک کی صف میں جگہ حاصل کرنا چاھتا ہے تو ضروری ہے کہ وہ ایسی بین الاقوامی مجالس میں شریک ہو۔ لوزان کانفرنس میں ''کرانیکل'' کی نمایندگی ایشیائی صحافت کے لئے بہت بڑی عزت کا سبب تھی۔

ہندوستان آنے سے پیشتر پکتھال نے اسلام اور ٹرکی پر متعدد کتابیں لکھی تھیں۔ لیکن اس وقت تک میں نے ان کی ایک کتاب پڑھی تھی جس کا نام تھا ''صبح صادق'' (The Early Hours) اور جس میں ۱۹۰۸ کے انقلاب ٹرکی کی داستان بیان کی گئی تھی۔ یہ نہایت دلکش ناول ہے۔ ان کی دوسری تصنیف (جسے وہ اپنا شاھکار کہا کرتے تھے) ''سعید ماھی گیر'' (Said the Fisherman) تھی۔ میرے ایک دوست نے مجھ سے شکایۃً کہا کہ اس کتاب میں اسلام کی کوئی اچھی تصویر نہیں کھنیچی گئی ہے۔ چنانچہ عندالملاقات میں نے پکتھال سے اس شکایت کا ذکر کیا اور انہوں نے جواب میں فرمایا :۔ '' آپ کے دوست ٹھیک کہتے ہیں۔ یہ اس زمانہ کی تصنیف ہے جبکہ میں مسلمان نہ ھوا تھا اور اسلام کے بارے میں میری معلومات گہری نہ تھی ۔'' اس سلسلہ میں انہوں نے بتایا کہ ''انگلستان میں ٹرکی اور اسلام کے خلاف اس قدر جذبۂ منافرت موجود ہے کہ اگر میں ان دونوں کے خلاف کوئی کتاب لکھ کر دوں تو پبلشر بہت زیادہ معاوضہ دینے پر تیار

ہوجائینگے اور وہ کتاب بکیگی بھی خوب۔ مجھے 'صبح صادق' پر مقابلتاً کم معاوضہ ملا اس لئے کہ میں نے اس میں ٹرکی کی اچھی تصویر کھینچی ہے۔"

ایک دن غازی طلعت بک اور دوسرے نوجوان ترکوں کا تذکرہ ہورہا تھا۔ فرمانے لگے کہ "میں نے طلعت بک سے کہا تھا کہ آپ یونہی غیر مسلح پھرتے رہتے ہیں۔ آپ کو اپنے ساتھ مسلح محافظ رکھنا چاہئے۔ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ خدا سے بڑھ کر میرا کوئی محافظ نہیں ہے۔ مجھے اسی پر اعتماد ہے۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق موت وقت سے پہلے کبھی نہیں آسکتی۔" اتنا کہنے کے بعد پکتھال نے عام ترکوں کے بارے میں فرمایا :- "لوگ ناحق ان پر لادینی کا الزام دھرتے ہیں۔ میں نے انہیں ہمیشہ خدا سے ڈرنے والا مسلمان پایا۔" وہ غازی انور پاشا، شوکت پاشا، غازی رؤف بک اور دوسرے ترک رہنماؤں کا تذکرہ والہانہ انداز میں کیا کرتے تھے۔

میرے استفسار پر کہ "آپ کے اسلام لانے میں خواجہ کمال الدین کا یا اُن کی جماعت کا کتنا ہاتھ ہے؟" انہوں نے فرمایا :- کہ "میں اپنے زور مطالعہ سے مسلمان ہوا ہوں، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ خواجہ صاحب اور ان کی جماعت کے افراد نے میری بعض اُلجھنوں کو دور کردیا۔ جو باتیں میری سمجھ میں نہ آئی تھیں، اُن کے بارے میں انہوں نے ایسی تشریحیں پیش کیں جن سے میری تشفی ہوگئی۔" پکتھال خواجہ صاحب کے دینی جذبہ سے بیحد متاثر تھے۔ اس سلسلہ میں میں نے پوچھا کہ "آپ کی بیوی بھی مسلمان ہوگئی ہیں؟" انہوں نے جواب دیا کہ "میں نے ان پر کبھی جبر نہیں کیا، وہ از خود مسلمان ہوئی ہیں۔ لا اکراہ فی الدین۔"

پکتھال یورپین تھے لیکن تھے اسلامی اخلاق سے پوری طرح آراستہ۔ انہوں نے رمضان کے روزے کبھی ناغہ نہیں کئے۔

سچے مسلمان کی طرح وہ ہر کام کو خدا پر چھوڑ دیتے تھے۔ قدم قدم پر اللہ اور رسول کا ذکر رہتا تھا۔ وہ انتہائی شریفانہ جذبات کے بزرگ تھے۔ ان سے مل کر ایمان میں تازگی پیدا ہوجاتی تھی۔

انہوں نے وفد خلافت کے ساتھ ملکر تحریر و تقریر کے ذریعہ تعصبات کے آن بادلوں کو چھانٹا جو یورپین ڈپلومیسی کی بدولت ٹرکی کے متعلق چھائے ہوئے تھے۔ ان کا ایک طویل مضمون ''فارین افیئرز'' (جولائی ۱۹۲۰) میں نکلا تھا جس کا عنوان تھا: ''قتل عام اور ترک: تصویر کا دوسرا رخ۔'' اس مضمون پر ایڈیٹر نے حسب ذیل نوٹ لکھا تھا:-

''ہم اس بحث میں کسی کی طرفداری نہیں کرتے، لیکن چونکہ ترکی نقطۂ نظر کبھی واضح نہیں کیا گیا اس لئے ہم ایک انگریز کو جو کھلم کھلا ترکوں سے ہمدردی رکھتا ھے اور جس کی معلومات بہت وسیع ھے، نہایت مسرت کے ساتھ یہ موقع دیتے ھیں کہ وہ اسے پیش کرے۔ مزید برآں موجودہ نازک موقع پر یہ امر نہایت اھمیت رکھتا ھے کہ ترکی نقطۂ نظر کا مطالعہ کیا جائے۔''

اس طرح ایک اور مضمون میں ''قلم در کف دشمن است'' والی کہانی کو جسے سعدی نے دوام بخش دیا ھے، نہایت دلآویز انداز سے بیان کرکے لکھا تھا کہ ''بات یہ نہیں ھے کہ ترک برے ھیں، لیکن چونکہ قلم دشمن کے ھاتھ میں ھے، اس لئے وہ انہیں ھمیشہ برے رنگ میں پیش کرتا ھے۔'' یہ حقیقت ھے کہ پکتھال زندگی بھر ترکوں کی حمایت میں سینہ سپر رھے۔

''کرانیکل'' کی ادارت سے پکتھال نے ۵ اگست ۱۹۲۴ سے علیحدگی اختیار کی۔ اس کے بعد وہ کچھ دنوں تک اسکول آف آرٹ (بمبئی) کے پرنسپل سولومن گلیڈاسٹون کے مہمان رھے۔ پھر نظام دکن کے ایما پر حیدرآباد پہنچے اور چادر گھاٹ ھائی اسکول

کے ہیڈ ماسٹر اور ریاست کی سول سروس کے اتالیق مقرر ہوئے۔
ہزایگزالٹڈ ہائینس ابھی نظام کی ملازمت میں تھے کہ انھوں نے
دو سال کی چھٹی لی اور مصر جاکر قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ
مکمل کیا ۔ یہ پہلا انگریزی ترجمہ ہے جسے ایک نو مسلم
انگریز نے دنیا کے سامنے پیش کیا ۔ اس میں بائیبل کے ترجمہ
کا سا لطف آتا ہے ۔ ان کے ترجمہ سے پہلے پامر، راڈویل اور
سیل وغیرہ کے تراجم رائج تھے۔ چونکہ پکتھال نے اپنی تمہید
میں لکھدیا تھا کہ ''ایک ایسا شخص جو کسی مقدس کتاب
کے الہامی ہونے کا قائل نہ ہو وہ کبھی اس کے ساتھ انصاف
نہیں کرسکتا'' * اس لئے عیسائی دنیا اس ریمارک سے بہت
چراغ پا ہوئی اور اس کوشش میں لگ گئی کہ ان کے ترجمہ
میں سقم نکالے۔ چنانچہ کچھ سقم نکالے بھی گئے تھے اور ''مسلم
ورلڈ'' جیسے دشمن اسلام رسالہ میں شائع کئے گئے تھے۔ بہر حال
پکتھال کا ترجمہ نہ صرف پرشکوہ ہے بلکہ آتشیں بھی ۔

ترجمہ شائع ہوجانے پر میں نے طباعت وغیرہ کی غلطیوں
کی مبسوط فہرست مرتب کرکے ۲۴ فروری ۱۹۳۳ کو پکتھال
کی خدمت میں بھیج دی اور مشورہ دیا کہ ترجمہ کا ایک سستا
ایڈیشن بھی شائع ہونا چاہئے تاکہ ہمارے نوجوان اس سے
مستفید ہوں ۔ جواب میں انھوں نے غلطیوں کا شکریہ ادا کیا
اورلکھا کہ ''میری زندگی میں شاید ہی ایسا ایڈیشن نکل سکے۔''

ایک دن پکتھال چند دوستوں میں بیٹھے ہوئے اپنے اسلام
لانے کے متعلق گفتگو کررہے تھے ۔ انھوں نے فرمایا ''میرے
دل میں اسلام کی بہت زیادہ قدر ہے ۔ آپ لوگوں کو تو اسلام
ورثہ میں ملا ہے ، اس لئے آپ اس کی قدر نہیں پہچانتے ۔ اس

---

* ان کے اصل الفاظ یہ ہیں : ۔
"It may be reasonably claimed that no holy scripture can be fairly presented by one who disbelieves its inspiration & its message."

نعمت پر میں خدائے برتر کا جس قدر شکر کروں ، کم ہے۔" ان کے اسلام لانے کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے - وہ ۱۸ برس کے تھے کہ مشرق اور اسلامی دنیا کی سیر و سیاحت کے لئے نکلے، اور مسجد اقصیٰ میں شیخ جامعہ سے عربی پڑھتے پڑھتے انہوں نے تبدیل مذہب کا اشتیاق ظاہر کیا۔ شیخ معمر تھے اور تجربہ کار۔ انہوں نے یہ دیکھکر کہ نوجوان لڑکے کا شاید یہ ابتدائی ولولہ ہو، انہیں اپنے والدین سے مشورہ کرنے کی رائے دی۔ پکتھال کہتے تھے کہ "اس مشورہ نے میرے دل پر عجیب اثر کیا اس لئے کہ میں یہ سمجھے بیٹھا تھا کہ مسلمان دوسروں کو اپنے مذہب میں لانے کے لئے بیتاب رہتے ہیں، مگر اس گفتگو نے میری رائے بدل دی اور میں یہ سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ مسلمانوں کو خواہ مخواہ متعصب ظاہر کیا جاتا ہے -" کچھ عرصہ بعد جب اسلام کی سچائیاں ان کے دل میں گھر کر گئیں تو انہوں نے طلعت پاشا سے کہا کہ "میں مسلمان ہونا چاھتا ہوں،" جس کا جواب انہوں نے یہ دیا کہ "قسطنطنیہ میں اپنے اسلام لانے کا اعلان نہ کیجئیگا ورنہ ہم لوگ بین الاقوامی مشکلات میں پھنس جائینگے۔" اسی نصیحت کا اثر تھا کہ انہوں نے لندن جا کر اپنے اسلام قبول کرنے کا اعلان کیا جس کی وجہ سے وہاں کی علمی اور ادبی دنیا میں ہلچل سی برپا ہو گئی اور عیسائی کہنے لگ گئے کہ "جس مذہب کو پکتھال جیسا شخص قبول کرسکتا ہے اس میں بالضرور موہ لینے والی اچھائیاں ہونی چاھئیں۔"

مسلم لیڈروں میں علی برادران سے ان کے تعلقات بہت صمیمانہ تھے۔ "کرانیکل" کی ادارت کے دوران میں جب وہ چھٹی لے کر انگلستان گئے تو راستہ میں انہوں نے کراچی جیل میں ان سے ملاقات کی اور اس کے بعد ذیل کا بیان شائع کیا :- "دونوں بھائی بہت خوش ہیں اور افسران جیل کے طرز عمل سے انہیں

کوئی شکایت نہیں ہے۔'' اس بیان کی ضرورت یوں پیش آئی تھی کہ بمبئی میں یہ افواہیں گشت کر رہی تھیں کہ جیل میں ان کے ساتھ بہت برا سلوک کیا جارہا ہے۔

ان کا انتقال ۶۱ برس کی عمر میں ۱۹۳۶ میں بمقام لندن ہوا اگرچہ ان کی دیرینہ تمنا یہ تھی کہ ان کی موت ھسپانیہ میں ہو جہاں مسلمانوں نے ۸۰۰ سال تک حکوست کی تھی اور جہاں کے اسلامی دور سے انہیں بیحد محبت تھی۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

***

محی الدین آزاد

محی الدین آزاد بمبئی کے ممتاز کوکنی خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ ان کی اعلیٰ تعلیم علیگڈھ میں ہوئی تھی اور اس وجہ سے علی برادران سے ان کے گہرے روابط قائم ہوگئے تھے ۔ جب مولانا شوکت علی تحریک خلافت کے سلسلہ میں بمبئی آئے تو مکان نہ ملنے کی وجہ سے کچھ عرصہ تک انہوں نے آزاد کے مکان ھی کو اپنا دفتر بنالیا ۔ ان کے یہاں بہت سی تصاویر آویزاں تھیں ، مولانا نے ان سب کا رخ دیوار کی طرف کردیا۔ جب میں نے پوچھا کہ ” آپ نے یہ کیا کیا ؟ “ تو فرمایا کہ ”بھلا ایسے کمرہ میں نماز کیسے ادا ھوسکتی ھے؟“ مولانا نے آزاد کے مکان کا حلیہ بگاڑدیا تھا لیکن آزاد نے بالکل برا نہیں مانا بلکہ کہا تو یہ کہا کہ ”اچھا ھے ۔ ان کمروں میں کبھی نماز نہیں پڑھی گئی تھی ۔ اب اتنی نمازیں پڑھی جارھی ھیں کہ پچھلے گناھوں کا کفارہ ادا ھوجائیگا ۔“

آزاد بیحد ذھین اور طباع تھے ۔ قدرت نے انہیں وکالت کے لئے بنایا تھا ۔ بڑے بڑے خونی مقدموں میں وہ محض اپنے زور خطابت سے ملزمین کو چھڑوالیا کرتے تھے ۔ ایک مرتبہ میرے ایک شناسا (مستری) ”نوٹ سازی“ کی علت میں پکڑے گئے ۔ آزاد نے ایسے موثر انداز سے ان کا مقدمہ جیوری کے سامنے پیش کیا کہ اس نے انہیں ” بے گناہ “ (Not guilty) قرار دیدیا۔ مگر جج نے اختلاف رائے کرتے ہوئے دوسری جیوری کے سامنے مقدمہ پیش کرنے کا حکم دیا ۔ اس جیوری نے بھی بالاتفاق انہیں بے گناہ قرار دیا ۔ قریب تھا کہ جج اس فیصلے سے اختلاف کرے کہ اتنے میں ” کلرک آف دی کراؤن“ نے

چپکے سے جج سے کہا کہ ''اس عدالت کی یہ روایت رہی ہے کہ جیوری جب کسی ملزم کو دو مرتبہ بے گناہ قرار دیدے تو پھر عدالت اسے رہا کردیتی ہے۔'' واقعہ یہ ہے کہ آزاد نے اپنی لسانی سے جیوری کے افراد کو اس قدر گرویدہ کرلیا تھا کہ بالآخر انہوں نے ملزم کو بے گناہ قرار دے دیا ۔ مستری درحقیقت ایک دوست کی غداری کا شکار ہوئے تھے اور اسی چیز کو آزاد نے کچھ اس خوبصورتی سے اچھالا تھا کہ جیوری کی تمام ہمدردیاں ملزم کے حق میں منتقل ہوگئیں۔ اپنے موکلوں کی رہائی سے آزاد کو دلی مسرت ہوتی تھی۔

بہت کم وکیل ایسے ہونگے جو ان کی طرح اپنے موکلوں کے بچانے میں اس قدر انہماک کا اظہار کرتے ہوں ۔ فن وکالت میں آزاد کے بہت کم حریف نکلینگے ۔ قدرت نے انہیں اسی آزاد پیشہ کے لئے پیدا کیا تھا اور حق یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ اپنے معزز پیشہ کی اعلیٰ روایات کو قائم رکھا ۔ مقدمہ لے لینے کے بعد وہ اپنی جان کی بازی لگادیتے تھے تا کہ جیتیں اور اپنی شہرت اور نیکنامی میں اضافہ کریں۔ وہ اپنی لسانی اور غیر معمولی قانونی قابلیت کی بدولت عدالتوں پر چھا جاتے تھے۔

آزاد کا خاندانی نام جسے بمبئی میں اٹک کہتے ہیں ، دیشمکھ تھا ، لیکن انہوں نے اس کی بجائے ''آزاد'' کی اٹک اختیار کرلی تھی ۔ وہ اسم بامسمیٰ تھے ۔ ایسے ذہین اور قابل آدمی کبھی کبھار دنیا میں آتے ہیں ۔ وہ بہت وجیہ تھے اور با رعب شخصیت کے مالک ۔

وہ آخر وقت تک علیگڈھ کالج کے پرستار رہے۔ وہ بمبئی کی ''علیگڈھ اولڈ بوآئز ایسوسی ایشن'' کی روح رواں تھے۔ ان کا انتقال ستمبر ۱۹۴۳ء میں ہوا ۔

* * *

ڈاکٹر اے۔ایل۔نایر

ڈاکٹر نایر جنوبی ہندوستان کے رهنے والے تھے۔ وہ ہندو تھے لیکن بدھ مت کے مشہور داعی ڈاکٹر کوسمبی سے ملنے کے بعد انہوں نے بدھ مذہب اختیار کرلیا۔

ان سے میری ملاقات استاذی اینڈریوز کے ذریعہ ہوئی تھی جو آن کے پرانے دوست تھے۔ ایک دن مہاتما بدھ کے بارے میں تبادلۂ خیال هورها تھا۔ میں نے کہا کہ ''از روئے اسلام کوئی قوم ایسی نہیں ھے جس میں خداتعالیٰ نے هادی اور نذیر نہ بھیجے ہوں۔ اگرچہ قرآن مجید میں صرف چند پیغمبروں کے نام صراحت کے ساتھ آئے هیں تاهم مسلمانوں میں ایک گروہ ایسا ھے جو اسی اصول کے ماتحت رام، کرشن اور بدھ کو پیغمبر تسلیم کرتا ھے۔'' یہ سنتے هی خوشی سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔ اس کے بعد میں نے بتایا کہ ''اسلام نے همیں یہ سبق بھی دیا ھے کہ هم تمام مذاهب کے هادیوں کا احترام کریں، خواہ انفرادی طور پر هم ان پر ایمان رکھیں یا نہ رکھیں۔'' یہ سن کر انہوں نے اسلام کی رواداری کی بہت تعریف کی۔

ڈاکٹر نایر کی زندگی بیحد سبق آموز ھے۔ وہ ایک غریب گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کی ماں نے کوڑی کوڑی بچا کے اپنے بچوں کو تعلیم دلوائی تھی۔ ڈاکٹر نایر نے ابتدا میں این۔ پاویل اینڈ کمپنی کے نام سے بمبئی میں کیمسٹ کی دکان کھولی۔ وہ مریضوں کو فقط نسخہ لکھکر دے دیتے تھے۔ مریض کثرت سے اچھے هونے لگے اور وہ ''مدراسی ڈاکٹر بابا'' کے نام سے مشہور ھو گئے۔ لوگ محبت سے انہیں محض ''بابا''

کہکر پکارتے تھے ۔ وہ روپے پیسے سے بھی غریب مریضوں کی مدد کردیا کرتے تھے ۔ اس کے بعد انہوں نے معذور اور اپاھج لوگوں کے لئے سرجیکل آلات بنانے کے لئے ایک ورکشاپ کھولا ۔ آج ھسپتال کا جملہ سامان ان کے کارخانہ میں تیار ھوتا ھے ۔ ھزاروں لولے لنگڑے اور اپاھج ان کے مصنوعی آلات کی بدولت چلنے پھرنے کے قابل ھوگئے ھیں ۔

رفتہ رفتہ انہوں نے چوپاٹی کے قریب معمل اور کارخانہ کے لئے کچھ زمین حاصل کرلی ۔ کچھ عرصہ بعد جب حکومت کو سنٹرل اسٹیشن کی تعمیر کے سلسلہ میں زمین کی ضرورت ھوئی تو اس نے بڑے دام دیکر اسے خریدا ۔ ڈاکٹر نایر کو زمین کے نو لاکھ روپے ملے اور اس کے بعد انہوں نے اپنی دیرینہ آرزو کو عملی جامہ پہنانے کی اسکیم مرتب کی ۔ وہ آرزو یہ تھی کہ اپنی والدۂ محترمہ کی یاد میں ایک ھسپتال تعمیر کریں ۔ اس ھسپتال کی افادیت کا اندازہ اس امر سے ھوسکتا ھے کہ خود لارڈ ولنگڈن اپنی گورنری کے زمانہ میں بجلی کے علاج کے لئے وھیں جاتے تھے ۔

جب ھسپتال تعمیر ھوگیا تو ان کے ایک ھندو دوست نے کہا کہ ” اگر آپ اسے صرف ھندوؤں کے لئے مخصوص کردیں تو میں ایک بہت بڑی رقم دان دینے کو تیار ھوں ۔ “ مگر ڈاکٹر نایر نے کہا :۔ ” خدا کی نظر میں ھندو اور غیر ھندو سب برابر ھیں ، مریضوں کی مصائب اور تکالیف بھی یکساں ھیں ، جہاں تک کاروبار کا تعلق ھے ھندو مسلمان دونوں میرے گاھک ھیں ۔ میرے اکثر گاھک وہ غریب مسلمان ھیں جو آس پاس کے محلوں میں رھتے ھیں ۔ ایسی حالت میں میں ذات پات کی بنیاد پر کیسے فرق کرسکتا ھوں ؟ “ یہ کہا اور اپنے دوست کی آفر مسترد کردی ۔ ان کے ھسپتال میں بلا امتیاز مذھب و ملت مریضوں کی خدمت کی جاتی ھے ۔ اگرچہ ڈاکٹر نایر اس

دنیائے آب و گل میں موجود نہیں ہیں ، لیکن ان کی روح برابر کارفرما ہے - انہوں نے اپنی ذاتی مثال سے خدمت الناس کا جو زبردست ولولہ اپنے اسٹاف میں پیدا کردیا تھا اس کا اندازہ وہی لوگ کرسکتے ہیں جو آن کے زیر علاج رہ چکے ہوں یا جنہوں نے انہیں کام کرتے دیکھا ہو - وہ بنی نوع انسان کے خادم تھے اور انسانیت کی خدمت کرتے کرتے انہوں نے اپنی جان عزیز جان آفریں کے سپرد کردی - وہ مریضوں کا علاج ایسی تن دھی ، محبت اور شفقت سے کرتے تھے گویا کہ وہ کوئی مذھبی عبادت ہے - یقیناً وہ اپنے رب کے پاس خوش خوش گئے ہونگے اس لئے کہ آنہوں نے انسانی دکھوں کو مقدور بھر کم کرنے کی کوشش کی -

***

شوکت علی خاں فانی

کوئی پچیس تیس برس پہلے کی بات ہے کہ سید عبداللہ بریلوی مدیر ''کرانیکل'' نے ''باقیات فانی'' بغرض ریویو میرے پاس بھیجی۔ میں فانی کے نام سے واقف تو تھا اور اُن کی کچھ غزلیں بھی رسالوں میں نظر سے گزر چکی تھیں، لیکن جب میں نے ان کے کلام کا بالاستیعاب مطالعہ کیا تو میں اس سے بیحد متاثر ہوا۔ چنانچہ میں نے ریویو میں ان کی شاعری کے بارے میں بہت ہی اچھی رائے ظاہر کی اور لکھا کہ ''ان کی شاعری میں ہمیں میر اور غالب کی شاعری کچھ اس طرح سے سموئی ہوئی ملتی ہے کہ وہ ایک نئی چیز بن گئی ہے۔ ان کے کلام میں جو درد ہے وہ پڑھنے والے کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا'' اور یہ کہ ''ان کے بہت سے شعر زندہ رہنے والے ہیں۔'' ریویو کی اشاعت کے کچھ عرصہ بعد میرا آگرہ جانا ہوا۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ فانی ''ہینگ کی منڈی'' میں اسی احاطہ میں سکونت پذیر تھے جہاں میں مقیم تھا۔ وہ میرے ہم زلف عبدالحمید انجینیر کے کرایہ دار تھے۔

جب مجھے ان کی موجودگی کا علم ہوا تو میں اولین فرصت میں ان کی خدمت میں پہنچا۔ ریویو نے بہت جلد مغائرت دور کردی اور اس لئے ہم دونوں بے تکلف ہو کر ملے۔ وہ ریویو کا بہت دیر تک شکریہ ادا کرتے رہے۔ پھر میری استدعا پر انہوں نے ''باقیات فانی'' سے چند غزلیں پڑھ کر سنائیں۔ فرماتے تھے کہ ''دوسرے شعرا کی طرح مجھے اپنا کلام یاد نہیں رہتا، مجھے ہر موقع پر کتاب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔''

میں تین چار دن تک آگرہ میں مقیم رہا اور وہاں روزانہ ان سے ملاقات رہتی تھی اور ان کا کلام سننے کا موقع ملتا تھا۔

ان کی شاعری میں جو گداز اور کرب ہے وہ بڑی حد تک ان کی زندگی کے تلخ تجربات کا رہین منت ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں خلوص ہے ۔ وہ ہمیشہ سے افسردہ طبیعت کے نہ تھے، بلکہ بعض واقعات نے انہیں افسردہ دل بنا دیا تھا ۔ آگرہ میں مجھے معلوم ہوا کہ ان کی وکالت کچھ عرصے کے لئے ان کے ایک دوست لالہ گنگا نراین کی بدولت جو باعتبار عہدہ جج تھے، خوب چمک گئی تھی ، لیکن کسی بدباطن نے اس کی اطلاع حکومت کو کردی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جج صاحب کا تبادلہ کردیا گیا اور فانی کو پھر اُن جیسا کوئی قدردان نہ مل سکا ۔ میرے ہم‌زلف نے جن صاحب کو کرایہ وصول کرنے پر مقرر کر رکھا تھا ان کی نظر کبھی روپے پیسے سے آگے نہ بڑھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے ہی زمانۂ قیام میں فانی یکایک ''ہینگ کی منڈی'' سے اٹھکر چہار سو دروازہ میں چلے گئے ۔

آگرہ سے روانہ ہونے سے پہلے میں نے رات کے نو بجے فانی کے اعزاز میں ایک ٹی پارٹی ترتیب دی ۔ سب اصحاب جنہیں مدعو کیا گیا تھا ، تشریف لے آئے سوائے حضرت فانی کے ۔ ان کا انتظار ۱۱ بجے تک کیا گیا ۔ پارٹی کے بعد میں ایک بجے کی ٹرین سے عازم بمبئی ہوگیا ۔ راستہ میں میرے ایک دوست عبدالرشید نے مجھے بتایا کہ ''فانی کرایہ وصول کرنے والے صاحب کے ڈر سے یہاں نہیں آئے ۔'' اگر مجھے ابتدا ہی میں یہ اطلاع مل جاتی تو میں خود جا کر انہیں اپنے ہمراہ لے آتا ۔ اس واقعہ کی وجہ سے مجھے راستہ بھر کوفت رہی اور آج بھی جب کبھی اس بات کا خیال آجاتا ہے تو قلب کو بیحد اذیت ہوتی ہے ۔ اُن دنوں ان کی مالی حالت درحقیقت بہت سقیم تھی ۔

اپنے ہندو دوست کے تبادلہ کے بعد فانی پھر عسرت کے چکر میں آ گئے اور یہ دور اُس وقت تک قائم رہا جب تک کہ وہ حیدرآباد دکن نہ پہنچ گئے ۔ مگر وہاں بھی بدقسمتی نے پیچھا

نہ چھوڑا اس لئے کہ مہاراجہ سر کشن پرشاد کی وفات کے بعد وہ پھر بے سہارا ہو گئے۔

بہ ہر زمیں کہ رسیدیم آسمان پیداست

نہ صرف یہ بلکہ حیدرآبادی بھی ان کے مخالف ہو گئے جس کی وجہ غالباً ان کا یہ شعر تھا :-

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا ہمیں
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

حیدرآبادیوں نے اسے طنز قرار دیا اور ان سے نفرت کرنے لگے، مگر یہ شعر کچھ ایسا نہیں ہے جس کی بنا پر فانی سے یا کسی اور شخص سے نفرت کی جائے۔ فانی خود بھی حیدرآباد سے خوش نہ تھے۔ ذیل کے اشعار سے ان کی بددلی کا کسی قدر اندازہ ہوتا ہے :-

زمین حشر فانی کیا قیامت ہے معاذاللہ
مجھے اپنے وطن کی سر زمیں معلوم ہوتی ہے

زندگی بھی تو پشیمان ہے یاں لا کے مجھے
ڈھونڈتی ہے کوئی حیلہ مرے مرجانے کا

مجھے بلا کے یہاں آکے چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

بہر حال وہ حیدرآباد ہی میں ۲۷ اگست ۱۹۴۱ کو تقریباً ۶۲ سال کی عمر میں شام کے پونے چھ بجے رحلت فرما گئے۔ مگر رسم تدفین دوسرے دن ادا ہوئی۔

اک عمر سے تھی تکلیف جسے کل رات وہ قیدی چھوٹ گیا

فانی دبلے پتلے تھے لیکن قد خاصا لمبا تھا۔ رنگ گہرا سانولا تھا اور طبیعت بیحد شگفتہ تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اندرونی غم کی تلخیوں پر پردہ سا پڑا رہتا تھا۔ بہرحال

مقام مسرت ہے کہ عسرت میں بھی انہوں نے اپنی خود داری کو خوب نبھایا اور اسے رسوا نہ ہونے دیا ۔ ذیل کا شعر ان کی آپ بیتی سمجھئے :-

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جسکو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

فانی کی بعض غزلیں انتہائی درد ناک ہیں۔ انہیں سناتے وقت وہ خود بھی مجسم درد بن جاتے تھے ، اور ان کی آنکھیں اشکبار ہو جاتی تھیں۔ وہ غزلیں آہستہ آہستہ پڑھتے تھے ۔ ان کی لافانی شاعری میں جو کرب اور درد ہے ، وہ زمانۂ حال کے کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں ملتا ۔

فانی جیسے تارے فضائے آسمانی پر کبھی کبھار نمودار ہوتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان جیسی جسامت کا تارہ اب کب نکلتا ہے ۔ جو چند گھنٹے ان کی صحبت میں گزرے وہ میری زندگی کا متاعِ عزیز ہیں۔

***

پروفیسر معینُ الدّین احمد

پروفیسر احمد میرٹھ کے رہنے والے تھے اور ولسن کالج بمبئی میں عربی ، فارسی اور اردو کے استاد تھے ۔ وہ سنسکرت زبان کے بھی ماہر تھے ۔ انہوں نے ہندوؤں کی قدیم تہذیب پر اردو میں ایک ضخیم کتاب بھی شائع کی تھی جس میں منجملہ اور باتوں کے یہ بتایا گیا تھا کہ قدیم زمانہ کے ہندو ہر قسم کا گوشت حتیٰ کہ گائے کا گوشت بڑے مزے لے لیکر کھاتے تھے اور مختلف وضع کی شرابیں بھی پیتے تھے اور یہی ان کی تہذیب کی نمایاں خصوصیت تھی ۔ انہوں نے سیکڑوں حوالے دیکر ثابت کیا تھا کہ قدیم ہندو گائے کا گوشت اس لئے کھاتے تھے کہ اُن کی نظر میں وہ خاص احترام کے قابل تھی ۔ یہ کتاب گاؤ کشی کے جواز میں لکھی گئی تھی اور وہ اس کے ذریعہ ہندوؤں کو گائے کی عظمت اور افادیت کا صحیح صحیح مفہوم سمجھانا چاہتے تھے تاکہ ملک آئے دن کے ہندو مسلم فسادات سے نجات پاجائے ۔ یہ کتاب برسوں کی تحقیقات کا نتیجہ تھی ۔

معین الدین احمد صحیح معنوں میں پروفیسر تھے ، وہ لباس کی اچھائی برائی سے بالکل بے نیاز تھے ، وہ پھٹے ہوئے اور پیوند لگے ہوئے کپڑے بھی پہنتے تھے اور انہیں پہنتے وقت وہ کسی قسم کا عار یا احساس کمتری محسوس نہ کرتے تھے ۔ کھانے پینے میں بھی وہ بیحد سادگی پسند واقع ہوئے تھے ۔ درحقیقت اُن کی ساری زندگی سیدھی سادی تھی ۔ ان کے کمروں میں چاروں طرف کتابیں ہی کتابیں پھیلی رہتی تھیں ۔ آخری عمر میں شکل و صورت کے اعتبار سے وہ ہو بہو آئینسٹین معلوم ہوتے تھے ۔

انہیں پرانی کتابیں اور مصوروں کے شاہکار جمع کرنے کا

بیحد شوق تھا ، ان کی ساری کمائی انھی دو چیزوں کی نذر ھوجاتی تھی۔ بعد کو انہوں نے اپنی جمع کردہ تصویروں کا ذخیرہ علیگڈھ مسلم یونیورسٹی کو دیدیا جہاں وہ آج بھی پکچر گیلری میں لگی ہوئی ھیں۔ تصاویر کے ساتھ آنہوں نے تقریباً ۳۰ ھزار روپے کی رقم بھی دی تھی تاکہ اس سے گیلری کے رکھ رکھاؤ کا انتظام ھوسکے۔

پروفیسر احمد عورتوں کی تعلیم کے زبردست حامی تھے ۔ وہ خاموشی سے مگر باقاعدگی کے ساتھ آن مسلم اداروں کی مالی امداد کرتے تھے جن کا مقصد وحید عورتوں میں تعلیم اور بیداری پھیلانا تھا ۔ وہ متعدد طلبا کے تعلیمی مصارف بھی برداشت کرتے تھے مگر ھونہار اور محنتی طلبا سب سے زیادہ ان کی امداد کے مستحق ٹھہرتے تھے ۔

معین الدین بچوں کی طرح تھے ، بالکل معصوم اور خوش مزاج ۔ مجھے ھمیشہ یہ دیکھکر حیرت ھوئی کہ بیسویں صدی میں رھنے سہنے کے باوجود وہ بیسویں صدی والوں سے ھر بات میں کسقدر مختلف تھے !

پروفیسر احمد کی تمامتر توجہ سنسکرت پر مبذول رھی ۔ وہ تھے تو آردو ، فارسی کے آستاد ، مگر ان کا سارا تحقیقاتی کام سنسکرت زبان ھی سے متعلق تھا ۔ اس بارے میں انکا تقابل انگلستان کے مشہور مستشرق پروفیسر ای ۔ جی ۔ براؤن سے کیا جاسکتا ھے جو اگرچہ عربی کے پروفیسر تھے ، مگر ان کی بیشتر تصانیف فارسی سے اور اھل ایران سے متعلق تھیں ۔

وہ عموماً سہ پہر کو گھومنے کے لئے نکلتے تھے ۔ ایک دن شام کے قریب وہ جے ۔ جے ۔ ھاسپٹل کے قریب سے گزر رھے تھے کہ موٹر کی جھپیٹ میں آگئے اور بری طرح زخمی ھوئے ۔ موٹر ڈرائیور اس قدر شقی القلب تھا کہ اس نے انھیں ھسپتال پہنچانے کی بھی کوشش نہیں کی بلکہ موٹر بھگاتا ھوا نکل گیا ۔ اس بدبخت کو کیا خبر کہ کتنی قیمتی جان اس کی غفلت اور بے

پروائی کی نذر ہوگئی ہے ! بہت دیر کے بعد وہ ہسپتال پہنچائے گئے جہاں وہ زخموں کی تاب نہ لاسکے۔ شہر کے متعدد افراد اور جماعتوں نے مطالبہ کیا کہ ملزم کو گرفتار کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے مگر اس کی گرفتاری عمل میں نہ آسکی۔ مولانا شوکت علی نے بھی "خلافت" میں اپنے قلم سے ایک مضمون اس مطالبہ کی تائید میں لکھا تھا، مگر اس پر بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ ان کی موت ستمبر ۱۹۳۲ میں واقع ہوئی اور وہ بائیکھلہ کے قبرستان "ناریل واڑی" میں سپرد خاک کئے گئے۔

اس وضع کے لوگ جو علم ھی کو اپنی زندگی کا اوڑھنا بچھونا بنالیں، قریب قریب ناپید ھیں، الاماشاء اللہ۔

انتقال کے وقت ان کی عمر پچپن سال کے لگ بھگ ہوگی، لیکن چونکہ ان کی ساری زندگی بڑے ضبط اور مقررہ پروگرام کے ماتحت گزری تھی، اس لئے ان میں کام کرنے کی استعداد اور صلاحیت غیر محدود تھی۔ مجھے ہمیشہ اس امر کا افسوس رہا کہ ایک نہایت مفید اور قیمتی زندگی قبل از وقت ختم ہوگئی۔

***

شریف دیوجی کانجی

مشہور خلافتی لیڈر مولانا شفیع داؤدی کی صدارت میں بمبئی کی جامع مسجد میں ایک مرتبہ جلسہ ہوا جس میں حکیم شمس الاسلام دہلوی اور دوسرے اصحاب نے تقریریں کیں - ان تقریروں میں مسلمانوں میں فواحشات اور بے دینی کے بڑھتے ہوئے رجحانات کی مذمت کی گئی تھی اور ان کی روک تھام کی تدابیر پر غور و خوض کیا گیا تھا ۔ مولانا نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ ''ہماری ساری خرابیوں کا واحد علاج یہ ہے کہ ہم ڈاڑھیاں رکھنی شروع کردیں ۔''

میں بھی جلسہ میں موجود تھا اور یہ دیکھ کر کہ بیماری اور علاج میں کسی طرح کا ربط یا تطابق نہیں ہے ، میں نے بھی چند منٹ تک تقریر کی جس میں عرض کیا گیا تھا :۔ ''جس طریقہ سے آج ڈاڑھیاں رکھنے پر زور دیا جارہا ہے ، اسلام کی ساری تاریخ میں اس طرح سے کبھی زور نہیں دیا گیا۔ رسول مقبول (ص) ایسی قوم میں مبعوث ہوئے تھے جس میں طرح طرح کے فواحشات پہلے سے موجود تھے ۔ آپ نے سب سے پہلے خدا کی وحدانیت کا نقش اس قوم کے دل پر بٹھایا ، پھر بتایا کہ خدا حاضر و ناظر ہے اور وہ ہمارے کاموں کو ہر وقت دیکھتا رہتا ہے ۔ اس کے بعد آپ نے بتدریج خشیۃ اللہ کا احساس پیدا کیا یہاں تک کہ وہ فواحشات سے دور ہٹتے گئے اور اللہ تعالیٰ کے قریب آتے گئے ۔ یہی عمل ہمیں آج بھی دہرانا ہوگا ۔ محض ڈاڑھیاں رکھنے سے ہماری بد اخلاقیاں کبھی دور نہ ہوسکینگی ۔'' میرے ان جملوں سے ہنگامہ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی اور جلسہ بے ترتیبی سے منتشر ہوگیا ۔

اس واقعہ کے چند دن بعد شریف دیوجی نے مجھے بلوا بھیجا۔ ان سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ دوران گفتگو میں انہوں نے میری تقریر کی پرزور تائید کی۔ یہی ملاقات بعد کو ہمارے دوستانہ تعلقات کی بنیاد بنی۔

شریف دیوجی اثنا عشری خوجے تھے اور محمد علی روڈ پر ان کی فرنیچر کی دکان تھی۔ یہ دکان بہت پرانی تھی۔ ان کے فرنیچر کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مدراس اور برما کی ساگوان لکڑی کو کئی سال تک پہلے تو خشک کرتے اور پھر اس کا فرنیچر تیار کراتے۔ ان کے فرنیچر کا مقابلہ یورپ کے فرنیچر سے کیا جاسکتا تھا اور یہی وجہ ہے کہ دور دور اس کی دھوم تھی۔ ان کی دکان کی سجاوٹ بھی دیکھنے کے قابل تھی۔

اپنی دکان میں بیٹھے بیٹھے وہ شہریوں کے مختلف کام انجام دیا کرتے تھے۔ میونسپل کارپوریشن کا انتخاب ہو یا کونسل کا یا اسمبلی کا، ان کی دکان مرکز ثقل کا کام دیتی تھی۔ جس مسلمان امیدوار کو ان کی تائید حاصل ہوجاتی تھی، اس کی کامیابی یقینی تھی۔ کارپوریشن میں وہ اپنے فرستادہ آدمیوں کے ذریعہ شہری تزئین و ترقی کے کام کرایا کرتے تھے۔ میرے ایک دوست حاجی ہاشم مونڈیا تھے۔ وہ شریف دیوجی کے اثر سے کارپوریشن کے ممبر بنے۔ مونڈیا صاحب کی کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بمبئی کی بس سروس بہترین سروس بن سکی۔ ان کی پیہم کوششوں سے دو دروازے والی بسوں کا رواج ہوا تاکہ مسافر ایک سے چڑھیں اور دوسرے سے اتریں۔ انہی مونڈیا صاحب کے ذریعہ شریف دیوجی نے اسکولز کمیٹی کے نظام کی اور میونسپل مدارس کی بہت سی خامیوں کی اصلاح کرائی۔ الغرض شریف دیوجی دکان میں بیٹھے بیٹھے تار کھینچتے رہتے تھے اور ان کے مہرے ان کی زیر ہدایت مفید کام انجام دیتے رہتے تھے۔

بمبئی میں آئے دن کے ہندو مسلم فسادات میں انہوں نے

اور ان کے رضاکاروں نے بیشمار ہندوؤں اور مسلمانوں کی جانیں بچائیں ۔ چونکہ انہیں دونوں قوموں کے عوام اور خواص کا اعتماد حاصل تھا اس لئے ہندو مسلمان خطرناک مقامات سے نکلوائے جانے کے بعد ان کی دکان میں لائے جاتے تھے جہاں سے انہیں محفوظ مقامات میں پہنچا دیا جاتا تھا ۔ ان کی یہ خدمات آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں ۔

بمبئی کے ایک نیک دل اور مخیر مسلمان حاجی فاضل بھائی داؤد بھائی نے پچیس تیس لاکھ روپے کی رقم ایک ٹرسٹ کی کی صورت میں اس لئے چھوڑی تھی کہ اس کے منافع سے مسلمان طلبا کو وظایف دئے جائیں تاکہ وہ غیر ممالک سے مختلف علوم و فنون کی ڈگریاں لیں اور پھر آکر قوم و ملک کی خدمت کریں ۔ شریف دیوجی کانجی اس ٹرسٹ کے ٹرسٹی تھے ۔ انہوں نے فاضل موراج (سیکریٹری) اور بعض دیگر ماہرین تعلیم کے اشتراک عمل سے ایک مفصل اسکیم تیار کی اور اسی کے ماتحت طلبا کو وظیفے دئے جاتے تھے ۔ ہند و پاکستان کے مسلمانوں میں جو بڑے بڑے انجینیر ، ڈاکٹر اور ماہرین تعلیم آج نظر آتے ہیں ان میں سے کئی ایک اسی ٹرسٹ کے چشمۂ فیض سے سیراب ہوچکے ہیں ۔

انہوں نے ایک سوسائیٹی بنائی تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ میونسپل دفاتر میں اور حکومت کے مختلف محکموں میں مسلم ملازمین کی مناسب نمایندگی حاصل کرنے میں حکومت کا ھاتھ بٹائے ۔ حکومت نے اسے تسلیم کرلیا تھا ۔ چنانچہ جب کبھی مسلم ملازمین کی ضرورت ھوتی تو حکومت اس سوسائیٹی کو لکھ بھیجتی ۔ اس کی کوششوں کی بدولت سرکاری اداروں میں مسلم ملازمین کی شکلیں زیادہ تعداد میں نظر آنے لگ گئی تھیں ۔ راقم الحروف در پردہ اس سوسائیٹی کے ساتھ مختلف طریقوں سے اشتراک عمل کرتا رھتا تھا ۔

شریف دیوجی کو اُن مایوس اور ناکام طلبا کے پاس سے کبھی کبھی دشنام نامے اور عتاب نامے وصول ہوتے تھے جو کسی بنا پر وظیفہ حاصل کرنے سے محروم رہتے تھے ۔ مگر وہ گالیاں کھا کے بھی کبھی بے مزا نہ ہوئے ۔ وہ مجھے یہ سب خط دکھاتے اور پوچھا کرتے کہ " ان کا میں کیا کروں ؟ " میں جواب میں کہتا کہ "سرسید علیہ الرحمہ" کے نام بھی ایسے خطوط آیا کرتے تھے ۔" اس کے بعد میں انہیں حالی کی رباعی سناتا جسے سن کر وہ مطمئن ہوجاتے :-

کہدو جنہیں اصلاح کا ہے قوم کی چاؤ
طعنے جھیلو برا سنو گالیاں کھاؤ
یہ قوم کی خدمت کا صلہ ہے سر دست
گر اس پہ قناعت کا ارادہ ہے تو آؤ

وہ زندگی بھر اس حدیث رسول (ص) پر عامل رہے ۔ " افضل الاشغال خدمت الناس ۔" خدمت کرتے وقت وہ یہ نہیں دیکھتے تھے کہ جس شخص کی وہ خدمت کررہے ہیں کس مذہب یا کس فرقہ سے تعلق رکھتا ہے ۔ وہ انسانیت کی خدمت کرتے تھے اور اس میں کسی قسم کی تخصیص نہیں برتتے تھے ۔ وہ خود بھی بہت اعلیٰ سیرت رکھتے تھے ۔

ان کی وفات دسمبر ۱۹۳۶ میں ہوئی ۔ آج بھی ان کی دکان وہیں ہے جہاں تھی مگر ساری گہما گہمی جو ان کی زندگی میں دیکھنے میں آتی تھی ، اب بالکل دکھائی نہیں دیتی :-

تھی کسی شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں ؟

* * *

کیقباد فرامجی نریمان

نریمان بمبئی کے مشہور وکیل تھے مگر ان کی غیر معمولی قابلیت کا اظہار اس وقت ہوا جب کہ بمبئی ڈیویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ کے سپرنٹنڈنگ انجینیر هاروے نے حکومت کے ایما سے ان پر ازالۂ حیثیت عرفی کا مقدمہ دائر کر دیا جس میں بالآخر وہ باعزت طریقہ سے بری کر دئے گئے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نریمان نے بمبئی لیجسلیٹو اسمبلی میں اور اسمبلی کے باہر ڈیویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ کے خلاف مختلف بد عنوانیوں کے الزامات عائد کئے۔ اگر ان کی تقریریں اسمبلی تک محدود رہتیں تو شاید کچھ بھی نہ ہوتا، لیکن جب انہوں نے پبلک پلیٹ فارم سے بھی ان الزامات کو بار بار دھرایا تو حکومت وقت نے جو ان کی آئے دن کی نکتہ چینیوں سے بدحواس ہو گئی تھی، هاروے کو نریمان پر مقدمہ کرنے کی اجازت دیدی۔ نریمان نے رشوت ستانی، اقربا پروری اور دوسری بد عنوانیوں کے واقعات جمع کرنے اور صفائی کے لئے ضروری مسالہ فراہم کرنے کے سلسلہ میں اس درجہ جانفشانی دکھائی کہ اس غریب کی صحت خراب ہو گئی۔ مگر وہ حکومت کے مقابلہ میں آخر وقت تک ڈٹے رہے۔ مقدمہ مہینوں گھسٹتا رہا۔ نریمان نے اس قدر مواد جمع کرلیا تھا کہ خود حکومت کے ایک گواہ نے مجھے بتایا کہ "اگر حکومت کو اس بات کا پہلے سے علم ہوجاتا کہ نریمان کے پاس اسقدر مواد موجود ہے تو وہ کبھی بھی هاروے کو مقدمہ دایر کرنے کی اجازت نہ دیتی۔" چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ (سر ھرمز دیار دستور) بھی اس مقدمہ کی غیر معمولی طوالت سے تنگ آگئے تھے اور اس لئے انہوں نے نریمان سے کہا کہ "اگر

آپ بدعنوانی کا صرف ایک واقعہ ثابت کردیں تو وہ مقدمہ کے منشا کے لئے بالکل کافی ہوگا۔" چنانچہ نریمان نے ثابت کردیا اور مجسٹریٹ نے یہ سننے کے بعد فیصلہ میں لکھا کہ "نریمان نے جتنے الزمات لگائے تھے وہ مفاد عامہ کی خاطر لگائے گئے تھے اوران کا تعلق محکمہ سے تھا نہ کہ هاروے کی ذات سے۔" اس مقدمہ نے سارے صوبۂ بمبئی میں غیر معمولی اهمیت اختیار کرلی تھی۔ مقدمہ کے اختتام پر بمبئی کی شکر گزار پبلک نے نریمان کی خدمت میں ان کی عظیم الشان شہری خدمات کے صلہ میں ۵۰ هزار روپے کا پرس پیش کیا۔

جب ۱۹۳۸ میں بمبئی میں پہلی مرتبہ کانگریسی حکومت قائم هوئی تو اس وقت عام خیال یہی تھا کہ نریمان کی قومی خدمات کا لحاظ کرکے انہیں وزیر اعلیٰ بنا دیا جائیگا۔ مگر انہیں نظر انداز کردیا گیا۔ اس کے بعد خیال ہوا کہ انہیں کم سے کم اسمبلی کا صدر منتخب کرلیا جائیگا، لیکن یہ امید بھی پوری نہ هوئی۔ نریمان کی سیاسی موت میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کا هاتھ تھا۔ اس کے بعد انہیں کانگریس کے هر عہدہ سے محروم کر دیا گیا۔ وہ ایک بڑی سازش کا شکار هوئے تھے۔*

نریمان ایک سال تک بمبئی میونسپل کارپوریشن کے میئر

---

* مولانا ابولکلام آزاد "انڈیا ونز فریڈم" (India Wins Freedom) میں لکھتے هیں:- "بمبئی میں مسٹر نریمان کانگریس کے مسلمہ لیڈر تھے۔ جب صوبائی حکومت کا سوال اٹھا تو عام توقع یہی تھی کہ ان کی شاندار خدمات کی بنا پر انہیں حکومت کا لیڈر بنا دیا جائیگا، مگر ایسا نہیں ہوا۔ سردار پٹیل انہیں پسند نہیں کرتے تھے۔ نتیجہ یہ هوا کہ کھیر بمبئی کے وزیراعظم بنا دیئے گئے۔ نریمان اس فیصلہ سے بہت بھڑکے۔ انہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کے روبرو سوال اٹھایا جس کے صدر پنڈت جواھرلال تھے مگر وہ بھی اس ظلم کا ازالہ نہ کرسکے۔ پھر انہوں نے گاندھی جی کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا مگر سردار پٹیل نے کچھ اس طرح سے اپنا اثر و رسوخ استعمال کیا کہ تحقیقات شروع هونے سے پہلے هی غریب نریمان اپنا مقدمہ هار گئے۔"

رہے ۔ اس دوران میں ان کی تمام تعمیری صلاحیتیں بروئے کار
آئیں۔ ان سے پیشتر جتنے میئر تھے آن سب کا دائرہ عمل کارپوریشن
کے ہال تک محدود رھتا تھا ، اور وہ وھیں گرجتے اور برستے
تھے ۔ یہ پہلے میئر تھے جنہوں نے شہریوں کی خدمت والہانہ
جذبہ کے ساتھ انجام دی ۔ انہوں نے اپنے دور میں مزدوروں کی
فلاح کے متعدد کام کئے ، شہر کی حفظان صحت کو بہتر بنایا ،
پانی کی بہمرسانی میں مزید آسانیاں بہم پہنچائیں اور ابتدائی تعلیم
کو لازمی کرنے اور مزید مدارس کھولنے کے لئے انتہائی جدوجہد
کی ۔ وہ روزانہ شہر کے مختلف علاقوں میں پہنچتے ۔ وہ اپنے
پروگراموں کا پہلے سے اعلان کر دیتے تھے تا کہ شہری اپنی
شکایتیں اصالتاً بیان کریں ۔ آنہوں نے شہر کی تزئین و ترق کے
کام کو ایک مقررہ پروگرام کے مطابق انجام دیا ۔ ان کا بیشتر
وقت شہری ضروریات پر توجہ دینے اور مختلف قسم کی خرابیاں
دور کرنے میں صرف ھوتا تھا ۔ ھر شخص ان تک بآسانی پہنچ
سکتا تھا ۔ ان میں خدمت کرنے کا بے پناہ جذبہ تھا ۔ بمبئی کو
ایسا کامی اور جنونی میئر پھر کبھی میسر نہ آیا ۔

اپنے ملک کو آزاد کرانے کی ھر تحریک میں وہ ھمیشہ
پیش پیش رہے ۔ انہیں اسلامی ممالک سے بھی گہری محبت تھی ۔
وہ آزادیٔ مصر کے دل سے قائل تھے اور چاھتے تھے کہ انگریزی
فوجیں اس ملک کو خالی کرکے چلی جائیں ۔ تحریک خلافت کے
زمانہ میں بھی آنہوں نے ھر موقع پر ٹرکی کی حمایت کی تھی ۔

وہ بہت نڈر اور جری سپاھی تھے ۔ ان میں نام کو عصبیت
نہ تھی ۔ بہ حیثیت انسان کے وہ بہت آونچے مقام پر تھے اور قدرت
کی طرف سے فیاض فطرت لیکر آئے تھے ۔

تا جہاں باشد بہ نیکی در جہانت باد نام

***

ڈاکٹر محمدّ ناظم

ڈاکٹر صاحب پنجاب کے ایک ذی علم گھرانے سے تعلق رکھتے تھے۔ خود ان کا سارا تعلیمی زمانہ بڑا شاندار گزرا ہے۔ میٹرک میں وہ درجۂ اول میں پاس ہوئے اور انٹرمیڈیایٹ میں یونیورسٹی بھر میں دوسرے نمبر پر آئے۔ اپنی تعلیم کے زمانہ میں انہوں نے متعدد انعامات اور وظائف حاصل کئے۔ علیگڈھ یونیورسٹی سے ایم۔ اے پاس کرنے کے بعد وہ وہیں تاریخ کے لکچرر مقرر ہو گئے۔ پھر انہوں نے کیمبرج یونیورسٹی سے سلطان محمود غزنوی پر مقالہ (thesis) لکھکر پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ ان کا مقالہ ایسا جامع اور فاضلانہ تھا کہ خود یونیورسٹی نے خواھش ظاھر کی کہ اسے کتابی صورت میں چھاپے، اور یہ بجائے خود بہت بڑا اعزاز ھے۔ اس کا دیباچہ مشہور مستشرق آر۔ اے۔ نکلسن کا تحریر کردہ ھے۔ اس میں وہ لکھتے ھیں:- ”.... جب یہ کتاب شائع ھوجائیگی تو اس سے نہ صرف مصنف کا وقار بلند ھوگا بلکہ علیگڈھ یونیورسٹی کی بھی عزت بڑھ جائیگی۔“ متحدہ ھندوستان کے مشہور مورخ سر جادو ناتھ سرکار نے جو رائے دی تھی وہ یہ ھے:- ”یہ کتاب لکھکر انہوں نے غزنوی خاندان پر سب سے بڑے زندہ اتھارٹی کی حیثیت حاصل کرلی ھے۔“ ڈاکٹر صاحب کی خواھش پر میں نے اس کا اردو میں ترجمہ کیا تھا جو ابھی تک شائع نہیں ھوا۔

۱۹۲۹ میں وہ حکومت ھند کے محکمۂ آثار قدیمہ میں اسسٹنٹ سپرنٹنڈنٹ مقرر ھو گئے۔ اس کے بعد وہ سپرنٹنڈنٹ بنے اور پھر قائم مقام ڈائرکٹر۔ پاکستان بن جانے کے بعد وہ اسی عہدہ سے ریٹایر ھوئے۔

یہ حقیقت ہے کہ زندگی بھر ڈاکٹر ناظم کا اوڑھنا بچھونا علمی مشاغل رہے۔ انہوں نے مختلف علمی جرائد میں اہم تاریخی مضامین لکھے۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے لئے بھی انہوں نے ایک درجن کے قریب آرٹیکل تحریر کئے تھے اور چند فارسی کتابوں کو بھی ایڈٹ کیا تھا۔

اُن کی زندگی کا مقصد وحید یہ تھا کہ ٹھوس علمی خدمت کے ذریعہ دنیا میں مسلمانوں کا نام روشن کریں۔ ۱۹۵۰ میں ہم دونوں نے مل کر ایک کتاب ''تاریخ اسلام کی سچی کہانیاں'' لکھی تھی جو مدت تک پرائمری مدراس کے نصاب میں شامل رہی۔

ڈاکٹر ناظم پسندیدہ سیرت کے مالک تھے۔ بیسویں صدی میں رہنے سہنے کے باوجود وہ اپنے دور کے لوگوں سے بالکل مختلف تھے۔ ان کا انتقال مئی ۱۹۵۵ میں ہوا۔

***

سر ابراہیم رحمت اللہ

سر ابراہیم خوجہ جماعت سے تعلق رکھتے تھے اور بمبئی میں روئی کی تجارت کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ پبلک لائف میں آئے۔ پہلے میونسپل کارپوریشن کے ممبر بنے اور کئی برس تک شہر کی خدمت مختلف حیثیتوں سے کرتے رہے۔ پھر مجلس واضعان قوانین بمبئی کے ممبر بنے اور یہیں ان کے فطری جوہر کھلے۔ اس کے بعد وہ اس کے صدر منتخب ہو گئے۔ پھر وہ دھلی کی لیجسلیٹو اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے اور بالآخر اس کے صدر چنے گئے۔ جب میری ان سے پہلی ملاقات ہوئی وہ گورنر بمبئی کی ایگزیکیوٹیو کونسل کے ممبر تھے۔

۱۹۱۸ میں سر ابراہیم آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ سورت کے صدر چنے گئے۔ ایڈریس کی تیاری کے سلسلہ میں انہوں نے ایک دن مجھے بلوا بھیجا اور اور فرمایا کہ ''چند اقتباسات ایسے دیدو جن سے مسلمانوں کے علمی کارناموں پر روشنی پڑے۔'' چنانچہ میں نے پروفیسر شیخ عبدالقادر کی اعانت سے مختلف کتابوں کے چند اقتباسات دیدئے جنہیں انہوں نے اپنے خطبہ کا جزو بنالیا۔ جب ان کا خطبہ تیار ہو گیا تو انہوں نے تنقید کی غرض سے اس کا ایک ایک لفظ مجھے پڑھکر سنایا اور پھر فرمایا کہ اس کا اردومیں ترجمہ بھی کردو۔ چنانچہ میں نے ان کے حکم کی تعمیل کی۔ میرے ترجمہ سے وہ بیحد خوش تھے اور کہتے تھے کہ ''تم نے اپنے ترجمہ سے میرے خطبہ میں چار چاند لگادئے ہیں۔'' عرصۂ دراز تک ان کا یہی وطیرہ رہا۔ جب ملتے ترجمہ کا شکریہ ضرور ادا کرتے۔

وہ خود ساختہ اور خود پرداختہ آدمی تھے۔ وہ دنیا کے

کسی حصہ میں بھی ہوتے ان کی ترقیوں کی یہی رفتار رہتی - خدا نے جو زبردست بصیرت انہیں اپنے خزانۂ غیب سے عطا کی تھی وہ اس قدر غیر معمولی تھی کہ دیکھکر حیرت ہوتی تھی -

انہیں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی سے گہری دلچسپی تھی - وہ مختلف تعلیمی اداروں کے صدر تھے - علیگڈھ کالج کے معاملات کی تحقیقات کے لئے جو کمیٹی حکومت ہند نے بنائی تھی اُس کے چیئرمین بھی وہی تھے - انہیں کرکٹ اور دوسرے کھیلوں سے گہری دلچسپی تھی - وہ اسلام جیمخانہ میں جا کر مسلمان کھلاڑیوں کی ہمت بندھاتے رہتے تھے - اس سلسلہ کا ایک واقعہ قابل ذکر ہے -

تقسیم سے قبل بمبئی میں کواڈرینگولر میچ کھیلے جاتے تھے جن میں ہندو، مسلمان، پارسی اور انگریز حصہ لیتے تھے - ان میچوں کو دیکھنے کے لئے ایک خلقت ٹوٹ پڑتی تھی - اور جب تک یہ میچ رہتے سارے شہر میں غیر معمولی گہما گہمی رہتی - ان دنوں پونا کے ایک بہت ہی اچھے کھلاڑی مرزا یوسف بیگ* تھے جن کی کپتانی میں مسلم ٹیم نے مسلسل تین سال تک (۱۹۱۸ تا ۱۹۲۰) میچ کھیلے، مگر ہر سال شکست کا سامنا کرنا پڑا - اس پر اسلام جمخانہ نے فیصلہ کیا کہ مرزا یوسف کی بجائے کسی اور کو کپتان بنایا جائے - یہ سننا تھا کہ یوسف بیگ بگڑ گئے اور کہا کہ "اگر مجھے کپتانی نہ دی گئی تو میں ان کھیلوں میں کوئی حصہ نہ لونگا -" اس پر سر ابراہیم نے میری موجودگی میں اُن سے کہا :- "تمہارے

---

* ایم - آئی - مرچنٹ اپنی کتاب "کرکٹ کے سو بہترین کھلاڑی" میں یوسف بیگ کے بارے میں لکھتے ہیں :- "He was one of the great Muslim cricketers. His off-driving, late cuts, leg-glances showed elegance & perfect skill & mastery of technique. He was a brilliant slip field......"

سامنے صرف ایک مقصد ہونا چاہئے یعنی مسلمانوں کی نیکنامی اور عظمت ۔ تمہیں اس بات کی مطلق پروا نہ کرنی چاہئے کہ تمہیں کونسی پوزیشن دی گئی ہے ۔ تمہارے پیش نظر حضرت خالد کی مثال رہنی چاہئے جنہیں کمانڈر انچیف کے عہدہ سے ہٹا کر حضرت ابوعبیدہ کی ماتحتی میں دیدیا گیا تھا ، مگر وہ مطلق کبیدہ خاطر نہ ہوئے اور یہی کہتے رہے کہ میں تو اسلام کا سپاھی ہوں ، اپنے نفس کے لئے نہیں لڑتا بلکہ اسلام کی خاطر لڑتا ہوں ۔ مجھے عہدہ سے کوئی سروکار نہیں ۔ یہی طرز عمل تمہارا بھی ہونا چاہئے ۔'' مگر اس ''کلام نرم و نازک'' کا مرزا یوسف بیگ پر کوئی اثر نہ ہوا ۔ اس سلسلہ میں یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ اس واقعہ کے بعد سے مرزا یوسف کی کرکٹ کی زندگی بالکل ختم ہو گئی ۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں

وفات سے کچھ عرصہ پیشتر آنہوں نے مجھے ایک سرٹیفکٹ عنایت فرمایا جس کا اقتباس درج ذیل ہے :-

"This is to certify that I have known Mr. Z. A. Barni for many years......He is quite proficient in Urdu and Persian and is a very efficient translator.

(Sd.) Sir Ibrahim Rahimtoola
G.B.E., K.C.S.I., C.I.E."

ان کی وفات کے بعد بمبئی کی میونسپل کارپوریشن نے ان کی شہری خدمات کے اعتراف میں بھنڈی بازار کا نام ''سر ابراھیم رحمت اللہ روڈ'' رکھا جو آج تک اسی نام سے مشہور ہے ۔

***

آغا شاعر قزلباش

داغ کی وفات کے بعد اُن کے شاگردوں نے آغا شاعر دھلوی، بیخود دھلوی، نوح ناروی اور سائل دھلوی کو الگ الگ ''جانشین داغ'' منتخب کرلیا۔ اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ان میں سے ھر ایک اپنی جگہ پر اس خصوصی اعزاز کا مستحق تھا۔ یہ میری خوش قسمتی ھے کہ مجھے ان چاروں کی خدمت میں نیاز حاصل رھا ھے۔

میرے والد سے آغا صاحب کے گہرے مراسم تھے۔ والد نے ان کی بعض تخلیقات کی کتابت بھی کی تھی اور اس سلسلہ میں وہ گاہ بگاہ ھمارے یہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ یہ میرا طالب علمی کا زمانہ تھا اور وھیں میں پہلی دفعہ میں ان کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ آخری ملاقات ۱۹۲۵ میں علیگڈھ میں ھوئی جہاں انہوں نے جوبلی کی تقریبات میں شرکت کی تھی اور مشاعرہ میں اپنی زوردار آواز میں معرکہ کی غزل بھی سنائی تھی۔

آغا شاعر اپنے پیچھے قرآن مجید کا منظوم ترجمہ چھوڑ گئے ھیں۔ یہ منظوم ترجمہ برسوں کی محنت شاقہ کا نتیجہ ھے۔ اُن کی محنت کو دیکھ کر مجھے فردوسی کے شاہ نامہ کی یاد آجاتی ھے جو تیس سال کی طویل مدت میں پایۂ تکمیل کو پہنچا تھا۔ اس مہتم بالشان کام میں انہوں نے شاہ ولی اللہ کے ترجمۂ قرآن سے استفادہ کیا تھا۔ ایکدن اثنائے گفتگو میں انہوں نے فرمایا :-

> ''شیعہ میرے ترجمہ کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔
> وہ کہتے ھیں کہ یہ منظوم ترجمہ ایک سنی عالم شاہ ولی اللہ کے ترجمہ پر مبنی ھے اور سنی اس لئے اسے قابل توجہ قرار نہیں دیتے کہ مترجم شیعہ ھے۔

بہرحال میرے ہاتھ سے جنت بھی گئی اور دوزخ بھی۔''
وہ اپنی اس عظیم الشان محنت کے اکارت جانے کے تخیل سے بہت متفکر رہتے تھے۔ پہلا پارہ میری نظر سے گزر چکا ہے اور وہ کافی جاندار اور پرشکوہ ہے۔ مجھے یقین ہے کہ دیر یا سویر اس ملک میں اس منظوم ترجمہ کا قدردان پیدا ہوکر رہیگا جو اس کی اشاعت کو اپنے لئے باعث سعادت خیال کریگا۔ بہر حال یہ کارنامہ ان کی زندگی کا شاہکار ہے۔

طالب علمی کے زمانہ میں میں گندے نالہ پر ان کی محرم کی مجالس میں بہت ذوق و شوق سے شریک ہوا کرتا تھا۔ میں نے آن کی زبان فیض ترجمان سے بیسیوں مرثیے اور غزلیں سنی ہیں۔ سناتے وقت وہ مجمع پر چھا جاتے تھے۔ آن میں ایک خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اشعار سے خود بھی متاثر ہوتے تھے اور دوسروں کو بھی متاثر کرتے تھے۔

انہیں رسول مقبول (ص) سے انتہائی عشق تھا۔ آنحضرت (ص) کا نام آتے ہی ڈاکٹر اقبال کی طرح ان کی آنکھیں اشکبار ہوجاتی تھیں۔ اللہ جانے اس وقت ان کے دل میں کیا کیا خیالات موجزن ہوتے ہونگے! ان کی رقت قلب کا مشاہدہ میں متعدد بار کرچکا ہوں۔

آغا شاعر بڑے وضعدار اور بھولے بھالے انسان تھے۔ جب ملاقات ہوتی تو بیحد شفقت اور محبت کا اظہار فرماتے۔ ایسی محبت کرنے والے بزرگ اب کہاں؟ وہ بہت خوش پوش تھے، اگرچہ لباس کی وضع قطع قدیم تھی۔ وہ ڈھیلے ڈھالے پائینچوں کے پاجامے پہنتے تھے اور شیروانی کی بجائے پرانی وضع کی گھنڈی دار اچکن زیب تن کرتے تھے۔ اپنی لمبی مونچھوں میں آن کی شخصیت بہت بارعب نظر آتی تھی۔ ویسے بھی وہ بہت وجیہ اور ہزاروں میں ایک تھے۔

ان کی زبان میں جو چٹخارہ تھا وہ انہی کی ذات گرامی پر ختم ہوگیا۔

کرشن لال جھویری

کرشن لال موھن لال جھویری بمبئی کی عدالت خفیفہ کے چیف جسٹس تھے، ۱۹۲۸ میں ریٹایر ھوئے اور اس کے بعد تقریباً ۲۹ برس تک پنشن پاتے رہے۔ ملازمت سے سبکدوش ھونے کے بعد ان کا وقت زیادہ تر سوشل کاموں میں صرف ھوتا تھا۔ وہ فارسی زبان کے فاضل تھے اور مدتوں آن کی فارسی گرامر صوبۂ بمبئی کے ثانوی مدارس میں درسی کتاب کی حیثیت سے رائج رھی۔ گجراتی ان کی مادری زبان تھی۔ لیکن وہ مراٹھی میں بھی گفتگو کرسکتے تھے اور آردو تو بہت بے تکلفی سے بولتے تھے۔ بنگالی اور عربی سے بھی واقف تھے۔ ایک اعتبار سے انہیں ماھر السنۂ مشرقیہ کہا جاسکتا ھے۔ میری کتاب ''لطائف ملا نصرالدین'' کو انہوں نے بہت پسند کیا تھا۔

وہ ۱۸۶۸ میں بھڑوچ کے ایسے گھرانے میں پیدا ھوئے تھے جس میں تعلیم کا بہت زیادہ چلن تھا۔ ان کی ابتدائی تعلیم بھڑوچ اور بھاؤ نگر میں ھوئی۔ بھاؤنگر سے ۱۸۸۸ میں بی اے کا امتحان درجۂ اول میں پاس کرنے کے بعد وہ بمبئی آگئے تاکہ قانون کا مطالعہ کریں۔ آن دنوں لا کالج صرف بمبئی میں تھا اور اس وجہ سے سارے صوبہ کے طلبا کھچ کھچ کر وھیں آتے تھے۔ قانون کے ساتھ ساتھ انہوں نے الفنسٹن کالج سے انگریزی اور فارسی میں ایم ، اے کا امتحان پاس کیا اور وھیں انہیں مشہور زمانہ ایرانی پروفیسر مرزا حیرت کی شاگردی نصیب ھوئی۔ وہ اپنے شفیق آستاد کا ذکر غیر معمولی احترام اور محبت سے کیا کرتے تھے۔

انہوں نے انگریزی میں ''اخلاق محسنی'' کی شرح لکھی اور ''طیبات سعدی'' کے ایک جزو کا اور ''دیوان حافظ'' کی

۲۰۰ غزلوں کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ ''انوار سہیلی'' پر اُن کا دیباچہ بہت شہرت رکھتا ہے۔ ۱۹۲۸ میں انہوں نے اُن فرامین کا انگریزی اور گجراتی میں ترجمہ کیا جو ہزھولی نیس ٹکایت مہاراج کے بزرگوں کے نام مسلمان فرمانرواؤں نے وقتاً فوقتاً جاری کئے تھے۔ ۱۸۹۲ میں انہوں نے فارسی علم عروض پر ایک کتاب لکھی جو انگریزی میں ہے۔ ۱۹۳۳-۳۴ میں انہوں نے ''مرأت احمدی'' کے دوسرے حصہ کا انگریزی میں ترجمہ کیا جو بعد کو ''گائیکواڑ اورینٹل سیریز'' میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

جھویری بمبئی کے ممتاز شہری تھے۔ اپنے علمی مشاغل کے ساتھ ساتھ وہ شہریوں کی سوشل خدمت بھی انجام دیتے رہتے تھے۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں فارسی اشعار کی چاشنی سے خاص لطف پیدا کردیتے تھے۔ ان کے دوستوں میں ہر مذہب و ملت کے فضلا شامل تھے۔

وہ غیر متعصب بزرگ تھے اور تمام مذاہب کے بانیوں اور بزرگوں کا دلی احترام کرتے تھے۔ باعتبار خیالات وہ بیحد متوازن آدمی تھے۔ جب ۱۹۲۹ کے ہندو مسلم فسادات کے اسباب و علل معلوم کرنے کی غرض سے حکومت بمبئی نے ایک ٹریبونل بٹھایا تو جھویری بھی اس کے رکن بنائے گئے۔ ترجمانی کے فرائض میرے ذمہ تھے۔ میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہ سکتا ہوں کہ انہوں نے اپنے فرائض نہایت تن دھی، جانفشانی اور غیر جانبداری سے ادا کئے۔ وہ مذہبی جذبات کی رو میں کبھی نہیں بہے اور آخر وقت تک جج کی سی صیانت سے کام کرتے رہے۔ جھویری نہایت پاکیزہ سیرت کے مالک تھے۔ علما اور فضلا کی محفلوں میں وہ خاص احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔

***

بی ۔ جی ۔ ہارنیمین

بی ۔ جی ۔ ھارنیمین کوئیکر سوسائیٹی سے تعلق رکھتے تھے ۔ اس سے پہلے کہ وہ بمبئی آئیں اور ’’ کرانیکل ‘‘ کی ادارت سنبھالیں وہ ’’ اسٹیٹسمین ‘‘ (کلکتہ) کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے ۔ سر فیروز شاہ مہتا نے انہیں کلکتہ سے بلوایا تاکہ وہ بمبئی کے پہلے قوم پرست اخبار کے مدیر بنیں ۔ چنانچہ وہ تشریف لائے اور مارچ ۱۹۱۳ سے ’’ کرانیکل ‘‘ کی ادارت سنبھال لی ۔ ’’ کرانیکل ‘‘ نے ملکی آزادی کی جنگ میں خدمت کا جو شاندار ریکارڈ پیش کیا ھے ، وہ براعظم پاک و ھند کی تاریخ میں آپ اپنی مثال ھے ۔

ھارنیمین زندگی بھر جس اصول پر عمل پیرا رھے وہ یہ تھا :۔

’’ لوگوں کے طعنے برداشت کرو ، قید و بند کی مصیبتیں جھیلو ، تکلیفیں سہو ، پھانسی پاجاؤ ، لیکن اپنی رائے کو بالضرور شائع کرو ۔ یہ محض تمہارا حق نہیں ھے بلکہ فرض عین ھے ۔ ‘‘

میں نے ھارنیمین کو پہلی بار بمبئی میں دسمبر ۱۹۱۸ میں دیکھا تھا جب کہ وہ محمد علی جناح کی سر کردگی میں لارڈ ولنگڈن کو الوداعی ایڈریس دئے جانے کے خلاف زبردست جنگ میں مصروف تھے ۔ ھارنیمین کو اس کا خمیازہ یوں بھگتنا پڑا کہ بمبئی کے نئے گورنر نے انہیں اپریل ۱۹۱۹ میں زبردستی جہاز میں بٹھا کر انگلستان روانہ کر دیا جہاں وہ سات سال تک بالجبر قیام پذیر رھے ۔ اس کے بعد وہ براہ سیلون اچانک بمبئی میں نازل ھو گئے ۔ ان کے آتے ھی پہلی سی سر گرمیاں پھر سے شروع ھو گئیں ۔

ان کی غیر حاضری میں امرتسر کا خونی واقعہ ظہور پذیر ہوا ۔ خلافت کی تحریک بھی اسی زمانہ میں شروع ھوئی ۔ انگلستان

سے انہوں نے ''امرتسر'' نام کی کتاب شائع کی۔ وفد خلافت کی تائید میں انہوں نے متعدد مضامین لکھے اور تقریریں کیں۔*

''کرانیکل'' سے تعلق ٹوٹنے پر انہوں نے معزول مہاراجہ نابھہ کی امداد سے ''نیشنل ہیرلڈ'' نکالا۔ جب حکومت کو یہ معلوم ہوا تو اس نے مہاراجہ کے الاؤنس میں اچھی خاصی تخفیف کردی تاکہ آیندہ وہ کسی قوم پرست اخبار کی امداد نہ کرسکیں۔ اس روزنامہ کے بند ہو جانے پر ''کرانیکل'' والوں نے انہیں پھر اپنے یہاں بلالیا اور ان کی خاطر شام کا اخبار ''سینٹینل'' نکالا۔ اپنی وفات تک وہ اسی اخبار سے وابستہ رہے۔ اس اخبار کی ایڈیٹری کے دوران میں ان پر متعدد مقدمات دایر کئے گئے، مگر وہ کسی ایک میں بھی سزایاب نہیں ہوئے۔

ایک دفعہ ان کے اخبار میں ایک گمنام مراسلہ شائع ہوا۔ جس شخص پر اس مراسلہ سے زد پڑتی تھی اس نے ہارنیمین کو نوٹس دیا کہ ''معافی مانگو اور نامہ نگار کا نام بتاؤ۔'' ہارنیمین نے معافی مانگنے اور نام بتانے سے صاف انکار کردیا اور جواب میں لکھا کہ ''نامہ نگار کا نام ایڈیٹر کے پاس بطور امانت محفوظ رہتا ہے اور اسے کسی حالت میں بھی ظاہر نہیں کیا جاسکتا۔ تم جو باز پرس کرنا چاہتے ہو، مجھ سے کرو اس لئے کہ ایڈیٹر کی حیثیت سے اخبار میں شائع ہونے والی ہر چیز کا ذمہ دار میں ہوں۔'' چنانچہ ہارنیمین پر مقدمہ دائر کردیا گیا۔ انہوں نے صفائی میں عدالت کو یقین دلایا کہ زیر بحث مراسلہ مفاد عامہ کی خاطر شائع کیا گیا تھا اور اس سے کسی کی دل آزاری مقصود نہ تھی۔ عدالت نے ان کے عذر کو تسلیم کرتے ہوئے انہیں بری کردیا۔ حکومت کے خلاف بھی جو مراسلے ''سینٹینل'' میں نکلتے تھے، ان کے لکھنے والوں کو بھی سرکاری

---

* سید سلیمان ندوی ''برید فرنگ'' میں لکھتے ہیں: ''مسٹر ہارنیمین جو ہندوستان سے باہر کئے گئے ہیں، عموماً وفد کے ساتھ رہتے ہیں....''

مطالبہ کے باوجود کبھی ظاہر نہیں کیا گیا۔

ہارنیمین پولیس کی فروگزاشتوں پر کڑی تنقیدیں کیا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ غیرملکی حکومت کی آلۂ کار تھی اور اپنے آقاؤں کو خوش کرنے کی غرض سے اوچھے ھتھیار استعمال کرنے سے بھی نہ چوکتی تھی۔ ہارنیمین چاھتے تھے کہ اس میں حب الوطنی کے جذبات پیدا ھوں اور وہ انگلستان کی پولیس کی طرح پبلک کی خادم اور دوست بنے۔ بہرحال اُنھوں نے اپنی ساری صحافی زندگی میں پولیس کو کبھی نہیں بخشا۔

ہارنیمین پر الہ آباد ھائی کورٹ کی طرف سے ھتک کا ایک مقدمہ دائر کیا گیا۔ بات یہ تھی کہ ہارنیمین نے اپنے مزاحیہ کالموں (Twilight Twitters) میں وھاں کے ججوں کے بارے میں کوئی مذاق آمیز جملہ لکھدیا تھا۔ اس پر چیف جسٹس نے پولیس کمشنر بمبئی کے نام گرفتاری کا وارنٹ بھیجدیا۔ چنانچہ ہارنیمین گرفتار کرلئے گئے اور چیف پریسیڈنسی مجسٹریٹ (آسکر براؤن) کے روبرو پیش کئے گئے۔ اس مقدمہ میں ہارنیمین نے اپنی صفائی خود پیش کی۔ ان کا ایڈریس سننے کے لئے عدالت مُمتاز وکلا سے بھر گئی تھی۔ آنھوں نے اپنی صفائی میں تین عذرات پیش کئے :- ”(۱) ھندوستان میں جس قانون کے ماتحت ھائی کورٹیں قائم ھیں اُس کی رو سے انھیں اپنے حدود اختیار سے باھر کسی کو گرفتار کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ (۲) جن الفاظ کے بارے میں کہا جاتا ھے کہ ان سے عدالت کی توھین ھوتی ھے وہ بالکل بے ضرر ھیں، اور (۳) الہ آباد ھائی کورٹ نے پولیس کمشنر کی وساطت سے جو وارنٹ گرفتاری بھیجا ھے، وہ قانوناً ناقص (Bad in law) ھے۔ صحیح طریقۂ کار یہ تھا کہ وارنٹ کی تعمیل ھائی کورٹ کے ذریعہ کی جاتی۔“ یہ وزنی دلائل سننے کے بعد بھی عقل کل مجسٹریٹ نے کہا کہ ”میرا کام محض اتنا ھے کہ میں پولیس کی تحویل میں آپ کو الہ آباد بھیجدوں۔ آپ کے

یہ سارے دلائل غلط ہیں۔ ‘‘ اس پر ہارنیمین نے کہا کہ ’’ آپ مجھے جلد از جلد اپنے فیصلہ کی نقل عطا فرمادیں تاکہ میں اس کے خلاف ہائی کورٹ میں چارہ جوئی کرسکوں۔ ‘‘ چنانچہ تھوڑی دیر میں نقل دیدی گئی اور اپیل دائر کردی گئی۔ ان دنوں بمبئی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر نارمن میکلوڈ تھے۔ انہوں نے اس مقدمہ کی سماعت خود کی اور ہارنیمین کے تینوں عذرات کو درست قرار دیتے ہوئے انہیں عزت کے ساتھ بری کردیا۔ ساتھ ہی انہوں نے الہ‌آباد ہائی کورٹ کے ججوں کو مخاطب کرکے کہا :۔ ’’ آپ کو اس قدر حساس نہ ہونا چاہئے کہ ذرا ذرا سی بات کو توہین عدالت کا سبب گردانتے لگیں۔ ‘‘ جب اس فیصلہ کی اطلاع الہ‌آباد پہنچی تو وہاں کے چیف جسٹس نے غالباً خفت مٹانے کو یو۔ پی کے انسپکٹر جنرل آف پولیس کے نام یہ حکم صادر کیا کہ ’’ جب کبھی ہارنیمین ہمارے حدود اختیار میں آجائے ، اسے گرفتار کرکے ہماری عدالت میں پیش کرو۔ ‘‘

عمال حکومت کی ’’ کمزوریاں ‘‘ معلوم کرنے کی غرض سے ہارنیمین اپنی تنخواہ کا اچھا خاصا حصہ اپنے مخصوص رپورٹروں اور فوٹو گرافروں پر صرف کیا کرتے تھے۔ بمبئی کے مشہور پارسی تاجر گودریج نے تلک سوراج فنڈ میں ایک لاکھ روپیہ دیا تھا۔ چونکہ حکومت اس کی بنائی ہوئی الماریوں کی سب سے بڑی خریدار تھی اس لئے اس نے ایک خفیہ قرارداد (G. R.) کے ذریعہ سب دفاتر کو حکم دیدیا کہ آیندہ سے گودریج کے مال کی سرپرستی نہ کیجائے۔ ہارنیمین کو کہیں سے وہ قرارداد ہاتھ لگ گئی اور انہوں نے اس کا عکس اپنے اخبار میں شائع کردیا۔ اس سلسلہ میں اسمبلی میں بھی سوالات پوچھے گئے تھے۔ اس وقت کے ہوم ممبر سر ماریس ہیورڈ نے پہلے تو منیجر گورنمنٹ سنٹرل پریس سے پوچھا کہ قرارداد کی کتنی کاپیاں چھاپی گئی ہیں اور کتنی مختلف محکموں کو بھیجی گئی ہیں۔ پھر

انہوں نے سختلف محکموں سے پوچھا کہ آیا قرارداد کی سب کاپیاں آن کے فائلوں میں محفوظ ھیں۔ جب اس بارے میں انہیں پورا اطمینان ھوگیا تو پھر اسمبلی میں جاکر نہایت ڈھٹائی سے متعلقہ سوالات کا یہ جواب دیا کہ ”حکومت نے اس قسم کی کوئی قرارداد جاری نہیں کی۔“ یہ جواب سن کر اکبر کا مصرع خود بخود میرے ذھن میں آ گیا۔

جھوٹے ھیں ھم تو آپ ھیں جھوٹوں کے بادشاہ

اسی طرح ایک ایرانی جرنلسٹ (سیف آزاد) تھے جو بمبئی کے ھوٹلوں میں بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے مخیر پارسیوں کی مدد سے ایک فارسی ماھنامہ بھی نکالا تھا جس کا پہلا نمبر اس شان کا تھا کہ بڑے بڑے غیر ملکی رسالے اس کے آگے ماند تھے۔ ھارنیمین نے اپنے آدمی اس کے پیچھے لگادئے اور پھر حکومت پر واضح کردیا کہ وہ جرمنی کا جاسوس ھے۔ چنانچہ اسے نظر بند کردیا گیا اور جنگ کے بعد حکومت کے خرچ پر ایران بھیجدیا گیا۔

ھمارے دفتر (اورینٹل ٹرانسلیٹرز آفس) کے ایک پارسی افسر (جہانگیر ایدلجی سنجانا) ”ٹائمز آف انڈیا“ میں جمعرات کے جمعرات ”تھرو انڈین آئیز“ کے عنوان سے مضامین لکھا کرتے تھے جن میں ھندوستانی لیڈروں کی زندگی کے قابل اعتراض پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی تھی اور ان کا مذاق آڑایا جاتا تھا۔ یہ مضامین مسلسل ۵ سال تک نکلتے رھے۔ بیسیوں اشخاص اس کوشش میں لگے ھوئے تھے کہ لکھنے والے کا نام معلوم کریں مگر سب ناکام رھے۔ بالآخر ھارنیمین نے پتہ لگا ھی لیا اور ان مضامین کو بند کرانے کی سہم شروع کردی۔ اس سلسلہ میں اسمبلی میں بھی سوالات پوچھے گئے تھے۔ اس زمانہ میں حکومت کے ھوم نمبر سر ارنسٹ ھاٹسن تھے۔ انہوں نے سنجانا کا ساتھ دیا اور کہا کہ ”ان مضامین سے کسی سرکاری قاعدہ یا ضابطہ کی خلاف

ورزی نہیں ہوتی اور اس لئے حکومت اس بارے میں کوئی کارروائی کرنا نہیں چاہتی ۔" مگر طوفان مخالفت کے پیش نظر خود سنجانا اور "ٹائمز" دونوں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس سلسلہ کو ہمیشہ کے لئے بند کردیا جائے ۔

گاندھی جی کی کسی تحریک کا زمانہ تھا کہ ایک یورپین سارجنٹ نے کسی کانگریسی والنٹیر کوجو پرنسس گودی (ڈاکس) کے دروازہ کے قریب پکٹنگ کررہا تھا ، بری طرح زد و کوب کیا - چنانچہ کانگریس نے سارجنٹ پر مقدمہ چلایا اور ہندوستانی مجسٹریٹ نے اسے اپنے اختیارات سے تجاوز کرنے کے جرم میں سزا بھی دیدی ۔ اس فیصلہ کے خلاف سارجنٹ نے ہائی کورٹ میں اپیل دائر کردی ۔ چونکہ یہ سوال نسلی اور قومی بن گیا تھا اس لئے اس وقت کے چیف جسٹس (سرہنری مارٹن) نے اس مقدمہ کو اپنے فائل پر لے لیا اور سماعت کے بعد ملزم کو بری کردیا ۔ اس شدید بے انصافی پر سارے شہر میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی ۔ ہارنیمین اس کھلی بے انصافی اور نسلی امتیاز کے اس بھونڈے مظاہرہ پر بیحد چراغ پا ہوئے اور انہوں نے بار کونسل کو مشورہ دیا کہ "چونکہ یہ چیف جسٹس عنقریب ریٹایر ہورہا ہے ، لہذا اسے کوئی الوادعی ایڈریس نہ دیا جائے ۔ اسے یہاں سے اس طرح سے جانا چاہئے کہ اس کی نہ فاتحہ ہو نہ درود ۔" چنانچہ جب وہ رخصت ہوا توجہاز پر صرف حکومت کے آدمی تھے ۔

بیالیس سال پہلے بمبئی میں چرچ گیٹ اسٹیشن کے قریب ایک تیرنے کا تالاب تھا جو صرف یورپینوں کے لئے مخصوص تھا ۔ اس کے دروازہ پر جو بورڈ آویزاں تھا اس پر یہ الفاظ درج تھے :- "کتوں اور ہندوستانیوں کو داخلہ کی اجازت نہیں ہے ۔" خدا جانے یہ بورڈ کب سے لگا ہوا تھا ، لیکن ہارنیمین کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے ایک زوردار آرٹیکل میں ہندوستانی اداروں کو مشورہ دیا کہ وہ بھی اپنے دروازوں پر

ذیل کا نوٹس لگادیں ''کتوں اور یورپینوں کو داخلہ کی اجازت نہیں ھے۔'' مضمون کا نکلنا تھا کہ حکومت بمبئی نے اپنے حکم سے بورڈ کو ھٹوادیا۔

ایک مرتبہ میں نے ان کی دعوت کی۔ ھر چند میں نے باورچی کو منع کردیا تھا کہ وہ لال مرچوں کا مطلق استعمال نہ کرے، مگر اس نے مزے کی خاطر تھوڑی بہت ڈال ھی دیں جس کا خمیازہ انہیں کئی دن تک بھگتنا پڑا۔ اس واقعہ کے بعد دوران ملاقات میں انہوں نے شکایتاً کہا کہ '' مرچوں کی وجہ سے مجھے چند دن تک بہت تکلیف رھی۔'' میں نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ '' باورچی نے میری صریح ھدایات کے خلاف لال مرچیں ڈال دی ہونگی۔ بہرحال آیندہ ایسا نہ ھوگا۔'' کہنے لگے کہ ''اب تمہارے یہاں کھاتے ہوئے ڈر معلوم ھوتا ھے۔'' کھانے کے بعد میں نے بہت سے سگار پیش کئے جس سے وہ بیحد خوش ہوئے۔

ھارنیمین انتہائی خلیق، ملنسار، خوش مزاج اور شریف انسان تھے۔ جب ۷ سال کی جبریہ جلاوطنی کے بعد وہ اچانک بمبئی میں نازل ھوگئے تو جہاں وہ اپنے دوستوں سے ملنے کے لئے گئے وہاں اپنے ملازم کے گھر بھی پہنچے۔ اس ایک واقعہ سے ان کی بلند سیرت کا اندازہ کیا جاسکتا ھے۔

وہ انگریز تھے لیکن آزادیٔ وطن کی ھر ھندوستانی تحریک میں پیش پیش رھے۔ اس سلسلہ میں ان کا نام ھیوم، مسز بیسنٹ، پولک، پیئرسن، ویڈر برن، ایرنڈیل اور اینڈریوز کے ساتھ لیا جاسکتا ھے جو بدیشی ہونے کے باوجود ھندوستان کی خدمت میں اپنی زندگی کے آخری لمحہ تک مصروف رھے۔ شیکسپیئر نے سیزر کے متعلق لکھا ھے :- ''اس کی زندگی بڑی شریفانہ تھی اور اس کی ذات میں عناصر کا امتزاج اس طرح سے کیا گیا تھا کہ قدرت کھڑے ھوکر یہ کہہ سکتی تھی کہ یہ آدمی ھے۔''

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ھارنیمین ایسا ھی آدمی تھا۔

دوستوں میں بیٹھ کر وہ دلچسپ لطیفے سنایا کرتے تھے۔ ایک لطیفہ ملاحظہ ھو:۔ ”کلکتہ میں ایک اینگلو انڈین ٹریم میں بیٹھا جارھا تھا۔ اس کے برابر کی نشست خالی تھی جس پر ایک بنگالی بابو جو میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس تھا، آکر بیٹھ گیا۔ اینگلو انڈین کو یہ بات سخت ناگوار گزری اور اس نے بابو سے کہا کہ ”کہیں اور جا کر بیٹھ جاؤ۔“ بابو نے کہا کہ ”میں دوسری جگہ کیوں جا کر بیٹھوں؟ تم خود کیوں نہیں چلے جاتے؟“ پیچھے کی نشست پر کوئی یوروپین بیٹھا ھوا تھا۔ اسے دیکھکر اینگلو انڈین نے کہا: ”یہ کالے آدمی صحیح طریقہ سے ھماری عزت نہیں کرسکتے۔“ اس پر بابو اور بھی چراغ پا ھوا اور قریب تھا کہ ھاتھا پائی کی نوبت آئے کہ اتنے میں یوروپین نے بابو سے کہا: ”بابو! تم میرے پاس آکر بیٹھ جاؤ اور اس کی بات کا برا نہ مانو۔ خدا نے تمہیں پیدا کیا ھے اور خدا نے مجھے بھی پیدا کیا ھے، لیکن ھم دونوں نے مل کر اسے پیدا کیا ھے اور یہی وجہ ھے کہ اس میں اس قدر اکڑفوں آگئی ھے۔“

ھارنیمین ”ٹائمز آف انڈیا“ کی انگریزی کا خوب مذاق آڑایا کرتے تھے۔ ایک موقع پر انہوں نے لکھا:۔

"The Old Dame of Bori Bunder has come with Babu Piche Lal's English in its leading article and we are sure it is not the Printer's Devil."

اس زمانہ میں ٹائمز کے ایڈیٹر شیپرڈ تھے۔

حکومت ھارنیمین سے بیحد خائف رھا کرتی تھی۔ وہ حکومت کی کسی تقریب میں کبھی شریک نہیں ھوئے اور نہ انہوں نے کبھی گورنمنٹ ھاؤس کا طواف ھی کیا حالانکہ لیڈی ولنگڈن بہت چاھتی تھیں کہ وہ آیا کریں۔ ھندوستان سے جو محبت انہیں تھی اس کی وجہ سے بمبئی کے مقیم انگریزوں نے ان کا

سوشل مقاطعہ کر رکھا تھا -

مجھے تفصیلات یاد نہیں رہیں لیکن کسی اہم معاملہ میں کانگریس کے مرد آہنی سردار ولبھ بھائی پٹیل سے ہارنیمین کا کچھ اختلاف ہو گیا - اس کے بعد سے ہارنیمین نے ولبھ بھائی کے نام کے ساتھ ''سردار'' لکھنا بند کر دیا اور ہمیشہ ''مسٹر'' ہی لکھا - سردار کا لقب ولبھ بھائی پٹیل کو گاندھی جی نے باردولی کے کسانوں کی ستیہ گرہ کی کامیابی کے بعد دیا تھا - چونکہ پٹیل نہایت زبردست آدمی تھے اور کانگریس پر ان کا رعب بیٹھا ہوا تھا اس لئے ہارنیمین کا ان کے مقابلہ پر آنا جب کہ ایک کانگریسی اخبار کی ادارت ان کے سپرد تھی، کچھ کم ہمت کی بات نہ تھی -

ہارنمین پیدایشی جرنلسٹ تھے - ان کے بارے میں ایک قصہ مشہور ہے کہ جب وہ جان مارلے کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ ''مجھے اپنے اخبار میں سب ایڈیٹر بنالیجئے'' تو اس نے ان سے پوچھا کہ ''تمہیں کس قسم کے مضامین لکھنے کی مہارت ہے ؟'' انہوں نے کہا کہ ''میں گالیاں خوب دے سکتا ہوں -'' چنانچہ وہ سب ایڈیٹر کی حیثیت سے فوراً مقرر ہوگئے - ان کے وہ مضامین جن میں حکومت اور اس کے عمال پر تنقید کیجاتی تھی، ملک بھر میں شوق سے پڑھے جاتے تھے -

دنیائے صحافت میں ہارنیمین کی موت سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ غالباً کبھی پر نہ ہوگا - میرا اپنا تو یہ خیال ہے کہ پیشۂ صحافت سے شاید ہی ہارنیمین جیسا کوئی اور سر پھرا مجاھد اور مرد قلندر نکلے -

* * *

ڈاکٹر سیّد حسین

سید حسین اُن اشخاص میں سے ہیں جن سے میری ملاقات فروری ۱۹۱۸ میں بمبئی پہنچتے ہی ہو گئی تھی۔ اُس زمانہ میں وہ ''بمبئی کرانیکل'' کے سب ایڈیٹر تھے۔ تعارف سید عبداللہ بریلوی نے کرایا تھا اور پھر رفتہ رفتہ ہمارے تعلقات بہت صمیمانہ ہو گئے۔ کچھ عرصہ بعد پنڈت موتی لال نہرو نے انہیں الہ آباد بلوالیا تاکہ روزنامہ ''انڈی پنڈنٹ'' کی ادارت انہیں سونپیں۔

جب سید حسین بمبئی سے الہ آباد جارہے تھے تو اسٹیشن پر بہت سے دوست الوداع کہنے کے لئے موجود تھے۔ چلتے وقت اُنہوں نے جذباتی انداز میں یہ شعر پڑھا:۔

جاتے ہیں خدا حافظ پر اتنی گزارش ہے
جب یاد ہماری آئے ملنے کی دعا کرنا

اس کے بعد میری ملاقات اُس وقت ہوئی جب وہ برسوں کی ''جلاوطنی'' کے بعد یکایک پہلی مرتبہ امریکہ سے بمبئی وارد ہو گئے۔ اُس وقت انہوں نے کانگریس جناح ہال میں بھی ایک تقریر کی تھی جسے سننے کے لئے پنڈت نہرو کی بہن مسز ہتھی سنگھ بھی تشریف لائی تھیں۔ دوسری مرتبہ جب آئے اُس وقت متعدد ملاقاتیں رہیں۔ آخری ملاقات دہلی میں جولائی ۱۹۴۷ میں ہوئی جب کہ وہ مسز نائیڈو کو پہنچانے کے لئے ریلوے اسٹیشن گئے تھے۔ اس موقع پر مسز وجے لکشمی پنڈت، اُن کی صاحبزادی اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی سوجود تھے۔ مسز پنڈت کمپارٹمنٹ میں سید حسین سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں اور ان کی نوعمر صاحبزادی احتراماً ''ڈیڈی۔ ڈیڈی'' کہہکر

ان سے خطاب کر رہی تھیں۔

امریکہ سے پہلی دفعہ جب وہ آئے تو ہندوستان پہنچنے سے پہلے انہوں نے راستہ میں کہیں سے مولانا شوکت علی کو ایک خط میں اپنی آمد کی اطلاع دیدی تھی۔ اس خط کی سلاست مقتضی ہے کہ اسے بجنسہ درج کردیا جائے۔ وھو ھذا:۔

''مائی ڈیر شوکت۔ میں بالآخر ہندوستان کا عزم کر رہا ہوں۔ راستہ میں فلسطین آترا تھا۔ محمد علی کی قبر دیکھی: بیا بخاک من و آرمیدہ بنگر

سبحان اللہ! سید حسین''

۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی قیادت میں جو وفد انگلستان بھیجا گیا تھا اس کے باقی دو ممبر سید سلیمان ندوی اور سید حسین تھے۔ انگلستان پہنچنے پر بعض اخبارات اور جماعتوں نے وفد کے بعض اراکین کو طرح طرح سے بدنام کرنے کی کوشش کی۔ مثلاً مولانا محمد علی کے بارے میں دارالعوام میں پوچھا گیا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جو دوران جنگ میں اتحادیوں کے دشمن جرمنی سے خط و کتابت کیا کرتا تھا؟ وزیر ہند نے اس کا نفی میں جواب دیا اور کہا کہ مولانا محمد علی ''کامریڈ'' کے ایڈیٹر ہیں اور ان کے خلاف اس قسم کا کوئی الزام نہیں ہے۔ اسی طرح سید حسین کے متعلق لکھا گیا کہ کیا یہ وہی شخص ہے جس نے ایک ہندو عورت کو بھگایا تھا؟ مگر بھلا ہو مسز بیسنٹ کا جنہوں نے لندن سے ایک بیان جاری کیا جس میں کہا گیا تھا کہ ''ان دونوں میں باقاعدہ شادی ہوئی تھی۔ وہ شادی ہندو مسلم اتحاد کی نشانی تھی اور اخلاقی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی بات بھی قابل گرفت نہ تھی۔'' تب کہیں جاکر معترضین کا منہ بند ہوا۔ انگریزی اخبارات اور دوسرے مخالفین وفد کے ارکان کو اس لئے بدنام کر رہے تھے تاکہ اتحادی وزرا اور اکابر ان سے ملاقات کرنے سے انکار کردیں۔ یہ سب کچھ ترک

دشمنی کے جذبہ کے ماتحت کیا جارہا تھا۔

انگلستان میں وفد خلافت چند ماہ رہا۔ اس تمام عرصہ میں سید حسین نے انگلستان کی پبلک کے روبرو اپنا مقدمہ بہتر سے بہتر طریقہ پر پیش کیا۔ اُنہوں نے مضامین لکھے، پبلک پلیٹ فارموں سے تقریریں کیں، اتحادی اکابر سے ملاقاتیں کیں اور مطالبہ کیا کہ وہ مفتوح ترکوں سے شریفانہ برتاؤ کریں۔ فرانس میں جاکر اُنہوں نے ''اخوت، آزادی اور مساوات'' کی سرزمین میں ترکوں کی تائید میں خوب پروپیگنڈا کیا۔ اُنہوں نے فرانس کو اُس کے انقلاب کی روشن روایات یاد دلائیں اور کہا کہ ''اگر فرانس آج بھی ان روایات کا سچا علمبردار ہے تو اس کا فرض ہے کہ دنیائے اسلام کے ساتھ انصاف کرے۔''

قیام انگلستان کے دوران میں سید حسین نے جولائی ۱۹۲۰ کے ''فارین افیئرز'' (Foreign Affairs) میں ایک طویل اور مدلل مضمون لکھا جس کا عنوان تھا ''ترکی معاہدۂ صلح کا اثر مسلمانان ہندوستان پر۔''* اس مضمون میں برطانوی وزیر اعظم سے کہا گیا تھا کہ وہ اُن مواعید کو پورا کرے جو اُس نے دوران جنگ میں اتحادیوں کے نام سے ہندوستانی مسلمانوں سے ٹرکی اور مقامات مقدسۂ اسلام کے بارے میں کئے تھے اور آخر میں دھمکی دی گئی تھی کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو انگلستان کو ۷ کروڑ مسلمانوں کی وفاداری سے ہاتھ دھولینا پڑیگا۔ وفد چند مہینے تک اتحادی زعما سے ملتا رہا اور اپنے دلائل سے انہیں اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کرتا رہا۔ مگر ساری فضا ترکوں کے اس قدر خلاف تھی کہ خدا کی پناہ۔ چنانچہ وفد نے بالآخر طے کیا کہ ہندوستان لوٹنے کے بعد وہاں باقاعدہ ایجی ٹیشن

---

* پورا عنوان یہ ہے: "The Relations of Great Britain with the Muslims of India as they are affected by the Turkish Treaty."

شروع کیا جائے۔ انگلستان ، فرانس اور اٹلی میں جدوجہد کرنے کے بعد وفد ہندوستان واپس آگیا ، مگر سید حسین پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق سیدھے امریکہ چلے گئے جہاں آنہوں نے امریکی شہریت اختیار کرلی اور پھر وہ وہیں کے ہو رہے۔

امریکہ میں جب تک رہے وہ متحدہ ہندوستان کے غیر سرکاری سفیر کی حیثیت سے کام کرتے رہے ۔ دوران قیام میں آنہوں نے تحریر و تقریر سے اپنے وطن کی ٹھوس خدمات انجام دیں ۔ چونکہ وہ بہترین مقرر تھے اس لئے ان کی تقریریں بڑی توجہ اور شوق سے سنی جاتی تھیں۔ امریکہ کا کوئی بڑا شہر ایسا نہ ہوگا جہاں آنہوں نے اپنی تقریروں کے ذریعہ اعلائے کلمہ الحق نہ کیا ہو ۔ ان کا شمار دنیا کے فصیح ترین مقرروں میں تھا ۔ وہ انگریزی بالکل انگریزوں کی طرح بولتے تھے ۔ انگریزی انشا پردازی میں ان کا وہی مقام ھے جو آردو میں مولانا ابوالکلام آزاد کو حاصل ھے ۔ امریکہ میں رہ کر آنہوں نے مختلف طریقوں سے آردو کی بھی بہت خدمت کی تھی۔

ان کی تحریریں انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہوا کرتی تھیں۔ جس زمانہ میں وہ اسکول میں تھے آنہوں نے ایک ایسا اعلیٰ درجہ کا مضمون (Essay) لکھا تھا کہ ان کے انگریز پرنسپل نے اپنے ایک آرٹیکل میں اسے نہ صرف تمام و کمال شائع کیا بلکہ یہ بھی لکھا کہ مجھے اپنے اس شاگرد پر ہمیشہ فخر رھیگا۔ مضمون میں آنہوں نے اتنے مصادر استعمال کئے تھے کہ آج کل کا ایم ۔ اے کا طالب علم بھی ان میں سے بہت سوں سے نا بلد ہوگا ۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ بہت وسیع تھا ۔ حقیقت یہ ھے کہ انہیں انگریزی پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی ۔ یہ عطیۂ خداوندی تھا۔

سید حسین تقسیم ملک کے حق میں نہ تھے ۔ آنہوں نے مختلف اخباروں میں اپنے نظریہ کی تائید میں مضامین لکھے اور

دھلی سے بعض مضامین کے تراشے مجھے بھی بمبئی بھیجے۔ وہ جناح کے ابتدائی دوستوں میں تھے اور باوجود اصولی اختلاف کے وہ ان کا ذکر انتہائی احترام سے کیا کرتے تھے۔

جولائی ۱۹۴۷ میں دھلی میں مسز نائیڈو کے مکان پر ایک پکنک پارٹی منعقد ھوئی۔ پر انٹھے میری طرف سے تھے اور باقی چیزیں مختلف دوستوں کی طرف سے لائی گئی تھی۔ اس دعوت میں سیلا کمپنی کے ڈاکٹر حمید، عثمان سوبانی، ڈاکٹر سید حسین اور دو ایک اور دوست شریک تھے۔ انہی دنوں میں نے ایک سہ پہر کو حالی پبلشنگ ھاؤس، آردو بازار، میں ان کے اعزاز میں آئس کریم پارٹی ترتیب دی جس میں بہت سے اصحاب مدعو تھے۔ اس موقع پر آنہوں نے میرے بھتیجے علاءالدین خالد کو کتابوں کی طباعت وغیرہ کے سلسلہ میں چند مفید مشورے بھی دئے۔ پارٹی کے اختتام پر ان کی خدمت میں حالی پبلشنگ ھاؤس کی مطبوعات پیش کی گئیں مگر آنہوں نے انہیں قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور جب زیادہ اصرار کیا گیا تو صرف ایک کتاب قبول کرلی اور فرمایا کہ ”میں پھر کسی دن آؤنگا اور اپنی پسند کی کتابیں خریدونگا۔“ جب وہ نیچے آترے تو انہیں دیکھنے کے لئے ایک جم غفیر جمع تھا۔ ان کی شخصیت ایسی دلآویز اور جاذب نظر تھی کہ لوگ انہیں دیکھنے کے لئے چلتے چلتے رک جاتے تھے۔

۱۹۴۷ کے زھرہ گداز ایام میں جب کہ دلی کے بے گناہ مسلمان بے دریغ قتل کئے جارہے تھے اور ان پر ھر ممکن طریقہ سے عرصۂ حیات تنگ کیا جا رھا تھا، میرے دوسرے بھتیجے صلاح الدین نے کراچی سے میرے تعلق سے انہیں تار بھیجا اور ان سے درخواست کی کہ وہ از راہ کرم محلہ مفتی والاں میں جائیں اور ان کے بال بچوں کی خیریت سے انہیں مطلع کریں۔ وہ غریب وھاں گئے اور دریافت حال کے بعد انہیں تار دیا کہ

سب بخیریت ھیں۔ ان کا یہ احسان میں تا زندگی نہ بھولونگا۔ خدا ھی جانتا ھے کہ وہ کن مشکلات میں سے ھو کر وھاں پہنچے ھونگے۔ اُن دنوں وہ اسپیریل ھوٹل میں مقیم تھے۔

سید حسین ایک معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے اور بہت ھی شریف اور قابل احترام ھستی تھے۔ اپنے آخری ایام میں وہ روحانیت کا پیکر بن کر رہ گئے تھے۔ وہ بہت خوش پوش، نہایت وجیہ اور خوبصورت انسان تھے۔ ان کا انداز تکلم بھی انتہائی دلآویز تھا۔ وہ بالعموم انگریزی لباس زیب تن کرتے تھے۔

جب کبھی پاک و ھند کی صحافت کی تاریخ لکھی جائیگی اس میں سیدحسین کا نام نامی جلی حروف سے لکھا جائیگا۔ جو چند سال انہوں نے ''بمبئی کرانیکل'' میں صرف کئے یا جو زمانہ اُنہوں نے ''انڈی پنڈنٹ'' میں گزارا وہ ان کی غیر معمولی قابلیت اور اعلیٰ صیانت اور مجاھدانہ اسپرٹ کو زندہ رکھنے کے لئے کافی ھے۔ ''انڈی پنڈنٹ'' میں اُنہوں نے ایک مرتبہ نہایت زوردار اداریہ لکھا تھا جس کا عنوان تھا : ''سی۔ایم۔جی۔'' یعنی (Chelmsford Must Go) ۔ چیمسفورڈ ۱۹۱٦ سے ۱۹۲۱ تک ھندوستان کا وایسرائے رھا۔ امرتسر کا خونی واقعہ اور مارشل لا کی تباہ کاریاں اسی کے منحوس عہد کی یادگار ھیں۔ اس مضمون سے متاثر ھو کر الہ آباد کے مشہور اخبار ''لیڈر'' کے فاضل ایڈیٹر سی۔ وائی۔ چنتامنی نے لکھا تھا :- That young politician who has risen to fame within two years. چنتامنی اُن کی سیاست دانی، حب الوطنی، انگریزی قابلیت اور سلجھے ھوئے خیالات کے بیحد دلدادہ تھے۔

ان کی سی قابلیت کے آدمی کبھی کبھار دنیا میں آتے ھیں۔ مبدع فیاض نے جو غیر معمولی صلاحیتیں ان کی ذات واحد میں جمع کردی تھیں وہ اجتماعی طور پر سیکڑوں اشخاص میں بھی نہیں پائی جاتیں۔

ڈاکٹر عمر محمد داؤد پوتا

عمر بن محمد داؤد پوتا سے میری پہلی ملاقات اس وقت ہوئی جب کہ وہ ۱۹۲۸ میں اسمعیل کالج (اندھیری ، بمبئی) میں عربی کے پروفیسر مقرر ہو کر آئے۔ اس وقت سے لیکر ان کی تاریخ وفات (۲۳ نومبر ۱۹۵۸) تک سرے ان کے گہرے دوستانہ روابط رہے۔

نومبر ۱۹۴۷ میں پاکستان پہنچانے کے بعد جب میں کراچی پہنچا تو سب سے پہلے میں ان سے جا کر ملا۔ جس محبت ، گرمجوشی اور اخلاص سے انہوں نے میری پذیرائی کی اس کی یاد آج بھی دماغ میں محفوظ ہے۔ ان دنوں وہ سندھ کے محکمۂ تعلیم کے ڈائرکٹر تھے۔ کچھ دنوں بعد انہوں نے اپنی کتاب ''آغاز فارسی'' کا مجھے پبلشر بنادیا۔

داؤد پوتا ہر لحاظ سے سیلف میڈ آدمی تھے۔ ان کی ابتدائی زندگی عسرت میں گزری ، لیکن محنت اور کارکردگی کے بیشمار ہفتخوان طے کرنے کے بعد وہ اعلیٰ مدارج پر فائز ہوئے۔ سب سے پہلے وہ ڈی۔ جے۔ سندھ کالج میں عربی اور سندھی کے پروفیسر مقرر ہوئے ، اس کے بعد اپنی مادرِ علمی سندھ مدرسہ الاسلام کے پرنسپل بنے ، وہاں سے وہ بمبئی چلے گئے اور کئی سال تک اسمعیل کالج میں عربی کے پروفیسر رہے۔ جب سندھ کا صوبہ الگ ہو گیا تو وہ اس کے محکمۂ تعلیمات کے ڈائرکٹر بنا دئے گئے۔ کئی سال تک اس حیثیت سے کام کرنے کے بعد انہیں پبلک سروس کمیشن کا ممبر مقرر کر دیا گیا۔ مگر ان کی عظمت ان بڑے عہدوں پر مبنی نہیں ہے بلکہ وہ ان کی ٹھوس علمی خدمات میں مضمر ہے جنہوں نے انہیں زندگی میں بڑا بنایا

اور جو مرنے کے بعد بھی ان کے نام کو زندہ رکھینگی۔

۱۹۲۴ میں وہ حکومت ہند کے وظیفہ سے کیمبرج بھیجے گئے جہاں انہیں بڑے بڑے مستشرقین اور فضلا کی صحبت میسر آئی۔ آنہوں نے پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے جو مقالہ لکھا اُس کا عنوان تھا :۔ Influence of Arabic Poetry on the Development of Persian Poetry. ۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد ھے۔ بالآخر وہ ۱۹۳۴ میں طبع ھوئی۔ آکسفورڈ کے ڈاکٹر ڈیوھرسٹ (Dr. Dewhurst) نے رائل سوسائیٹی آف گریٹ برٹن کے جرنل میں اس پر تبصرہ کرتے ھوئے لکھا تھا :۔ "I have rarely come across an Indian student who could write such pure, chaste & idiomatic English."

آنہوں نے اپنے اُستاد پروفیسر ایچ۔ ایم۔ گوربخشانی کے اشتراک سے شاہ لطیف کے ''شاہ جو رسالو'' کی چاروں جلدوں کو مرتب کیا۔ آنہوں نے ''تاریخ معصوی''، ''تحفۃ الکرام'' اور ''چچ نامہ'' کو ایڈٹ کیا اور ان پر توضیحی نوٹ تحریر کئے۔ بمبئی کی اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن کی درخواست پر آنہوں نے ''مقدمۂ ابن خلدون'' کے ترجمہ کے اھم کام کی ذمہ داری قبول کی۔ یہ کام ایک تہائی کے قریب مکمل ھوچکا ھے۔ پاکستان بنجانے کے بعد آنہوں نے اپنی مادری زبان سندھی کے فروغ کے لئے بہت کچھ کیا۔ انہوں نے اس کام کے لئے سابقہ سندھ گورنمنٹ سے لڑجھگڑ کر ایک لاکھ روپے کی گرانٹ حاصل کی۔ آنہوں نے سندھ ادبی بورڈ اورسندھ ھسٹاریکل سوسائیٹی کی بھی بنیاد ڈالی تاکہ یہ دونوں ادارے اس صوبہ کی کلچر، زبان، تاریخ اور ادب کی بقا کے لئے کام کریں۔ وفات سے قبل وہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کے اشتراک سے سندھی زبان کی مبسوط ڈکشنری تیار کر رھے تھے۔ ۱۹۴۱ میں انہیں شمس العلما کا

خطاب ملا ۔ وہ فواد انسٹی ٹیوٹ (مصر) کے بھی ممبر تھے۔ غالباً وہ پہلے پاکستانی ھیں جو اس اعزاز سے نوازے گئے ۔

ان کی تعلیمی زندگی نہایت شاندار تھی ۔ وہ میٹرک تک ہر جماعت میں اول آئے ۔ اسکول اور کالج کی تعلیم کے دوران میں انہوں نے متعدد سرکاری اور غیر سرکاری وظایف حاصل کئے ۔ انٹر میڈی ایٹ کے امتحان میں وہ اول نمبر پر نہ آسکے اس لئے کہ وہ سخت بیمار ہو گئے تھے ، مگر بی ۔ اے کا امتحان انہوں نے امتیاز کے ساتھ پاس کیا اور صوبہ بھر میں اول آئے ۔ ایم ۔ اے کے امتحان میں بھی وہ یونیورسٹی بھر میں اول آئے اور "چانسلرز میڈل" کے حقدار ٹھہرے جو بجائے خود بہت بڑا اعزاز ھے ۔ وہ پہلے سندھی مسلمان تھے جنہیں یہ اعزاز ملا ۔ ان کے بعد پھر کسی سندھی کو یہ عزت نصیب نہ ہوئی ۔

داؤد پوتا بہت پاکیزہ سیرت کے مالک تھے ۔ ان میں جو انکسار میں نے دیکھا وہ ان کی عظمت کا شاھد تھا :۔

نہد شاخ پر میوہ سر بر زمیں

چونکہ انہوں نے خود اپنی زندگی کا ابتدائی حصہ عسرت میں کاٹا تھا اس لئے وہ ساری عمر ایسے ہونہار نوجوانوں کی امداد کرتے رہے جو اپنے محدود ذرائع کی وجہ سے آگے بڑھنے سے معذور تھے ۔ پاکستان بنجانے کے بعد انہوں نے مہاجرین کو محکمۂ تعلیم میں کھپانے کی پوری پوری سعی کی ۔ انہوں نے حکومت کی اجازت کے بغیر سندھ میں ہر سندھی طالب علم کے لئے اردو پڑھنا لازمی قرار دیدیا تھا ۔ یہ ان کا بہت بڑا کارنامہ ھے ۔

وہ بہت با اخلاق آدمی تھے اور ہر کہ و مہ سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے ۔ ان میں نام کو اکڑ نہ تھی ۔ دوسروں کے کام آنا ان کی زندگی کا مقصد عظیم تھا ۔ ساری عمر علمی مشاغل ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا رہے ۔ دنیا کے بعض مشہور مستشرقین سے ان کے گہرے روابط تھے ۔

ان کی سیرت کی پاکیزگی ملنے والوں پر اثر کئے بغیر نہ رهتی۔ وہ اپنی علمی فضیلت اور بلند سیرت کی وجہ سے ہر جگہ عزت و احترام سے دیکھے جاتے تھے اور آج بھی مرے پیچھے وہ اسی احترام سے یاد کئے جاتے ھیں۔ وہ جہاں جہاں رہے، انتہائی نیکنامی کے ساتھ رہے حالانکہ وہ اس دور سے بھی گزر چکے تھے جسے ''سیاست دانوں کا عہد'' کہا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے اپنی علمی خدمات سے نہ صرف سندھ کا نام اونچا کیا بلکہ سارے پاکستان کا نام بلند کر دیا۔ اس وضع کے فاضل اشخاص کہیں قرنوں میں جا کر پیدا ہوتے ھیں۔

انہیں ساری عمر عربی، فارسی اور اردو سے غیر معمولی شغف رھا۔ ان کی خواهش تھی کہ پاکستان میں عربی کو بہت اونچا مقام حاصل ھونا چاھئے تاکہ دوسرے اسلامی ممالک سے قریبی رابطہ قائم ھوسکے۔ پاکستان بنجانے کے بعد انہوں نے شاہ لطیف کے بارے میں اردو میں ریڈیو پاکستان سے متعدد تقریریں کیں۔ وہ اپنی تقریریں نظر ثانی کے لئے میرے پاس بھیجدیا کرتے تھے۔ یہ میری عزت افزائی تھی اور میں اس پر جتنا فخر کروں کم ہے۔

ان کی ذاتی لائبریری ہزاروں قیمتی کتابوں پر مشتمل تھی۔ ان میں سے بعض نایاب ھیں۔ وہ اپنی تنخواہ کا ایک مخصوص حصہ ہر مہینے کتابوں کی خریداری پر صرف کرتے تھے۔ ان کے پاس حوالہ کی کتابیں جتنی تھیں اتنی شاید یہاں بڑی سے بڑی لائبریری میں بھی موجود نہ ھوں۔ ان کا خط بہت منشیانہ تھا۔

انہیں سندھ کے مشہور صوفی اور شاعر شاہ لطیف سے جو محبت تھی اسی کا نتیجہ تھا کہ وفات کے بعد انہیں ان کے مزار کے پاک ماحول میں جگہ ملی۔ یہ خدا کی دین ہے۔ ان کی دلی تمنا یہ تھی کہ انہیں ان کے مزار کا قرب نصیب ھو۔ راقم الحروف کو پچھلے سال ان کی قبر پر فاتحہ خوانی کی سعادت حاصل ھوچکی ہے۔ اس وقت میں ان کی قبر کے روحانی ماحول سے بیحد متاثر ھوا۔

سر ابراہیم ہارون جعفر

سر ابراھیم پونا کے رھنے والے تھے اور ایک مشہور میمن خاندان کے چشم و چراغ تھے ۔ ایسٹ اسٹریٹ میں ان کی وسیع تجارتی کوٹھی تھی ۔ وہ حکومت کے کنٹراکٹر بھی تھے ۔ برسوں تک صوبائی کونسل کے ممبر رہے ، پھر مرکزی اسمبلی کے ممبر بنے اور بعد کو کونسل آف اسٹیٹ کے ممبر منتخب ہو گئے ۔ بمبئی کی صوبائی حکومت اور دھلی کی مرکزی حکومت دونوں میں انہیں غیر معمولی رسوخ حاصل تھا ۔

اپنی زندگی میں انہوں نے اپنے اثرات سے کام لیکر سیکڑوں مسلمانوں کو سرکاری اور نیم سرکاری ملازمتیں دلوائی ہونگی ۔ پونا اور بمبئی کے متعدد مسلمان انہی کی سفارش سے آونچے عہدوں پر فائز ہوئے ۔ جہاں تک مجھے معلوم ھے ان کی سفارش کبھی رائیگاں نہیں گئی ۔ یہ آن دنوں کے قصے ھیں جبکہ ملک میں پبلک سروس کمیشن قائم نہیں ہوئے تھے ۔

۱۹۱۲ میں انہوں نے آردو کا ایک ھفتہ وار اخبار نکالا جس کا نام تھا ”مسلم ۔“ سر آغا خان نے اس کے لئے ۲۵ ھزار روپے کا عطیہ دیا تھا ۔ پونا کی آب و ھوا آردو اخبارات کے لئے کبھی راس نہیں آئی ، اور یہی وجہ ھے کہ وھاں سے کبھی بھی آردو کا کوئی اخبار یا رسالہ جم کر نہ نکل سکا ۔ چنانچہ یہ اخبار چند مہینے زندہ رہنے کے بعد بند ہو گیا ۔ اس اخبار کا مقصد وحید یہ تھا کہ دکنی مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت اور ترویج کی جائے ۔

سر ابراھیم نے صوبہ کے مسلمانوں میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کی غرض سے اس صدی کے شروع میں پونا میں بمبئی پراونشل مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی اور اسے علیگڈھ کی آل

انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتھ ملحق کرادیا ۔ اس کانفرنس کے اجلاس میں بڑے بڑے ماہرین تعلیم اور عمال حکومت شرکت کیا کرتے تھے ۔ سر ابراھیم میں ایک خاص وصف یہ تھا کہ وہ ہرسال صدارت کے لئے موزوں ترین آدمی کا انتخاب کرتے تھے ۔ سر اکبر حیدری ، سر علی محمد خاں دھلوی ، ڈاکٹر سر ضیاءالدین احمد ، مولوی حبیب الرحمن خان شیروانی ، سر غلام حسین ہدایت اللہ ، سر ابراھیم رحمت اللہ وغیرہ مختلف سالانہ جلسوں کی صدارت کرچکے ھیں۔ کانفرنس کے اجلاس میں تقریریں کرنے کے لئے دور دور سے ماھرین تعلیم اور مقررین بلائے جاتے تھے ۔ پروفیسر ھادی حسن ، سر سرینواس شاستری ، ڈاکٹر ذاکر حسین ، مسز سروجنی نائیڈو اور بہت سے دیگر اکابر کانفرنس کے پلیٹ فارم سے تقریریں کرچکے ھیں ۔ گورنر وقت اور حکومت بمبئی کے وزرا اور دیگر عمال بھی اپنی موجودگی سے سالانہ جلسوں کی زینت بڑھاتے تھے ۔ راقم الحروف خوش نصیب ھے کہ اسے اس کانفرنس کے متعدد جلسوں میں عملی طور پر شریک ہونے کی عزت حاصل رہ چکی ھے ۔

اسی کانفرنس کے پیہم مطالبہ پر حکومت بمبئی نے محکمۂ تعلیم میں ایک مسلم (سید نوراللہ) کو اسسٹنٹ ڈائرکٹر کی حیثیت سے مقرر کیا تھا ۔ عام اجلاس کے بعد تعلیمی نمایش بھی ھوتی تھی اور مشاعرہ بھی ۔ یہ نمایشیں اور مشاعرے بہت مقبول تھے اور پونا میں ان کی وجہ سے خاصی گھما گھمی رھا کرتی تھی ۔

جن دنوں سر ابراھیم بمبئی اسمبلی کے ممبر تھے انھوں نے حکومت کے مسلم ملازمین کے لئے جمعہ کی نماز کے لئے ۱۹۱۳ میں دو گھنٹے کی چھٹی منظور کرائی ، اس شرط کے ساتھ کہ بشرط ضرورت وہ دفتر کے اوقات کے بعد بیٹھکر اپنا مفوضہ کام پورا کرلیا کرینگے ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ھے کہ سب سے پہلے علامہ شبلی نے تعطیل جمعہ کی تحریک اٹھائی اور پھر اسے

مختلف اصحاب کی وساطت سے صوبائی کونسلوں اور مرکزی اسمبلی میں پیش کرایا ۔ چنانچہ حکومت بنگال نے مارچ ۱۹۱۳ میں سر عبدالحلیم غزنوی کی تحریک پر دو گھنٹے کی چھٹی منظور کی ۔ بمبئی کی صوبائی مجلس میں سر ابراہیم نے تحریک اٹھائی اور حکومت نے اسے بغیر کسی مخالفت کے منظور کرلیا ۔ اس کے بعد حکومت نے ایک قرارداد (جی ۔ آر) شائع کی جس میں اس رعایت کی وضاحت کی گئی تھی ۔

صوبۂ بمبئی کے شہر احمد نگر میں بہت سی قدیم شاہی مساجد ایسی تھیں جن پر حکومت بمبئی نے غاصبانہ قبضہ کر رکھا تھا اور وہاں اپنے دفاتر قائم کرلئے تھے ۔ سر ابراہیم نے اس غاصبانہ قبضہ کے خلاف سب سے پہلے اپنی آواز بلند کی اور زور دے دے کر بہت سی مساجد کو رفتہ رفتہ مسلمانوں کے حق میں واگزار کرایا ۔ جو مساجد اس وقت واگزار نہ ہوئی تھیں ۔ وہ پہلی کانگریسی حکومت کے زمانہ میں واگزار ہو گئیں ۔

اسپیریل کونسل کی ممبری کے زمانہ میں سر ابراہیم نے کچھی میمنوں کے لئے نہایت مفید قانون منظور کرایا جس کا مقصد یہ تھا کہ ترکہ کے معاملہ میں کچھی میمنوں پر رسم و رواج کی بجائے اسلامی قانون کا اطلاق ہوا کرے ۔ اس سلسلہ میں انہوں نے سخت دوڑ دھوپ بھی تھی اور زمین ہموار کرنے کے لئے گجرات ، کاٹھیاواڑ وغیرہ کے دورے بھی کئے تھے ۔ اس کارنامہ کو ان کی زندگی کا شاہکار سمجھنا چاہئے ۔ اسی طرح ان کی کوششوں سے حاجیوں کی متعدد شکایتیں رفع ہوئیں ۔ ان کی ایک معرکے کی تحریک یہ تھی کہ ڈاکخانوں میں جو مسلمان اپنا سرمایہ جمع کرتے ہیں اور پھر اس پر سود نہیں لیتے ، وہ سود عیسائی اداروں کو نہ دیا جائے (جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا تھا) بلکہ اسے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی پر صرف کیا جائے ۔ یہ رقم لاکھوں تک پہنچتی تھی مگر سر ابراہیم کی دور رس نگاہوں نے

اسے ہمیشہ کے لئے مسلمانوں کے حق میں محفوظ کرالیا۔

سر ابراہیم نے پونا میں ایک پرائمری اسکول بھی قائم کیا تھا جو ان کے تعمیر کردہ ہارون ہال میں واقع تھا۔ یہ ہال انہوں نے اپنے والد مرحوم کی یادگار میں تعمیر کرایا تھا۔ صوبائی ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے اسی خوبصورت ہال میں منعقد ہوا کرتے تھے۔

۱۸۹۸ میں جب پونا اور ملحقہ مقامات میں طاعون کی وبا پھوٹی تو اس وقت سر ابراہیم نے مسلم پردہ والی خواتین کے لئے پلیگ ہاسپٹل میں علیحدہ وارڈ کے قیام کی تحریک کی جسے حکومت نے منظور کرلیا۔ علیحدہ وارڈ ہوجانے سے مسلم خواتین کو بہت آرام پہنچا۔

سر ابراہیم کی تعلیمی خدمات کے پیش نظر ۱۹۲۰ میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ امراؤتی (صوبجات متوسطہ) کی صدارت انہیں پیش کی گئی تاکہ ساری قوم ان کے مفید مشوروں سے مستفید ہوسکے۔ اس موقع پر جو خطبۂ صدارت انہوں نے پڑھا، وہ پر مغز ہونے کے علاوہ متعدد عملی تجاویز پر مشتمل تھا۔ ندوۃالعلما کے ایک سالانہ اجلاس کی صدارت بھی انہوں نے کی تھی۔

سر ابراہیم کا قاعدہ تھا کہ وہ عیدین پر اپنے احباب اور رفقائے کار کو لے کر مسلمان وزیروں اور بڑے بڑے مسلم افسروں کے یہاں مبارکباد دینے اور عید ملنے کے لئے پہنچتے تھے۔ یہ سماں دیکھنے کے قابل ہوتا تھا۔ ایسی ملاقاتوں سے ایک طرف مسلم عمال حکومت اور عوام میں باہمی رابطہ قائم ہوجاتا تھا اور دوسری طرف بہت سی کام کی باتیں بھی ہوجاتی تھیں۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر سر ابراہیم مسلمانوں کی شکایتیں بھی ان کے گوش گزار کردیا کرتے تھے تاکہ انہیں دور کیا جاسکے۔ مجھے ان کی یہ ادا بہت پسند تھی۔ میں بھی متعدد مرتبہ ان ملاقاتوں میں

شامل رہ چکا ہوں اور ان کی افادیت کا مشاہدہ اپنی آنکھوں سے کرچکا ہوں ۔

سر ابراھیم بڑے دوست پرور انسان تھے۔ اپنی ابتدائی عمر کے غریب دوستوں کو ھمیشہ یاد رکھتے تھے ۔ یہی وجہ ھے کہ ضرورت پڑنے پر متعدد وفادار دوست ان کا ھاتھ بٹانے کے لئے موجود رھتے تھے۔ وہ بیحد متواضع اور خلیق انسان تھے ۔ ان کی مہانداری کی شہرت دور دور تھی ۔ حقیقت یہ ھے کہ دوسروں کی خاطر تواضع کرنے میں وہ دلی مسرت محسوس کرتے تھے ۔

اس سلسلہ کی ایک اور خدمت کی طرف اشارہ کرنا ضروری ھے ۔ یہ بات سب کو معلوم ھے کہ آخری مغل شہنشاہ سراج الدین بہادر شاہ ظفر کی قبر نہایت خستہ حالت میں تھی ۔ جب سر ابراھیم رنگون گئے اور انہوں نے اپنی آنکھوں سے اس کی حالت زار کا مشاھدہ کیا تو ان کا حساس دل بہت متاثر ھوا اور انہوں نے تحریک اٹھائی کہ اس کا رکھ رکھاؤ حکومت ھند کا محکمۂ آثار قدیمہ اپنے ھاتھ میں لے لے ۔ چنانچہ حکومت نے اچھی خاصی بحث کے بعد اسے منظور کرلیا ۔ اسی طرح جب مسلمانوں میں شایان شان مقبرہ بنانے کی تحریک اٹھی تو اس موقع پر بھی انہوں نے حکومت سے کہکر اس مقصد کے لئے ایک قطعۂ اراضی دلوادیا ۔ ان کی تحریک سے پہلے مسلمانان ھند میں شاہ ظفر کے لئے کوئی خاص ولولہ موجود نہ تھا ۔

ان کا انتقال ۱۲ ستمبر ۱۹۳۵ کو پونا میں یکایک قلب کی حرکت بند ھوجانے سے ھوا ۔ ان کی وفات سے پونا سونا ھو گیا۔ ان کی تعلیمی خدمات کے پیش نظر لوگ انہیں ”دکن کا سرسید“ کہا کرتے تھے ۔ خدمت الناس کی جو لگن میں نے ان میں دیکھی وہ آپ اپنی مثال تھی۔

***

منشی محمد الدین

میں نے اپنے دادا کو نہیں دیکھا لیکن ان کا نام نظام الدین تھا اور وہ بہت اچھے عالم دین تھے ۔ ان کے چار بیٹے تھے ۔ میرے والد منشی محمدالدین منجھلے بیٹے تھے اور ان سے بڑے میرے تایا مولوی گنج بخش تھے ۔ یہ اپنے دور کے جید عالم تھے اور ان کی ساری عمر تعلیم و تعلم میں گزری ۔ اگرچہ انہوں نے جنڈیالہ (ضلع گوجرانوالہ) جیسے چھوٹے سے گاؤں میں اپنی پوری زندگی گزاردی مگر ان کا فیض دور دور تک جاری تھا ۔ میرے والد نے اردو ، عربی اور فارسی کی مروجہ گھریلو تعلیم پانے کے بعد جنڈیالہ کے میدان کو اپنے لئے ناکافی سمجھکر ملتان کا رخ کیا اور اس کے بعد دھلی کا ۔ یہ واقعہ کوئی ۷۵ سال پہلے کا ھے ۔ وھاں جا کر انہوں نے کتابت کا سلسلہ شروع کردیا ۔ پھر تو میرے والد دھلی کے اتنے گرویدہ ھوئے کہ وہ مولوی نذیر احمد کی طرح اپنے نام کے بعد ''ثم الدھلوی'' لکھنے میں دلی مسرت محسوس کرتے تھے ۔ ان کی کنیت ابو یوسف تھی ۔ یوسف میرے چھوٹے بھائی کا نام ھے جو مشہور خوشنویس ھیں ۔

دھلی پہنچتے ھی انہوں نے وھاں کے بڑے بڑے پریسوں سے اپنا تعلق پیدا کر لیا ۔ اس زمانہ میں انصاری پریس عربی فارسی اور اردو کی معیاری ادبی و مذھبی کتابیں شائع کرنے میں پیش پیش تھا ۔ یہ وھی پریس ھے جس سے ایک زمانہ میں مفتی کفایت اللہ ، مولوی محمد اور مولوی محمد رحیم بخش وابستہ تھے ۔ مولوی رحیم بخش اور مولوی محمد بعد کو مولوی نذیر احمد کے دست راست بنے ۔ ایک اور بڑا پریس مطبع مجتبائی تھا جس کے مالک خان بہادر مولوی عبدالاحد تھے ۔ اس پریس کا دھلی

میں وھی درجه تھا جو لکھنؤ میں نولکشور پریس کو حاصل تھا۔ ان چھاپه خانوں کے علاوہ چند اور نامی پریس بھی تھے جن سے میرے والد کے گہرے تعلقات تھے اور وھیں سے انہیں کام بھی ملتا تھا ۔ موخرالذکر میں افضل المطابع ، مطبع فاروقی اور میور پریس خصوصیت سے قابل ذکر ھیں۔ آخر میں دھلی پرنٹنگ پریس سے تعلقات قائم ھوگئے تھے۔ اس کے مالک لاله ٹھاکر داس والد کے بیحد قدردان تھے۔

میرے والد اس لحاظ سے انتہائی خوش قسمت تھے که انہیں مولوی نذیر احمد ، منشی سید احمد مولف 'فرھنگ آصفیه' ، مولوی ذکاء الله ، خواجه الطاف حسین حالی ، مفتی کفایت الله ، آغا شاعر قزلباش ، مولوی محمد حسین خاں عارف ، خواجه حسن نظامی اور دوسرے بڑے ادیبوں کی کتابیں لکھنے کو ملیں۔ میرے والد کا قاعدہ تھا که وہ پہلے تو مسودہ کا بغور مطالعه فرماتے اور پھر لکھنے بیٹھتے ۔ اس طریقه سے انہیں موقع ملتا تھا که وہ فاضل مصنفین کو بتاسکیں که فلاں فقرے کی بندش سست ھے یا فلاں لفظ کا استعمال صحیح نہیں ھے یا فلاں واقعه غلط طریقه سے پیش کیا گیا ھے ، وغیرہ وغیرہ ۔ خواجه حالی کو تو والد پر اس قدر اعتماد تھا که وہ ان کی ترمیم و تنسیخ کو بلا چون و چرا تسلیم کرلیتے تھے ۔ خواجه حسن نظامی اور ملا واحدی کے رساله "نظام المشائخ" کے ابتدائی دور کی کتابت بھی انھوں نے کئی برس تک کی ۔ سیکڑوں کتابوں کے "ٹائیٹل پیج" والد کے ھاتھ کے لکھے ھوئے ھیں ۔

چونکه والد خط نسخ اور خط نستعلیق دونوں میں مہارت تامه رکھتے تھے اس لئے جب کبھی کسی پریس یا مصنف کو اچھے خوشنویس کی ضرورت پڑتی تو وہ بالعموم انھی کی خدمات سے فائدہ اٹھاتا ۔ والد کے لکھے ھوئے قرآن اور پنجسورے آج بھی اچھے داموں پر فروخت ھوتے ھیں ۔ احادیث کی متعدد کتابیں

بھی ان کی کتابت کردہ ھیں۔

والد کے لکھنے کی ایک خوبی یہ تھی کہ ان سے کوئی لفظ چھٹنے نہ پاتا تھا اور نہ کوئی اور غلطی ہونے پاتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ھے کہ وہ سمجھکر لکھتے تھے اور دوسرے کاتبوں کی طرح مکھی پر مکھی نہیں مارتے تھے۔ انھوں نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ اندھا دھند صفحے کے صفحے بھرتے چلے جائیں۔ وہ لکھتے کم تھے مگر جتنا کچھ لکھتے تھے اُسے محنت اور یکسوئی کے ساتھ لکھتے تھے اور اکثر اوقات خود ھی تصحیح بھی کر لیتے تھے۔ اس کے باوجود وہ اتنا کما لیتے تھے کہ گھر کی جملہ ضروریات خوش اسلوبی سے پوری ہوجائیں۔ سوائے دو تین مواقع کے ہمارے گھر والوں کو کبھی مالی مشکلات سے دو چار ہونا نہیں پڑا۔

یوں تو والد نے متعدد کتابوں کی کتابت کی ھے، لیکن چند اہم کتابوں کے نام یہ ھیں:- دیوان حالی (پہلا ایڈیشن)، الحقوق و الفرائض (پہلا ایڈیشن)، ادعیہ القرآن، قرآن مجید (مترجمہ مولوی نذیر احمد)، حمائل شریف، رموز اعظم و اکمل، وغیرہ۔ عنایت اللہ مشرقی کا ''تذکرہ'' بھی والد ھی کا کتابت کردہ ھے۔ مشرقی صاحب نے انھیں پشاور بلوا لیا تھا۔ چند اور کتابوں کے نام یہ ھیں:- ''لکچروں کا مجموعہ'' (مصنفہ مولوی نذیر احمد)، ''لمعات نور''، ''ترجمان القرآن'' (پہلا حصہ مولفہ مولانا آزاد)، ''قصیدہ بردہ'' (مترجمہ مولوی محمد حسین خان عارف، جج ھائی کورٹ جموں و کشمیر)۔

والد کے زمانہ میں دھلی میں چند نامی خوشنویس اور بھی تھے، مثلاً محمد قاسم لدھیانوی، منشی ممتاز علی دھلوی، غلام رسول، حافظ امیرالدین پنجہ کش وغیرہ۔ ان سب حضرات سے والد کے گہرے مراسم تھے اور وہ ان کے فن کے انتہائی قدردان تھے۔ میں نے کبھی نہیں سنا کہ انھوں نے

ان حضرات کی خطاطی پر کبھی کوئی مخاصمانہ تنقید کی ہو۔ ویسے تو فارسی کی ضرب المثل ہے: ''بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن۔'' لیکن یہ جذبہ والد میں بالکل مفقود تھا۔ مجھے ان کی یہ ادا بیحد پسند تھی۔

دھلی کا کوئی قابل اور فاضل شخص مشکل سے ایسا ہوگا جس سے والد صاحب کے مراسم نہ ہوں۔ ان حضرات میں مولوی نذیر احمد محدث دھلوی، میر شاہ جہان، مولوی کراست اللہ، مولوی تلطف حسین، قاری محمد اسمعیل میرٹھی، خواجہ عبدالرحیم، نواب محمد حسن خان، مولوی عبدالمجید، نواب فیض احمد خاں، مولوی عبدالحق (صاحب تفسیر حقانی) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔ وہ ان کے یہاں جا کر بیٹھتے اور ان کی صحبت سے مستفید ہوتے تھے۔ اسی طرح مشکل سے دھلی کا کوئی تعلیم یافتہ شخص ایسا ہوگا جو والد کے نام سے ناآشنا ہو۔ ویسے ان کے خصوصی دوستوں اور ہم مشربوں کا حلقہ محدود تھا لیکن جو کچھ بھی تھا ستھرے اور باذوق اشخاص پر مشتمل تھا۔

والد کو جتنے مشاہیر قدردان میسر آئے، آتنے غالباً کسی اور خوشنویس کو میسر نہ آئے ہونگے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے شاعر اور بڑے بڑے ادیب ان کے قدردان تھے۔ غدر کے بعد دھلی میں قدیم شرفاء کے جو چند گھرانے باقی رہ گئے تھے، ان سے والد کے گہرے روابط تھے۔ چنانچہ حکیم محمد اجمل خاں، ننھے خاں، سائل، محمد الدین خلیقی وغیرہ ان کے فن سے استفادہ کرتے تھے۔ والد کے فن کی شہرت دور دور پھیلی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ افسرالملک حیدرآباد سے تشریف لائے۔ انہیں ایک دو لفظ لکھوانے تھے۔ وہ بہ نفس نفیس گھر پر والد سے ملنے کے لئے آئے اور اپنے سامنے وہ لفظ لکھوائے اور بطور اجرت ایک اشرفی عنایت کی، حالانکہ والد یہ کہتے رہ گئے کہ ''آپ جیسے معزز مہمان سے میں کچھ بھی لینا نہیں چاھتا۔ آپ کا اتنی دور

سے تشریف لانا ھی میری محنت کا کافی معاوضہ ھے ۔'' مگر افسر الملک نہ مانے۔

آج کل کے عام کاتبوں اور خوش نویسوں سے میرے والد بالکل مختلف تھے۔ یہ لوگ مزدوری کے لئے جس طرح لڑتے جھگڑتے ھیں، میں اسے فن کی توھین سمجھتا ھوں۔ والد اس بارے میں بیحد مستغنی اور قانع واقع ھوئے تھے۔ میں نے متعدد مرتبہ دیکھا ھے کہ وہ مقررہ اجرت سے بھی کم قبول کرلیتے تھے۔

والد اپنے عقائد میں بیحد سخت تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی کتاب نہیں لکھی جو ان کے عقائد کے خلاف ھو یا جو خلاف اخلاق یا سوقیانہ ھو۔ ایک مرتبہ انہوں نے آدھی کتاب لکھکر باقی واپس کردی یہ کہکر کہ وہ ان کے عقائد کے خلاف ھے۔ لکھے ھوئے حصہ کی اجرت بھی انہوں نے نہیں لی۔

راجاؤں، مہاراجاؤں اور دوسرے رئیسوں کی خدمت میں لوگ جو عریضے بھیجتے تھے انہیں لکھوانے کے لئے خاص طور پر والد کو تکلیف دیجاتی تھی۔ صاحب ''فرھنگ آصفیہ'' منشی سید احمد دھلوی گھنٹوں بیٹھکر اپنے سامنے وہ عرضداشتیں لکھواتے تھے، جو وہ میر محبوب علی خاں اور بعد کو میر عثمان علی خاں کی خدمت میں بھیجتے تھے۔ ان کی آخری عرضداشت وہ تھی جو انہوں نے اپنے بیٹے دربار احمد کے نام پر اپنا منصب منتقل کرانے کے سلسلہ میں حضور نظام کو بھیجی تھی۔ منشی صاحب والد سے کہا کرتے تھے کہ ''آپ کی خوش نویسی کا طفیل ھے کہ میری ساری عرضداشتیں منظور ھو جاتی ھیں۔'' والد نے اپنی زندگی میں اس قسم کی سیکڑوں عرضداشتیں لکھی ھونگی۔ مولانا محمد علی کے اخبار ''ھمدرد'' کی سرخیاں بھی والد نے تحریر کی تھیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد کے اخبارات ''الہلال'' اور ''البلاغ'' کی چھوٹی بڑی ساری سرخیاں والد ھی کی تحریر کردہ ھیں۔ مولانا آزاد

سے والد کے گہرے مراسم تھے ۔ وہ ان تعلقات کا خاص خیال رکھتے تھے ۔ چنانچہ جب میرے بھتیجے علاء الدین خالد (حالی پبلشنگ ہاؤس، دہلی) نے ''غبار خاطر'' کے پہلے ایڈیشن کے چھاپنے کی اجازت چاہی تو مولانا نے انہی تعلقات کے پیش نظر انہیں دوسرے پبلشروں پر ترجیح دی ۔ علیگڈھ یونیورسٹی کی جامع مسجد اور قصور کی جامع مسجد کی سورتیں بھی والد کی تحریر کردہ ہیں ۔

والد کبھی کبھی پبلک جلسوں میں بھی شریک ہوا کرتے تھے، اور تقریریں بھی کرتے تھے ۔ مجھے ان کی دو تقریریں یاد رہ گئی ہیں ۔ جب عربک ہائی اسکول دہلی کو کالج بنانے کی تحریک شروع ہوئی تو اس سلسلہ میں سب سے پہلا جلسہ مسجد فتحپوری میں منعقد ہوا ۔ ڈاکٹر انصاری صدر تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی صدارتی تقریر میں منجملہ اور باتوں کے فرمایا :۔ ''اس کالج سے بڑے بڑے فضلا پیدا ہونگے ۔ یہیں سے ابن رشد، امام غزالی اور ابن بیطار اٹھینگے، وغیرہ وغیرہ ۔'' والد نے اپنی تقریر میں فرمایا :۔ ''یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس کالج سے غزالی اور ابن رشد کی قبیل کے فضلا پیدا ہونگے ۔ ایسے فضلا کبھی کبھار دنیا میں آتے ہیں اور پیدا نہیں کئے جاتے ۔ ڈاکٹر صاحب کو یوں کہنا چاہئے کہ سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر کے کل پرزے اسی کالج میں تیار کئے جائینگے ۔ یہ کہنا دھوکا اور فریب ہے کہ یہ کالج اس لئے قائم کیا جارہا ہے تاکہ یہاں سے غزالی، عمرخیام، ابن رشد کے ہم پایہ فضلا پیدا ہوں ۔'' ڈاکٹر صاحب اس حق گوئی سے بہت جزبز ہوئے اور جب ان سے کوئی جواب بن نہ آیا تو انہوں نے اتنا کہا کہ ''ہم منشی صاحب کے جذبات کی قدر کرتے ہیں ۔'' ...

دوسرا موقع وہ تھا جبکہ ۱۹۱۵ میں علی برادران کی نظربندی کے خلاف احتجاج کرنے کے لئے ڈاکٹر انصاری کی

صدارت میں ایک جلسہ منعقد ہوا تھا ۔ والد نے اپنی تقریر میں حکومت سے پوچھا تھا کہ ”ہمیں بتایا جائے کہ علی برادران کا قصور کیا ہے جس کی بنا پر انہیں نظربند کیا گیا ہے ۔“ اور پھر غالب کا یہ شعر پڑھا جو معلوم ہوتا ہے کہ خاص اسی موقع کے لئے لکھا گیا تھا :-

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پہ ناحق
آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا ؟

اس وقت انگریزی حکومت کا خوف اس قدر غالب تھا کہ احتجاجی جلسہ بہت عرصہ کے بعد منعقد ہوسکا اور وہ بھی ایک صاحب کے مکان میں جس میں گنتی کے آدمی شریک تھے ۔ جب اس جلسہ کی اطلاع چھندواڑہ میں مولانا محمد علی کو ہوئی تو انہوں نے مجھے ایک خط میں تحریر فرمایا : ”اپنے بہادر باپ سے میرا سلام کہنا ۔“ اس دور میں حکومت پر نکتہ چینی کرنا خاصی جرأت کا کام تھا ۔ خط کے آخر میں مولانا نے چند قطعات کی فرمایش کی تھی ۔ والد نے ان کی رہائی کے بعد وہ قطعات لکھکر دیدئے تھے جو بالآخر ان کے دیوانخانے کی زینت بنے ۔

والد نے ۱۹۰۱ میں ”دارالعلوم“ نام کا ایک ہفتہ وار علمی و ادبی پرچہ نکالا تھا جو تقریباً تین سال تک جاری رہا ۔ اس کے قلمی معاونین میں مولوی نذیر احمد ، مولانا عبدالقدیر ، اور منشی سید احمد جیسے اکابر شامل تھے ۔ اس اخبار میں مرزا حیرت کے مضامین کی تردید بھی چھپتی تھی ۔ اگرچہ یہ پرچہ بند ہو گیا لیکن صحافت سے والد کو آخر وقت تک لگاؤ رہا ۔ وہ ”الہلال“ باقاعدگی سے پڑھتے تھے اور کبھی کبھی مولانا آزاد کو ان کے پرزور اداریوں پر مبارکباد بھی لکھکر بھیجتے تھے ۔ ”ہمدرد“ اور ”زمیندار“ تو ہمیشہ ان کے مطالعہ میں رہا ۔

خوشنویسی میں والد کے یوں تو سیکڑوں شاگرد ہونگے مگر میں چند کے نام درج کرتا ہوں ، نہ صرف اس لئے کہ انہوں

نے فن خطاطی میں نام پیدا کیا بلکہ اس میں چار چاند لگادئے۔
اس ضمن میں سب سے پہلے میں اپنی بڑی ہمشیرہ فاطمۃ الکبریٰ
کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انہوں نے خط نسخ میں کمال پیدا
کیا، اوراب ان کی یادگار دو حمائلیں رہ گئی ہیں جن میں سے ایک
مولوی فتح محمد جالندھری نے اور دوسری مولوی عبدالحفیظ نے
شائع کی تھی۔ چند پنجسورے بھی ان کی یادگار ہیں۔ ان کی
خطاطی سے متاثر ہوکر علیا حضرت سلطان جہاں بیگم والیٔ
بھوپال نے انہیں جڑاؤ پہنچیاں عنایت فرمائی تھیں اور ان کا
ماہانہ وظیفہ بھی مقرر کردیا تھا۔ اسی طرح میر عثمان علی خان
نے بھی ان کا منصب مقرر کردیا تھا۔ دوسرے شاگرد میرے
چھوٹے بھائی محمد یوسف ہیں جو خط نستعلیق میں اپنا ثانی نہیں
رکھتے۔ دوسرے شاگردوں میں مفتی کفایت اللہ، نواب سراج الدین
احمد خاں سائل، عبدالخالق، محمد فردوس، برکت اللہ، نوراحمد،
شفاعت احمد، امام الدین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

میرے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر نے بھی والد سے خوشخطی
سیکھی تھی۔ بڑھاپے کے باوجود آج بھی ان کا خط بہت اچھا ہے۔
مگر انہوں نے اسے کبھی پیشہ نہیں بنایا۔ گھر والوں میں سب
سے بھدا خط میرا ہے، لیکن وہ بھی سیکڑوں کاتبوں سے اچھا
ہے۔ دھلی والے والد سے کہا کرتے تھے کہ ”آپ کے گھر
کے چوھے بھی خوشنویس ہوتے ہیں۔“

جس زمانہ میں والد مولانا آزاد کی کتاب ”ترجمان القرآن“
کی کتابت کر رہے تھے ان دنوں وہ اپنے شاگردوں (عبدالخالق
اور شفاعت احمد) کی معیت میں مولانا کے یہاں گئے۔ والد تو
سیدھے اندر چلے گئے مگر یہ دونوں باہر رک گئے۔ والد انہیں
ڈھونڈنے کے لئے باہر آئے۔ مولانا بھی پیچھے پیچھے آئے۔
والد نے پوچھا کہ تم اندر کیوں نہ آگئے؟ شفاعت نے کہا:
”احتراماً۔“ والد نے انہیں ڈانٹا اور کہا: ”کیا مولانا آدمی

نہیں ہیں؟ ان سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' اس کے بعد مولانا آزاد ان دونوں کو اندر لے گئے اور ان کی چائے سے تواضع کی۔ والد اپنے شاگردوں میں کسی قسم کا احساس کمتری پیدا نہ ہونے دیتے تھے۔

اجرت کے معاملہ میں والد بہت بے پروا واقع ہوئے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے اشخاص پر رقمیں رہ گئیں۔ غلاف کعبہ کی تیاری کی سعادت ہندوستان کے حصہ میں صرف ایک بار آئی * اور اس غلاف کعبہ پر قرآنی سورتیں والد نے لکھیں۔ والد نے چھ مہینے کی محنت شاقہ کے بعد غلاف کعبہ تیار کیا تھا مگر انہیں اپنی محنت کا پھل نہ مل سکا۔ اس محنت کا معاوضہ سعودی حکومت نے اسمعیل غزنوی کو دیا تھا جسے وہ ہضم کر گئے۔ یہ آخری خدمت تھی جو خدا تعالیٰ نے ان سے لی۔ اس کے بعد ان کی آنکھیں جاتی رہیں۔

میں بچپن سے دیکھا کرتا تھا کہ لوگ اپنے معاملات فیصلہ کے لئے ان کے سامنے پیش کیا کرتے تھے۔ والد جو فیصلہ کردیتے تھے، متعلقہ فریق اسے بلا تامل منظور کر لیتے تھے۔ ایک دن ہمارے مکاندار (کالو قصائی) نے والد سے کہا کہ ''کمیلے جاتے ہوئے مجھے راستہ میں پانچ ہزار روپے کے نوٹ رومال میں بندھے ہوئے ملے ہیں۔ منشی جی، بتائیے کہ میں کیا کروں؟'' والد نے رائے دی کہ ''کمیلے میں منادی کرادو کہ جو شخص صحیح صحیح اتا پتہ بتادیگا رقم اس کے حوالہ کردی جائیگی۔'' چنانچہ دوسرے دن ایک شخص آیا اور والد

---

* ۲۶ مارچ ۱۹۶۱ کے ''لیل و نہار'' میں ''ذالک الکتاب'' کے عنوان کے ماتحت والد کے بارے میں مصنف مضمون نے ذیل کے الفاظ سپرد قلم کئے ہیں:- ''.... منشی ابو یوسف کو یہ فخر بھی حاصل ہے کہ جب حکومت سعودی عرب اور مصر کے تعلقات کشیدہ تھے تو بیت اللہ کے غلاف پر کتابت انہوں نے کی تھی۔''

کے روبرو وہ رقم اس کے حوالہ کردی گئی ۔

والد نے ساری عمر ایکساں لباس پہنا ۔ ان کا روزمرہ کا لباس یہ تھا : سفید تہبند ، سفید کرتا اور سفید صافہ ۔ جاڑے میں روئی دار نیم آستین استعمال کرتے تھے اور اوپر سے گاڑھے کی چادر یا شال وغیرہ اوڑھ لیتے تھے ۔ ''کرزن گزٹ'' میں والد کے خلاف مضامین کے علاوہ نظمیں بھی نکلتی تھیں ۔ مجھے ایک نظم کا صرف ایک مصرع یاد رہ گیا ہے ، وھو ھذا :۔

وھی تہبند گاڑھے کا جو پہلے تھا سو اب بھی ہے

شروع شروع میں دھلی والوں نے والد کو اچھی نظر سے نہیں دیکھا ۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ غدر کے بعد وہ سکھوں اور پنجابی فوجیوں کی روش سے متنفر تھے اور چونکہ والد بھی انہی کا سا پہناوا پہنتے تھے اس لئے اھل دھلی کے جذبات کا متاثر ہونا لازمی تھا ۔ مگر رفتہ رفتہ غیریت دور ھوتی گئی اور لوگ ان کے گرویدہ ھوتے گئے ۔ والد نے دھلی کا جو دور دیکھا تھا وہ اب کاھے کو کسی کو نصیب ھوگا ۔ دھلی گئی گزری حالت میں بھی دھلی تھی ۔ اس کا کچھ کچھ اندازہ واحدی صاحب کی کتاب ''میرے زمانہ کی دلی'' سے کیا جاسکتا ہے ۔

والد کے ساتھ ساتھ میں اپنی والدہ کا ذکر کئے بغیر نہیں رہ سکتا ۔ وہ سمبڑیال (ضلع سیالکوٹ) کی رھنے والی تھیں ۔ معمولی پڑھی لکھی تھیں ، لیکن کتابیں ، رسالے اور اخبار ھمیشہ اپنے مطالعہ میں رکھتی تھیں ۔ ان کی پنجابی نہایت فصیح تھی اور اس زبان کے محاوروں پر انہیں غیر معمولی قدرت حاصل تھی ۔ انہیں اس زبان کی ھزارھا ضرب الامثال یاد تھیں ۔ دھلی میں رھنے سہنے سے ان کی اردو بول چال بہت اچھی ھوگئی تھی ۔ وہ بڑے سلیقہ کی عورت تھیں اور تھوڑی سی آمدنی میں گھر کا خرچ اس طرح سے چلاتی تھیں کہ میں حیران رہ جاتا تھا ۔ خدا نے صحیح معنوں میں ان کے ھاتھ میں برکت دے رکھی تھی ۔

وہ بہت عبادت گزار تھیں اور روزانہ تلاوت قرآن مجید کرتی تھیں۔ ان کا انتقال عصر کے وقت ہوا لیکن مرتے مرتے ان سے نماز قضا نہیں ہوئی۔ وہ فقرا کی بیحد معتقد تھیں اور باوجود اس کے کہ میں انہیں ہٹے کٹے فقیروں کو خیرات دینے سے ہمیشہ روکتا تھا مگر انہوں نے اپنے دروازے سے کسی سائل کو خالی ھاتھ جانے نہیں دیا۔ انہیں حضرت سلطان جی (خواجہ نظام الدین اولیا) سے گہری عقیدت تھی اور یہی وجہ ھے کہ انتقال سے کوئی ڈیڑھ سال پیشتر انہوں نے میرے ذریعہ خواجہ حسن نظامی کے خاندانی قبرستان میں اپنے لئے جگہ محفوظ کرالی تھی۔ خواجہ صاحب نے تحریر فرمایا تھا کہ "قبر کی جگہ بلا شرط دی جائیگی۔"

میری والدہ میرے والد کی بہترین رفیق زندگی تھیں۔ جاڑے میں والد کبھی کبھی رات کو بھی کام کرتے تھے اور ایسا بھی ہوا ھے کہ ساری ساری رات انہوں نے لکھنے میں گزار دی۔ اس وقت میری والدہ ان کے پاس بیٹھتیں اور حقہ بھر بھر کر اور چائے بنا بنا کر دیتی رہتیں۔ ہم آہنگی کا یہ نظارہ دیکھکر میں دل میں ہمیشہ مسرور ہوتا تھا۔ میری والدہ درحقیقت تمام نسوانی خصوصیات کی حامل تھیں۔

ماں کی حیثیت سے بھی ان کا مقام بہت آونچا تھا۔ انہوں نے حتی المقدور سب بچوں کو اچھی سے اچھی تعلیم دلوانے کی کوشش کی۔ خود تکلیف آٹھائی مگر ھمیں آرام سے رکھا۔ میری پہلی بیوی سے آن کا برتاؤ ایسا اچھا تھا کہ ان کے رشتہ دار دیکھکر حیرت میں رہ جاتے تھے۔ دنیا بھر میں ساس بہو کا رشتہ بہت نازک ھے، لیکن میری پہلی بیوی زندگی بھر آن کا کلمہ پڑھتی رہیں۔ میری دوسری بیوی جب آئیں وہ دنیا سے رخصت ہوچکی تھیں۔

میں چونکہ بہ سلسلۂ ملازمت ہمیشہ دھلی سے باھر رہا

اس لئے وہ مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتیں۔ انھی دعاؤں کا نتیجہ تھا کہ میں متعصب اور کینہ پرور افسروں کے ہاتھوں ابتلا میں پھنسنے کے باوجود بال بال بچ گیا۔

والدہ کو مختلف قسم کے اچار ڈالنے کا بیحد شوق تھا۔ اُن کے اچاروں کی شہرت دور دور تھی۔ سال بھر ملنے والے ہمارے یہاں سے اچار منگواتے رہتے تھے۔ ہمارے یہاں کے اچار اس صفائی اور نفاست سے ڈالے جاتے تھے کہ اس کی مثال مشکل سے ملیگی۔ یہ اچار گھر کے لئے ڈالے جاتے تھے مگر ڈالتے وقت وہ پڑوسیوں اور دوسرے ملنے والوں کا حصہ بھی رکھ لیتی تھیں۔ اسی طرح وہ کھانے پکانے میں بھی ماہر تھیں۔ حضرت خواجہ حسن نظامی کو ہمارے گھر کے پراٹھے بہت مرغوب تھے اور وہ پابندی سے اُن دعوتوں کا ذکر اپنے روزنامچہ میں کرتے تھے جن میں پراٹھے ہمارے یہاں سے جایا کرتے تھے۔

جہاں جہاں ہم رہے آس پاس کی چھوٹی بڑی لڑکیاں ہمارے یہاں پڑھنے کے لئے آتی رہیں۔ دھلی کی سیکڑوں لڑکیاں میری والدہ اور بہنوں کی شاگرد ہونگی۔ ہمارے گھر کا ماحول اسقدر پاکیزہ تھا کہ سب لوگ بخوشی اپنی لڑکیاں پڑھنے کے لئے بھیج دیا کرتے تھے۔ وہ ہمارے گھر کا کام کاج بھی کرتی تھیں اور قرآن خوانی کے علاوہ نوشت و خواند سے بھی بہرہ ور ہو جاتی تھیں۔ والدہ جہاں جہاں رہیں پڑوس کے لئے باعث خیر و برکت بنی رہیں۔

آخری عمر میں والدہ کو دمہ کی شکایت ہوگئی تھی جو بڑھتے بڑھتے ان کی موت پر منتج ہوئی۔ انتقال سے تھوڑی دیر پہلے انہوں نے والد سے (اور والد نے اُن سے) اپنا کہا سنا معاف کرایا اور پھر جان جان آفریں کے سپرد کردی۔

میں نے نہ چھٹپن میں اور نہ بڑپن میں والدہ اور والد کو آپس میں لڑتے جھگڑتے دیکھا۔ اختلاف رائے ہوتا ہوگا، مگر

وہ سب بدمزگی پیدا کئے بغیر محبت کی فضا میں تحلیل ہو جایا کرتا تھا۔ اس لحاظ سے والد اور والدہ کی ازدواجی زندگی جو نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک قائم رہی، نہایت درجہ قابل تقلید ہے۔

میں اپنے والدین کو ہر لحاظ سے صاحب عظمت سمجھتا ہوں اس لئے کہ وہ اپنی سیرت کے اعتبار سے عام انسانوں کی سطح سے بہت آونچے تھے۔ ان کا انتقال دھلی میں یکے بعد دیگرے ۳۰ نومبر ۱۹۳٦ اور ۱۳ جولائی ۱۹۴۳ کو ھوا۔ خدائے برتر سے دعا ہے کہ وہ دونوں پر اپنی رحمت کا دامن کشادہ کرے، اور ان کے ”خاکی شبستانوں“ کو ھمیشہ ”نور سے معمور“ رکھے! دونوں دھلی کی سر زمین میں جس سے آنھیں بیحد محبت تھی، آسودہ ھیں۔

***

مفتی محمد کفایت اللہ

مفتی صاحب شاہ جہاں پور کے رہنے والے تھے۔ وہ ایک غریب گھر میں پیدا ہوئے تھے۔ اُن کے والد ایک صاحب تقویٰ بزرگ تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میرا بیٹا عالم دین بنے۔ ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی تھی، پھر انہیں مرادآباد میں اور بعد کو دیوبند میں بغرض تعلیم بھیجدیا گیا۔ ان کے ہم جماعتوں میں بعض ایسے اصحاب کے نام ملتے ہیں جو بعد کو مشہور زمانہ ہوئے۔ ان میں مولوی انور شاہ کشمیری، مولوی ضیاء الحق دیوبندی، مولوی محمد شفیع اور مولوی امین الدین (بانی مدرسہؑ امینیہ) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

دوران تعلیم میں کھانے کا انتظام مدرسہ کی طرف سے تھا۔ باقی مصارف کو پورا کرنے کی غرض سے وہ کروشیا سے تاگے کی ٹوپیاں بن بن کر بازار میں فروخت کرتے تھے۔ ایک ٹوپی دو تین دن میں تیار ہوجاتی تھی اور بآسانی دو روپے میں بک جاتی تھی۔ انہوں نے کبھی بھی ملا بن کر مسجد کی روٹیوں پر گزارہ نہیں کیا اور نہ کسی سے اعانت چاہی۔

تعلیم سے فراغت پانے کے بعد وہ مدرسہؑ امینیہ واقع چاندنی چوک میں ملازم ہوگئے۔ درس و تدریس کے علاوہ انہوں نے فتوے دینے کا کام بھی شروع کردیا۔ جب ۱۹۲۰ میں مولوی امین الدین کا انتقال ہوگیا تو معززین شہر اور حضرت شیخ الهند سولانا محمود الحسن نے مدرسہؑ امینیہ ان کی سپردگی میں دیدیا۔ اپنی وفات تک وہ اسی خدمت پر مامور رہے۔

دارالافتاء کا کام بجائے خود بہت اہم تھا۔ سارے ہندوستان اور بلاد اسلامیہ کے مسلمان اپنی دینی مشکلات ان سے رجوع

کرتے تھے۔ اسی خدمت کی وجہ سے وہ مفتی مشہور ہوئے۔ ان کی کتاب ''تعلیم الاسلام'' متحدہ ہندوستان میں رائج تھی۔ مفتی صاحب خطاطی میں راقم الحروف کے والد کے شاگرد تھے۔ اس زمانہ میں خوشخطی داخل نصاب تھی۔ مگر آج اس پر کچھ توجہ نہیں دی جاتی اور یہی وجہ ہے کہ طلبا عام طور پر بد خط ہوتے ہیں۔ مفتی صاحب ہمارے گھر والوں سے قریبی اور دوستانہ تعلقات رکھتے تھے بالخصوص میرے بڑے بھائی منشی عبدالقدیر سے جو سیاسی اعتبار سے ان کے ہم آہنگ ہیں۔ مولانا آزاد کو انہوں نے ۱۹۴۴ میں میرے بھتیجے سے متعارف کراتے وقت جو خط لکھا تھا وہ مفتی صاحب اور مولانا آزاد سے ہمارے خاندانی مراسم کا آئینہ‌دار تھا۔ مفتی صاحب نے لکھا تھا کہ ''حامل رقعہ هذا عزیزی علاء الدین خالد سلمہ منشی محمدالدین صاحب مرحوم کے پوتے ہیں اور آپ کی تصانیف کی اشاعت کا حق ان کے سوا اور کسی کو نہیں پہنچتا۔''

میرے والد مفتی صاحب کی دینی فراست اور بصیرت سے بہت متاثر تھے اور یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار ان سے تقاضا کرتے تھے کہ وہ علما کو ایک پلیٹ فارم پر لے آئیں اور انہیں صحیح معنوں میں ''علمائے امتی کانبیاء بنی اسرائیل'' کا مصداق بنادیں۔ چنانچہ مفتی صاحب نے ۱۹۱۹ میں جمعیۃ العلمائے ہند قائم کی، مگر افسوس ہے کہ چند ہی سال بعد علما دو ٹکڑیوں میں منقسم ہوگئے۔ ایک کا مرکز دهلی تھا اور دوسری کا مرادآباد۔ جمعیۃ العلمائے ہند جنگ آزادی میں ہمیشہ پیش پیش رہی اور اسی کا طفیل تھا کہ مسلمان لاکھوں کی تعداد میں کانگریس میں داخل ہوئے اور وہ (کم سے کم کچھ مدت کے لئے) ملک کی نمایندہ جماعت بن گئی۔ جو عظیم الشان قربانیاں اس جمعیۃ نے دیں وہ کسی دوسری مذہبی جماعت سے بن نہ آئیں۔ سیاسیات میں داخل ہونے کے بعد سے مفتی صاحب ہمیشہ

مسلمانوں کے حقوق کے لئے سینہ سپر رہے۔
ان کی زندگی میں موتمر اسلامی کے دو اجلاس منعقد ہوئے ایک مکہ میں اور دوسرا قاہرہ میں۔ انہوں نے دونوں میں شرکت فرمائی تھی اور اپنی علمیت اور شخصیت سے دنیائے اسلام کے نمایندوں کو متاثر کیا تھا۔
وہ شاعر نہیں تھے اور نہ انہوں نے غزل گو کی حیثیت سے کسی مشاعرے میں شرکت کی۔ لیکن چونکہ وہ علم عروض سے کماحقہ واقف تھے اور قادرالکلام ادیب تھے اس لئے وہ شعر کہہ لیتے تھے۔ ملتان جیل میں ان کے دم سے متعدد مشاعرے ہوئے۔ ان کی فی البدیہہ غزلیں مولوی احمد سعید پڑھکر سنایا کرتے تھے۔ وہ جیل میں بیڈمنٹن بھی کھیلتے تھے اور اچھی خاصی چابکدستی سے۔
ایک مرتبہ مدرسہ امینیہ کے چند طلبا گرفتار کرلئے گئے۔ کشمیری دروازہ کے تھانہ پر شناخت کی پریڈ ہونے والی تھی کہ مفتی صاحب عین موقع پر پہنچ گئے۔ وہاں کا ماحول دیکھکر آپ نے مجسٹریٹ سے فرمایا کہ ”شناخت کی غرض سے جو پریڈ ہورہی ہے وہ محض خانہ پری کرنے کے لئے کی جارہی ہے۔ آپ کا یہ طریقہ شناخت بالکل غلط ہے۔“ مجسٹریٹ نے پوچھا کہ ”یہ کیسے؟“ آپ نے فرمایا کہ ”میرے مدرسہ کے طلبا اس صف میں اسی طرح نمایاں ہیں جس طرح سے بھیڑوں میں اونٹ۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ آپ شہر کے دینی مدارس سے انہی کی وضع قطع اور لباس کے طلبا فراہم کریں، پھر انہیں ان میں ملا کر شناخت کرائیں۔ قانون کا اصل مقصد صرف اسی صورت میں پورا ہوگا۔“ مجسٹریٹ ان کی قانونی موشگافی سے بہت متاثر ہوا اور اس نے شناخت کی پریڈ ملتوی کرادی۔ پھر جب پریڈ کرائی گئی تو مدرسہ امینیہ کا کوئی طالب علم بھی شناخت میں نہ آیا۔

میرے ایک دوست کی صاحبزادی کو مقدمہ کی سماعت کے بعد علیگڈھ کی عدالت نے طلاق دلوادی۔ وہ مفتی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے اور کاغذات دکھا کر پوچھا کہ ''مذہبی نقطۂ نظر سے اس طلاق میں کوئی سقم تو نہیں رہا؟'' تمام کاغذات پڑھنے کے بعد مفتی صاحب نے رائے دی کہ ''مذہب کا منشا عدالت کے اس حکم سے پورا نہیں ہوتا۔'' چنانچہ میرے دوست نے آصف علی سے مسئلہ کو رجوع کیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ مفتی صاحب کے شبہات کا ازالہ کردیں۔ چنانچہ وہ قانون کی کتابوں سے مسلح ہوکر مفتی صاحب کے یہاں پہنچے۔ بحث تین گھنٹے تک جاری رہی مگر آصف علی مفتی صاحب کے شبہات کی تشفی نہ کرسکے۔ اس واقعہ سے محض یہ دکھانا مقصود ہے کہ مفتی صاحب کی نظر مذہبی احکام پر کس قدر گہری تھی۔ کچھ عرصہ بعد میرے دوست کی صاحبزادی کو اسی صورت میں طلاق مل گئی جیسا مفتی صاحب چاہتے تھے۔

مفتی صاحب اتباع سنت پر سختی سے عامل تھے۔ محلہ میں کسی شناسا یا غیر شناسا کی موت ہوجاتی تو تعزیت کے لئے وہ ضرور پہنچتے۔ جب سودا سلف لینے کے لئے نکلتے تو وہ پڑوسیوں سے بھی پوچھ لیتے اور ان کا سودا سلف لادیتے۔ زندگی بھر وہ اسی اصول پر گامزن رہے۔ اهل محلہ کے لئے ان کی موجودگی ہر لحاظ سے خیر و برکت کا باعث تھی۔

مفتی صاحب ایک وسیع النظر عالم، دقیقہ رس سیاست دان، حساب دان مدرس، فاضل استاد، جنگ آزادی کے جری سپاهی اور رهنما اور تقویٰ و تقدس کے امام تھے۔ لین دین کے معاملات میں نہایت کھرے تھے۔ بصیرت دین میں وہ دوسرے آزاد تھے۔ اپنی حریت فکر کی وجہ سے وہ ہر جگہ احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ جو فوٹو درج کتاب کیا جارہا ہے وہ ایک ترکیب سے بمبئی میں کھنچ گیا تھا ورنہ مفتی صاحب تو اسکے خلاف تھے۔

ابوالکلام آزاد

میں نے پہلے پہل آزاد کو ۱۹۰۸ میں ملا واحدی کے مکان پر دیکھا تھا جہاں وہ خواجہ حسن نظامی سے ملنے کے لئے تشریف لائے تھے ۔ اس وقت ان کی عمر کوئی بیس بائیس برس کی ھوگی ۔ اگرچہ یہ ان کی نوعمری کا زمانہ تھا لیکن وہ اس عمر میں بھی کافی جانے پہچانے آدمی تھے اور ادبی اور علمی حلقوں میں ان کا غلغلہ بلند تھا ۔ بات یہ تھی کہ انہوں نے ملک کے ممتاز اخباروں اور رسالوں میں علمی مضامین لکھنے شروع کردئے تھے اور لوگ سمجھنے لگ گئے تھے کہ ایک غیر معمولی جسامت کا تارہ فضائے آسمانی پر نمودار ھوچکا ھے ۔ بہر حال جیسا شاندار ان کا آغاز تھا اس سے کہیں زیادہ شاندار ان کا انجام ھوا ۔ وہ اپنی وفات سے قبل خیالات کے اعتبار سے بلا مبالغہ سارے ملک پر چھائے ھوئے تھے ۔

۱۹۱۲ میں میں مولانا محمد علی کے اخبار ”ھمدرد“ میں سب ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتا تھا ۔ اس زمانہ میں جن اکابر سے ملاقات ھوئی ان میں آزاد بھی شامل تھے ۔ ۱۹۱۳ میں میں نے خلیل خالد بک (ترکی قونصل متعینہ بمبئی) سے طویل ملاقات کی اور اس کا حال ”ھمدرد“ میں شائع کیا ۔ اس واقعہ کے چند دن بعد مولانا نے مجھے اپنے مہمانخانہ میں بلوابھیجا ۔ وھاں اس وقت آزاد اور ترکی اخبار ”تصویر افکار“ کے ایڈیٹر توفیق بک بھی موجود تھے ۔ مجھے دیکھتے ھی مولانا محمد علی مجھ پر برس پڑے یہ کہکر کہ تم نے اپنی ملاقات میں ایسی باتیں لکھ دی ھیں جن کی وجہ سے خلیل خالد بک کی پوزیشن نہایت نازک ھوگئی ھے ۔ میں نے پوچھا کہ کیا وہ انٹرویو

آپ کی نظر سے گزر چکا ہے ؟ فرمایا نہیں ۔ اسپر مولانا آزاد نے اپنی طرف سے فرمایا کہ پہلے اسے پڑھ لیا جائے ۔ چنانچہ وہ مضمون پڑھا گیا ، مگر اس میں کوئی بات بھی قابل گرفت نہ نکلی ۔ بہرحال میں مولانا آزاد کا شکر گزار رہا کہ انہوں نے از خود مداخلت کرکے مولانا محمد علی کی صحیح رہنمائی فرمائی ۔

طالب علمی کے زمانہ سے میں آزاد کی تحریروں کا عاشق تھا ۔ میں ان کا اخبار ''الہلال'' پابندی سے پڑھتا تھا ۔ یہ حقیقت ہے کہ اکیلے اس اخبار نے جتنی سیاسی بیداری مسلمانان ہند میں پھیلائی ، اتنی دوسرے بہت سے اخباروں نے اجتماعی طور پر بھی نہ پھیلائی ہوگی ۔ اس اخبار نے ان کے لئے مستقبل کی راہیں متعین کیں ، انہیں ملک و ملت کی خاطر قربانیاں دینا سکھایا اور دنیا کے دوسرے اسلامی ممالک کے ساتھ انہیں رشتۂ اخوت میں نہ صرف منسلک کیا بلکہ اس رشتہ کو اور بھی استوار کردیا ۔ اردو صحافت پر جو نشان وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے ہیں ، وہ امٹ ہے ۔

وہ اعلیٰ درجہ کے ادیب تھے ۔ وہ پاک و ہند کے ان مصنفوں میں سے ہیں جن کی نگارشات ان دونوں ممالک میں بیحد مقبول ہیں ۔ ان کے پرانے مضامین کو مختلف عنوانات کے ماتحت کتابی شکلوں میں آج بھی چھاپا جارہا ہے ۔ ان کی آخری کتاب ''انڈیا ونز فریڈم'' (India wins Freedom) نے سیاسی لٹریچر میں اپنا خاص مقام حاصل کرلیا ہے ۔

خدائے برتر نے اپنے خزانۂ غیب سے انہیں خطابت کی جو قوت عطا کی تھی ، وہ بے مثل تھی ۔ ہند و پاکستان کا کوئی اور خطیب ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ انہیں اردو خطابت میں وہی درجہ حاصل ہے جو انگریزی میں مسز سروجنی نائیڈو ، سر ارڈنلی نارٹن اور مسز بیسنٹ کو حاصل تھا ۔ میں نے برک (Burke) کی آتش بیانی نہیں سنی لیکن آزاد ان سے کسی طرح

کم نہ تھے۔ میں نے دہلی اور بمبئی میں ان کی متعدد تقریریں سنی ہیں اور میں اپنے تجربہ کی بنا پر کہ سکتا ہوں کہ وہ دل و دماغ پر اثر کرتی تھیں جس سے سننے والے مسحور ہوجاتے تھے۔

چونکہ بہ سلسلۂ ملازمت میرا قیام زیادہ‌تر بمبئی میں رہا اس لئے میری بیشتر ملاقاتیں وہیں ہوئیں۔ بمبئی ہر قسم کی سیاسی تحریک کا مرکز تھا۔ ایک دفعہ انہوں نے کانگریس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے بھولا بھائی دیسائی کے مکان پر پریس کانفرنس منعقد کی جس میں مسز نائیڈو کے کہنے سے میں بھی شریک ہوگیا تھا۔ جس طریقہ سے انہوں نے واقعات کا احاطہ کیا اور رپورٹروں کے سوالوں کا جواب دیا اُس سے ان کی سیاسی بصیرت کا پورا پورا اندازہ ہوسکتا تھا۔

مولانا ابوالکلام آزاد میرے والد کے قریبی دوست تھے۔ جس زمانہ میں مولانا کا قیام دہلی میں تھا تو والد تقریباً روزانہ شام کو ان کے یہاں جایا کرتے تھے اور گھنٹوں وہاں علمی صحبت رہتی تھی۔ انہی تعلقات کی وجہ سے مولانا آزاد نے ''غبار خاطر'' کی اشاعت کی اجازت میرے بھتیجے علاء الدین خالد کی حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی کو دی تھی۔ مولانا نے ''غبار خاطر'' کے علاوہ دو اور کتابیں ''سیرت اسمعیل شہید'' اور ''ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا حصہ'' بھی لکھی تھیں۔ مولانا یہ کتابیں بھی خالد کے ذریعہ شائع کرانے والے تھے کہ اتنے میں ملک تقسیم ہوگیا۔ خالد کراچی چلے آئے اور پھر مولانا کو کوئی ایسا آدمی نہ ملا جس پر انہیں اس درجہ اعتماد ہوتا اور وہ اپنے مسودات اس کے سپرد کردیتے۔

آخری دفعہ میں نے انکی تقریر جون ۱۹۴۷ میں کانسٹی‌ٹیوشن ہال دہلی میں سنی تھی جسمیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے تقسیم ہند کے اصول کو باضابطہ طور پر منظور کیا تھا۔ مولانا تقسیم کے موید نہ تھے۔ انہوں نے اپنی تقریر میں فرمایا تھا کہ

''میں ابھی تک ہندوستان کو تین گروپوں میں رکھنے کے حق میں ہوں ۔ اس میں جہاں ملک کی سالمیت برقرار رہتی وہاں تقسیم کا سوال بھی نہ اٹھتا ۔ ہم نے تقسیم کو حالات سے مجبور ہو کر منظور کیا ہے ۔'' ان کے بعد سردار پٹیل نے تقریر کی اور غصہ کے لہجہ میں کہا :۔ '' کیا مولانا سارے ہندوستان کو پاکستان بنانا چاہتے ہیں ؟ . . . . ہم نے پاکستان کا مطالبہ اس لئے منظور کیا ہے کہ جب جسم کا کوئی حصہ گل جاتا ہے تو ہم ڈاکٹر سے کہتے ہیں کہ اسے کاٹ دو ۔ پاکستان جسم ہندوستان کا ایک گلا ہوا حصہ ہے ۔ اب ہم باقی ماندہ ملک سے بیماری ، مفلسی ، ناخواندگی وغیرہ کو دور کرسکینگے ، وغیرہ وغیرہ ۔'' صدر کانگریس (اچاریہ کرپلانی) نے اپنی اختتامی تقریر میں نہایت اشتعال انگیز لہجہ میں فرمایا :۔ ''اب جبکہ پاکستان بن گیا ہے ، ہم پاکستان والوں کو آگاہ کئے دیتے ہیں کہ اگر انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ برا برتاؤ کیا تو پھر ہم یہاں کے ہندوؤں کے غصہ کے سیلاب کی روک تھام نہ کرسکینگے ۔'' جب جلسہ منتشر ہو گیا تو میں نے پٹیل کی تقریر اور کرپلانی کے ریمارکس کی طرف مسز نائیڈو کی توجہ مبذول کرائی ۔ جواب میں انہوں نے صرف ایک لفظ ''فولش'' (foolish) استعمال کیا ۔ مسز موصوفہ مولانا آزاد کی صیانت رائے کی بیحد معترف تھیں ۔

'' ترجمان القرآن '' جو غالباً تین حصوں میں ہے ، مولانا آزاد کا ایک عجیب و غریب ادبی اور مذہبی شاہکار ہے جو مدت دراز تک ان کی مذہبی بصیرت اور غیر معمولی فراست کی یاد دلاتا رہیگا ۔

* * *

موہن داس کرم چند گاندھی

میں نے پہلی مرتبہ گاندھی جی کو ۱۹۱۷ میں کانپور کے ریلوے اسٹیشن پر دیکھا تھا۔ جاڑے کا موسم تھا اور وہ اونی دوشالہ اوڑھے ہوئے تھے جس میں بلا مبالغہ چھوٹے چھوٹے بیسیوں سوراخ تھے۔ یہ دوشالہ ہاتھ کا کتا ہوا اور بنا ہوا تھا۔ اس کے بعد مجھے متعدد بار ان کی تقریریں سننے کے مواقع ملے۔ لیکن بدقسمتی سے میری ان سے کبھی بات چیت نہیں ہوئی۔ ایک دو مرتبہ میں نے ان کی خدمت میں خطوط بھی بھیجے مگر ان کے رفیق کار مشرو والا نے مجھے جواب دیا کہ "آجکل گاندھی جی فلاں فلاں کام میں اتنے مصروف ہیں کہ دوسرے امور پر توجہ دینے سے بالکل قاصر ہیں۔"

بہرحال گاندھی جی کے بارے میں جو چند باتیں میرے مشاہدہ میں آئیں میں انہیں محفوظ کر دینا چاہتا ہوں۔

بمبئی میں جو پہلی خلافت کانفرنس مستان شاہ تالاب میں منعقد ہوئی تھی اس میں گاندھی جی خاص طور پر شریک ہوئے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اسی کانفرنس میں ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پڑی۔ گاندھی جی نے مسلمانوں کو یقین دلایا تھا کہ "تحریک خلافت میں ہندو دل و جان سے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ ساتھ ہی جیئینگے اور ساتھ ہی مرینگے۔" اس جلسہ کی روح رواں حاجی میاں جان محمد چھوٹانی تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ گاندھی جی مسلمانوں سے من حیث القوم روشناس ہوئے۔

"ہندوستان چھوڑ کر چلے جاؤ" (Quit India) کی تحریک کے سلسلہ میں گاندھی جی کو سر آغا خاں کے "محل" واقع پونا میں نظر بند رکھا گیا تھا۔ اس زمانہ میں ان کا قاعدہ تھا کہ

وہ روزانہ ساٹھ ستر خطوط اپنے ہاتھ سے لکھکر دوستوں کو بھیجا کرتے تھے ۔ یہ خط مختلف زبانوں میں ہوتے تھے ، کچھ اردو میں ، کچھ گجراتی میں ، کچھ تامل میں اور کچھ انگریزی اور ہندی میں۔ یہ محض چند سطری اور خالصۃً ذاتی امور پر مشتمل ہوتے تھے۔ اس کے باوجود حکومت انہیں ہمارے دفتر میں سنسر کرنے کے لئے بھیجدیتی تھی۔ اردو کے خط میرے حصہ میں آتے تھے ۔ جہاں تک میری یاد کام کرتی ہے ، اردو کا پہلا خط بڑودہ کے لیڈر عباس طیب جی کے نام بھیجا گیا تھا۔ تین چار دن کے بعد گاندھی جی کو کسی طرح معلوم ہوگیا کہ ان کے خطوط سنسر کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے حکومت کے نام ایک عتاب نامہ بھیجا جس میں یہ پوچھا گیا تھا کہ ”جب حکومت کو اچھی طرح سے معلوم ہے کہ میں جیل میں رہ کر جملہ ضوابط کی پابندی کرتا ہوں تو پھر میرے خطوط کیوں سنسر کئے جاتے ہیں؟ “ حکومت نے اسی وقت اپنے احکام واپس لے لئے۔ زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ تک ان کے خطوط سنسر ہوئے ہونگے۔

حکومت بمبئی کا قاعدہ تھا کہ گاندھی جی کو جیل بھیجنے سے پیشتر وہ ان کی قیامگاہ کے لئے شدھ کھدر کی چادریں ، تکیوں کے غلاف ، پردے اور دیگر چیزیں پہلے سے بھیجدیتی تھی تاکہ گاندھی جی کے عقائد کو ٹھیس نہ لگے۔ یہ مراعات گاندھی جی کی ذات کے لئے مخصوص تھیں۔ میری ۲۷ سالہ ملازمت کے دوران میں بہت سے آل انڈیا لیڈر گرفتار ہوئے اور صوبۂ بمبئی کے مختلف جیلوں میں رکھے گئے، لیکن کسی کے ساتھ وہ امتیازی برتاؤ روا نہیں رکھا گیا جو گاندھی جی کی ذات کے لئے مختص تھا۔

حکومت کی پریس برانچ ہمارے ہی دفتر سے متعلق تھی اور وہیں سے مختلف زبانوں کے اخبارات کے قابل اعتراض حصوں کا ترجمہ اور انگریزی اخبارات کے تراشے حکومت کے مختلف محکموں کو بھیجے جاتے تھے۔ اکیلا گاندھی جی کا اخبار ایسا تھا جس

کا ایک ایک لفظ بذریعہ تار وزیر ہند کی خدمت میں ہفتہ کے ہفتہ بھیجا جاتا تھا ۔ گاندھی جی کے وہ نوٹ بھی جن میں جنسی معاملات پر نوجوانوں کو مشورے دئے جاتے تھے ، اسی طرح بذریعہ تار ارسال کئے جاتے تھے ۔ میرے علم میں اس خصوصیت میں متحدہ ہندوستان کا کوئی دوسرا اخبار شریک نہ تھا ۔

جس زمانہ میں گاندھی جی اور قائد اعظم باہم بات چیت کر رہے تھے اور گاندھی جی روزانہ قائد اعظم سے ملنے کے لئے آن کے بنگلہ واقع ماؤنٹ پلیزنٹ روڈ پر جایا کرتے تھے ، میں بھی آخری دن (۲۷ ستمبر ۱۹۴۴) کی سہ پہر کو اتفاقیہ طور پر وہاں جانکلا ۔ میں نے دیکھا کہ دونوں لیڈر بالکنی میں بیٹھے خط و کتابت کا باہمی مقابلہ کر رہے ہیں ۔ رپورٹروں سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ گفتگو ٹوٹ چکی ہے اور تھوڑی دیر میں گاندھی جی چلے جائینگے ۔ بہرحال مراسلت کا باہمی مقابلہ کرنے کے بعد جناح انہیں رخصت کرنے کے لئے نیچے تک آئے ۔ اس کے بعد ایک ریلا آیا جس میں اتفاقیہ طور پر تین اشخاص سب سے آگے ہو گئے اور باقی سارا مجمع جو زیادہ تر رپورٹروں پر مشتمل تھا ، پیچھے رہ گیا ۔ وہ تین آدمی تھے گاندھی جی، پیارے لال اور راقم الحروف ۔ میں گاندھی جی کی دائیں جانب تھا اور ان کے سیکریٹری پیارے لال بائیں طرف تھے ۔ گاندھی جی کا بایاں ہاتھ پیارے لال کے کندھوں پر تھا ۔ جناح کے بنگلہ سے ہم برلا ہاؤس پہنچے جو قریب ہی نشیب میں واقع تھا ۔ گاندھی جی راستہ بھر بولتے رہے اور پیارے لال مکمل خاموشی سے ان کی باتیں سنتے رہے ۔ گاندھی جی کو اتنا گھبرایا ہوا میں نے اس سے قبل کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ وہ فرما رہے تھے :- " میں پاکستان کا مطالبہ کیسے منظور کرسکتا ہوں جب کہ میں بالکل نہیں سمجھ سکا کہ وہ کیا ہے ! اسے منظور کرنے سے پہلے مجھے اپنے دوستوں سے ، اپنے رفقائے کار سے ، پیارے لال سے اور دوسروں سے مشورہ کرنا ہوگا ۔ مجھے کانگریس

ورکنگ کمیٹی سے بھی مشورہ کرنا ہوگا ، وغیرہ وغیرہ ۔" جب ہم تینوں برلا ھاؤس پہنچے تو گاندھی جی اور پیارے لال تو سیدھے اس کمرے میں چلے گئے جہاں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ارکان بیٹھے ان کا انتظار کر رہے تھے اور میں اس کمرے میں رک گیا جہاں مسز نائیڈو تیاری میں مصروف تھیں ۔ میں نے ان سے نامہ و پیام کے ٹوٹ جانے پر اپنے دلی رنج و غم کا اظہار کیا ۔ اس پر وہ نہایت جذباتی انداز میں بولیں : ۔ "میں نے اس بڈھے (گاندھی) کو جناح کے پاس جانے سے روکا تھا اور کہدیا تھا کہ وہ بہت ضدی* آدمی ھے اور وہ تمہاری بات نہیں سنیگا ۔ مگر اسے اپنے اوپر اس قدر اعتماد تھا کہ اس نے میری بات نہیں مانی ، اور اب نتیجہ سامنے ھے ۔"

مولانا محمد علی کی وفات پر ایک دن گاندھی جی اپنے چند رفقا کو لیکر تعزیت کی غرض سے اچانک خلافت ھاؤس میں نازل ہو گئے ۔ باتوں باتوں میں مولانا شوکت علی نے فرمایا :۔ "باپوجی ! وہ دن بھی یاد ھیں جب آپ میری جیب میں رھا کرتے تھے؟" گاندھی جی نے فوراً جواب دیا :۔ "لیکن آپ ھی نے تو مجھے نکال کر باھر پھینک دیا تھا ۔" اس پر تھوڑی دیر تک قہقہہ ہوتا رھا ۔ جب گاندھی جی خلافت ھاؤس سے رخصت ہوئے تو مولانا شوکت علی ، زاھد علی ، محمد احسن اور دیگر اکابر خلافت انہیں چھوڑنے کے لئے نیچے موٹر تک گئے ۔

جس زمانہ میں گاندھی جی جوھو میں برت رکھ رہے تھے اس وقت دربانی کے فرائض مسز نائیڈو ادا کر رھی تھیں ۔ ھزاروں آدمی وھاں روزانہ درشن کے لئے پہنچتے تھے مگر مسز نائیڈو

---

* اسی خیال کو سید سلیمان ندوی نے یوں ظاھر کیا ہے :۔ "ان کی بڑی خصوصیت اپنی بات پر جم کر دوسروں سے اپنی بات منوانے کی قوت تھی ۔ انہوں نے اپنی اس قوت کا مظاھرہ پاکستان کے مطالبہ میں پوری طرح کیا اور بالآخر کامیابی حاصل کی ۔" (یاد رفتگاں ۔ ۴۲۲)

اس قدر سخت تھیں کہ کسی کو دروازہ کے اندر پھٹکنے نہیں دیتی تھیں۔ ایک سہ پہر کو میں بھی وہاں پہنچ گیا۔ انہوں نے مجھے اندر بلالیا اور دیر تک گاندھی جی کی حالت بیان کرتی رہیں۔ میں نے دور سے گاندھی جی کے دیدار بھی کرلئے۔ اس وقت وہ باہر کھلی ہوا میں ایک چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ بیماری اور برت کے ایام میں بالعموم مسز نائیڈو ہی پہرہ دار اور نرس کے فرائض انجام دیا کرتی تھیں۔ جوہو میں گاندھی جی بڑے تشویشناک دور سے گزر رہے تھے اوراسی وجہ سے مسز نائیڈو بیحد مغموم رہا کرتی تھیں حتیٰ کہ اُن کی راتوں کی نیندیں بھی حرام ہو گئی تھیں۔

سیسون ہاسپٹل (پونا) میں اپنڈے سائیٹس کے آپریشن کے بعد جب گاندھی جی کو قبل از وقت رہا کردیا گیا تو حکومت بمبئی نے ہوم ڈیپارٹمنٹ کے ایک افسر اعلیٰ جے۔سی۔ میکڈانل کو خاص طور پر متعین کیا کہ وہ آدھی رات کو "کرانیکل" کے ایڈیٹر سید عبداللہ بریلوی سے جاکر ملیں اور انہیں رہائی کی اطلاع دیں۔ اس واقعہ سے دونوں کی اہمیت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے، یعنی گاندھی جی کا اور "کرانیکل" کا۔ چنانچہ بریلوی نے اُسی وقت گاندھی جی کی قبل از وقت رہائی پر نیا لیڈنگ آرٹیکل لکھا جس میں حکومت کے اس دانشمندانہ اقدام کی تعریف کی گئی تھی۔

ایک دن میرے دوست میاں علم الدین نے مجھے ٹیلیفون کرکے بلایا اور کہا کہ "آج سہ پہر کو میرے ساتھ چائے نوشی کرو۔" چنانچہ میں دفتر سے سیدھا کسٹم ھاؤس پہنچا۔ چائے کے ساتھ عراق کی بہترین کھجوریں بھی میز پر موجود تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ "یہ کھجوریں گاندھی جی کے لئے عراق سے بڑی پابندی سے آتی ہیں۔ کچھ پارسل سے الگ ہو گئی تھیں اور یہ وہی ہیں۔" میں نے ایسی نفیس کھجوریں زندگی بھر نہیں کھائی

تھیں ، بہرحال میں دل ہی دل میں مسرور تھا کہ کم سے کم ایک اسلامی ملک تو ایسا ہے جہاں کا میوہ گاندھی جی کی غذا کا جزو لاینفک ہے ۔

مجھے کانپور ، دھلی اور بمبئی میں گاندھی جی کی بیسیوں تقریریں سننے کا اتفاق ہوا ہے ، میں اپنی خوش قسمتی پر نازاں ہوں کہ مجھے قریب سے گاندھی جی کی باتیں سننے کے اس قدر مواقع ملے ، مگر میں شرف ہم کلامی سے محروم رہا جس کا افسوس مجھے تا زندگی رہیگا ۔

***

محمد علی جناح

بمبئی میں میرا قیام بہ سلسلۂ ملازمت فروری ۱۹۱۸ سے نومبر ۱۹۴۷ تک رہا۔ اس اثنا میں مجھے محمد علی جناح کو قریب سے دیکھنے کے متعدد مواقع ملے۔ میں نے ان کے دونوں دور دیکھے ہیں، ایک وہ جبکہ وہ محض محمد علی جناح تھے اور دوسرا وہ جبکہ وہ مسلمانوں کے قائد اعظم بن چکے تھے۔

بمبئی پہنچنے کے چند دن بعد انجمن اسلام ہائی اسکول کے پرنسپل محمد حفیظ سید، ہائی کورٹ چیمبر میں جناح سے ملنے کے لئے گئے اور مجھے بھی اپنے ساتھ لیتے گئے۔ جناح نے چھٹتے ہی مجھ سے پوچھا کہ "کیا تم کانگریس کے ممبر ہو؟" اور جب میں نے اثبات میں جواب دیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ "ہر تعلیم یافتہ مسلمان کو کانگریس کا ممبر بن جانا چاہئے۔" یہ وہ زمانہ تھا جبکہ وہ خود کانگریس سے وابستہ تھے۔ اس واقعہ کے بعد ان سے کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی تھی۔

جناح ابتدا ہی سے بمبئی کی سماجی زندگی میں اہم انفرادیت کے سالک تھے۔ طلبا کے مقامی اداروں میں بھی وہ کبھی کبھی نظر آجاتے تھے۔ وہ کانگریس، ہوم رول لیگ اور مسلم لیگ سب سے دلچسپی لیتے تھے۔ مگر دسمبر ۱۹۱۸ میں ایک واقعہ ایسا پیش آگیا جس نے انہیں ایک دم آل انڈیا لیڈروں کی صف میں جا بٹھایا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بمبئی کے گورنر لارڈ ولنگڈن کے کچھ بہی خواہ اہل شہر کے نام سے انہیں الوداعی ایڈریس دینا چاہتے تھے۔ لارڈ موصوف عوام میں اپنی استبدادیت کی وجہ سے بیحد بدنام تھے اور اسی لئے ہوم رول لیگ والے نہیں چاہتے تھے کہ ایسے مطلق العنان حاکم کی اس طریقہ سے

عزت افزائی ہو۔ جناح بھی اس تجویز کے شدت سے مخالف تھے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ ''اگر الوداعی ایڈریس لارڈ ولنگڈن کے دوستوں اور خوشامدیوں (sychophants) کی طرف سے دیا جارہا ہے تو پھر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہئے، لیکن اگر یہ سارا ہنگامہ بمبئی کے شہریوں کے نام سے برپا کیا جارہا ہے تو پھر ہم پوری قوت سے اس قومی توہین کا مقابلہ کرینگے۔'' چنانچہ جب شریف بمبئی نے اس تجویز پر غور کرنے کے لئے ٹاؤن ہال میں شہریوں کا ایک عام جلسہ طلب کرلیا تو جناح اور ان کے مویدین نے اسے ایک مراسلہ کے ذریعہ اطلاع دیدی کہ وہ اس تجویز کی جلسہ ہی میں مخالفت کرینگے۔ ''بمبئی سماچار''، ''بمبئی کرانیکل'' اور دوسرے وطن دوست اخباروں نے اپنے مضامین سے ملک بھر میں عموماً اور سارے صوبہ میں خصوصاً، ایک ہیجانی کیفیت پیدا کردی تھی۔

ہارنیمین، عمر سوبانی، جمنا داس دوارکا داس، وی۔ اے۔ دیسائی، سید حسین، ایس۔ جی۔ بینکر، ایچ۔ مسیح وغیرہ شروع ہی سے جناح کے ساتھ تھے۔ چنانچہ جلسہ کے دن یہ سب اصحاب مسٹر اور مسز جناح کی قیادت میں کئی ایک ہفتخواں طے کرنے کے بعد ٹاؤن ہال پہنچے اس لئے کہ پولیس نے ہال تک جانے کے تمام راستوں کی ناکہ بندی کر رکھی تھی۔ حکومت نے گودیوں کے مزدوروں، قلیوں اور موالیوں کو سیکڑوں کی تعداد میں ہال میں بھیجنے کا انتظام کیا تھا تاکہ پبلک کے آدمیوں کو بیٹھنے کی جگہ بھی نہ مل سکے۔ جلسہ سہ پہر کو پانچ بجے شروع ہوا۔ شریف بمبئی نے تجویز پڑھکر سنائی مگر وہ شور و شغب میں دب کر رہ گئی۔ تجویز کے پیش ہوتے ہی جناح اور ہارنیمین نے پرزور الفاظ میں مخالفت کی اور حاضرین نے ''شیم''، ''شیم'' کے نعرے بلند کئے۔ حکومت کے موالیوں نے بھی ان کی دیکھا دیکھی ''شیم''، ''شیم'' کے

نعرے بلند کرنے شروع کردئے جس سے ایک ہنگامہ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی اور جلسہ تھوڑی دیر میں بے ترتیبی سے منتشر ہو گیا ۔ جب جناح اور ہارنیمین جلسہ سے نکلے تو اس وقت جناح پر حملہ کیا گیا ۔ اس پر جناح کے ساتھیوں نے (جن میں مدراسی سینڈو خصوصیت سے قابل ذکر ہے) حملہ آور کو مکے مار کر نیچے گرا دیا ۔ یہ رنگ دیکھکر باقی حملہ آور فرار ہو گئے ۔ اس کے بعد سے جناح کو گھیرے میں لے لیا گیا ۔ اس سہ پہر کا جوش و خروش ایسا سماں ہے جسے بھلایا نہیں جاسکتا ۔ ٹاؤن ہال سے نکل کر لیڈر جلوس کی شکل میں قریب ہی بیک ہاؤس لین میں گئے جہاں ایک بلڈنگ کی بالکنی سے جناح نے اس عظیم الشان کامیابی پر مجمع سے یوں خطاب کیا :-

"ہم نے اپنا فرض منصبی ادا کردیا ہے ۔ ہم اس جمہوری اسپرٹ کو ہمیشہ زندہ رکھینگے اور استبدادیت کے سامنے کبھی سر نہ جھکائینگے ۔"

اس کے بعد متعدد جلسے ہوئے جن میں جناح کی خدمت میں ان کی اس کامیابی پر مبارک باد پیش کی گئی ۔ اخبارات کے ذریعہ بھی یہ تجویز پیش ہوئی کہ اس واقعہ کی مستقل یادگار بنائی جائے ۔ چنانچہ پبلک نے اس مقصد کے لئے اچھی خاصی رقم جمع کی اور اس سے کانگریس ہاؤس میں "پیپلز جناح ہال" کے نام سے ایک ہال تعمیر کیا گیا ۔ اب اس کا نام بدل کر "کانگریس ہال" رکھدیا گیا ہے ۔

ایک زمانہ میں محمد علی جناح کانگریسی اخبار "کرانیکل" سے وابستہ تھے ۔ وہ ڈائرکٹروں کے بورڈ کے چیئرمین تھے ۔ انہی دنوں کا قصہ ہے کہ بعض "قابل اعتراض" مضامین کی وجہ سے "کرانیکل" پر حکومت بمبئی کی جانب سے "پری سنسر شپ" قائم کردی گئی ، یعنی یہ کہ چھپنے سے پہلے ادارتی مضامین اور مراسلات حکومت کو دکھائے جائیں ۔ جب یہ حکم پہنچا

تو ڈائرکٹروں کی رائے ہوئی کہ اخبار کو کچھ عرصہ کے لئے بند
کردیا جائے اور کسی نوع حکومت کے حکم کے سامنے سر تسلیم
خم نہ کیا جائے۔ مگر جناح کی رائے تھی کہ اخبار بند نہ
کیا جائے بلکہ حکومت کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے، اس طرح
سے کہ ایڈیٹوریل کے کالموں کو خالی چھوڑا جائے اور باقی تمام
اخبار کو خبروں اور کلاسیکل انگریزی کتب کے اقتباسات سے
بھر دیا جائے۔ چند ہفتے تک اخبار اسی ہیئت سے نکلتا رہا۔
یہ خاموش احتجاج اس قدر موثر ثابت ہوا کہ حکومت نے بغیر
کسی تحریک کے اپنے احکام واپس لے لئے۔

جناح نے زندگی بھر گاندھی جی کے لئے ''مہاتما'' کا لفظ
استعمال نہیں کیا، مگر وہ انہیں ہندوؤں کا سب سے بڑا لیڈر
مانتے رہے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ بمبئی کے ایمپایر تھیٹر
میں جناح کسی پبلک جلسہ میں تقریر کررہے تھے۔ اثنائے تقریر
میں محمد علی کا نام آگیا، جناح نے ان کے لئے مسٹر کا لفظ
استعمال کیا۔ اس پر مجمع نے مطالبہ کیا کہ ''مولانا محمد علی
کہئے۔'' جناح نے مسکراتے ہوئے حاضرین کے مطالبہ کے سامنے
سر تسلیم خم کردیا۔ کچھ دیر بعد جناح نے گاندھی جی کو
مسٹر گاندھی کہا۔ اس پر حاضرین نے پھر مطالبہ کیا کہ
''مہاتما گاندھی کہئے۔'' مگر جناح اپنی بات اڑے رہے۔ جب
ہنگامہ کسی طرح فرو نہ ہوا تو گاندھی جی نے جو جلسہ کی صدارت
کر رہے تھے، مداخلت کرتے ہوئے فرمایا کہ ''میں مہاتما نہیں
ہوں۔'' تب کہیں جا کر یہ شور و شغب ختم ہوا۔ حقیقت یہ
ہے کہ جناح نے گاندھی جی کی مہاتمائیت کو کبھی تسلیم نہیں
کیا۔ گاندھی جی کے وحشیانہ قتل پر بھی جو پیغام تعزیت ان
کی طرف سے اہل ہند کے نام بھیجا گیا تھا اس میں بھی لفظ
''مہاتما'' استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ اسے خواہ جناح کی
وضعداری کہئے، خواہ اسے بدعقیدگی سے تعبیر کیجئے، مگر

حقیقت اپنی جگہ مسلم ہے۔

پاکستان بننے سے دو تین سال قبل میمن چیمبر آف کامرس (بمبئی) نے ان کی خدمت میں ایڈریس پیش کیا۔ اس موقع پر جناح نے جو تقریر کی اس کے ایک دو فقرے مجھے یاد رہ گئے ہیں۔ انہوں نے فرمایا:۔ ”میں ان جماعتی ناموں کو بالکل ناپسند کرتا ہوں۔ آپ کو چاہئے کہ اپنا نام مسلم چیمبر آف کامرس رکھیں اس لئے کہ اسلام ہی ہمارا حقیقی طرۂ امتیاز ہے۔“

ایک دفعہ سارت چندر بوس نے یہ بیان جاری کیا کہ ”مسٹر جناح کا یہ کہنا سرتاسر غلط ہے کہ ۱۰۰ فیصدی مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد ہے۔“ جناح نے سابو صدیق انسٹی ٹیوٹ میں ایک بھرے جلسہ میں اس کا یوں جواب دیا:۔ ”میں نے کبھی ایسی احمقانہ بات نہیں کہی کہ ۱۰۰ فیصدی مسلمان مسلم لیگ کے ساتھ ہیں۔ میں نے ہمیشہ یہ کہا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ مسلمانوں کی زبردست اکثریت (Overwhelming Majority) لیگ کے ساتھ ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مسلمانوں میں کچھ Quislings ہیں جو ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔“

جناح ایک اعتبار سے کم آمیز آدمی تھے۔ لیکن قومی کاموں کے سلسلہ میں وہ ہر کہ ومہ سے ملنے کے لئے تیار رہتے تھے، میرے دوست آفندی نے جو بمبئی ہائی کورٹ میں مترجم اور ترجمان رہ چکے ہیں اور جناح سے اچھے خاصے مراسم رکھتے تھے، ایک مرتبہ ان سے ٹیلیفون پر کہا کہ ”چند دوست آپ سے ملنا اور لیگ فنڈ میں کچھ رقم دینا چاہتے ہیں۔ ان کی واحد تمنا یہ ہے کہ کچھ لمحات آپ کی معیت میں گزاریں۔“ جناح نے پہلے تو عدیم الفرصتی کی بنا پر انکار کیا، لیکن پھر آفندی کے اصرار پر کہا کہ ”اچھا، میں صرف پانچ منٹ دے سکونگا۔“ بہرحال ملاقات ہوئی اور پانچ منٹ کی بجائے پورے پون گھنٹے

تک سلسلۂ گفتگو جاری رہا۔

راقم الحروف مرکزی حکومت کی مجلس قوانین کا بھی ووٹر تھا اور اس لئے جہاں کہیں بھی ہوتا جناح کو ووٹ دینے کے لئے لازماً بمبئی پہنچتا۔ ایک انتخاب میں (اور یہ بہت پرانی بات ہے) ان کے مقابلہ پر صالح بھائی بڑودہ والا اور حسین بھائی عبداللہ بھائی لال جی کھڑے تھے۔ دوپہر تک معلوم ہوگیا کہ کامیابی کس کا ساتھ دیگی۔ چنانچہ صالح بھائی جناح کے پاس آئے اور کہا کہ ''اگر آپ مجھ سے درخواست کریں کہ تم بیٹھ جاؤ تو اس صورت میں میرے لئے مقابلہ سے دست بردار ہوجانا زیادہ آسان ہوگا۔'' جناح نے مسکراتے ہوئے جواب دیا :۔ ''میرے دوست! میں ہرگز آپ سے ایسی درخواست نہیں کرونگا۔ آپ کو چاہئے کہ آخر وقت تک لڑیں اور اپنا کام جاری رکھیں'' مگر تھوڑی دیر بعد وہ مقابلہ سے ہٹ گئے۔ اس کے بعد حسین بھائی، جناح کے پاس پہنچے اور ان سے وہی کہا جو بڑودہ والا کہہ چکے تھے، مگر جناح نے انہیں بھی وہی جواب دیا، بالآخر وہ بھی میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ ان دونوں حریفوں کے میدان سے ہٹ جانے کے باوجود جناح انتخاب کا وقت ختم ہونے تک میدان میں ڈٹے رہے اور بالآخر زبردست اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

یہ واقعہ سب کو معلوم ہے کہ ایک خاکسار نے ملاقات کے بہانے جناح کی کوٹھی پر پہنچ کر ان پر چاقو سے حملہ کیا تھا۔ چونکہ جناح طویل القامت تھے اور حملہ آور پست قد تھا اس لئے حملہ میں جناح کو صرف گردن میں ذرا سی خراش پہنچی اور اس کے بعد خود جناح نے چوکیدار کی مدد سے حملہ آور پر قابو پالیا۔ مقدمہ کے دن میں ہائی کورٹ کے ترجمان آفندی کے پاس بیٹھا ہوا حملہ آور کے سوالوں کا ترجمہ کرنے میں ان کی مدد کر رہا تھا۔ جب ملزم کو سزا ہوگئی تو میں عدالتی لاک اپ میں

حملہ آور سے جا کر ملا۔ میں نے پوچھا کہ ''جب تمہارا ارادہ محض ملاقات کرنا تھا تو پھر چاقو تیز کروا کر اپنے ساتھ کیوں لے گئے تھے؟'' اُس نے جواب میں کہا کہ ''یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔'' پھر میں نے کہا کہ ''اب تمہیں ۵ سال تک اپنے کئے کی سزا بھگتنی ہوگی۔'' اس نے نہایت لاپروائی سے کہا کہ ''یہ مدت چٹکیاں بجاتے گزر جائیگی۔'' جناح اپنی زندگی میں اسی مقدمہ میں پہلی بار گواہ کی حیثیت سے عدالت میں پیش ہوئے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ جب ان کا بیان ہوا تو عدالت کا کمرہ ممتاز وکیلوں اور شہریوں سے بھر گیا تھا۔

جناح کی ساری عمر قانونی موشگافیوں میں گزری۔ اور اس سلسلہ میں کبھی کبھی ہائی کورٹ کے ججوں تک سے ان کی آویزش ہوجاتی تھی۔ اس قبیل کے دو واقعات درج کئے جاتے ہیں:۔ ایک دفعہ کوئی ہندو تاجر جناح کے پاس آیا اور باصرار کہا کہ ''آپ میرے مقدمہ میں عدالت العالیہ میں پیش ہوں۔'' جناح نے پوچھا کہ ''مقدمہ کس کی عدالت میں ہے؟'' اس نے کہا کہ ''جسٹس کانیا کی عدالت میں۔'' جناح نے کہا کہ ''اس جج سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں اور اس لئے مقدمے کا فیصلہ یقیناً تمہارے خلاف جائیگا۔'' اس نے کہا کہ ''کوئی پروا نہیں۔'' بہرحال جناح اس کی طرف سے پیش ہوئے اور جیسا کہ پہلے سے اندیشہ تھا فیصلہ ان کے موکل کے خلاف ہوا۔ جناح نے عدالت میں بیٹھے بیٹھے اُس سے کہا: ''میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ مجھے اس wretched کورٹ کے سامنے مت لےجاؤ، مگر تم نہ مانے۔ اب نتیجہ تمہارے سامنے ہے۔'' کہیں جسٹس کانیا نے یہ الفاظ سن لئے اور جناح سے کہا کہ ''آپ ابھی ابھی اپنے موکل سے کچھ کہ رہے تھے۔'' جناح نے پوچھا کہ ''کیا یور لارڈ شپ کو اُس گفتگو سے دلچسپی ہے جو ایک وکیل اپنے موکل سے کرتا ہے؟'' جسٹس کانیا نے اثبات میں

جواب دیا۔ اس پر جناح نے وہ الفاظ دھرا دئے جو انہوں نے اپنے موکل سے کہے تھے۔ یہ سنتے ہی جسٹس کانیا نے ایڈووکیٹ جنرل (سر جمشید جی کانگا) سے پوچھا کہ کیا ان الفاظ سے عدالت کی توہین ہوتی ہے؟ کانگا نے نفی میں جواب دیا اور معاملہ وہیں ختم ہوگیا۔ مگر اس کے بعد جناح نے جسٹس کانیا کی عدالت کا ہمیشہ کے لئے بائیکاٹ کردیا۔

اسی وضع کا ایک اور واقعہ اس وقت پیش آیا جبکہ جناح جسٹس علی اکبر خاں کی عدالت میں بحث کر رہے تھے۔ دوران بحث میں کہیں جسٹس مرزا کے منہ سے یہ الفاظ نکل گئے:-
"میری ذاتی رائے یہ ہے ...." اس پر معاً جناح نے کہا:-
"مائی لارڈ، میں یور لارڈ شپ کی ذاتی رائے کو پیتل کے دو بٹنوں کے برابر بھی وقعت نہیں دیتا۔" یہ سنتے ہی جسٹس مرزا نے جناح سے کہا کہ "آپ توہین عدالت کے مرتکب ہو رہے ہیں،" اور پھر ایڈووکیٹ جنرل (سر چمن لال سیتلواڈ) سے مخاطب ہوکر پوچھا کہ "کیا آپ کی رائے میں مسٹر جناح توہین عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں؟" اس کا جو جواب سر چمن لال نے دیا وہ یہ ہے:—

> "یہ میرا فرض منصبی نہیں ہے کہ اس بارے میں کسی رائے کا اظہار کروں کہ آیا مسٹر جناح توہین عدالت کے مرتکب ہوئے ہیں یا نہیں۔ یہ حق صرف یور لارڈ شپ کو ودیعت ہے اور صرف یور لارڈ شپ ہی اس امر کا فیصلہ کرنے کے مجاز ہیں۔ مگر مسٹر جناح کو جتنا میں جانتا ہوں اس کی بنا پر کہ سکتا ہوں کہ ان کا کبھی بھی یہ ارادہ نہیں ہوسکتا کہ وہ توہین عدالت جیسی چیز کے مرتکب ہوں۔"

اس کے بعد معاملہ آگے نہیں بڑھا۔

غالباً ۱۹۴۵ کا ذکر ہے کہ حسین بھائی آخری بار انتخاب

میں جناح کے خلاف کھڑے ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ ملک کے مسلمانوں کی زبردست اکثریت انہیں اپنا قائد مان چکی تھی۔ انتخاب کے سلسلہ میں جتنی تقریریں جناح نے کیں اُن میں سے کسی ایک میں بھی مذہب کا غلط استعمال نہیں کیا گیا تھا۔ برعکس اس کے حسین بھائی نے لفظ ''حسین'' سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ انتخاب والی رات کو حاجی داؤد ناصر کے یہاں ڈنر پر حسین بھائی بھی مدعو تھے۔ وہاں حاجی صاحب نے ان سے آخری بار درخواست کی کہ وہ جناح کے مقابلہ سے دست بردار ہوجائیں۔ اس کے جواب میں حسین بھائی نے کہا :-
'' تو کیا آپ بھی 'حسین' کو اکیلا چھوڑ کر جارہے ہیں؟''
اس انتخاب میں حسین بھائی کو گنتی کے صرف چند ووٹ ملے تھے۔ اگر خدانخواستہ جناح اس انتخاب میں ہار جاتے تو جو عظیم نقصان ملت اسلامیہ کو پہنچتا اُس کے تصور ہی سے بدن میں کپکپی پیدا ہوجاتی ہے۔

قائد اعظم کی زندگی کے آخری چند سال پاکستان کی جنگ سر کرنے میں صرف ہوئے اور اس میں جوزبردست کامیابی انہیں نصیب ہوئی وہ محض اُن کی دانشمندانہ رہنمائی کا نتیجہ تھی۔ اس طویل کشمکش میں انہوں نے قیادت کی جن اعلیٰ صفات کا مظاہرہ کیا وہ محض محیرالعقول ہیں۔ وہ ایک کامیابی کے بعد دوسری کامیابی سے ہم کنار ہوتے گئے یہاں تک کہ انہوں نے اپنا مقصد حیات پا لیا۔

خدا رحمت کند بر عاشقان نیک طینت را

***

ضمیمے

(۱)

[میرے چچا زاد بھائی مولوی محمد حسین (صفحہ ۲۴۲)
کی وفات پر مولانا ظفر علی خاں نے ذیل کا شذرہ اپنے قلم
سے "زمیندار" کی اشاعت مورخہ ۲۸ رمضان المبارک
۱۳۳۱ ھ میں لکھا تھا ۔ ض ۔ ا ۔ ب :-]

"مولوی محمد حسین کی وفات حسرت آیات

ہم نے اشاعت دیروزہ میں بہ عنوان 'اعتذار' مولوی محمد حسین خوشنویس اخبار زمیندار کے متعلق یہ خبر شائع کی تھی کہ وہ چند گھنٹہ سے عارضۂ ہیضہ میں مبتلا ہیں اور ان کی صحت کے لئے دعائیں مانگی جارہی ہیں، لیکن افسوس مولوی صاحب کا وقت پورا اور وعدہ برابر ہوچکا تھا ، اس لئے دوا بیکار اور دعا بے اثر ثابت ہوئی ، اور انہوں نے ۲۰ اگست کو رات کے ۱۰ بجے جان جان آفریں کے سپرد کردی ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔ یہ تیسری موت ہے جس سے "زمیندار" کو پندرہ دن کے اندر سابقہ پڑا ہے ۔ پہلی دو موتیں خاص دفتر زمیندار کے احاطہ میں واقع ہوئیں اور یہ آخری موت ڈپٹی سردار احمد صاحب پنشنر ڈپٹی کلکٹر کے جدید مکانات میں ہوئی جہاں مولوی محمد حسین نے ایک مکان کرایہ پر لے رکھا تھا ۔

جب ہم مولوی محمد حسین اور اخبار زمیندار کے تعلقات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمارے دل و دماغ پر رنج و الم کی گوناگوں کیفیات طاری ہوتی ہیں۔ ۱۹۰۳ میں اخبار زمیندار کا پہلا پرچہ

شائع ہوا تو اس کی کتابت کرنے والے مولوی محمد حسین ہی تھے۔ اور جب سے اب تک ان کا تعلق اخبار ہذا سے برابر قائم رہا اور آخر وہ دفتر اخبار زمیندار سے مر کر ہی علیحدہ ہوئے :-

آفریں داغ تجھے، خوب نبھائی تو نے
مرحبا کوچۂ دلدار سے مر کر نکلا

مولوی محمد حسین خدا ان کی قبر پر انوار رحمت نازل کرے، نہایت شریف النفس، منکسرالمزاج، اپنے فرض کے پابند اور مرنجان مرنج بزرگ تھے۔ ان کی وفات سے ہمارے قلب حزیں وضعیف پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ہے۔ انہیں اپنے کام کا اس درجہ خیال تھا کہ گذشتہ جمعہ کو وہ اپنے چھوٹے بھائی کی مزاج پرسی کے لئے جو بمقام جنڈیالہ ڈھابوالہ اسی مہلک مرض میں مبتلا تھا، گئے تھے لیکن ہفتے کے دن واپس لاہور آگئے اور یہاں آکر چار روز کے بعد خاک میں مل گئے :-

دشت میں مجنوں کی مٹی لائی تھی

اب مولوی محمد حسین زمین کے اندر چار ہاتھ اتر کر ایسے ہوگئے گویا کبھی دنیا میں آئے ہی نہ تھے، لیکن ان کی یاد ہمارے دل سے کبھی محو نہ ہوگی۔ مرحوم نے اپنی وفات سے چند دن قبل برسبیل تذکرہ ایک روز یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ میں اپنی تنخواہ میں ترقی نہیں چاہتا مگر محبوب عالم کی تنخواہ میں ضرور اضافہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ مرحوم کی خواہش کے مطابق محبوب عالم خوشنویس زمیندار کی تنخواہ تیس سے پینتیس کردی گئی ہے۔ مرحوم کے افسوس کوئی اولاد نہیں صرف ایک بیوی ہے جس کی خدمت میں ہم انشاء اللہ مبلغ دس روپے ماہوار بطور پنشن پیش کرتے ہیں اور یہ سلسلہ اس کی زندگی تک جاری رہیگا۔ دعا ہے کہ خدا ہمیں اپنے بیگانوں اور ابنائے جنس کی ہمدردی کی توفیق عطا فرمائے۔"

(۲)

(یہ مضمون وہ ہے جس پر مولانا حسرت موہانی کو پہلی مرتبہ ۱۹۰۸ میں دو سال کی سزائے قید ہوئی تھی :-)

انگریزوں سے بڑھکر شاید ہی کوئی قوم دوسرے ملکوں پر حکومت کرنے میں مشاق ہو۔ یہ لوگ جس ملک پر تسلط کرتے ہیں پہلے ان کی خواہش ہوتی ہے کہ وہاں کے باشندے مطمئن رہیں اور اپنے حکمرانوں کو اعتبار کی نظر سے دیکھنے لگیں۔ اس کے بعد یہ لوگ اپنے ہاتھ دکھاتے ہیں۔ سب سے پہلے کوشش انکی حکمراں جماعت کی یہ ہوتی ہے کہ محکوم قوموں اور ملکوں میں اپنی حالت سنبھالنے کا احساس پیدا نہ ہونے پائے، جہاں تک ہوسکے محکوم قومیں آپس میں لڑتی جھگڑتی رہیں اور ہمدرد بنی نوع انسان آن کی باہمی عداوت سے خوب فائدہ آٹھائیں۔ محکوم قوموں کی قومی بقاء کو تباہ کرنے کی جو کوششیں انگلستان نے کی ہیں شاید ہی کسی نے کی ہوں۔

قومی ترقی کے اسباب کو ایسے غیر محسوس ذریعوں سے روکا کہ کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی، مگر ان کی پالیسی اپنا اثر کر گئی۔ لاریب جب ایک حکمران قوم اپنے محکومین کے مستقبل سے متعلق اپنا کوئی خاص مدعا قرار دے لیتی ہے تو ایک نہ ایک دن پورا ہی ہوکر رہتا ہے۔ مسلمانوں کو سلطنت انگلستان سے ٹرکی کے بعد سب سے گہرا تعلق ہے اور اگر انگریزوں میں مسٹر بارٹلٹ آنجہانی کے خیال کے لوگ پیدا ہوتے رہتے تو غالباً دونوں قوموں کے تعلقات دوستانہ ہوجاتے۔ مگر [illegible] کو انگریزوں ہی

[illegible]

ثالث بنتے ھیں ، مصر اور ھندوستان کے مسلمانوں کے ملکی وجود کو تباہ کرنے میں انگریز ھی سرگرم نظر آئینگے ۔ عربی پاشا جو مصر کی آزادی اور نئی روشنی کا حامی اور نئے خیالات کا لیڈر تھا ، کیا وہ اس لائق تھا کہ جلا وطن کیا جائے ؟ سیلون سے گو وہ مصر میں آ گیا ، مگر ایک کشتی میں قید ھے اور اپنی زندگی کے باقی ایام کو نہایت حسرت اور یاس کی حالت میں دریائے نیل میں بسر کر رھا ھے ۔ قاھرہ آنے کا حکم نہیں ۔ غریب کی معاش کا نہایت ھی ناکافی بندوبست ھے ۔ مصر میں انگریزوں نے ۱۸۹۰ء تک رھنے کا وعدہ کیا تھا ، اور انگلستان کی عزت کا حلف اٹھایا تھا ۔ مگر آج جاتے ھیں نہ کل بلکہ روز بروز قدم جماتے جاتے ھیں ۔ اس پر بھی بس نہیں کرتے ، جب کہ مصر کی قومی ترقی اور نموئے ملی کو بھی غارت اور تباہ کرنا چاھتے ھیں ۔ چنانچہ انگریزوں کے قدم آتے ھی تعلیم میں کمی آ گئی گو آبادی میں تیس لاکھ کا اضافہ ھوا اور آمدنی پہلے کی نسبت چھہ گنی ھو گئی ۔

ذیل میں ھم ایک فہرست لکھتے ھیں جس سے تعلیم کو جو نقصان انگریزوں کے قبضۂ مصر سے پہنچا ھے واضح ھو جائیگا ۔ ۱۸۷۲ء تک معلمین کی تعداد ۱۹۳۷۸ تھی (انگریزوں سے پہلے) ۱۸۸۹ء میں یعنی انگریزوں کے دخل کے ساتھ ھی ۱۵۷۱۳ رہ گئی اور بالفعل یعنی ۱۹۰۵ء میں کم سے کم ھوتے ھوئے ۱۲۲۰۳ پر آ پہنچی ۔ پہلے ملک میں ۶۳ مدارس تھے مگر اب صرف ۵۰ ھیں ۔ متذکرہ بالا شمار و اعداد سے انگریزوں کی نیک نیتی اور قبضے کے مزید اثرات کا خوب پتہ چلتا ھے اور ضمناً کرومر کے اس وعدے کی تصدیق ھوتی ھے کہ میں نے اپنی عمر کا بہترین حصہ فلاحین مصر کی فلاح اور بہبودی میں صرف کیا ھے ۔

ظاھر ھے کہ ھر قوم کی ترقی تہذیب و شائستگی کا اندازہ اس

کی تعلیمی حالت سے ہوتا ہے اور تعلیم ہی ایک ایسی چیز ہے کہ جس کی بدولت ملک و ملت ذلت و خواری کی کینچلی آتار پھینکتے ہیں۔ مگر مصر میں باوجود انگریزوں کی تعلیم کے باب میں سد راہ ہونے کے ، تعلیم پھیلتی جاتی ہے ۔

ہر چند کہ کرومر نے فیس بڑھوادی اور سر رشتۂ تعلیم کا خرچ کم کر دیا ، مگر وہ تعلیم کی عام خواہش کو اور آزادی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو نہ روک سکا ۔ پہلے زمانے میں یعنی ہمدردان بنی نوع بشر کی تشریف آوری سے پہلے مصر کے سر رشتۂ تعلیم کا خرچ ایک لاکھ پونڈ تھا مگر انگریزوں نے رعایا کی خیر اندیشی کے خیال سے گھٹا کر ۲۳۰۰۰ پونڈ کر دیا اور اس میں نصف فیس کی رقمیں بھی شامل ہیں ، سر رشتۂ تعلیم میں ناقابل اور نا واقف لوگ بھرتی کئے جاتے ہیں ، تعلیم کے انتظامی مناصب کا بندوبست انگریزوں کے ہاتھ میں ہے ۔ غور کا مقام ہے کہ انگریز مصر کی ضروریات کیا خاک سمجھ سکتے ہیں ، اور ملکی زبانوں سے نابلد اشخاص تعلیمی مسائل کی مقامی دقتوں کو کیونکر حل کرسکتے ہیں ۔ انگریز جنہیں برسوں ہندوستان میں جھک مارتے گذر جاتے ہیں ، آردو تک ٹھیک نہیں بول سکتے ، آن سے یہ کیونکر توقع کی جائے کہ لوگوں کو مصر کا چند روزہ قیام زبان عربی کا ماہر بنادیگا جس کے نکات اور رموز سوائے اہل زبان کے کوئی شخص چاہے کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو نہیں جان سکتا ۔ اس وقت مصر کو تحصیل علم و آزادی کے لئے جد وجہد کرتے دیکھ کر جب ان ہمدردان بنی نوع بشر کا دل کڑھے تو وہاں تعلیم کو روکنے کے لئے چالبازی سے بڑھ کر جبر و تشدد سے کام لینا شروع کر دیا ۔ چنانچہ اب مصر میں یہ تجویز ہو رہی ہے کہ علوم و فنون کا درس حسب سابق عربی میں نہ دیا جائے ۔ عربی زبان نے اپنی وسعت کی وجہ سے آج تک یورپ کے تمام علوم کو

جگہ دی تھی اور مغربی اثر نے اس کی روح کو تازہ کر دیا تھا ۔ ملک میں زیادہ تر علوم اسی زبان میں پڑھائے جاتے تھے ۔ ظاھر ھے کہ کوئی ملک ادبی ذخائر سے اُس وقت تک مالا مال نہیں ھوسکتا تا وقتیکہ ملک میں اخذ کی قابلیت نہ ھو اور غیر سرمایہ اس میں جمع نہ ھو جائے ۔ انگریزی زبان ھی کی تاریخ کو دیکھئے ۔ اگر اس میں فرانسیسی اور لاطینی علم و ادب کا اثر نہ ھوتا تو یہ بھی چند وحشی زبانوں کی طرح سے ھوتی ۔ عربی زبان کی یہ ترقی اور اس میں نئی جان پڑتی دیکھکر کرومر جیسے مصر کے خیراندیشوں سے نہ رھا گیا ۔ چنانچہ مسٹر ڈنلوپ وزیر تعلیم اس بات پر زور دیتے ھیں کہ زبان عربی میں علوم و فنون نہ پڑھائے جائیں ۔

انہوں نے اپنی رپورٹ میں لکھا ھے کہ چونکہ عربی زبان اپنے موجودہ زمانے کے لئے ناکافی ھے اور غیر وسیع ھونے کی وجہ سے اس میں علوم مغربیہ کی تعلیم باکمل وجہ نہیں ھوسکتی ۔ مصر کے ان جار اللہ زمخشری کا یہ دعویٰ ایسا لچر ھے کہ اس کی تردید فضول ھے کیونکہ جس شخص کو عربی زبان سے ذرا سا بھی مس ھے یا جس نے جرمن محققین کی رائیں پڑھی ھیں وہ ڈنلوپ صاحب کے اس دعوے کی صداقت کو خوب سمجھ سکتا ھے ۔ کاش کہ اھل مصر کو یورپین زبانوں ھی میں تعلیم دی جاتی ۔ مگر وھاں نہ صرف تعلیم کا انتظام ناکافی ھے ، بلکہ اس کے اُصول میں بہت سے نقائص پیدا کئے جاتے ھیں ۔ مدارس کا کورس نہایت بیکار اور لغو ھے اور کسی کی تعلیم مکمل طور پر نہیں دی جاتی ۔ مصر میں امریکہ اور فرانس کے آزاد مدارس ھیں مگر اُن کی سندیں تسلیم نہیں کی جاتیں ۔ لیکن یہ بات قابل اطمینان ھے کہ مصر میں علم کی خواھش اور آزادی کے خیالات دن بدن ترقی کرتے جارھے ھیں ۔ اور نوجوان مصری یورپ کے مدارس میں تعلیم کے لئے بکثرت جاتے ھیں ۔ ھم کو اُمید ھے کہ قومیت

کی تعلیم جو مصطفی کامل رحمۃ اللہ علیہ نے اہل مصر کو دی ہے ، وہ ان کے دل میں نت نئے ولولے اور جوش پیدا کرتی رہیگی اور اسلامی ترقی کا آفتاب وادیٔ نیل سے نمودار ہوکر افریقہ ، ایشیا اور یورپ کو منور کر دیگا ۔ آمین ثم آمین۔

(از سلمان طالب علم)
(اردوئے معلیٰ ، اپریل ۱۹۰۸)

غلط نامہ

ص ۸۸ پر سبحان ہند کی بجائے سحبان ہند پڑھئیے

،، محمد راسخ ،، محمد عبدالرحمن راسخ پڑھئیے

ڈاکٹر مولوی عبدالحق

(کتاب وسط جولائی ۱۹۶۱ میں چھپ کر تیار ہوگئی تھی لیکن کچھ تو فضلی سنز کی مصروفیتوں کی وجہ سے اور کچھ میری اپنی مشغولیتوں کی وجہ سے کتاب کی جلد بندی میں تاخیر ہوتی چلی گئی - اس اثنا میں بابائے اردو کی حالت نازک سے نازک تر ہوگئی، یہاں تک کہ وہ ۱۶ اگست کی صبح کو اپنے خالق کے دربار میں پہنچ گئے۔ یہ دیکھ کر میرے جی نے گوارا نہ کیا کہ میں "عظمت رفتہ" کو ان کے ذکر سے محروم رکھوں - چنانچہ مولوی صاحب کے بارے میں میں اپنی کچھ یادیں شامل کتاب کر رہا ہوں — ض - ا - ب) -

مجھے مطلق یاد نہیں رہا کہ مولوی عبدالحق سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی - لیکن اتنا یاد ہے کہ ۱۹۱۶ میں اردو کانفرنس کا جو اجلاس ملک کے مشہور ادیب اور شاعر نواب نصیر حسین خاں "خیال" کی صدارت میں لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا اور جس میں شرکت کی غرض سے میں بھی کانپور سے لکھنؤ پہنچا تھا، اس میں ہم دونوں اس طرح سے ملے تھے گویا ایک دوسرے سے خوب واقف ہیں - اس کے بعد مولوی صاحب سے انگریزی — اردو لغت کی تیاری کے سلسلہ میں کچھ خط و کتابت بھی ہوئی - ایک خط کی نقل درج ذیل ہے :-

اورنگ آباد - دکن نمبر ۳۵۰

۱۰ مئی ۲۳ (۱۹)

مکرمی زاد لطفہ - تسلیم -

عنایت نامہ پہنچا - میں ممنون ہوں کہ آپ نے ترجمہ

لغت میں شرکت کی آمادگی ظاہر فرمائی ۔ انگریزی لغت کے اوراق مرسل خدمت ھیں ۔ افسوس کہ فیلن کی ڈکشنری اب تک دستیاب نہیں ہوئی ورنہ اس کے اوراق بھی ساتھ ھی ساتھ بھیجدیتا ۔ اگر آپ کو پتہ معلوم ہو جہاں سے ڈکشنری مل سکتی ہو تو ضرور مطلع کیجئے۔

عبدالحق

مجھے یاد نہیں کہ میں نے کب سے ''بمبئی کرانیکل'' میں انجمن کی مطبوعات پر بالاستیعاب ریویو لکھنے شروع کئے ۔ اس سلسلہ میں میں نے مولوی صاحب کو ایک خط بھی بھیجا تھا کہ وہ بغرض تبصرہ انجمن کی مطبوعات کے بھجوانے کا انتظام فرمادیں ۔ مولوی صاحب نے اس خیال کو بیحد پسند فرمایا تھا اور جواب میں ذیل کا گرامی نامہ بھیجا تھا :۔

اگست (سن کا حصہ کرم خوردہ ہے)

مکرمی و معظمی زاد لطفہ ۔ تسلیم ۔

آپ کا عنایت نامہ پہنچا ۔ ممنون فرمایا ۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے انجمن کی مطبوعات اور ''آردو'' پر ریویو کرنے کا خیال ظاہر فرمایا ہے ۔ اس سے انجمن کے مقاصد میں بہت بڑی مدد ملیگی ۔ میں نے دفتر کو ھدایت کردی ہے کہ رسالہ آردو باقاعدہ آپ کے نام جاری کر دیا جائے اور اس سال کے رسالے بھی آپ کی خدمت میں بھیجدئے جائیں اور جدید مطبوعات بھی بغرض ریویو ارسال کردئے جائیں۔

یہ سب چیزیں براہ راست آپ کی خدمت میں پہنچ جایا کرینگی - آپ کی اس عنایت کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں ۔

نیاز مند

عبدالحق

ریویو نگاری کا یہ سلسلہ تقریباً تقسیم ھند تک جاری رھا ۔

فروری ۱۹۳۴ میں میں نے مولوی صاحب کی خدمت میں انجمن کی کسی کتاب کے تبصرہ کا تراشہ ارسال کیا اور ساتھ ھی اپنے ایک دوست کی شکایت بھی لکھ کر بھیجی ۔ ان صاحب کا کہنا یہ تھا کہ ”میں نے دھلی کالج مرحوم کی تیاری میں مولوی صاحب کا ھاتھ بٹایا ھے ۔ لیکن اس کے باوجود مجھے اپنی محنت کا پورا معاوضہ نہیں ملا ۔ براہ کرم میرا حق الخدمت مجھے دلوا دیجئے ۔“ ان کی دوسری شکایت یہ تھی کہ ”میرا نام بھی کہیں درج نہیں کیا گیا حالانکہ میں ھر طرح اس کا مستحق تھا ۔“ چنانچہ میں نے یہ شکایتیں مولوی صاحب کو بھیج دیں تاکہ مجھے اصل واقعات سے آگاہ فرمایا جائے ۔ مولوی صاحب نے تفصیلی جواب مرحمت فرمایا جسے تمام و کمال اس غرض سے شائع کیا جارھا ھے کہ مولوی صاحب کی سیرت کا یہ رخ بھی جس کا تعلق لین دین سے ھے ، آجاگر ھوجائے ۔ و ھو ھذا :۔

بنجارہ روڈ ۔ حیدرآباد دکن ۔

۵ فروری ۱۹۳۴ء

مکرم بندہ ۔ آپ کا عنایت نامہ سفر میں میرے پیچھے پیچھے پھرتا رھا اس لئے جواب عرض نہ کرسکا ۔ عنایت نامہ کے ساتھ تبصرہ بھی پہنچا جس کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ھوں ۔

دھلی کالج کے مضمون میں . . . . صاحب کے ذکر کا کونسا موقع تھا ۔ نہ وہ وھاں کے طالب علم نہ مدرس ۔ البتہ اس کا گنہگار ھوں کہ ان سے معقول آجرت دیکر کچھ اوراق نقل کروائے تھے ۔ یہ اوراق اب بھی میرے پاس ھیں ۔ ان کی اس قدر آجرت دی ھے کہ وہ اس کے مصنف بھی ھوتے تو اتنی آجرت نہ ملتی اور وہ محض ان کے حال

پر رحم کیا کر، کیونکہ میرے ہاں بہت دنوں کام
کرچکے تھے۔ ان کے خط آپ پڑھیں تو ہنستے ہنستے
لوٹ جائیں۔ جنون کی ہر قسم موجود ہے۔ یہ اوراق
جب بھیجتے تو ایک لمبا چوڑا خط ہوتا کہ للہ ان
کا حوالہ نہ دیجیئے ورنہ سیکریٹریٹ کے کلرکوں کی
گردن مار دی جائے (گی)، یہاں بڑی احتیاط کی جاتی
ہے، کئی آدمی برخاست ہوگئے، کئی جیل بھیجدئے
گئے۔ یہ نقلیں بہت ناقص تھیں اور میرے پاس مدتوں
پڑی رہیں اور کام نہ آسکیں۔ چوتھے سال میں میں دو
تین مہینے کے لئے گرمیوں میں شملہ چلا گیا تھا۔ وہاں
گورنمنٹ (سے) تمام ضروری رپورٹیں اور کاغذات منگا کر
دیکھے۔ بعض چیزیں امپیریل لائبریری کلکتہ سے طلب
کرنی پڑیں۔ باقی پرانے گزیٹیروں، کتابوں، سفرناموں،
وغیرہ سے اور کالج کے پرانے طلبا سے پوچھ پوچھ کر
لکھیں۔ یہ اصل روئداد ہے اب آپ ہی فرمائیں کہ ان
کا نام میں کس ضمن میں لیتا۔

معلوم نہیں آجکل ان کے دماغ کا کیا حال ہے؟ آپ بالکل
مطمئن رہیں، ان کی کسی قسم کی حق تلفی نہیں کی گئی
بلکہ جو کچھ دیا گیا ان کے کام کے مقابلہ میں اس قدر
تھا کہ کسی کو یقین نہ آئے، یعنی مٹھا بھر کاغذات
کی نقل کے لئے کئی سو روپے دئے گئے ہیں۔ آپ شاید
.... والوں سے واقف نہیں۔

نیاز مند

عبدالحق

اس خط کے ملتے ہی میں نے اپنے دوست کو لکھ بھیجا
کہ "آپ کا کیس بہت ہی کمزور ہے اور مجھے افسوس ہے کہ
میں نے مولوی صاحب کو ناحق تکلیف دی۔"

عدم تعاون کے زمانہ میں مولوی صاحب گاندھی جی کی تحریک سے حد درجہ متاثر تھے۔ مگر جب علی برادران ''علیگڑھ یونیورسٹی کا بت'' توڑنے میں لگ گئے تو اس وقت مولوی صاحب بلبلائے بلبلائے پھرتے تھے تاکہ یونیورسٹی پر آنچ نہ آنے پائے۔ ان دنوں ایک سفر میں میرا ان کا ساتھ ہو گیا۔ راستہ میں جو گفتگو ہوئی اس کا خلاصہ یہ تھا:۔ ''میں خوش ہوں کہ گاندھی جی کی تحریک کی بدولت انگریزوں کے خناس ڈھیلے ہو رہے ہیں، مگر میں کسی نوع اس بات پر تیار نہیں ہوں کہ مسلم یونیورسٹی کو جو میری مادر علمی ہے، کوئی گزند پہنچے۔''

مولوی صاحب کے متعلق عام طور پر مشہور تھا کہ وہ دھریے ہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے۔ وہ پکے موحد تھے اور انہیں رسول اکرم (ص) کی رسالت پر پختہ یقین تھا۔ میرے بہت سے دوست ایسے ہیں جنہوں نے ان کی معیت میں نماز ادا کی ہے۔ اس سلسلہ میں میں ایک واقعہ بیان کرونگا جس سے اس مسئلہ پر مزید روشنی پڑتی ہے:۔ ایک مرتبہ کسی شخص نے ان سے پوچھ ہی لیا کہ ''کیا آپ دھریے ہیں؟'' مولوی صاحب یہ سنتے ہی آپے سے باہر ہوگئے اور نہایت جوش سے کہا کہ ''تم میرا نام جانتے ہو؟ جلد بتاؤ، میرا نام کیا ہے؟'' اس شخص نے رکتے رکتے نام بتایا۔ اس پر مولوی صاحب نے فرمایا: ''جس شخص کا نام عبدالحق ہو کیا وہ دھریہ ہوسکتا ہے؟''

بعض لوگوں کا خیال تھا اور اب بھی ہے کہ ۱۹۰۸ میں جس مضمون کی پاداش میں مولانا حسرت موہانی کو پہلی مرتبہ سزائے قید ہوئی تھی وہ مولوی صاحب کا تحریر کردہ تھا۔ یہ سچ ہے کہ مولوی صاحب نہ صرف ہندوستان کی آزادی کے قائل تھے بلکہ وہ تمام غلام ملکوں کو آزاد دیکھنا چاہتے تھے،

مگر وہ مضمون ان کا نہ تھا ۔ ایک دن میں نے خاص طور پر ان سے اس مضمون کے بارے میں بات چیت کی ۔ جواب میں انہوں نے فرمایا کہ ” وہ مضمون میرا لکھا ہوا نہ تھا ۔ “ خود حسرت نے بھی حکومت کے اصرار کے باوجود نہیں بتایا کہ اس کا لکھنے والا کون تھا ، بلکہ ایڈیٹر ، پرنٹر اور پبلشر کی حیثیت سے سارا جرم خود اوڑھ لیا اور یہ چیز معمہ بنکر رہ گئی ۔ البتہ مولوی سید سلیمان ندوی نے ” یاد رفتگاں “ (صفحہ ۹۷۳) میں اس راز سے پردہ اٹھاتے ہوئے تحریر فرمایا ہے :۔ ”جہاں تک کان میں پڑی ہوئی بات اس وقت یاد آتی ہے ، یہ مضمون اعظم گڑھ کے مشہور شاعر وکیل اقبال سہیل کا تھا جو انہی کی طرح شعر و سخن اور سیاسی مذاق کا اتحاد رکھتے تھے ۔ “

مولوی صاحب سودیشی کے بڑے حامی تھے ۔ نجی خط و کتابت میں وہ بالعموم ہاتھ کا بنا ہوا کاغذ استعمال کرتے تھے ۔ یہ اورنگ آباد کی ایک خاص صنعت تھی اور شاید اب بھی باقی ہے ۔

ایک دن میں سہ پہر کے وقت انجمن گیا ۔ ابھی مولوی صاحب سے باتوں میں مشغول تھا کہ میں نے ان کے ملازم سید بدر عالم مارہروی سے کہا کہ ”چائے بنا کر لاؤ ۔ “ تھوڑی دیر میں چائے آ گئی ۔ میں چائے پی رہا تھا کہ کوئی صاحب آئے اور بدر عالم کو مٹھائی کا ایک ڈبہ دیکر چلے گئے ۔ یہ صاحب ہندوستان سے آئے تھے اور مولوی صاحب کے لئے وہیں کی مٹھائی لائے تھے ۔ بدر عالم چاہتے تھے کہ مٹھائی لیجا کر اندر رکھ آئیں کہ اتنے میں میں نے زور سے آواز دی : ” میاں، مٹھائی کہاں لئے جارہے ہو ؟ ٹیکس تو دیتے جاؤ ۔ “ چنانچہ میں نے چند ڈلیاں لیکر باقی ڈبہ واپس کر دیا ۔ میں مٹھائی کھاتا جاتا تھا اور مولوی صاحب کو دیکھتا جاتا تھا ۔ وہ میری ان حرکتوں پر مسکرا رہے تھے ۔ وہ میری بے تکلفی سے کبھی ناخوش نہیں

ہوئے - میرے چلے جانے کے بعد انہوں نے حکیم اسرار احمد سے میری بے تکلفی کی بہت تعریف کی -

ایک مرتبہ انجمن کے دفتر میں ایڈھاک کمیٹی بنائی گئی اس غرض سے کہ یونیورسٹی کے لئے چندہ کی مہم شروع کی جائے۔ منصوبہ یہ تھا کہ مولوی صاحب چندہ کے لئے خود نکلیں - میں نے عرض کیا کہ ”مولوی صاحب کو صرف ایسی جگہ لے جانا چاہئے جہاں سے اچھی رقم ملنے کی توقع ہو، ورنہ یوں انہیں لئے لئے پھرنا کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا - ہمیں انفرادی طور پر بھی کوشش کرنی چاہئے اور فنڈ کی فراہمی میں ان کا ہاتھ بٹانا چاہئے - “ اس کے بعد میں نے مولوی صاحب سے عرض کیا کہ ”جہاں تک پین اسلامک اسٹیم شپ کمپنی کا تعلق ہے میں آپ کو زحمت دئے بغیر مطلوبہ رقم لادونگا - “ چنانچہ میں نے کمپنی کے منیجنگ ڈائرکٹر عبدالحمید اسمعیل صاحب سے اردو یونیورسٹی کی ضروریات کا ذکر کیا اور انہوں نے نہایت مسرت سے پہلی قسط کے طور پر ایک ہزار روپے کا چیک عنایت فرمایا۔ جب میں چیک لیکر مولوی صاحب کی خدمت میں پہنچا تو وہ بیحد خوش ہوئے اور فرمایا کہ ”اب آپ چائے اور کیک کے حقدار ہوگئے ہیں۔ “

ایک دفعہ بمبئی میں سہ پہر کے وقت سیر میں میرا ان کا ساتھ ہوگیا - اس موقع پر موضوع گفتگو ”کتابیں“ تھا - اردو کی مختلف نایاب کتابوں کے نام لے لیکر بتاتے تھے کہ وہ انہیں کس طرح سے اور کہاں سے حاصل ہوئیں - وہ اس قسم کی گفتگو خوب مزے لے لیکر کرتے تھے - اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا میں اگر انہیں کسی چیز سے کوئی دلچسپی ہے تو وہ صرف کتابیں ہیں - اس بارے میں ان کا تقابل خدا بخش (بانیٔ پٹنہ لائبریری) سے کیا جاسکتا ہے -

مولوی صاحب کو اردو سے انتہائی عشق تھا - انہوں نے

" مومن " کی پہچان یہ مقرر کر رکھی تھی کہ اسے اردو سے محبت ہو۔ بالفاظ دیگر اگر اسے اردو سے محبت نہیں ہے تو وہ ان کے خیال میں کافر ہی نہیں بلکہ اکفر ہے - بقول پروفیسر سجاد مرزا " اردو کا اگر کوئی مذہب ہے تو بس وہی مولوی صاحب کا مذہب ہے - اردو زبان کا اگر کوئی وطن ہے تو بس وہی مولوی صاحب کا وطن ہے - اردو کے لئے جہاں حالات سازگار دیکھتے ہیں وہیں جا دھمکتے ہیں - چنانچہ دھلی چھوڑنی پڑی تو کراچی میں ڈیرا ڈال دیا - " ان کی دوستی اور دشمنی محض اردو کی بنا پر تھی - اگر کوئی شخص اردو کا دشمن ہے تو وہ ان کا دشمن ہے اور اگر کوئی شخص اردو کا دوست ہے تو وہ ان کا دوست ہے - انہوں نے دوستی اور دشمنی کا معیار یہی کچھ مقرر کر رکھا تھا -

وہ بہترین مرقع نگار تھے - ان کے مرقعے دیکھنے ہوں تو " چند ہمعصر " پڑھئے۔ یہ کتاب ایسی ہے جسے بار بار پڑھنے سے بھی سیری نہیں ہوتی - سید محمود ، خواجہ غلام الشقلین ، مولانا محمد علی ، نواب محسن الملک ، نواب عمادالملک ، مولوی چراغ علی ، خواجہ حالی اور سر سید کی کیسے کیسے خوبصورت انداز میں کردار نگاری کی گئی ہے ۔ ان سب حضرات کی ذاتی خصوصیات بھی کسی حد تک مولوی صاحب کی ذات گرامی میں جمع ہو گئی تھیں ، مثلاً دیانت ، مہمان نوازی ، سچائی ، فرض شناسی وغیرہ -

انہوں نے متعدد کتابوں کے " مقدمے " لکھے ہیں اور اسی وجہ سے وہ عام طور پر " مقدمہ باز " کے لقب سے مشہور ہو گئے تھے - آپ ان مقدموں کو بہ نظر غائر پڑھیں تو آپ کو ایک ایک لفظ سے ان کی وسیع معلومات اور علمیت کا احساس ہو جائیگا۔ ان کے بعض " مقدمے " حرف آخر کی حیثیت رکھتے ہیں -

بلحاظ عادات مولوی صاحب بہت سیدھے سادے انسان تھے۔

وہ بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے - تندرستی کے زمانہ میں ان کی صبح کی ہوا خوری کبھی ناغہ نہیں ہوئی - چائے کے بہت شوقین تھے - ذاتی طور پر بہت محنتی تھے - انگریزی کی مشہور مثل (Simple living & high thinking) کا وہ پیکر مجسم تھے - ''چند ھمعصر'' میں مولوی صاحب نے ''نام دیو مالی کا تذکرہ بڑے مزے لے لیکر لکھا ہے اور اس کی سیرت کے مختلف پہلوؤں کو خوب اجاگر کیا ہے - بعض امور میں اس میں اور مولوی صاحب میں گہری مماثلت تھی اس لئے کہ مولوی صاحب بھی اپنا کام اس کی طرح انتہائی انہماک سے انجام دیتے تھے -

نہ ستایش کی تمنا نہ صلہ کی پروا

وہ اپنا کام کر کے خوش ہوجاتے تھے کہ '' کارے کردم -''

چند سال پیشتر کراچی پولیس نے یہ ھنگامہ کھڑا کر دیا کہ موٹروں وغیرہ پر نمبروں کی تختیاں صرف انگریزی میں قابل قبول ھونگی اور یہ کہ جن کاروں کا نمبر اردو میں ھوگا، ان کے مالکوں پر مقدمہ چلایا جائیگا - اس وقت مولوی صاحب بھڑک گئے اور زور دار بیانات شائع کر کے حکومت پر واضح کر دیا کہ '' پاکستان میں اردو کو دیس نکالا نہیں مل سکتا - '' اس سلسلہ میں ابو طالب نقوی کی خدمت میں ایک وفد بھیجا گیا تھا جس میں راقم الحروف بھی شامل تھا - وفد نے نقوی صاحب کو اس غلط حکم کے نتائج سے آگاہ کیا، پھر کہیں جا کر یہ فیصلہ ھوا کہ پلیٹوں پر اردو کے نمبر بھی قانونی طور پر صحیح متصور ھونگے - اگر اس طرح سے اردو کے حق میں فیصلہ نہ ھوجاتا تو مولوی صاحب با این سن و سال (جیسا کہ وہ مجھ سے فرماتے تھے) قانون شکنی پر بھی آمادہ تھے -

اسی زمانہ میں مولوی عبدالحق نے '' قوم کے نام ایک پیام'' جاری کیا تھا جس میں انہوں نے تحریر فرمایا تھا: '' پولیس نے اردو دشمنی کے تحت اعلان کیا ہے کہ تمام کاروں کی پلیٹیں

صرف انگریزی میں ہوں ورنہ کاریں ضبط کرلی جائینگی - لہذا میں قوم کے ہر فرد سے اپیل کرتا ہوں کہ اس حکم کی مطلق پروا نہ کی جائے اور جس قدر جلد ہوسکے تمام کاروں کے نمبر اردو میں تبدیل کرلئے جائیں تاکہ اقتدار کے نشہ میں مست اور متوالوں کو معلوم رہے کہ آج قائد اعظم (رح) ہمارے درمیان موجود نہیں لیکن ان کے بتائے ہوئے راستوں پر چلنے والی قوم بیدار ہے ، اور ان کے اس فرمان کو کہ پاکستان کی قومی زبان اردو اور صرف اردو ہوگی ، بھولی نہیں — عبدالحق - ''

خواجہ کمال الدین کے بعد میں نے سوائے مولوی عبدالحق کے اور کسی شخص کو نہیں دیکھا جس نے محض ایک مقصد کے لئے اپنی ساری زندگی قربان کردی ہو -

ان کی زندگی کا مقصد وحید اردو کی خدمت کرنا تھا - جہاں دیکھتے کہ اردو پر حملے ہو رہے ہیں ، وہیں پہنچکر وہ اس کی مدافعت میں سینہ سپر ہو جاتے - زبان کے مسئلہ پر گاندھی جی سے ان کے معرکے آج بھی دماغوں میں تازہ ہونگے - انہوں نے بالآخر بابو راجندر پرشاد سے یہ منوالیا تھا کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان کا نام '' ہندی '' کی بجائے '' ہندوستانی '' ہوگا جو دیوناگری اور فارسی رسم الخط دونوں میں لکھی جائیگی - یہ عظیم الشان کامیابی تھی جو انہیں حاصل ہوئی - انہوں نے نہ صرف یہ کہ اپنا ذاتی کتب خانہ انجمن کے حوالہ کردیا بلکہ اپنی زندگی بھر کی کمائی بھی اسی کی نذر کردی - اس سے بڑھکر اور کیا قربانی ہوسکتی ہے ؟

انہیں طلبا سے بیحد محبت تھی - وہ انہیں مستقبل کا معمار کہا کرتے تھے - سال ڈیڑھ سال پیشتر جبلپور کے فسادات کے سلسلہ میں کراچی میں طلبا اور پولیس میں جو آویزش ہوئی اور جس کے نتیجہ میں چند طلبا سزایاب بھی ہوگئے اس سے مولوی صاحب بہت متاثر تھے - انہوں نے فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب

خاں سے ''رحم کے نام پر نہیں بلکہ انصاف کے نام پر'' ان کی رہائی کی اپیل بھی کی تھی - اس سلسلہ میں انہوں نے قدرت‌اللہ شہاب سے بھی مراسلت کی تھی اور آخر میں طلبا سے صاف صاف کہدیا تھا کہ ''اگر تمہیں کچھ مزید کہنا ہو تو میرے پاس آنے کی بجائے 'یاخدا' کے مصنف کو پکارو جو ایک درد مند دل رکھتا ہے -''

کراچی آجانے کے بعد مولوی صاحب کے ابتدائی چند سال تو اطمینان کے ساتھ گزرے پھر ایک مخصوص حلقہ سے ان کی مخالفت شروع ہوگئی - یہ مخالفت اس شدت کی تھی کہ خدا کی پناہ ! ان کے لئے یہ سخت ابتلا کا زمانہ تھا - سرسید ، حالی اور مولانا محمد علی کی طرح انہیں بھی زہر کا پیالہ پینا پڑا - اور کوئی ہوتا تو اس صدمۂ جانکاہ سے عہدہ برآ ہی نہ ہوسکتا ، مگر اس بوڑھے کی ہمت قابل داد ہے کہ اس نے صبر ایوبی سے سب کچھ جھیل لیا - اگر ملک میں انقلابی حکومت قائم نہ ہو جاتی تو نہیں کہا جاسکتا کہ سیاست دانوں کے عہد حکومت میں خود غرض مخالفین کے ہاتھوں ان پر کیا گزرتی !

میں مولوی صاحب سے عمر میں ۲۰ سال چھوٹا تھا - مگر وہ مجھ سے اس طرح سے ملتے تھے گویا ہم دونوں برابر کے دوست ہیں - ہم میں بیحد بے تکلفی تھی اور میری بے تکلفانہ باتوں سے وہ بہت خوش ہوتے تھے - جس زمانہ میں ان کی مخالفت زوروں پر تھی میں وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا تھا اور طرح طرح کی باتیں کر کے انہیں خوب ہنسایا کرتا تھا - مقصد یہ تھا کہ وہ طوفان مخالفت سے کبیدہ خاطر نہ ہوں - انگریزی محاورہ کے مطابق انہیں چیئراپ (Cheer up) کرنے کی سخت ضرورت تھی - میں اخبارات کے کالموں میں بھی مخالفین کے الزامات کا جواب دیتا رہتا تھا - خدا کا شکر ہے کہ ان تاریک ایام میں میں مقدور بھر مختلف طریقوں سے مولوی صاحب کے

کام آیا :-

منت منہ کہ خدمت سلطاں همی کنی
منت شمار ازو کہ بہ خدمت گزاشتت

مولوی صاحب کبھی کبھی شعر بھی کہ لیتے تھے - جتنے شعر میں نے اب تک سنے ھیں - وہ زیادہ تر مزاح کا رنگ لئے ہوئے ھیں - ان کا ایک مشہور شعر ھے :-

نہ فکر معیشت نہ عشق بتاں ھے
مگر جاگتے رات کٹتی ھے ساری

یہ شعر مشہور اس معنی میں ھے کہ یہ ان کے بہت سے ملنے والوں کو یاد ھے - اسی طرح انہوں نے ایک دن بیٹھے بیٹھے شان الحق حقی کی تعریف میں ذیل کے دو شعر ایک کاغذ پر لکھ کر مشفق خواجہ کو بھیجدئے - وہ شعر یہ ھیں :-

تو نے حقی کو خوب گانٹھا ھے
اپنے مطلب کو خوب چھانٹا ھے
دیکھنے میں وہ پھول ھے لیکن
در حقیقت وہ سیہ کا کانٹا ھے

یہ محض مذاقاً لکھا گیا ھے ، اس سے کسی کی تنقیص مراد نہ تھی - مولوی صاحب حقی کو بہت چاھتے تھے اور ان سے مذاق بھی کیا کرتے تھے -

مولوی صاحب کبھی کبھی ایک مصرع پر دوسرا مصرع بھی لگا دیتے تھے -

اسی طرح مولوی صاحب نے نواب شاہ کے زمانۂ قیام میں اختر انصاری اکبر آبادی ایڈیٹر ”نئی قدریں“ کی شان میں ذیل کے اشعار لکھے تھے :-

اختر انصاری اکبر آبادی
دین و دنیا کی تجھ سے آبادی

حیدرآباد میں ترے دم سے
گونجتی ہے صدائے آزادی
تو نے وہ وہ اصول لکھے ہیں
پڑھ کے حیراں ہیں حیدرآبادی
نئی قدروں میں لکھ کے شعر اپنے
غزل اپنی اثر سے ٹکرا دی
منظر و خواجہ و حکیم اسرار
مانتے سب ہیں تیری استادی

انہوں نے ''اختر انصاری اکبر آبادی'' کے لئے ایک ''مزاحیہ'' شعر بھی لکھا تھا مگر افسوس ہے کہ وہ اب میرے حافظہ میں نہیں ہے۔ بہرحال مولوی صاحب شعر کہتے تھے جو زیادہ‌تر وقتی ہوتے تھے اور بعضوں میں چوٹیں بھی ہوتی تھیں۔

گذشتہ سال میں دمہ کے مرض میں مبتلا ہوا۔ وہ حملہ اس قدر سخت تھا کہ میری زندگی کے لالے پڑگئے تھے۔ میں دو تین مہینے تک بستر سے نہیں اٹھا۔ ان دنوں حکیم امام الدین امامی (بنگلور) مولوی صاحب کے یہاں مہمان کی حیثیت سے مقیم تھے۔ میرا حال پوچھنے کے لئے مولوی صاحب انہیں پابندی سے بھیجا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کی یہ شفقت آمیز محبت آج بھی میرے دل پر پوری طرح نقش ہے۔

عرصہ ہوا کراچی میں وائی۔ ایم۔ سی۔ اے کے ہال میں قومی زبان کے بارے میں ایک بحث و مباحثہ ہوا۔ زاھد حسین نے رائے دی کہ پاکستان کو عربی زبان اختیار کرلینی چاہئے۔ اس پر عبدالحق بگڑ گئے اور ایک زور دار تقریر میں زاھد حسین کے دلائل کو رد کرتے ہوئے انہوں نے فرمایا: ''تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہم ساری عمر پتھر ہی ڈھوتے رہیں۔'' جلسہ کے بعد میں نے مولوی صاحب کے موقف کی یہ کہکر تائید کی کہ ''تاریخ میں ایسے واقعات تو ہوئے ہیں کہ لاکھوں افراد

نے کسی ایک مذہب کو قبول کرلیا ہو، لیکن آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ لوگوں نے اپنی خوشی سے اور برضا و رغبت اپنی زبان چھوڑ کر کسی غیر ملک کی زبان کو اختیار کرلیا ہو۔ یہ تو بہت ہی غیر فطری چیز ہوگی۔" مولوی صاحب میرے استدلال سے بہت خوش ہوئے، اور دیر تک اسی موضوع پر اظہار خیال کرتے رہے۔

جس دن سے مولوی صاحب راولپنڈی سے نیول ہاسپٹل کراچی میں لائے گئے، میں شام کو ان کی مزاج پرسی کے لئے بلا ناغہ پہنچ جاتا تھا اور وہاں ہسپتال والوں کی بندشوں کے باوجود کئی گھنٹے تک رہتا تھا، مگر میں نے ان سے بات چیت کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی اس لئے کہ ان کی نحیف حالت اس امر کی اجازت نہ دیتی تھی۔ مگر کمزوری کے باوجود اُنہوں نے از خود مشفق خواجہ، حکیم اسرار احمد اور نجمی سے باتیں کیں۔ ایک سہ پہر کو اُنہوں نے ڈاکٹر شوکت سبزواری سے خاص طور پر اُردو بورڈ کا ذکر کیا اور پھر مشفق خواجہ کو ہدایت کی کہ صدق جائسی کی کتاب "دربار دربار" انجمن کی طرف سے جلد از جلد شائع کی جائے۔ آخری دن شام کے وقت اُنہوں نے میری موجودگی میں آہستگی سے لفظ "انجمن" ادا کیا جسے ابن انشا، ڈاکٹر شوکت سبزواری اور مولوی صاحب کے بھائی احمد حسین نے بھی سنا۔ یہ آخری لفظ تھا جو اُن کے منہ سے نکلا اور پھر انہیں چپ سی لگ گئی۔ اس شام کو میرے ساتھ حافظ عثمانی بھی تھے۔ میں نے ان سے کہا کہ "آپ حافظ قرآن ہیں، دل ہی دل میں کچھ سورتیں پڑھئے اور ان پر پھونک دیجئے۔" چنانچہ اُنہوں نے سورۂ یسین کے علاوہ چند اور سورتیں تلاوت کرکے دم کیں۔ ابھی ہم سب اندر ہی تھے کہ اطلاع ملی کہ ڈاکٹر سید آرہے ہیں۔ چنانچہ ہم لوگ باہر چلے آئے۔ بعد از معائنہ اُنہوں نے جمیل الدین عالی سے اکیلے میں کہا

کہ "حالت تشویشناک (grave) ہے - ابھی (coma) کی کیفیت
شروع نہیں ہوئی مگر تھوڑی دیر میں بیہوشی شروع ہو جائیگی۔"
اسی اثنا میں پنڈی سے ایک پیغام آیا کہ صدر مملکت مولوی
صاحب کی خیریت دریافت فرماتے ہیں۔ اس کے بعد میں گھر
لوٹ آیا اور دل میں یہ دہشت تھی کہ مولوی صاحب کی زندگی
کی یہ آخری رات ہے - بہرحال ساری رات مولوی صاحب
خاموشی ، ضبط اور تحمل سے موت سے کشمکش کرتے رہے -
اور آخرکار صبح کو آٹھ بجکر چالیس منٹ پر یہ مرد مجاھد
اپنے رب کے حضور میں حاضر ہو گیا -

صدر مملکت فیلڈ مارشل جنرل محمد ایوب خان نے شروع
ھی سے اس عظیم المرتبت ادیب کے ساتھ جو امتیازی
برتاؤ روا رکھا اس پرسارے پاکستان کو سدا فخر رھیگا -
صدر کا یہ اعلان کہ وہ مولوی صاحب کے مقبرہ کی تعمیر
اپنے صرفہ سے کرائینگے ، قدر دانی کا ایسا کارنامہ ہے
جس کی دوسری مثال اس زمانہ میں شاید ھی مل سکے -
درحقیقت صدر نے اپنے حسن سلوک سے ساری دنیائے
اردو کو گرویدہ بنالیا ہے -

مولوی عبدالحق کی موت کوئی معمولی سانحہ نہیں ہے - یہ
ایک ایسے شخص کی موت ہے جس پر تہذیب و ادب کا ایک
پورا دور ختم ہو گیا ، وہ دور جو ھند و پاکستان کی تاریخ میں
غالباً سب سے زیادہ شاندار اور مہتم بالشان تھا - اپنی ۹۲ سالہ
زندگی میں جن بڑے بڑے اشخاص سے وہ ملے یا جن کی صحبتوں
میں وہ رہے ، وہ سب دیو پیکر تھے ، اور افسوس ہے کہ اتنا زمانہ
گزرنے پر بھی ھم ان کی عظمت کا کماحقہ اندازہ نہیں کرسکے
حالانکہ وہ تاریخ پر اپنا امٹ نشان چھوڑ گئے ھیں -

ھمارے یہاں اس قدر قحط الرجال ہے کہ جو بڑا آدمی
مر جاتا ہے ، اس کا نعم البدل تو کیا اس جیسا بھی پھر نہیں

پیدا ہوتا ۔ ویسے میری دعا ہے کہ ملک میں بہت سے عبدالحق پیدا ہوں ، لیکن ذاتی طور پر مجھے امید نہیں کہ کوئی دوسرا شخص ان کی جگہ کو پر کرسکے ۔

تمت بالخیر

کچھ کتاب کے بارے میں

اس میں کوئی 94 شخصیتوں کے مرقعے ہیں - یہ چلتی پھرتی ، جیتی جاگتی ، بولتی تصویریں ہیں جو آپ کے سامنے پیش کی گئی ہیں - یہ اُن اشخاص کے حالات ہیں جو ہند وستان کی تاریخ پر اپنا اسٹ نشان چھوڑ گئے ہیں - ان صفحات میں آپ کو نیکی، پاس وضع، انسان دوستی ، حب الوطنی ، شرافت اور خدمت الناس کے لازوال نمونے ملیں گے-

اس میں بعض بڑی بڑی ہستیاں ہیں- جو اپنے زمانے میں منفرد تھیں- ان کی صرف خوبیوں سے سروکار رکھا گیا ہے تاکہ موجودہ اور آنے والی نسلیں اثر پذیرہوں- یہ سوانح مختصر انداز میں تحریر کئے گئے ہیں- ان میں سے اکثر لوگ دیوپیکر تھے اور ہم سب ان کے سامنے محض پودنے ہیں - ان میں کچھ گمنام بھی ہیں ، مگر تھے سب کے سب اپنی جگہ پر صاحب عظمت-

اس کے مطالعہ سے زندگی کی اعلٰی قدریں اُجاگر ہوں گی - برصغیر پاکستان اور ہندوستان کی تاریخ لکھنے والوں کو اس سے بڑی مدد ملے گی- اُردو میں ایسی کتابیں بس چند ہی ہیں اور بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی " یہ ان میں معقول اور خوشگوار اضافہ ہے -" جو فوٹو درج کئے گئے ہیں ان میں چند نایاب ہیں - وہ " گروپ فوٹو " جس میں خلیل خالد بک بیج میں بیٹھے ہیں، مولانامحمدعلی کے دفتر واقع کوچہء چیلاں میں کھینچا گیا تھا- دوسرا گروپ فوٹو تحریک علیگڑھ سے تعلق رکھتا ہے- یہ فوٹو بھی ایک حد تک نایاب ہے- خواجہ حسن نظامی کے فوٹو بھی نایاب ہیں-